دینِ اسلام میں
سُنّت وحدیث کا مقام

ترجمہ کتاب

السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی

تالیف

الدکتور الشیخ مصطفیٰ حسنی السباعی الشامی

ترجمہ

ڈاکٹر مولینا احمد حسن ٹونکی

نظرثانی وترمیم وتعلیقات

مولینا محمد ادریس میرٹھی

جلد اول

ناشر

شعبۂ تصنیف وتالیف مدرسۂ عربیۂ اسلامیہ کراچی ۵

اسلام میں
سنت و حدیث کا مقام
السنة ومكانتها في التشريع الإسلامي
تالیف
الشيخ مصطفى حسني السباعي
ترجمہ
اضافہ و تعلیق
مولانا محمد ادریس میرٹھی
ناشر
toobaa-elibrary.blogspot.com

فہرست

جلد اول تمام شد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

(حضرت مولانا محمد یوسف بنوری مدظلہم)

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد خاتم النبیین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

امابعد! حق تعالیٰ شانہ نے روز اول سے اولادِ آدم کی ہدایت و رہنمائی کے لئے وحی آسمانی کا سلسلہ جاری فرمایا ہے۔ اس آسمانی ہدایت کی روشنی میں نسل انسانی کی علمی اور عملی تعلیم و تربیت کے لئے ہر زمانہ میں جن برگزیدہ نفوس قدسیہ کا انتخاب فرمایا ہے اسلامی زبان میں ان کو انبیا ورسل کہتے ہیں اسی لئے ایک طرف ان مقدس ہستیوں کے "معصوم" ہونے کی ضمانت دی ہے کہ ان حضرات کا دامنِ عصمت شیطانی تسلط اور استیلاء ہوائے نفس سے قطعاً پاک ہے یہ جو زبان سے کہتے ہیں وہ

وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ — اور وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا وہ تو وحی ہوتی ہے جو بھیجی جاتی ہے۔

کے بموجب وحی ربانی ہوتی ہے اور جو کچھ کرتے ہیں وہ بھی:۔

ان اتبع الا ما یوحیٰ الیّ — میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔

کے بموجب وحی ربانی ہوتی ہے دوسری طرف ان مقدس و معصوم ہستیوں کو پوری نوع انسانی کے لئے آسمانی حکم ہے:۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ۔ — اور جو رسول بھی ہم نے بھیجا، صرف اس لئے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

کے بموجب مُطاع یعنے واجب الاطاعت قرار دیا ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے مخلوق کی ہدایت کے لئے مبعوث (فرستادہ) اور کائنات میں حق تعالیٰ کی خلافت الٰہیہ قائم کرنے پر مامور ہونے کے ثبوت کے طور پر جو دلائل و براہین ان کو دیئے جاتے ہیں تاکہ مخلوق پر حجّت قائم ہو اور وہ صدق دل سے ان کی تصدیق کر سکے اور ایمان لا سکے ان دلائل و براہین کا نام اسلامی زبان میں معجزات اور آیات بیّنات ہے۔

درحقیقت ارشادات ربانی اور ہدایات آسمانی کے سلسلہ کا مدار اُس ربط و تعلق پر ہے جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا حق جل وعلیٰ کی بارگاہ قدس سے بلاواسطہ اور انبیاء کرام کے واسطہ سے تمام مخلوق کا خالق کائنات سے، قائم و دائم ہوتا ہے چنانچہ حضرت حق تعالیٰ کی بارگاہ سے برابر انبیاء کرام کو پیغامات و احکامات ملتے رہتے ہیں اور وہ مخلوق تک پہونچاتے رہتے ہیں۔

ان پیغامات کا سلسلہ کبھی براہِ راست بصورت "القاء فی القلب" قائم ہوتا ہے اور کبھی فرشتہ کے ذریعہ یہ پیغامات انبیاء کے پاس آتے ہیں جس فرشتہ کو اس اہم کام — پیغام رسانی — کے لئے انتخاب فرمایا ہے اس کا نام جبرئیل ہے۔ ارشاد ہے:۔

ماکان بشران یکلمہ اللّٰہ الّا وحیا	کسی بھی بشر کے لئے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے
اومن وراء حجاب او یرسل	(رُو در رُو) کلام کرے بجز اس کے کہ وحی کے ذریعہ
رسولا فیوحی باذنہ	یا پردہ کے پیچھے سے (کلام کرے) یا فرشتہ بھیجے اور
مایشاء۔	وہ اللہ کے حکم سے جو اللہ چاہے وحی پہونچائے۔

فرشتہ جو پیغام — وحی — لاتا ہے ضروری نہیں کہ آسمانی صحیفہ یا کتاب آسمانی کی شکل میں ہو بلکہ بسا اوقات وہ پیغام — وحی — فرشتہ کی زبانی "نفث فی الروع" — دل میں پھونک دینے — کی شکل میں ہوتا ہے۔

فرشتہ کے ذریعہ جو پیغام — وحی — الفاظ کی صورت میں منضبط کر کے پہنچایا جاتا ہے تاکہ امت اس کو پڑھے پڑھائے زبانی یاد کرے اور قیامت تک نسلاً بعد نسل اس کو اپنے سینوں میں محفوظ رکھے اس پیغام کا نام شریعت کی زبان میں وحی متلو، کلام اللہ، کتاب اللہ صحیفہ ہے۔ اور اس کے علاوہ جو پیغام الٰہی فرشتہ کے واسطہ کے بغیر یا فرشتہ کی زبانی آتا ہے اس کا نام شریعت کی زبان میں

وحی غیر متلو، ہوتا ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے، چاروں اولوا العزم انبیاء علیہم السلام پر نازل شدہ چاروں کتابیں۔ توریٰ تا، زبور، انجیل اور قرآن اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز ہے اور صحائف وکتب کی تعداد معدودۂ چند ہے اس لئے ان صحائف وکتب کے علاوہ بقیہ تمام تر وحی الٰہی نیز ان انبیاء کے علاوہ باقی تمام انبیاء کرام کے پاس پیغام الٰہی اور وحی آسمانی یا براہ راست آیا ہے یا فرشتہ کی زبانی القار فی القلب کی شکل میں آیا ہے۔ ایسی صورت میں تمام احکام شرعیہ کا مدار یقیناً کسی کتاب یا صحیفہ پر نہیں ہے بلکہ نبی اور رسول کی معصوم ذات گرامی پر ہے۔ اور جس طرح اُمت کے لئے کتاب اللہ پر ایمان لانا اور اس کی پیروی کرنا فرض ہے ٹھیک اسی طرح نبی اور رسول کا ہر حکم بھی واجب الاطاعت ہے اور اطاعت واتباع کے لحاظ سے وہی درجہ رکھتا ہے جو کتاب اور صحیفہ کا ہوتا ہے حضرات صحابہ کے حق میں قرآنی وحی اور حدیثی احکام دونوں یکساں طور پر واجب الاطاعت تھے بقیہ اُمت کے لئے جو عہد نبوت میں موجود نہ تھے قرآن کا حکم قطعی ہے اور احادیث یا سنت اگر تواتر سے پہنچی ہیں تو وہ بھی قطعی ہیں البتہ جو تواتر سے نہیں پہنچیں قطعیت کے درجہ کو تو نہیں پہنچے لیکن ان پر عمل کرنا واجب ہے قرآن کریم کی تصریح۔

ما اتاکم الرسول فخذوہ	جو تم کو رسول (حکم) دے اس کو لو (قبول کرو) اور
وما نھاکم عنہ فانتھوا	جس سے تمہیں منع کرے اس سے باز آؤ

نیز

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔	(اے نبی) کہدو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

کے مطابق ان کو ماننا اور ان پر عمل کرنا اُمت پر واجب اور فرض ہے۔

اور یہ حقیقت بھی بلا شبہ مسلّم ہے کہ جس طرح ہدایات ربانی اور احکام خداوندی بصورت قرآن عظیم رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوئے ہیں اسی طرح بہت سے پیغامات الٰہیہ اور احکام ربانیہ قرآن کے علاوہ بھی بصورت وحی خفی رسول پر نازل ہوئے ہیں اور اُمت کو بتلائے گئے ہیں اور احکام خداوندی کی حیثیت سے اُن پر عمل کرایا گیا ہے۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں

دوسری صورت میں دی ہوئی تعلیمات کا عنوان الحکمۃ ہے چنانچہ قرآن کریم نے متعدد مقامات میں الحکمۃ کے لئے بھی انزل کا لفظ استعمال کیا ہے۔

ان بنیادی حقائق و اشارات کو سمجھ لینے کے بعد یہ باور کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ درحقیقت دین کا دار و مدار حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر ہے دین کا سرچشمہ آپ ہی کی تعلیمات و ہدایات اور اقوال و افعال ہیں قرآن کریم میں اُن کا ذکر ہو یا نہ ہو۔

اسلام کے تشریعی نظام کی تشکیل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر و بیشتر اہم ترین احکامات حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی نافذ فرمایا کرتے تھے ظاہر ہے کہ یہ احکامات وحی الٰہی خفی کے ذریعہ ہی آپ جاری فرماتے تھے لیکن قرآن کریم میں اُس وقت تک اُن کا ذکر نہیں ہوتا تھا بعد میں قرآن کریم میں ان احکام سے متعلق آیات نازل ہوتی تھیں گویا قرآن کریم آپ کے جاری کئے ہوئے احکامات کی تصدیق و توثیق کرتا تھا۔ حسب ذیل چند مثالوں سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوتی ہے۔

(۱) عقیدۂ توحید کے بعد سب سے پہلی اور اہم عبادت صلوٰۃ یعنے نماز ہے۔ ابتداء اسلام سے ہی اس عبادت کے ادا کرنے کا سلسلہ قائم اور اس پر عملدرآمد شروع ہو گیا تھا لیلۃ الاسراء یعنے شب معراج سے قبل دو نمازیں پڑھی جاتی تھیں ایک صبح ایک شام اسراء کے بعد نمازیں پانچ ہو گئیں لیکن اس وقت تک نہ قرآن کریم میں اس طرح نمازوں کا ذکر تھا نہ ہی نماز کی تشکیل اور عملی صورت مذکور تھی، اُمت نے اس فریضہ کو حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی اور فعلی ہدایات کے تحت ہی قبول کیا تھا اور عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔

(۲) ارشاد مبارک: صلّوا کما رأیتمونی اُصلّی کے تحت نماز کی جو عملی صورت آپ نے عملاً اور قولاً پیش فرمائی ہے کہ اللہ اکبر سے شروع ہوتی ہے اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ پر ختم ہوتی ہے قیام ہوتا ہے قرأتِ قرآن ہوتی ہے، رکوع ہوتا ہے سجدہ ہوتا ہے پھر دو رکعت پر قعود ہوتا ہے۔ دو دو رکعتیں ہوتی ہیں یا چار چار یا تین رکعتیں، گرچہ بطور تصدیق قرآن کریم میں جستہ جستہ ان تمام تفصیلات کی طرف رہنمائی ہوتی رہی مگر اُمت نے پنج وقتہ نماز اور اس کی تفصیلات کو آپ کی قولی اور فعلی ہدایات سے ہی سیکھا، سمجھا اور عمل کیا ہے نزول قرآن کا انتظار کیا نہ اُس پر مدار

رکھا۔ قرآن کریم نے نہ ابتداءمیں "اقیموا الصلاۃ" کا حکم دیا تھا حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کی تعلیم وارشاد سے نماز کا وہ نقشہ قائم فرمایا جس پر امت عمل پیرا ہے قرآن کریم کا جو ارشاد ہے: وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیھم یہ اسی کی عملی تفسیر ہے۔

(۳) نماز ادا کرنے کے لئے طہارت اور وضو یا غسل کی تمام تفصیلات بھی آپ نے ہی بتائیں کپڑوں اور جگہ کے پاک ہونے کے احکامات بھی آپ نے ہی تبلائے اور امت نے ان پر عمل کیا تقریباً اٹھارہ ۱۸ سال بعد طہارت اور وضو وغیرہ سے متعلق سورۃ مائدہ والی آیات نازل ہوئیں حالانکہ ان پر امت کا عمل محض آپ کے فرمانے سے اٹھارہ سال پہلے سے جاری تھا۔

(۴) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو آپ نے حکم دیا کہ: نماز میں بیت المقدس کا استقبال کرو" یعنے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو سولہ، سترہ مہینے تک اس پر عمل ہونے کے بعد قرآن کریم میں بیت اللہ شریف کے استقبال کا حکم آیا۔ باوجودیکہ استقبال بیت المقدس کا حکم قرآن کریم نے نہیں دیا تھا تاہم حضرت رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے اس حکم کی جو خود آپ نے دیا تھا تصدیق و توثیق فرمادی اور فرمایا سیقول السفھاء من الناس ما ولّٰھم عن قبلتھم التی کانوا علیھا نہ صرف یہ بلکہ آیت کریمہ ذیل : وما جعلنا القبلۃ التی کنت علیھا الخ میں آپ کے حکم کو اپنے حکم سے تعبیر کیا اور فرمایا وما جعلنا۔

(۵) جنگ کے موقعہ پر یہود بنی نضیر کے کچھ کھجور کے درختوں کے کاٹ ڈالنے کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت دیا تھا جبکہ بنو نضیر سے جنگ کرنے کا حکم ہوا تھا اور جنگی مصلحت کے تحت اس کی ضرورت تھی۔ یہودیوں نے جب اس پھلدار درختوں کے کاٹ ڈالنے پر واویلا مچائی تو حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں آپ کے اس حکم کی تصدیق و توثیق فرمادی ارشاد ہوا: وما قطعتم من لینۃ او ترکتموھا قائمۃ علیٰ اصولھا فباذن اللہ۔

ان چند مثالوں سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ امت کی رہنمائی کے لئے سرچشمہ ہدایت نبی و رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی ہوتی تھی آپ کے احکامات پر عمل کیا جاتا تھا نہ کسی بھی معاملہ میں قرآن کریم پر توقف ہوتا تھا نہ انتظار۔

صحابہ کرام احکام الٰہیہ کے سب سے پہلے مکلف اور کتاب وسنت کے براہ راست مخاطب

تھے اور آپ کی دونوں حیثیتیں ان کے نزدیک مسلم تھیں کہ آپ "نبی معصوم" بھی ہیں اور "رسول مطاع" بھی اس لئے وہ قرآنی احکامات کو اور حدیث نبوی کے احکامات کو جو وہ براہ راست آپ کی زبان مبارک سے سنتے تھے دونوں کو یکساں طور پر قطعی اور واجب الاتباع جانتے اور مانتے تھے۔

احادیث و تعلیمات نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا بڑا حصہ تو وہ ہے جو قرآن حکیم کے احکامات و تعلیمات کی تشریح و توضیح اور بیان معانی و مصادیق پر مشتمل ہے اور یہ لتبیین للناس ما نزل الیہم کے تحت آپ کا منصبی فریضہ تھا چنانچہ قرآن کریم میں اقیموا الصلوٰۃ کا حکم فرمایا تو آپ نے قولاً اور فعلاً نماز کی تفصیلات بتلائیں اور ارشاد فرمایا: صلوا کما رأیتمونی اصلی اور قرآن کریم کے حکم و آتوا الزکوٰۃ کے تحت اموال زکوٰۃ اور نصاب زکوٰۃ کی تعیین فرمائی اور ہر مال میں سے مقدار زکوٰۃ متعین کی اور اسی کے مطابق زکوٰۃ وصول کی گئی۔ علی ہذا القیاس۔

اسی لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باوجود اور آپ کی حیات طیبہ عملی قرآن ہے یعنے قرآنی تعلیمات و احکامات کا عملی نمونہ اور زندہ مثال ہے اسی لئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک سوال کے جواب میں فرماتی ہیں:

وکان خلقہ القرآن — آپ کے اخلاق قرآن کریم تھا

اور ظاہر ہے کہ دین اسلام ایک ایسا وسیع نظام حیات ہے جس میں عقائد و عبادات، احکام و معاملات، آداب و اخلاق اور معاشرت کے تمام شعبے جہاد و قتال، صلح و جنگ، حکومت و سیاست وغیرہ انسانی معیشت و معاشرت کے تمام تر مسائل پر حاوی ہے اور ظاہر ہے کہ تعلیمات نبوت اور احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی ان سب پر حاوی ہیں ان میں بہت سے ایسے احکامات و ہدایات بھی ہیں جن کا قرآن کریم میں صراحتاً ذکر تک نہیں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی وحی الٰہی خفی کے تحت امت کو بتلائے اور نافذ کئے ہیں۔

بہرحال اس میں تو ذرہ برابر بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ دین اسلام کا تفصیلی اور عملی نقشہ انفاس قدسیہ یعنے احادیث نبویہ کے انضمام کے بغیر تیار ہو سکتا ہے اور نہ دین متین کی تکمیل و تشریع سنت نبویہ کے بغیر ممکن ہے۔ احادیث رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی وہ سدا بہار

(مضبوط بند) ہے جس کے ذریعہ الحاد و زندقہ اور دین میں تصرفات و تحریفات کے سیلاب کو روکا جاسکتا ہے اور خود ساختہ و دُور از کار تاویلات و تلبیسات کے دروازے بند کئے جاسکتے ہیں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور عملی زندگی یعنے احادیث نبویہ کو قرآن سے علیحدہ کردیا جائے تو صرف قرآن عظیم کی مجمل تعبیرات اور ذو معنی الفاظ کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں ان ملحدین و زائغین کی زبانیں بند کرنا مشکل اور من مانی تاویلات و تحریفات کے راستے بند کرنا دُشوار ہے۔

علاوہ ازیں دین اسلام جس کی تکمیل کا اعلان قرآن کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریعی زندگی کے بالکل آخری حصہ میں یعنے حجۃ الوداع کے عظیم ترین تاریخی اجتماع کے موقعہ پر کیا ہے ارشاد ہے:-

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔

آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کردیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور تمہارے لئے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دیدیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور حیاتِ طیبہ کو نظر انداز کردینے کے بعد صرف قرآن کریم کی روشنی میں دین اسلام کا ایسا نقشہ جسے انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کیا جاسکے کبھی تیار ہو ہی نہیں سکتا اور اگر اس زمانہ کے ظروف و ماحول کو سامنے رکھ کر ادھورا سدھورا نقشہ تیار بھی کیا جائے تو وہ ہر زمانہ ہر ملک ہر قوم اور ہر ماحول کے لئے رہنما نہیں بن سکتا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں دین اسلام کی نت نئی تعبیریں اور خود ساختہ نو بنو تشریحیں ہوتی رہیں گی اور بقول شاعر ؏

ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت

قرآن کریم اور دین اسلام بازیچۂ اطفال اور انسانی اغراض و خواہشات کی آماجگاہ بنا رہے گا حالانکہ قرآن کریم اعلان کررہا ہے:

لایاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ

اس قرآن میں باطل (کسی بھی راستے سے) نہیں آسکتا نہ آگے سے اور نہ پیچھے سے۔

نیز نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم ہے :۔

اتل ما اوحی الیک من الکتاب لا مبدل لکلماتہ ۔ (اے نبی) جو کتاب تمہارے پاس بھیجی گئی ہے اسے پڑھ کر سُنایا کرو اس کے کلمات (و احکام) کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے۔

اس لحاظ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ دین اسلام کی وہ تکمیل جس کا اعلان آپ کی حیات طیبہ کے بالکل آخری ایام میں کیا گیا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تئیس سالہ تشریعی زندگی کے ذریعہ ہی ہوئی ہے اور اسی لئے کُتب سابقہ سماویہ کی طرح قرآن عظیم ایک ہی مرتبہ کتابی شکل میں نازل نہیں کیا گیا بلکہ تدریجی طور پر تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا اور آپ اپنے انفاس طیبہ اور عملی زندگی کے ذریعہ اللہ جل جلالہ کے منشا اور حکم کے مطابق اس کے معانی و مصادیق متعین کرتے رہے اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی عملی تشکیل فرماتے رہے اسی حقیقت کے پیش نظر بعض کبار محدثین فرماتے ہیں :۔

الکتاب احوج الی السنۃ ۔ قرآن کے لئے سنت کی بہت زیادہ حاجت ہے۔

بہر حال نہ قرآن عظیم کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات یعنے احادیث سے الگ کرنا ممکن ہے اور نہ ہی قرآن عظیم اور دین اسلام حدیث کے بغیر زائغین و ملحدین کی دست برد سے محفوظ رہ سکتا ہے بلکہ بقول ہمارے شیخ امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ کے :" ہمارا تو دعویٰ یہ ہے کہ حدیث کے بغیر نہ قرآن پر ایمان لانا ممکن ہے اور نہ عمل کرنا ممکن ہے عبادات و احکام سے متعلق قرآن عظیم کی کسی بھی آیت کریمہ کو لے لیجئے چاہے واقیموا الصلوٰۃ ہو یا وللہ علی الناس حج البیت ہو چاہے وان تصوموا خیرا لکم ہو حدیث کے بغیر آپ نہ اس کے معنی متعین کر سکتے ہیں نہ مصداق، نہ اس پر ایمان لا سکتے ہیں نہ عمل کر سکتے ہیں "

اس لحاظ سے بھی اسلام کی تشریع حدیث کے بغیر ممکن نہیں۔

بہر حال متن قرآن کی حفاظت کا ذمہ تو رب العالمین نے لے لیا تھا اور اعلان ہو چکا تھا :۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون ۔ بلاشبہ ہم ہی نے اس ذکر (قرآن) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

اس لئے اس کا تو امکان نہ تھا کہ قرآنی کلمات میں کسی بھی قسم کا تغیر و تبدل، محو و اثبات اور قطع و برید کی جا سکے اسی لئے اعدائے اسلام جو ہمیشہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ دین اسلام کے محکم حصار میں رخنے ڈال کر مداخلت اور من مانی تبدیلی پیدا کر سکیں وہ قرآن کریم سے تو مایوس تھے اس لئے انھوں نے کوشش کی کہ اپنی مقصد برآری کے لئے کوئی چور دروازہ تلاش کریں چنانچہ انھوں نے چاہا کہ حدیث جس کے ذریعہ اسلام کی تشکیل و تکمیل ہوئی تھی اس کو ناقابل اعتبار ثابت کر دیں تو آپ سے آپ اسلام کی پوری عمارت منہدم ہو جائے گی۔

اسی لئے اسلام کے ابتدائی دور کے تمام ملاحدہ اور زائغین نے اور عصر حاضر میں یورپ کے تمام مستشرقین اور ان کے پروردہ مسلمان مصنفین نے تمام ذخیرۂ حدیث کو بے وقعت اور ناکارہ بنانے میں اپنی تمام دماغی اور قلمی طاقتیں مختلف پہلوؤں سے حدیث کے خلاف صرف کی ہیں، اور انہی قدیم و جدید دشمنان اسلام کی رہنمائی میں "اسلام کی تعمیر نو" کے نام سے اس زمانہ میں بھی اسلام کے خلاف تخریبی کام کیا جا رہا ہے۔ وقد قال اللہ تعالیٰ وقولہ الحق:

ولقد صدّق علیھم	اور بلاشبہ ابلیس لعین نے ان کے بارے میں
ابلیس ظنہ	اپنے گمان کو صحیح پایا۔

عنوان نہایت دل کش اور مسحور کن تھا، نئی نسل اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ جس کو نہ دینی تربیت حاصل تھی نہ تعلیم دین نصیب تھی، اس دام ہمرنگ زمین کا یعنے ان ملحدانہ افکار و خیالات کا شکار ہو گیا۔

انکار حدیث کی ابتداء:

فتنۂ انکار حدیث کی تاریخ بہت قدیم ہے سب سے پہلے اسلام کے ابتدائی دور میں واقعۂ تحکیم (ثالثی) کے بعد اسلام کے انتہائی سخت دشمن فرقہ خوارج نے اس بنیاد پر حدیث کا انکار کیا کہ تحکیم (ثالثی) کو قبول کرنے کی وجہ سے تمام صحابہ کافر ہو گئے اور کسی روایت کو قبول کرنے کی پہلی شرط راوی کا مسلمان ہونا ہے اور صرف کتاب اللہ (قرآن) کو حجت مانا اور اسی پر پورے دین کا دار و مدار رکھا اس کے ذرا ہی بعد رد عمل کے طور پر خوارج کے بالمقابل روافض اور شیعہ کا فرقہ ظہور میں آیا

اُنھوں نے بھی قرآن کریم میں کمی بیشی اور مسخ و تحریف کے دعوے کے علاوہ ائمہ اہل بیت کے سوا تمام صحابہ کی روایات کا انکار کردیا اور پورے دین کو اپنے ائمہ کی روایات اور انہی کے اتباع میں محدود و منحصر کردیا۔ اسی طرح مسلمانوں میں سب سے پہلے عقلیت پرست فرقہ یعنی معتزلہ نے بھی اپنی عقل اور عقلی معتقدات کے خلاف تمام احادیث کا انکار کرکے اس فتنۂ انکار حدیث کو مزید تقویت پہونچائی اور منکرین حدیث کے ہاتھ خوب مضبوط کئے

لیکن وہ دورِ اسلام کی شوکت و عظمت کا دور تھا حدیث کے خلاف محاذ بنانے والے تمام فتنہ پردازوں کی کوششیں انتہائی فتنہ انگیزیوں اور خونریز ہنگاموں کے باوجود ناکام رہیں اور مسلمانوں نے جس طرح قرآن عزیز کو سینے سے لگایا اور حفظ قرآن و علوم قرآن کی خدمت کو اپنے لئے سرمایۂ سعادت سمجھا اسی طرح سنت مطہرہ اور احادیث نبویہ کو بھی سر آنکھوں پر رکھا اور پوری جد وجہد اور عقیدت و اخلاص کے ساتھ خدمت حدیث کے سلئے اپنی زندگیاں وقف کردیں اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے انفاس مقدسہ اور حیاتِ طیبہ کو اس طرح محفوظ کیا کہ تاریخ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے قدیم و جدید تمام عظماء رجال کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے ابتداءِ ولادت سے لے کر آخری لمحات حیات تک کی پوری زندگی کے نہ صرف پیغمبرانہ تشریعی امور بلکہ بعثت سے پہلے اور بعد کا بھی ایک ایک جزئی واقعہ اور سفر و حضر، درون خانہ و بیرون خانہ کے تفصیلی حالات کسی بھی ہستی کے اس طرح محفوظ نہیں کئے گئے جیسے محدثین کرام نے سرور کائنات خاتم الانبیاء فداہ ابی و امی کے انفاس قدسیہ اور حیاتِ طیبہ کی واقعات و حالات کی حفاظت کی ہے کہ مخالفین تک کی عقل حیران ہے۔

وضع حدیث

اعداء اسلام نے احادیث نبویہ اور سنت مطہرہ سے مسلمانوں کے اس شغف اور والہانہ فریفتگی کو دیکھ کر اسلام کے اس بیش بہا سرمایہ یعنے ذخیرۂ احادیث کو ناکارہ بنانے کی ایک اور شیطانی راہ اختیار کی کہ خودساختہ حدیثیں اور من گھڑت روایتیں صحیح احادیث وروایات کے ساتھ خلط کرکے مسلمانوں میں پھیلانی شروع کردیں اور موقعہ بموقعہ اس کا اعلان

بھی کیا کہ ہم نے اتنے ہزار موضوع حدیثیں صحیح احادیث کے ساتھ ملا کر شائع کر دی ہیں اور وہ محدثین کے حلقہ ہائے درسِ حدیث میں متداول ہیں اس دجل و فریب کا منشاء صرف یہ تھا کہ صحیح اور ضعیف احادیث کے خلط ملط ہو جانے کی وجہ سے تمام ہی ذخیرہ احادیث سے مسلمانوں کا اعتماد اٹھ جائے اور دین اسلام کی یہ محکم عمارت زمین بوس ہو جائے۔

لیکن اللہ جل شانہ نے اپنے دین اور سنن سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حفاظت وصیانت اور بقاء ودوام کے لئے ایسے رجال کار پیدا فرما دیئے جنہوں نے نقد حدیث اور تمیز صحیح وضعیف کے لیے مستقل علوم وفنون مدون کر دیئے جن کی تعداد ایک سو علوم کے قریب تک پہونچتی ہے نیز راویان حدیث کی چھان بین اور جرح وتعدیل کی غرض سے ایک مستقل علم علم اسماء الرجال یہ کہئے تاریخ راویان حدیث — مدون کر دی جس کو سامنے رکھ کر علماء جرح وتعدیل نے بآسانی ایک ایک راوی حدیث پر ثقہ یا ضعیف یا کذاب ووضاعِ حدیث ہونے کا حکم لگایا اور اس طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا اور اس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ اعداء اسلام کی آخری کوشش بلکہ سازش ناکام ہو کر رہ گئی بلکہ حدیث کے بقاء ودوام کے لئے محافظ علوم وجود میں آگئے ع

خدا شرے برانگیزد کہ خیرے ما دراں باشد

بلاشبہ دین اسلام ابدی دین تھا، قیامت تک کی آنے والی نسلوں کے لیے سرچشمۂ ہدایت تھا اس لئے ضروری تھا کہ دین اسلام کی دونوں مشعلیں — کتاب وسنت کہئے یا قرآن وحدیث — بھی روشن رہیں اور ہر قسم کے طوفانوں، آندھیوں اور جھکڑوں سے ان کو محفوظ رکھا جائے تاکہ حق تعالیٰ کی حجت نوع انسانی پر پوری ہو اور قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ اولاد آدم کے کانوں میں گونجتی اور دلوں کو جھنجھوڑتی رہے ارشاد ہے:۔

وکیف تکفرون	اور تم کس طرح کفر اختیار کر سکتے ہیں۔
وانتم تتلی علیکم	دراں حالیکہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں تمہیں
آیات اللہ وفیکم رسولہ	برابر پڑھ کر سنائی جا رہی ہیں اور تم میں
(آل عمران)	اللہ کا رسول بھی موجود ہے۔

اور فرمانِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں اسی حقیقت کا اظہار اس طرح فرمایا گیا ہے :۔

ترکت فیکم امرین لن تضلوا	میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں تم ہرگز گمراہ نہ ہوگے
ما تمسکتم بھما کتاب اللّٰہ	جب تک ان کو (مضبوطی کے ساتھ) پکڑے رہوگے
وسنت رسولہ (موطا[1] مالک)	اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت

الغرض اس کا کوئی امکان نہیں کہ کتاب وسُنّت کہئے یا قرآن وحدیث یا اللہ ورسول دونوں میں سے ایک کو دوسرے سے الگ کرسکیں اور اس کا بھی کوئی امکان نہیں کہ قرآن کریم پر ایمان کا دعوٰی کیا جائے اور سنت نبویہ یا احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا انکار کیا جائے، دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ پر ایمان کا دعوٰی کیا جائے اور رسول کے ماننے سے انکار،

قرآن عظیم بار بار اس حقیقت کا اظہار اور اعلان کرتا ہے کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان اور ان کی اطاعت واتباع میں انسانیت کی نجات مضمر ہے اور ان کی رسالت کے انکار ومخالفت اور نافرمانی میں انسانیت کی ہلاکت وتباہی مضمر ہے۔ رسول کی مخالفت، عداوت اور نافرمانی پر سخت سخت وعیدیں سُناتا ہے، اُمت کے لئے رسول کو خدا پرستی کا اُسوۂ اور نمونہ قرار دیتا ہے۔ قرآن کی تعلیم اس کے معنی ومفہوم کی تعیین، اجمال کی تفصیل، ابہام کی وضاحت، عبادات واحکام کی عملی تشکیل اور متعلقہ واقعات کا بیان کرنا ـــــ رسول کا مخصوص منصبی فرض بتلاتا ہے تا اینکہ رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت اور رسول کی مخالفت ونافرمانی کو اللہ کی مخالفت و نافرمانی قرار دیتا ہے بلکہ غور وتدبر کے ساتھ قرآن کے مطالعہ سے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نجات وسعادت اور فلاح وبہبود سب کچھ حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ومتابعت میں منحصر ہے نہ صرف یہ بلکہ بندہ کی حق تعالیٰ سے محبت اور حق تعالیٰ کی بندہ سے محبت ـــــ دوطرفہ محبت ـــــ کا معیار بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور متابعت کے بغیر میسر نہیں ہے ارشاد ہے :

---

[1] یہ حدیث اس سند کے اعتبار سے "معضل" ہے یعنے سند میں سے دو واسطے ساقط ہیں مستدرک حاکم میں ابن عباس کی روایت سے اور سنن بیہقی میں ابوہریرہ کی روایت سے اور معقل بن یسار کی روایت سے مستدرک ہیں، اس حدیث کی صحت کے شواہد موجود ہیں لہٰذا مضمون کے اعتبار سے حدیث صحیح ہے۔

قل ان کنتم تحبّون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفرلکم ذنوبکم۔

(ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بھی معاف فرمادے گا۔

بہر حال ہوا یہ کہ تمام فرق باطلہ — خوارج، روافض، شیعہ اور معتزلہ، قدریہ، مرجیہ، جہمیہ وغیرہ نے سنت و حدیث کے خلاف جو زہر اُگلا تھا ہر دور میں ملاحدہ وزنادقہ وہی زہر نئی نئی شکلوں اور صورتوں میں اُگلتے رہے ہیں اور امام ابوحنیفہ، امام شافعی کی مجاہدانہ کوششوں نے اور اُن کے بعد کے تمام متکلمین اُمت کی مساعی نے ان کے دنداں شکن اور مسکت جوابات دیئے ہیں اور اہل باطل کے حوصلے پست کردیئے ہیں۔

مستشرقین کی حدیث دشمنی!

مستشرقین یورپ نے بھی صلیبی لڑائیوں میں فیصلہ کن شکست کے بعد انہی ہتھیاروں سے اور اسی محاذ سے اسلام کی بیخکنی شروع کردی اور ازراہ دجل وفریب "سائنٹفک ریسرچ" (علمی تحقیقات) کے نام سے حدیث وسنت کے خلاف ایک منظم مہم چلائی اور جو زہر قدیم فرق باطلہ نے اُگلا تھا ازسر نو نئی نئی بوتلوں میں بھر کر اور "اسلامی" "علمی تحقیقات" کا لیبل لگا کر یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے والی سادہ لوح اور اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ نئی نسل کے حلق سے اُتارنے کی کوشش کی کبھی یہ کہا کہ: یہ احادیث تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دو سو برس بعد قلمبند ہوئی ہیں انکا کیا اعتبار" اور کبھی حاملین حدیث صحابہ کرام اور رجال حدیث تابعین وائمہ حدیث کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا اور بے سروپا الزامات لگائے اور کبھی عقل کو معیار تنقید بنا کر صحیح حدیثوں پر عقلی شبہات ووساوس کا طوفان باندھا اور ان راستوں سے تمام اسلام کے اساسی معتقدات میں — ملائکہ، جنات، شیاطین، ارواح، عذاب قبر، جزا وسزاء اعمال، جنت، دوزخ وغیرہ عقائد میں — نو بنو تاویلات کے دروازے کھولنے کی کوشش کی اور عبادات میں، نماز واوقات نماز، زکوٰۃ ونصاب زکوٰۃ، روزہ، ارکان حج، قربانی وغیرہ عبادات میں نئے نئے شکوک وشبہات پیدا کرنے شروع کئے اور معاملات — بیع وشراء، حرمت ربا،

حدود و قصاص وغیرہ معاملات میں تحریفات و تشویہات پیدا کرنے کی کوششیں کیں سود کو "منافعہ" نام رکھ کر جائز و حلال بنا دیا اور شراب کو "آب جو" کہہ کر جائز کر دیا۔ غرض تمام متوارث احکام شرعیہ جن پر تیرہ سو سال سے مسلمان عمل کرتے چلے آرہے تھے نئے نئے اسلوب اور نت نئے انداز سے ان پر حملے کرکے پورے دین اسلام کی عمارت کو متزلزل کرنے کی جد وجہد میں زور قلم صرف کر دیا ہر ہر موضوع پر تصنیفات و تالیفات کے انبار لگا دیئے اور یورپ کی تمام یونیورسٹیوں میں اسلامی موضوعات پر پی، ایچ، ڈی (تخصص) کے شعبے قائم کر دیئے یہودی اور عیسائی پروفیسر نو عمر اور سادہ لوح طالب علموں کے ذہن مسخ کرنے کے لئے مقرر کر دیئے اور دامے، درمے، قلمے پورا زور اسلامی تعلیمات کو تباہ کرنے اور نئی نسل کو اسلام سے متنفر کرنے پر صرف کر دیا۔

لیکن خاتم انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے امت کو خبردار کرنے کے لئے یہ اعلان ہو چکا تھا۔

يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتاويل الجاهلين۔	اس علم دین کی امانت کو نسلاً بعد نسلٍ امت کے برگزیدہ اہل علم اٹھاتے رہیں گے جو حد سے تجاوز کرنے والوں کی تحریفوں اور اہل باطل کی دینی چوریوں اور جاہلوں کی تاویلوں کا پردہ چاک کریں گے۔

اس لئے حق تعالیٰ نے امت کے ہر دور اور ہر عہد میں ایسے "عظماء رجال" اور حامیان دین "رجال کار" پیدا فرمائے جنہوں نے دشمنان دین کے تمام اعتراضات کے دنداں شکن جوابات دیئے ہیں اور شکوک و شبہات کا ایسا تار و پود بکھیرا ہے اور منافقانہ و معاندانہ اغراض کا۔۔۔ ایسا پردہ چاک کیا ہے کہ ہمیشہ ذلیل و رسوا ہوئے ہیں اور مسلمانوں نے ان کو نکو بنا کر چھوڑا ہے۔

حفاظت حدیث:

امام شافعی رحمہ اللہ سے لے کر امیر ابن وزیر یمانی صاحب الروض الباسم تک اور شیخ جلال الدین سیوطی صاحب مفتاح الجنة فی الاحتجاج بالسنة تک اور اس کے بعد سے لے کر آج تک نہ صرف عربی اور اردو میں بلکہ انگریزی اور یورپ کی زبانوں میں بھی قابل قدر

تصنیفات و تالیفات مخالفین حدیث و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب اور منکرین حدیث وسنت کے رد میں لکھی جا چکی ہیں۔

ہمارے اس انحطاط پذیر دور میں بھی اس پچاس سال کے عرصہ میں اسی موضوع پر بیسیوں گراں بہا تصانیف علمی کتب خانوں میں بیش بہا اضافہ کا موجب ہوئی ہیں قدماء امت نے جو چھوٹی بڑی کتابیں اس موضوع پر تصنیف فرمائی ہیں ان کی مکمل فہرست تو راقم الحروف کی تالیف عوارف المنن مقدمہ معارف السنن میں مذکور ہے جو عربی، اردو، انگریزی تینوں زبانوں میں انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب طبع ہوگی باقی اس پچاس سال بلکہ تیس چالیس برس کے اندر اندر جو ذخیرہ اس موضوع پر آ گیا ہے قارئین کی واقفیت کے لئے اس میں سے بطور نمونہ چند کتابوں کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

نمبر	کتاب		مؤلف	زبان
①	الحدیث والمحدثون	تالیف	محمد محمد ابو زہو	عربی
②	السنة قبل التدوین	"	محمد عجاج خطیب	"
③	الانوار الکاشفة	"	شیخ عبدالرحمن یمانی	"
④	ظلمات ابوریہ	"	شیخ محمد عبدالرزاق حمزہ	"
⑤	کتاب السنة	"	موسیٰ جار اللہ قازانی	"
⑥	فی الحدیث النبوی	"	شیخ مصطفےٰ زرقا شامی	"
⑦	تدوین حدیث	"	مولانا مناظر احسن گیلانی	اردو
⑧	بصائر السنة	"	مولانا امین الحق طوروی	عربی
⑨	فتنۂ انکار حدیث	"	مولانا افتخار احمد بلخی	اردو
⑩	فتنۂ انکار حدیث	"	مولانا سرفراز صاحب گوجرانوالہ	عربی
⑪	سنت قرآن کریم کی روشنی میں	"	مولانا غفار حسن صاحب	اردو
⑫	حدیث قرآن کی نظر میں	"	مقالہ شائع شدہ ماہنامہ دار العلوم دیوبند ۱۹۵۶ء از راقم الحروف	"
⑬	احادیث النبی الکریم	تالیف	پروفیسر روحی	"

⑭ سنت کا تشریعی مقام قرآن کی روشنی میں، تالیف مولانا محمد ادریس میرٹھی اردو

⑮ احادیث النبی الکریم " ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی انگریزی

مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی کے درجہ تخصص فی الحدیث کے رفقاء نے حسب ذیل مقالات کتابی شکل میں مرتب کئے ہیں۔

① السنۃ النبویہ فی ضوء القرآن الکریم از الاستاذ محمد حبیب اللہ المختار عربی، اردو

② وسائل حفظ الحدیث وجهود الامۃ فیہ از مولوی عبد الحکیم سلہٹی اردو

③ کتابۃ الحدیث وادوار تدوینہ از مولوی محمد اسحٰق ڈھاکوی "

④ الکتب المدونۃ فی الحدیث واصنافہا وخصائصہا، از مولوی محمد زمان کلاچوی عربی

⑤ علم مصطلح الحدیث واسماء الرجال وثمراتہ از مولوی عبد الحق دیروی "

⑥ الصحابۃ وما رووہ من الاحادیث از مولوی حبیب اللہ مہندری "

یہ چھ کتابیں ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکی ہیں جس وقت امت کے سامنے یہ ذخیرہ اور حفاظت حدیث کی خدمت آجائیگی تو انشاء اللہ تعالیٰ مدرسہ عربیہ اسلامیہ کے اساتذہ و متخصص طلبہ بھی حامیان سنت و حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمرہ میں شامل ہونے کا شرف حاصل کرسکیں گے وما ذالک علی اللہ بعزیز

امت کے اسی قابل ذکر قیمتی ذخیرہ میں ایک قابل قدر کتاب الاستاذ مصطفیٰ حسنی السباعی رحمہ اللہ کی تصنیف۔

السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی

بھی اہم ترین کتاب ہے جس کا یہ مختصر سا تعارف قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ کتاب عربی ٹائپ میں اب سے گیارہ سال قبل ۱۳۸۰ھ ہجری میں قاہرہ میں طبع ہوئی۔

مؤلف موصوف علیہ الرحمۃ نے ۱۳۴۹ھ میں جامعہ ازھر کے کلیۃ الشریعۃ میں ایم۔ اے عالمیہ کی ڈگری حاصل کرنے کی غرض سے اس کتاب کو بصورت مقالہ پیش کیا تھا جو مقدمہ طبع میں مذکور وجوہات کی بنا پر تیس سال بعد ۱۳۸۰ھ میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔

نہایت فصیح و بلیغ ادبی زبان اور شیریں و شگفتہ اسلوب میں کتاب لکھی گئی ہے مؤلف

موصوف جس طرح اپنے وقت کے بہترین خطیب تھے اس سے زیادہ پرشوکت اور زوردار قلم کے مالک ادیب بھی تھے۔ اس کتاب کے ماخذ پوری ایک سو قدیم وجدید کتابیں ہیں جنکی فہرست کتاب کے آخر میں ملاحظہ کیجیے کتاب تین ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے پہلے باب میں چار فصلیں ہیں دوسرے میں سات، تیسرے باب میں تین فصلیں ہیں اور خاتمہ میں ائمہ اربعہ، محدثین ومصنفین صحاح ستہ کے موضوع کی مناسبت سے مختصر تراجم (حالات) بیان کئے ہیں۔ فہرست میں ابواب اور فصول کے عنوانات پر ہی طائرانہ نظر ڈالنے سے کتاب کی اہمیت اور قدروقیمت معلوم ہوجاتی ہے۔

اس کتاب کی خصوصیت :-

خصوصاً کتاب کا وہ حصہ جو یہودی اور عیسائی مستشرقین سے متعلق ہے وہ تو ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کا بے نظیر شاہکار ہے جس تفصیل واہتمام کے ساتھ موصوف نے استشراق کی تاریخ بیان کی ہے اور یورپ کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں جاکر مباحثے کئے ہیں اور مستشرقین کے جدامجد گولڈزیہر کے دجل وفریب، سائنٹفک ریسرچ کے نام سے اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے کی ناپاک کوششوں اور مجرمانہ خیانتوں کا پردہ چاک کیا ہے حتیٰ کہ ان مستشرقین سے گولڈزیہر کی بددیانتی کا اقرار کرالیا اس استیعاب کے ساتھ یہ بحث آپ کو کسی بھی اس موضوع پر لکھی ہوئی کتاب میں نہیں مل سکتی اگر اس کتاب میں اس کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتا تب بھی اسکی علمی قدروقیمت کا اندازہ کرنے کے لئے یہی حصہ بہت کافی تھا۔ کتاب کا یہ حصہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں یہودی اور عیسائی مصنفین اور اساتذہ کے زیر تربیت پروان چڑھنے والی نوخیز، سادہ لوح، دین سے ناواقف، یورپین محققین ومصنفین سے مرعوب نسل کے ایمان ویقین کے بے بہا سرمایہ کو ان غارت گروں کی یورش اور لوٹ کھسوٹ سے بچانے کے لئے بیحد کارآمد ہے۔

ترجمہ کی ضرورت :

جیساکہ اس سے پہلے عرض کیا جاچکا ہے یہ کتاب معیاری عربی زبان میں لکھی گئی ہے نہ صرف عربی داں بلکہ ادبی اور علمی ذوق رکھنے والے علماء ہی اس سے مستفید ہوسکتے تھے اس لئے

مدرسہ عربیہ اسلامیہ کے دارالتصنیف نے چاہا کہ اُمت کی نئی نسل اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس سے مستفید ہو اور یہ کتاب یہودی و عیسائی مصنفین و مولفین کے پھیلائے ہوئے زہر کے لئے تریاق کا کام دے اور جدید افکار و خیالات میں جو سمیت سرایت کر گئی ہے اس کا تنقیہ کر کے دوبارہ نشو و نما سے بچانے کے لئے اکسیر اعظم اور کبریت احمر کا فائدہ پہونچا سکے۔

بلا شبہ قرآن عظیم شریعت اسلامیہ کی روح ہے اور احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اُس روح کے لئے بمنزلہ جسد ہیں ظاہر ہے کہ روح کا ظہور، تجلی اور تشکل و کارفرمائی جسد کے ذریعہ ہی ممکن ہے اس لحاظ سے قرآن کریم کی عملی شکل و صورت، انفاس قدسیہ اور حیات طیبہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر ہی جلوہ پذیر ہو سکتی ہے جیسے روح کو جسد سے اور جسد کو روح سے انسانی زندگی میں الگ نہیں کیا جا سکتا ایسے ہی شریعت مقدسہ کی حیات میں قرآن کو حدیث سے اور حدیث کو قرآن سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور جو شخص حدیث کا انکار کرتا ہے وہ در اصل قرآن کا انکار کرتا ہے اور کافر و مرتد ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ قرآن اگر روح ہے تو حدیث اس کا قالب ہے اسی روح اور اسی قالب سے شریعت اسلامیہ کا بقا و ظہور وابستہ ہے۔ یہی مطلب ہے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد گرامی کا : کان خلقہ القرآن۔

اس ضرورت کے پیش نظر اس کتاب کے ترجمہ کا فیصلہ کیا گیا اور مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی کے سابق درجۂ تکمیل کے فارغ التحصیل اور ایم، اے، پی، ایچ، ڈی کراچی یونیورسٹی مولانا احمد حسن ٹونکی کا انتخاب کیا گیا چنانچہ موصوف نے اول تحت اللفظ ترجمہ کیا بعد ازاں مدرسہ عربیہ اسلامیہ کے درجۂ تخصص فی الحدیث کے استاذ مولانا محمد ادریس میرٹھی نے زبان کی شستگی و شگفتگی اور سلاست و روانی کے نقطۂ نظر سے اس پر اول سے آخر تک نظر ثانی فرما کر سونے پر سہاگہ کا کام کیا پہلی جلد آپ کے سامنے ہے دوسری جلد کی کتابت بھی شروع ہو گئی انشاء اللہ عنقریب وہ بھی آپ کے سامنے آجائے گی۔

دُعا ہے کہ اللہ جل شانہٗ اس خدمت کو شرف قبول عطا فرمائیں۔ وصلی اللہ علی خیر خلقہ صفوۃ البریۃ سیدنا محمد وآلہ وصحبہ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فتنۂ استشراق

عرض مترجم

مسلسل دو صدی تک مغربی طاقتیں اور یورپین قومیں مسلمانوں سے برسرپیکار رہنے اور تمام یورپین اقوام کو صلیبی جنگ کی بھٹی میں جھوک دینے کے باوجود رسوا کن شکست اور پسپائی سے دوچار ہونے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچیں کہ مسلمانوں کی وہ ناقابل تسخیر قوت جس نے پورے یورپ کی مادی طاقت ـــ بے شمار افواج اور اسلحہ ـــ کے پرخچے اُڑا دیئے وہ صرف اسلام کی حقانیت اور دین الٰہی ہونے پر "پختہ ایمان" اور "محکم یقین" کی قوت ہے جب تک اس ایمانی طاقت کی بیخکنی نہ کی جائے اس وقت تک مسلمانوں کو زیر کرنا اور اسلامی ممالک و اقوام پر استعماری تسلط حاصل کرنا ناممکن ہے۔

چنانچہ یورپ کی استعماری حکومتوں کے تمام سربراہوں، مسیحی مشنری کے بڑے بڑے پادریوں، اُسقفوں اور علماء یہود نے بڑے غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو اس ایمان و یقین کی طاقت سے محروم اور دین سے بیزار کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے جید علماء اور مذہبی پیشواؤں کی ایک جماعت اسلام کے بنیادی علوم قرآن و حدیث، عقائد و فقہ وغیرہ کے تمام لٹریچر کا علم حاصل کرے اور تنقیدی و تخریبی نقطۂ نظر سے اُس کا گہرا مطالعہ کرے اور پھر ان اساسی علوم اور ان کے ماخذوں ـــ مستند کتابوں ـــ میں مسخ و تحریف اور ائمہ دین کی دیانت و امانت میں شکوک و شبہات اور اوہام و وساوس کے ذریعہ دین میں رخنہ اندازی ایسے غیر محسوس طریقہ پر کی جائے کہ اسلامی عقائد و شرعی احکام کی پوری عمارت زمین پر آرہے اور مسلمان ان عقائد و احکام کو اوہام و خرافات اور دقیانوسی خیالات محسوس کرنے لگیں اور دین اسلام سے کلی طور پر بیزار ہو جائیں۔

ظاہر ہے کہ اس شیطانی منصوبے اور تخریبی سازش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کارکنوں کو اپنی عمریں صرف کرنے کی اور اُن کی معاشی کفالت کے لئے حکومتوں کو اپنے خزانوں کا منہ کھول دینے کی

ضرورت تھی چنانچہ کٹر متعصب یہودیوں اور مسیحیوں نے اس کام کو پایۂ تکمیل پہونچانے کا بیڑا اُٹھایا اور استعماری حکومتوں نے مالی کفالت کی ذمہ داری لی اور ان اسلام دشمن دو فریقوں کے گٹھ جوڑ سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک نیا مگر خفیہ محاذ کھل گیا۔

ان تعصب پرست استعماری حکومتوں کے ایجنٹ یہودیوں اور مسیحیوں میں سے کچھ کی تو مادری زبان عربی ہی تھی اور لغت وادب میں تخریبی کارنامے انجام دے چکے تھے اور کچھ نے عربی زبان کی شدہ بدہ حاصل کرکے حدیث وفقہ وعقائد وغیرہ علوم دینیہ — مشرقی علوم — کے اہم ترین ماخذوں اور مستند کتابوں میں سائنٹفک ریسرچ (علمی تحقیق) کے پُر فریب اور مرعوب کُن نام سے غیر محسوس تحریفیں کرکے اُنھیں ایڈٹ کرنا، چھاپنا اور اسلامی ملکوں میں شائع کرنا شروع کردیا اور "اسلامی موضوعات" پر اسی سائنٹفک ریسرچ کے نام سے مستقل مقالے اور کتابیں لکھنی شروع کردیں اور چند برسوں میں ہی اسلام کے خلاف ان متعصب مستشرقین کا تیار کردہ بہت بڑا ذخیرہ تالیف وتصنیف کی دنیا میں آگیا۔

ان مستشرقین کا جدامجد اور باوا آدم جرمنی کا یہودی مستشرق گولڈ تسیہر ہے اس یہودی نے اپنی عمر کا کافی حصہ صرف کرکے اور باقاعدہ عربی زبان حاصل کرکے علوم عربیہ کا نہایت دقیق مطالعہ کیا نہ صرف یہ بلکہ انتہائی عقیدت مندانہ انداز میں اُس زمانے کے جید علما اور محدثین کے حلقہ ہائے درس میں شریک ہوکر ان سے براہ راست علوم دینیہ کو کماحقہ حاصل کیا اور اپنے تخریبی نقطۂ نظر کے تحت تعلیمات اسلام کے کمزورترین اور قابل اعتراض ولائق تنقید پہلو معلوم کئے خصوصاً گمراہ فرقوں معتزلہ، خوارج اور روافض کے غیر اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرکے ان سے اسلامی معتقدات واحکام پر اعتراضات کا ذخیرہ مہیا کیا۔ اور پھر اسلام کے خلاف اپنی سب سے زیادہ زہریلی کتاب العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام شائع کی جس کا اول فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا اور اس کے بعد نہ صرف یورپ کی زبانوں میں بلکہ عربی میں بھی اس کے ترجمے کرائے گئے۔ شاخت وغیرہ تمام مستشرقین اور اسلامی موضوعات پر ان کی تمام تصانیف گولڈ زیہر کی ہی ذرّیّت یعنے پیداوار ہیں۔

مگر چونکہ اسلام کے خلاف یہ تمام علمی اور تصنیفی کام یہودیوں یا مشنریوں کا کیا ہوا تھا اس لئے تمام اسلامی دنیا کے عوام اور پڑھے لکھے طبقہ نے یہ کہکر اسے ردّی کی ٹوکری میں پھینکدیا کہ "یہودی اور مسیحی تو اسلام کے ازلی دشمن ہیں ہی یہ اسلام کے خلاف زہر نہ اُگلیں گے تو اور کیا کریں گے" اور اس طرح ان دشمنان اسلام کی سالہا سال کی محنتیں اور بیشمار سرمایہ سب خاک میں مل گیا۔

یہ دیکھ کر ان دشمنان اسلام نے اپنی اس تخریبی سازش کا رُخ بدلا اور ایک طرف تو اسلامی ملکوں میں مسلمانوں کو دینی تعلیم سے محروم اور حقیقی اسلام سے ناواقف رکھنے کی غرض سے "جدید تعلیمی نظام" کا جال پھیلایا اور تمام اسلامی ملکوں میں مسیحی مشنریوں نے کروڑوں روپے کے سرمایہ سے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لئے پرائمری اور سکنڈری اسکول کھولے اور اعلیٰ تعلیم کے لئے کالج اور یونیورسٹیاں قائم کیں اور اعلیٰ تعلیم کے نصابوں میں وہی یہودی اور مسیحی مصنفین کی لکھی ہوئی کتابیں داخل کیں جن کو مسلمان ردی کی ٹوکری میں ڈال چکے تھے اور دوسری طرف یورپ و امریکہ وغیرہ کی تمام یونیورسٹیوں میں مشرقی علوم اور اسلامی موضوعات پر ریسرچ (تحقیق) کے شعبے جاری کئے اور ان میں اسی قماش کے متعصب یہودی اور مسیحی پروفیسر (اساتذہ) مقرر کئے اور اسلامی ملکوں کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل طلبہ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری کا لالچ اور ڈاکٹریٹ کا سبز باغ دکھا کر اور گرانبہا وظائف دے کر اپنی یونیورسٹیوں میں مشرقی علوم اور اسلامی موضوعات پر ریسرچ کرنے کی ترغیب دی اور نوعمر و نوخیز گریجویٹ مگر اسلام سے ناآشنا طلبہ کو ان میں داخل کرنا شروع کیا تاکہ ایک طرف تو وہ علم دین سے بے بہرہ طلبہ ان یہودی اور مسیحی اساتذہ کے زیر تعلیم و تربیت رہ کر اسی مسخ شدہ اسلام سے آشنا ہوں جس کا حسین چہرہ سالہا سال کی مسلسل تحریف و تشویہ کے ذریعہ ان خدا ناشناس دشمنوں نے بگاڑ رکھا ہے اور "ماڈرن اسلام" (جدید اسلام) کے پر فریب نام سے اس کو پیش کرتے رہیں۔

اور دوسری طرف وہ طلبہ ان مغربی ممالک یورپ و امریکہ میں قیام کے دوران ان ملکوں کے مسموم معاشرہ اور زہریلی تہذیب کی رنگینیوں، رعنائیوں اور ہیجان انگیز مناظر میں ــــ جہاں ہر ہر قدم پر دعوت گناہ عام ہے ــــ اس قدر گم ہو جائیں کہ تمام مشرقی اخلاق اور مذہبی اقدار کو ع "این دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ" کہہ کر پھینک دیں۔ اور کلی طور پر مغربی تہذیب کے سانچہ میں اس طرح ڈھل جائیں کہ اپنے اپنے ملکوں میں واپس جا کر مغربی تہذیب کی ایک ایک ادا کو عین اسلام ثابت کرنے میں اور ملک کے علماء دین اور دیندار طبقہ کو دقیانوسی اور لکیر کے فقیر کہہ کر مطعون اور بدنام کرنے میں اپنی پوری قوت صرف کر دیں نیز اپنی ڈگریوں کے بل بوتے پر اسلام کے تمام عقائد و احکام پر مجتہدانہ رائے زنی اور خامہ فرسائی کا خود کو اہل اور مجاز بلکہ محقق ثابت کر کے "اسلام کی تعمیر نو" کے پُر فریب نام سے اسلام کو علماً، عملاً، اخلاقاً غرض ہر اعتبار سے مسخ کر کے رکھ دیں اور جو کام مستشرقین غیر مسلم ہونے کی وجہ سے نہیں کر سکے تھے وہ کام ان فرزندان اسلام کے ہاتھوں سے پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے۔

بالفاظ دیگر ان یہودی اور مسیحی مستشرقین نے اس تدبیر سے خود مسلمانوں میں استشراقی ذہن و فکر کا

مالک ایک ایسا اعلیٰ تعلیم یافتہ طاقتور گروہ پیدا کر دینے کی خطرناک سازش کی جو اسلامی ملکوں میں اقتدار حاصل کر کے اپنے اپنے ملکوں سے اسلام اور اسلامی تہذیب کا جنازہ نکال سکے۔ تب ہر ملک میں مسلمان مفکرین اور علماء دین نے اس "فتنۂ استشراق" کا سر کچلنے اور بیخکنی کرنے کے لئے کمر کس لی۔ چونکہ یہ فتنہ قلم و قرطاس اور تصنیف و تالیف کی راہ سے آرہا تھا اس لئے ہر ملک میں ارباب تصنیف و تالیف اور اہل قلم نے اس فتنۂ استشراق کی دھجیاں بکھیرنے اور اسلام کے خلاف اس سازش کو بے نقاب کرنے کی غرض سے اپنے اپنے مقدور اور حالات کے مطابق کوشش یعنے اسلام کے دفاع کے لئے قلمی جہاد شروع کر دیا اور بے شمار تصانیف مقالے اور مضامین لکھے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ڈاکٹر مصطفیٰ حسنی السباعی کی زیر ترجمہ کتاب ہے۔

اور جیسے مصر کے ان استشراق زدہ مصنفین میں سے دو سر فہرست مصنف ڈاکٹر محمود ابوریہ اور ڈاکٹر محمد امین مصری کے خلاف ڈاکٹر مصطفیٰ حسنی السباعی نے زیر ترجمہ کتاب السنة ومكانتها في التشريع الاسلامي تصنیف کی ہے اسی طرح پاکستان میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن ڈائرکٹر ادارۂ تحقیقات اسلامی کے خلاف مدرسہ عربیہ اسلامیہ کے ماہنامہ بینات نے اس قلمی جہاد میں حصہ لیا اور بفضلہ تعالیٰ اس میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو ادارۂ تحقیقات اسلامی کے عہدہ سے معزول کر دیا گیا اور وہ بیک بینی و دوگوش وہیں چلے گئے جہاں سے آئے تھے یعنی میکگل یونیورسٹی امریکہ۔

مگر اس سات سال کے عرصہ میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں استشراقی ذہن و فکر کے مالک جو مصنفین و مولفین پیدا کر دئے ہیں ان سے نمٹنا ابھی باقی ہے اور اسی مقصد کے تحت مدرسہ عربیہ اسلامیہ ڈاکٹر مصطفیٰ حسنی السباعی کی کتاب کا ترجمہ شائع کر رہا ہے وباللہ التوفیق

(از مترجم)

ہدیہ

اس ذاتِ گرامی کی خدمت میں

جس نے مجھے اس بے مثل شفقت و عاطفت پدری سے نوازا جس کی بدولت میں عہد طفلی میں پھلا پھولا اور پروان چڑھا۔

اور

جس کی مربیانہ نگرانی و رہنمائی نے مجھے اس نازک عہد میں راہِ راست پر قائم رکھا جبکہ میں ایک نرٹہنی کی طرح ہر کجی اور گمراہی کو قبول کر سکتا تھا

اور

جس کی گرانقدر امداد و اعانت اور کفالت نے تحصیل علوم و فنون کے سلسلہ میں مجھے اس قابل بنا دیا کہ میں فارغ البالی اور یکسوئی کے ساتھ طالب علمی کے ابتدائی عہد میں ہی تحصیل علم و ہنر کی کماحقہ جدوجہد کر سکوں۔

اور

جس کی تائید و تقویت اور ہمت افزائی و پشت پناہی نے دعوت و ارشاد اور اعلاءِ کلمۃ الحق کے عظیم کام میں میرے لئے اللہ کے راستہ میں سخت سے سخت تکلیفیں اٹھانا اور اذیتیں برداشت کرنا آسان کر دیا۔

اور

جس کے صبر و ثبات اور پامردی کے جذبہ نے راہِ حق میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کو میرے لئے اس کس مپرسی کے زمانہ میں محبوب و مرغوب بنا دیا جبکہ میں دربدر مارا مارا پھر رہا تھا یا قید و بند کی مصیبتیں جھیل رہا تھا۔

اور

جس کے شفیق و مہربان دل کی دھڑکنوں نے میری جسمانی و روحانی اذیتوں، بیماریوں اور تکلیفوں کو اُس مجبوری و بیچارگی کی حالت میں ہلکا اور قابل برداشت بنا دیا جبکہ میں گوناگوں بیماریوں سے نڈھال ہو چکا تھا اور میری قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔

اور اُس لائق صد احترام ذات گرامی کی خدمت میں

جس کی تمام تر آرزو اور تمنا یہ تھی کہ میں اپنے علمی خاندان کے سلسلۂ علما کی ——— جو سیکڑوں برس سے علما پرور چلا آ رہا ہے ——— ایک کڑی بنوں

اور

جس کی اپنے رب سے تمام تر التجا یہ تھی کہ قیامت کے دن اللہ جل و علیٰ مجھے ان کی "نیکیوں" میں سے ایک "نیکی" بنا دے یعنی

اپنے والد بزرگوار ؛

شیخ حسن السباعی

کی خدمت اقدس میں

اپنی اس پہلی علمی تالیف کا ھدیہ پیش کر کے

اُن کی عظمت و جلالت اور حسن تربیت کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں

اللہ جل جلالہ سے میں یہ اُمید کرتا ہوں کہ وہ میری خاطر اُن کی زندگی میں برکت عطا فرمائیں گے اور اُن کو اس "نیکی" اور "عمل صالح" کے اجر جزیل سے سرفراز فرمائیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ ایک شفیق و کریم باپ کے حق میں ایک فرمانبردار بیٹے کی وہ دعا اللہ تعالیٰ ضرور قبول فرمائینگے جو وہ خود اُن کے حکم کی تعمیل میں کرتا ہے :

وقل رب ارحمهما كما ربياني صغيرا ۔

اور رحم کہا کر وائے میرے رب تو ان دونوں (ماں باپ) پر ایسے ہی رحم فرما جیسے اُنھوں نے بچپن میں میری پرورش کی ہے

ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ

مصطفیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ کتاب

سب تعریفیں اُس اللہ کے لئے ہی ہیں جس نے اپنے بندوں کے لئے کتاب مبین — قرآن عظیم — کے ذریعہ احکام تجویز کئے اور ان احکام کی تشریح و تفصیل اور عملی تشکیل کا ناگزیر کام خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمایا، جو ہمارے آقا محمد بن عبداللہ ہیں، ان کی آل و اولاد پر اور ان کے صحابیوں پر اللہ کی رحمتیں اور سلامتی ہمیشہ ہمیشہ نازل ہو، وہ صحابہ جو اللہ کے رسول سے وحی الٰہی کو نقل کرنے اور اُمت تک پہونچانے والے ہیں، حق کے بارے میں امین ہیں، اللہ کی طرف دعوت دینے اور بُلانے والے ہیں، ہدایت الٰہی اور صراط مستقیم پہ قائم ہیں، اور ان لوگوں پر بھی یہ رحمتیں اور سلامتی نازل ہو جو قیامت تک اُن صحابہ کے نقش قدم پر حسن و خوبی کے ساتھ چلیں۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد:-

ہم اس وقت ایک ایسے دور سے گذر رہے ہیں جس میں متعدد عالمی نظاموں کی کشمکش کارفرما ہے، مگر یہ سب کے سب نظام اقوام عالم کے لئے سلامتی اور خوشحالی مہیا کرنے سے قطعاً عاجز ہیں۔ عالم پر حکومت کرنے والی قوموں کے قائدین اور سربراہوں کے وہ عیوب جو بظاہر اس اضطراب اور ابتری کا سبب بنے ہوئے ہیں، کچھ ہی ہوں، ہمارے نزدیک تو اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں کہ دُنیا کی بدبختی اور تباہی کے براہ راست ذمہ دار خود وہ عالمی نظام ہیں جو اب تک بھی انسانی مشکلات اور مسائل کو ایسے طریق پر حل کرنے کے لئے اپنی اہلیت و صلاحیت نہ ثابت کرسکے کہ عالمگیر جنگوں اور بین الاقوامی جھگڑوں سے دُنیا کو نجات دلاسکیں اور وہ انسانیت، جو عالمگیر جنگوں کے دوران قتل و خونریزی اور تباہی و بربادی کی خونی و تاریک فضا میں کافی عرصہ زندگی گذارنے کے بعد، اب ان خونریز عالمی جنگوں کے اختتام پر اضطراب، سراسیمگی اور بے چینی

کی فضا میں سانس لے رہی ہے، اس سہمی ہوئی انسانیت کو اس مصیبت سے نجات دلا سکیں۔

ہم مسلمانوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ اگر یہ عالم اپنے لئے حقیقی سعادت اور پائدار امن و سلامتی چاہتا ہے تو دنیا کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ خالق کائنات اللہ جل جلالہ کی اُن آسمانی تعلیمات کی طرف رجوع کرے جو ہر طرح کی بے اعتدالیوں اور ظلم و جور سے پاک صاف ہیں اور ہر طرح کی انسانی کتر بیونت، فکری شعبدہ بازی اور تغیر و تبدل، ترمیم و اصلاح سے منزہ اور بالاتر ہیں اور انہی تعلیمات و احکام الٰہیہ کی تکمیل و تتمیم کیلئے اسلام کا پیغام دنیا میں آیا ہے اور اس نے اُن تعلیمات الٰہیہ کی ہر پہلو سے ایسی مکمل، دقیق، ہمہ گیر اور جامع ترین تعبیر و تشکیل کی ہے اور اُن کو انسانیت کی فلاح کیلئے ایک ایسے مکمل نظام زندگی کے طور پر پیش کیا ہے جو ہر ملک اور ہر قوم کیلئے سازگار ہے، اسمیں مختلف ظروف و احوال کیلئے لچک بھی موجود ہے اور مختلف زمانوں کی ترقیات کے ساتھ ساتھ چلنے کی صلاحیت بھی ہے اور ہر شعبہ زندگی میں نوع انسانی کی ضروریات کو ـــــ ادلتے بدلتے مختلف حالات اور زمانوں میں، اور مختلف قوموں اور ملکوں میں ـــــ پورا کرنے کی ضمانت بھی ہے

اس لئے کہ اسلامی شریعت اپنے ابتدائی ماخذوں کے اعتبار سے بھی اور فقہا و ائمہ مجتہدین کی بحثوں اور تنقیحوں کے اعتبار سے بھی، ایسی عالمگیر و ہمہ گیر وسعتوں کی حامل ہے کہ ہر نئے پیش آنے والے واقعہ کے لئے اس میں کافی گنجائش ہے اور زندگی کے ہر جدید مسئلہ کا قابل عمل حل بھی اس میں موجود ہے۔ افراد، طبقات اور حکومتوں کے درمیان عدل و انصاف کی ترازو اور توازن کو بھی قائم کرتی اور برقرار رکھتی ہے۔ اور ایک اطاعت شعار، بیدار مغز، ترقی پذیر اور قیادت کی صلاحیت رکھنے والی قوم کے لئے بھی، اور دنیا کی دوسری مختلف قوموں اور ملکوں کے لئے بھی عدل و انصاف اور امن و امان قائم کرنے والی ایسی حکومت کو بھی جنم دیتی ہے جو ہر صلح جو مصالحت پیشہ فرد یا طبقہ کے ساتھ صلح کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتی ہے لیکن جب کوئی حد سے گزرنے والا مجرم انسانیت یا مکار و باغی فرد یا گروہ اس کے ساتھ بے اعتدالی اور سرکشی پر اُتر آتا ہے تو اپنے عقیدہ، اخلاق اور سچی آزادی کی آبرو کا دفاع کرنے کے لئے بھی ایک آہنی دیوار کی طرح تیار رہتی ہے۔

اسلامی تشریع ـــــ اسلامی قانون ـــــ کے ماخذ مسلمانوں میں چودہ سو سال سے مُسلّم

اور مشہور و معروف چلے آتے ہیں اُن پر مسلمانوں کا مکمل اعتماد و وثوق بھی رہا ہے اور وہ محفوظ بھی ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سُنّت مطہرہ — جو اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ ہے — اپنی فروعات و تفصیلات کے اعتبار سے سب سے زیادہ وسیع ہے اور اپنے متنوع نظاموں کے اعتبار سے زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے اور انسانی مسائل و مشکلات کو حل کرنے کے اعتبار سے سب سے زیادہ فراخدل اور کشادہ دامن ہے۔

پچھلے دور میں اس سنت کو بعض ایسے اسلامی فرقوں کے پے بہ پے حملوں کا سامنا کرنا پڑا ہے جو ایسے شکوک و شبہات کی بنا پر حق کے راستوں سے ہٹے ہوئے تھے جن کے ازالہ کے لئے جو دلائل و براہین درکار تھے اُن تک ان فرقوں کے ماننے والوں کی رسائی نہ ہوسکی۔ بالکل اسی طرح جیسے دور حاضر میں سنت، استعمار پرست قوموں اور مسیحی مشنریوں کے پروردہ متعصب مستشرقین کے بے پناہ حملوں کا ہدف بنی ہوئی ہے جن کا واحد مقصد اسلام کے خلاف نو بنو فتنے برپا کرنا اور اسلامی قانون کے اس محکم رکن — سُنّت — کی بیخکنی کرنا ہے جس کا دُوررس سایہ پوری انسانی زندگی کو اپنے آغوش میں لینے کی صلاحیت رکھتا ہے

اور بد قسمتی سے ہمارے بعض ناپختہ کار مسلمان اہل قلم بھی انہی مستشرقین کے قدم بقدم چلنے لگے یا تو وہ ان مستشرقین کی اُس نام نہاد علمی تحقیق — سائنٹفک ریسرچ — کے نام سے دھوکا کھا گئے جس کا لیبل وہ اپنی معاندانہ بحث و تنقید پر لگا دیتے ہیں یا پھر وہ اپنے غلط شخصی رجحانات اور فکری شکوک و شبہات کی رو میں بہہ گئے ہیں جن کو انھوں نے اپنے پاس موجود، سلف صالحین کے علمی ورثہ — تصانیف — اور پختہ کار علماءِ راسخین کی تحقیقات کی روشنی میں حل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی اور ان مستشرقین کے تصورِ سنت میں ان کو اپنے دلوں میں چھپے ہوئے رجحانات و افکار کی جھلک نظر آئی لہٰذا انھوں نے — بے سوچے سمجھے — استشراقی ساز پر مستشرقین کے راگ الاپنے شروع کر دیئے بقول شاعر:

اتانی ھواھا قبل ان اعرف الھویٰ	اس کی محبت میرے پاس ایسے وقت آئی جبکہ میں
فصادف قلبا خالیا فتمکنا	محبت سے آشنا تک نہ تھا چنانچہ اس نے ایک سادہ
٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭	لوحِ دل پاکر اسے اپنا گھر بنا لیا۔

چنانچہ ۱۳۵۸ھ میں ان اہل قلم میں سے بعض مولفین کے ساتھ میرا بھی سابقہ پڑا ہے اور ان یہودی وعیسائی مستشرقین کی علمی تحقیقات یعنے ہرزہ سرائیوں سے متاثر ہو کر ان کے ذہنوں میں جو شکوک وشبہات راسخ ہو گئے تھے اُن کی بیخکنی کرنے میں مجھے بڑی مشقت اُٹھانی پڑی ہے۔

اس لئے میں نے یہ تہیہ کر لیا کہ میں اپنی اس تالیف میں سنت اور اسلامی قانون میں اُس کے مرتبہ اور مقام پر محققانہ بحث کروں اور ان تاریخی ادوار کی نشاندہی کروں جن سے یہ سُنّت گذر کر ہم تک پہونچی ہے اور علماء اسلام اور حُفّاظ حدیث نے سُنّت کی بے مثل حفاظت اور حیرت انگیز چھان بین میں جو حیرت میں ڈال دینے والی کوششیں کی ہیں ان پر بھی سیر حاصل روشنی ڈالوں اور گزشتہ اور موجودہ دور میں سنت پر حملے کرنے والوں نے جو اعتراضات کئے ہیں سنجیدہ انداز اور پُرسکون علمی روح کے ساتھ اُن کے جوابات بھی دوں تاکہ حق کا روشن چہرہ ان تمام شکوک وشبہات کے گرد وغبار سے اور جرح ونقد کے داغ دھبوں سے پاک وصاف ہو جائے اور سُنّت مطہرہ کا رُخ روشن جگمگاتا ہوا دنیا کے سامنے آجائے۔

آخر میں اس تالیف کو میں نے مشہور علماء اسلام میں سے اُن حفّاظ حدیث اور ائمہ مجتہدین ومحدثین کے مختصر مگر موضوع سے متعلق حالات زندگی کے بیان پر ختم کیا ہے جن کا سنت کی حفاظت وصیانت اور اس کی تدوین وتہذیب میں ممتاز اور نمایاں حصہ رہا ہے یا جنہوں نے اسلامی شریعت کے اصل ماخذوں سے شرعی احکام کے استنباط کرنے کے لئے ہمیشہ سُنّت کی طرف رجوع کیا ہے۔

اس لئے میں نے اس کتاب کو تین بابوں اور ایک خاتمہ پر تقسیم کیا ہے۔

باب اوّل:۔ اس باب میں سنت کے لغوی اور اصطلاحی معنی اور مصداق سے اور اس کی نقل وتدوین سے بحث کی ہے۔ اس باب میں چار فصلیں ہیں:

فصل اوّل:۔ سنت کے لغوی معنی، اصطلاحی تعریف اور سنت کے بارے میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا موقف۔

فصل دوم:۔ سنت میں وضع (حدیثیں گھڑنے) کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اور کب ہوئی؟

اور کہاں ہوئی۔

فصل سوم:۔ علماء وحفاظ حدیث کی ان بے مثل کوششوں، کاوشوں اور جاں فشانیوں کا بیان جو انھوں نے سنت کی چھان بین اور اس کی صحت کو معلوم کرنے کے سلسلہ میں کی ہیں۔

فصل چہارم:۔ علماء حدیث کی ان مساعی اور کاوشوں کے نتائج وثمرات کا بیان۔

باب دوم:۔ اس باب میں ان تمام شکوک وشبہات واوہام اور معاندانہ اعتراضات وتنقیدات سے بحث کی ہے جن کا مقابلہ سنت کو مختلف زمانوں میں کرنا پڑا ہے۔ اس باب میں سات فصلیں ہیں۔

فصل اول:۔ شیعہ اور خوارج کا رویّہ سنت کے ساتھ

فصل دوم:۔ قدیم زمانہ میں جو لوگ سنت کے حجت ہونے کے منکر تھے ان کا رویّہ سنت کے ساتھ۔

فصل سوم:۔ دور حاضر میں جو لوگ سنت کے حجت ہونے کے منکر ہیں ان کے نزدیک تصورِ سنت

فصل چہارم:۔ جو لوگ خبر واحد کے حجت ہونے کے منکر ہوئے ہیں ان کا رویّہ سُنّت کے ساتھ

فصل پنجم:۔ معتزلہ اور متکلمین کا رویّہ سنت کے ساتھ

فصل ششم:۔ دور حاضر کے بعض ارباب قلم کا رویّہ سنت کے ساتھ۔

فصل ہفتم:۔ مستشرقین کا تصور سنت

باب سوم:۔ اس باب میں اسلامی قانون میں سنت کے مرتبہ اور مقام سے بحث کی ہے۔ اس میں تین فصلیں ہیں۔

فصل اول:۔ قرآن عظیم کی نسبت سے سنت کا مقام

فصل دوم:۔ قرآن عظیم سنت پر کس طرح مشتمل ہے۔

فصل سوم:۔ قرآن سے سنت کے منسوخ ہونے کی تحقیق۔

خاتمہ :۔ کبار علماء اسلام میں سے دس مشہور و معروف ائمہ مجتہدین و محدثین کا تذکرہ

(۱) امام ابو حنیفہؒ (۲) امام مالکؒ (۳) امام شافعیؒ (۴) امام احمد بن حنبلؒ
(۵) امام بخاریؒ (۶) امام مسلمؒ (۷) امام نسائیؒ (۸) امام ابو داؤد (۹) امام
ترمذیؒ (۱۰) امام ابن ماجہؒ

میں اللہ جل و علیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے ہر طرح کی لغزشوں سے بچائے اور ہر موقعہ اور محل میں رشد و ہدایت میرے دل میں ڈال دے اور اپنی رحمت کے خزانے میرے لئے کھولدے اور ہمیں ان نکوکاروں کے زمرہ میں شامل فرمادے جو ہر بات کو خوب غور سے سنتے ہیں اور پھر بہتر بات کی پیروی کرتے ہیں۔

اور سب تعریفیں تو اللہ رب العالمین کے لئے ہی سزاوار ہیں۔

مصطفیٰ حسنی السباعی
قاہرہ ۸ رجب ۱۳۶۸ھ
۴ مئی ۱۹۴۹ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمۂ طبع

سب تعریفیں اللہ رب العالمین کیلئے سزاوار ہیں اور قیامت تک صلوٰۃ وسلام ہمارے سردار حضرت محمد پر، ان کی آل پر، ان کے صحابہ پر، اور آپ کی سنت کے حاملین پر اور اس کی طرف سے مدافعت کرنے والوں پر ہو۔

یہ کتاب جس کو میں آج طباعت کے لئے بھیج رہا ہوں، درحقیقت یہ وہ مقالہ ہے جسکو میں نے ۱۳۶۸ھ مطابق ۱۹۴۹ء میں فقہ، اصول اور تاریخ تشریع اسلامی میں ایم، اے عالمیہ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے جامع ازہر کلیۃ الشریعہ میں پیش کیا تھا

بہت سی وجوہات کی بنا پر میں اُس وقت سے اب تک اس کو شائع کرنے سے پہلو تہی کرتا رہا۔ ان میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں نے اس کتاب — مقالہ — کو ایسے سخت حالات اور تنگ وقت میں لکھا تھا کہ میں اس کی بہت سی اہم بحثوں پر تفصیلی روشنی نہ ڈال سکا اور اختصار سے کام لینے پر مجبور ہوا حالانکہ میں جانتا تھا کہ ان مباحث کو تفصیل سے لکھنے اور کثرت سے شواہد ونظائر پیش کرنے کے بعد ہی یہ کتاب کما حقہ مفید ہو سکتی ہے تاکہ سنت کے سارے گوشے اور تمام پہلو واضح طور پر سامنے آجائیں۔ علاوہ ازیں میں اس موضوع سے متعلق کچھ اور مباحث کے اضافہ کو بھی ضروری سمجھتا تھا۔

بہرحال اس سلسلہ میں جو کچھ میں کرنا چاہتا تھا اس کے لئے مجھے فرصت اور وقت نہ مل سکا تھا۔

پھر ہوا یہ کہ اس مقالہ کے کچھ حصے قاھرہ اور دمشق وغیرہ سے شائع ہونے والے علمی اور دینی رسالوں میں اسی مختصر صورت میں چھپ گئے تو ان کے قارئین کی جانب سے اس پورے مقالہ کو کتابی صورت میں چھاپنے کے تقاضے آنے لگے لیکن پھر بھی اس کی طباعت کو میں

اس وقت تک کے لئے ٹالتا رہا کہ مجھے اپنے ارادہ کے مطابق اس میں تفصیلات اور اضافے شامل کرنے کی فرصت میسر آئے

کتاب کی اشاعت کا محرک

اسی اثنا میں استاد۔ پروفیسر۔ محمود ابوریہ کی کتاب اضواء علی السنۃ المحمدیہ شائع ہوگئی۔ اس کتاب میں سنت اور اس کے حاملین و رُواۃ کے متعلق جو غیر سنجیدہ اور غیر تحقیقی اظہار رائے کیا گیا ہے وہ سب کو معلوم ہی ہے۔ تو میرے ان عزیز دوستوں نے اور بھی شدت کے ساتھ اس کتاب (مقالہ) کی علمی اور مدلل تحقیقات کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس کی اشاعت کے لئے مجھے بیحد مجبور کیا۔ لہٰذا بدرجہ مجبوری جس صورت میں یہ مقالہ لکھا تھا اسی شکل میں اب پیش کر رہا ہوں، بجز اس اضافہ کے جو میں نے حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کے متعلق کیا ہے۔

یہ اضافہ درحقیقت استاذ ابوریہ کی کتاب میں جو حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ اعتراضات کئے گئے ہیں ان کا ایک مختصر سا تحقیقی جائزہ اور علمی تبصرہ ہے۔

بُے خدائے کارساز سے اُمید ہے کہ اگر صحت نے اجازت دی تو میری آرزو بھی پوری ہو جائے گی اور جس صورت میں، میں چاہتا ہوں اس کی بھی توفیق نصیب ہو جائے گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

(۱)

اسلامی قانون میں سنت کی ناگزیر اہمیت

تشریع اسلامی ۔ قانون شریعت ۔ میں سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مرتبہ اور مقام اور فقہ اسلامی کی وسعت و جامعیت میں اس کا اثر و نفوذ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے زمانہ سے لیکر ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ کے زمانہ تک جبکہ فقہی اور اجتہادی مذاہب کی تشکیل عمل میں آئی، کسی بھی شخص پر مخفی نہیں ہے۔ یہ سنت ہی کی ہمہ گیر کارفرمائی ہے جس نے فقہ اسلامی کو ایسی تشریعی ۔ قانونی ۔ ثروت اور وسعت بخشی ہے کہ جس کی نظیر گزشتہ اور موجودہ تمام اقوام عالم کے تشریعی ۔ قانونی ۔ سرمایہ میں نہیں ملتی جو شخص بھی قرآن اور سنت کا تقابلی

مطالعہ کرے گا اس کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلامی قانون کے دائرہ کو ہمہ گیر وسعت دینے اور اس کو عظمت و پائندگی بخشنے میں سنت کا سب سے زیادہ دخل ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار کوئی بھی فقہ اور فقہی مذاہب سے واقفیت رکھنے والا نہیں کر سکتا۔

یہی وہ عظیم الشان قانون ــ شریعت اسلامی ــ ہے جس کی وسعت و جامعیت اور عظمت نے دنیا کے ہر خطہ میں قانون اور فقہ کے ماہرین کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے اور جب اس پورے اسلامی قانون کو اُس قانونی اسلوب اور دفعات کی شکل میں ڈھال کر مرتب و منقح صورت میں، پیش کیا جائے گا جس سے دور حاضر کے لوگ مانوس ہیں تو ان ماہرینِ قانون کی آنکھیں اور بھی زیادہ کھُلی کی کھُلی رہ جائیں گی۔

اسلامی قانون کی دفعہ وار تدوین

جامعہ دمشق ــ دمشق یونیورسٹی ــ کے ماتحت کلیۃ الشریعہ ــ لا کالج ــ میں موسوعۃ الفقہ الاسلامی کے نام سے اسلامی قانون کو مروجہ قانونی قالب میں ڈھالنے کی سرگرم کوششیں جاری ہیں اور تیزی کے ساتھ کام ہو رہا ہے

ہر زمانہ میں سنت کی مخالفت و عداوت کی وجہ

یہی سنت کی وہ دُور رس کارفرمائی اور وسعت و جامعیت ہے جس نے گزشتہ عہد میں بھی اعداء اسلام کو اس پر برانگیختہ کیا تھا اور دور حاضر میں بھی، کہ وہ ہر پہلو سے سنت پر حملے کریں اس کی حجیت میں شکوک و شبہات پیدا کریں، صحابہ و تابعین میں سے جو حضرات سنت کو محفوظ کرنے والے اور احادیث کو روایت کرنے والے ہوئے ہیں ان کی صداقت و دیانت حفظ و ضبطِ حدیث کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں مختلف عنوانات سے شکوک و شبہات کی تخم ریزی کریں۔

یہی معاندانہ مقصد وہ نقطۂ اتحاد و اشتراک ہے جس پر اسلامی تہذیب کے روشن عہد کے دشمنان اسلام ــــ، خاص طور پر فارس وغیرہ کے ملحدین ــــ، اور عہد حاضر کے اعداء اسلام ــــ خاص طور پر مستشرقین اور اُن کی آواز پر لبیک کہنے والے مغربی تہذیب کے نامور مصنفین و مولفین، متفق و متحد ہو گئے ہیں۔

درحقیقت یہ سنت کے خلاف معاندانہ کوششوں اور کاوشوں کا سلسلہ آج کا نہیں بلکہ روز اول سے برابر چلا آرہا ہے چودہ سو سال سے آج تک کبھی منقطع نہیں ہوا، اور جب تک اسلام کے اور حق کے دشمن دنیا میں باقی رہینگے اور اسلام کی خیرہ کن تابانی ان کی آنکھوں کو خیرہ، اور اُن کے سینوں میں اسلام کے خلاف غیظ وغضب کی آگ کو مشتعل کرتی رہے گی اس وقت تک یہ سلسلہ برابر قائم رہے گا چنانچہ یہ اعداء اسلام ہمیشہ اپنی اس اندھی اور احمقانہ عصبیت کے ہاتھوں اس پر مجبور ہوئے ہیں اور ہوں گے کہ ہر اس چیز کی عمارت کو منہدم کردیں جو اسلام سے تعلق رکھتی ہے قرآن ہو خواہ سنت یا اجتہاد ہو اور ہر اس ہستی کی شکل وصورت بگاڑ کر رکھدیں جس نے اسلام کا جھنڈا بلند کیا ہے خواہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے صحابہ ہوں یا سنت کے حاملین یعنی رُواۃ حدیث ہوں یا اسلامی شریعت کے مقننین یعنی ائمہ مجتہدین ہوں۔

اور ہمیں اس میں ذرہ برابر بھی شک وشبہ نہیں کہ اسلام اور اس کے دشمنوں کے درمیان جو یہ مسلسل معرکے جاری ہیں اُن میں عصر حاضر کے معرکے بھی قدیم زمانے کے معرکوں کی طرح دشمنوں کی رسوا کُن شکست پر ختم ہو کر رہیں گے اور اُن کے دلوں کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے اور خبیث مقاصد دُنیا کے سامنے طشت از بام ہو کر رہیں گے اور اسلام ایک ایسے عظیم الشان بلند پہاڑ کی طرح اپنی جگہ قائم رہے گا جس کی سطح سے ٹکرا کر ریت کے بڑے بڑے طوفان اور بگولے پاش پاش ہوتے رہتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام اور اس کے مخالفین کے درمیان جنگ درحقیقت حق اور نفسانی خواہشات کی علم اور جہالت کی، رواداری اور کینہ پروری کی، نور اور ظلمت کی، جنگ ہے اور قانون قدرت یہ ہے کہ حق باطل پر، علم جہل پر، رواداری کینہ پروری پر اور نور ظلمت پر ہمیشہ اور دائمی طور پر غالب رہے ہیں۔

بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذاھو زاھق	بلکہ ہم حق کو باطل پر دے مارتے ہیں تو وہ اس کا بھیجا پاش پاش کردیتا ہے اور وہ ایک دم بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

(۲)

عہد حاضر کے مولفین کی افسوسناک روش

بڑا افسوس تو اس کا ہے کہ عہد حاضر میں ہمارے علماء اور مصنفین و مولفین کا ایک ایسا نام یارک گروہ پیدا ہو گیا ہے جس کے پکا مسلمان ہونے میں تو ہمارے لئے شک و شبہ کی گنجائش نہیں لیکن وہ برابر ان دشمنانِ اسلام کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے شاید یہ حضرات اُس نام نہاد جھوٹی علمی تحقیق (سائنٹفک ریسرچ) کے نام سے دھوکا کھا گئے ہیں یا مرعوب ہو گئے ہیں جس کا لبادہ ان اسلام اور مسلمانوں کے دشمن مستشرقین، مورخین اور اہل مغرب نے اپنی کمینی اغراض و مقاصد کی حقیقت کو چھپانے کے لئے اوڑھ رکھا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ حضرات مسلمان ہونے کے باوجود نادانستہ یا دانستہ طور پر وہی سب کچھ کر رہے ہیں جس کے لئے وہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن یہودی یا عیسائی یا سامراج کے پٹھو سر توڑ کوشش کر رہے ہیں یعنے اسلام اور اس کے حاملین کے خلاف شکوک و شبہات اور بدگمانی و بد دیانتی کا پروپیگنڈا۔

اس طرح یہ دشمنان اسلام اور اسلام کے یہ نا خلف فرزند اسلام کے خلاف ایک ہی محاذ پر جمع ہو گئے ہیں جن کی نہ علمی اور تحقیقی میدان میں کوئی قدر و قیمت ہے اور نہ تاریخی اعتبار سے کسی شرف و منزلت کے مالک ہیں۔

اس روش کو اختیار کرنے کے وجوہ

یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھنی ضروری ہے کہ مسلمانوں میں سے جو مصنفین و مولفین ان مستشرقین و مورخین اور اسلام کے دشمن لکھنے والوں کے فریب میں آ گئے ہیں ان کی فریب خوردگی اور اس جال میں پھنسنے کا موجب جو ایسے ہی لوگوں کے لئے بچھایا گیا ہے مندرجہ ذیل چار امور میں سے کوئی نہ کوئی ضرور رہا ہے۔

(۱) یا تو وہ اصلی اسلامی ورثہ یعنے علماء اسلام کی تصنیفات و تالیفات سے سرے سے جاہل اور اسلام کے پاک و صاف سرچشموں یعنے قرآن و حدیث اور مستند دینی کتابوں سے بالکل بیخبر ہیں۔

(۲) یا پھر وہ اس نام نہاد علمی انداز تحقیق (سائنٹفک ریسرچ) سے دھوکا کھا گئے یا مرعوب ہو گئے ہیں جس کا یہ دشمنان اسلام — مستشرقین اور یورپین مورخین — دعویٰ کیا کرتے ہیں۔

(۳) یا وہ سستی شہرت اور خود نمائی کے طالب ہیں اور "بزعم خود" تقلید کے بندھنوں سے آزاد ہوکر مذہبی" آزاد خیالی" کا ڈھونگ رچانا چاہتے ہیں۔

(۴) یا پھر وہ بذات خود بے دینی کے رجحانات اور ذہنی بے راہ روی اور فکری آوارگی کے مریض ہیں مگر اس کے اظہار کی جرأت بجز اس کے اور کسی صورت میں نہیں پاتے کہ ان مستشرقین اور یوربین مورخین کی آڑ لیکر اپنی بھڑاس نکالیں یعنے دوسروں کے کاندھوں پر رکھکر بندوق چلائیں۔

(۳)

پروفیسر محمود ابوریۃ کی کتاب اور اس کے اصلی ماخذ اور نمائشی ماخذ

مذکورۃ الصدر" فکری فضا" میں استاذ — پروفیسر — ابوریۃ اپنی کتاب اضواء علی السنة المحمدیہ منظر عام پر لائے ہیں میں نے اپنی اس زیر نظر کتاب کو چھپوانے کے وقت استاذ ابوریہ کی کتاب کا بنظر غائر مطالعہ کیا تو مجھے پتہ چلا کہ ان تمام مباحث میں جن کے اندر مصنف نے جمہور محققین اور علماء سلف کی متفقہ رائے سے خلاف کیا ہے ان کے اصلی ماخذ حسب ذیل ماخذوں سے آگے نہیں جاتے۔

(۱) ائمہ معتزلہ کے وہ نظریات جو عام کتابوں میں منقول ہیں۔

(۲) غالی شیعوں کے وہ نظریات جن کو انھوں نے اپنی تصانیف میں خوب اچھالا ہے۔

(۳) مستشرقین کے وہ نظریات جن کو انھوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اپنی تصانیف اور موسوعات — انسائیکلو پیڈیا — میں پھیلایا ہوا ہے۔

(۴) وہ قصے کہانیاں جو ادب کی بعض کتابوں میں محض ادبی اور تفریحی نقطہ نظر سے مذکور ہیں جن کے مولفین کی صداقت و دیانت اور واقعات و حقائق کی ذمہ دارانہ چھان بین کا اہتمام مشکوک اور مشتبہ ہے۔

(۵) مولف کی وہ مذہبی آزاد خیالی اور فکری بے راہ روی کے رجحانات جو ان کے سینہ میں سالہا سال سے انگڑائیاں لے رہے تھے اور منظر عام پر آنے کے لئے بے چین تھے۔

مستند کتابوں کے حوالوں کی حقیقت

رہے وہ اقتباسات اور حوالے جو مصنف نے اپنی کتاب میں ایسے مستند ماخذوں سے نقل کئے ہیں جن کو علمی اور اسلامی حلقوں میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے تو ان کی حقیقت اس سے متجاوز نہیں کہ:

(۱) وہ اقتباسات اُن کتابوں میں ایسے موقعہ اور محل پر مذکور ہیں جن کا اُس موقعہ محل سے کوئی تعلق نہیں جہاں مولف نے اُن کو بطور دلیل پیش کیا ہے گویا مؤلف نے ان کو بے محل استعمال کیا ہے۔

(۲) یا وہ نقول بجائے خود محققین کے نزدیک مسلم حقائق ہیں لیکن ان کی مراد وہ نہیں ہے جو مصنف نے بیان کی ہے مؤلف نے کلمۃ حق اریدبہ الباطل کے طور پر اس طرح ان کو پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا یہ سمجھے کہ جن لوگوں سے یہ روایتیں منقول ہیں وہ مصنف کی رائے اور اُس کے رجحانات سے متفق ہیں۔

(۳) یا ان منقول عبارتوں اور اقتباسات میں کاٹ چھانٹ کی گئی ہے وہ حصے نکال دیئے گئے ہیں جو مصنف کے خیال کی تردید کرتے ہیں اور صرف وہی حصے نقل کئے گئے ہیں جن سے مصنف اپنی تحقیق میں ثبوت کا کام لینا چاہتے ہیں۔ اس کا کچھ نمونہ آپ کو حضرت ابوہریرہؓ سے متعلق بحث میں ملے گا۔

(۴) یا وہ منقول عبارتیں معتزلہ کے اقوال ہیں جو مصنفین نے بغرض تردید نقل کئے ہیں لیکن ہمارے مصنف نے ان اقوال کو خود ان مصنفین کی طرف منسوب کر دیا ہے جیسا کہ ابن قتیبہ کے اقوال نقل کرنے میں مصنف نے یہی حرکت کی ہے۔

بہرحال یہ علماء محققین جن کے اقتباسات مصنّف نے نقل کئے اور جو نظریات ان کی طرف منسوب کئے ہیں وہ حضرات مصنف کے نظریات ورجحانات سے قطعاً متفق نہیں ہیں۔

اس سے بھی زیادہ اہم اور قابل گرفت بات یہ ہے کہ — عنقریب آپ پڑھیں گے — کہ مصنف ایک طرف تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف ناعاقبت اندیشی، غفلت اور عدم تدبّر کی نسبت کرتے ہیں جبکہ اُنھوں نے حضرت کعب احبار کے ان کی شہادت کا وقت قریب آنے کی خبر دینے کے وقت اُن سے غفلت برتی (اور احتیاطی تدابیر اختیار نہ کیں) اور دوسری طرف وہ — محض حضرت ابوہریرہؓ

کی احادیث کو مشکوک ثابت کرنے کی غرض سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تدبّر، دوراندیشی اور بیدار مغزی کی تعریف کرتے ہیں کہ وہ حضرت ابوہریرہ کی حدیثوں پر کڑی نظر رکھا کرتے تھے (گویا وہی ناعاقبت اندیش عمر یہاں آکر اعلیٰ درجہ کے دوراندیش بن جاتے ہیں)

اسی طرح آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ ایک طرف وہ ائمہ دین، علماء اسلام اور محققین اُمت کے احترام اور اعتراف عظمت کا جگہ جگہ مظاہرہ کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ اُنہی حضرات کو، تحقیق سنت کے بارے میں اُس اسلوبِ "تحقیق" کو — جس پر اُنھیں ناز ہے — اختیار نہ کرنے پر کوتاہ کار اور مقصّر قرار دیتے ہیں۔

علماء حق کے حوالوں کی حقیقت

مصنف نے بزعم خود اپنے اس نظریہ اور نرالے اندازِ تحقیق کی تائید کے لئے جس پر ان کی تمام بحث وتحقیق کا مدار ہے جن اکثر وبیشتر علماء حق کے ناموں کی آڑلی ہے اور اُن کے اقوال نقل کرکے اپنی تائید کا مظاہرہ کیا ہے جیسے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ، شیخ طاہر الجزائری، امام محمد عبدہ اور سید رشید رضا رحمہم اللہ ان حضرات میں سے کسی ایک شخص کی بحث وتحقیق کا حاصل بھی وہ ہرگز نہیں ہے، جو مصنف نے نکالا ہے بلکہ جو کچھ مصنف نے کہا ہے یہ حضرات اس سے قطعاً بری ہیں خاصکر جو گستاخیاں مصنف نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حق میں کی ہیں، اور تحقیق سنت کے بارے میں جو دور رس اور اہم نتیجے نکالے ہیں ان سے تو ان حضرات کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔

حوالوں کی شاندار فہرست اور اُن کی حقیقت

یہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ استاذ ابوریہ نے اپنی تحقیق کے ماخذوں کی فہرست کو دوسرے معاصر مصنفین کی بہ نسبت بہت زیادہ اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ پڑھنے والا یہ محسوس کرے کہ مصنف کی کتاب بہت اہم اور محققانہ ہے۔

ان ماخذوں میں (۱) کچھ تو تفسیر، حدیث، فقہ اور کتاب وسنت سے متعلق علوم کی کتابیں ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک بھی کتاب میں ایک لفظ تک ان نتائج سے متعلق مذکور نہیں ہے جو مصنف نے اُن کی روشنی میں اپنی بحث وتحقیق کے دوران نکالے ہیں نہ صرف یہ بلکہ مصنف کی تکذیب وتردید کرتے ہیں بالفاظ دیگر نتائج بالکل خود ساختہ اور فرضی ہیں (۲) ان ماخذوں

ہیں کچھ تاریخ کی کتابیں ہیں، لیکن یہ وہ تاریخ کی کتابیں ہرگز نہیں ہیں جن کو علماء محققین، سنت کی تدوین اور رُواۃ و حفّاظ حدیث کے متعلق بحث و تحقیق کے لئے اصل ماخذ قرار دیتے ہیں۔ سب اِدھر اُدھر کی تاریخی کتابیں ہیں بلکہ اُن میں سے بعض کتابیں تو وہ تاریخی کتابیں ہیں جن پر جمہور محققین کسی بھی مسئلہ میں اعتماد نہیں کرتے (۳) ان ماخذوں میں کچھ ادب، لغت، نحو و صرف کی کتابیں بھی ہیں جن کا تحقیق سنت جیسے اہم علمی اور دینی موضوع سے دور کا تعلق بھی نہیں۔

تحقیق سنت اور اس کے لئے ماخذ

آیئے ذرا ان ماخذوں کا جائزہ تو لیں جن کا مصنف نے بڑے اہتمام کے ساتھ نمایاں طور پر ذکر کیا ہے یہی وہ ماخذ ہیں جو ہمیں مصنف کی اس علمی تحقیق کی حقیقت اور قدر و قیمت سے آگاہ کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ تحقیق سنت کے بارے میں مصنف کے پاس یہ "وحی"[1] کہاں سے آئی ہے۔ سنئے اور سر دھنیئے :-

(۱) جرجی زیدان — مشہور عیسائی مورخ — کی تاریخ التمدن الاسلامی

(۲) اسی جرجی زیدان کی دوسری تاریخ العرب قبل الاسلام

(۳) یہودی مستشرقین کی مرتب کردہ دائرۃ المعارف

(۴) ڈان کریمر — مشہور عیسائی مورخ — کی کتاب الحضارۃ الاسلامیہ

(۵) ڈالٹن — مشہور عیسائی مورخ — کی کتاب السیادۃ العربیہ

(۶) ابراہیم الیازجی — مشہور عیسائی ادیب — کی کتاب حضارۃ الاسلام فی دار السلام

(۷) فلپ ہتی، ایڈورڈ جرجس اور عیسائی پادری جبرائیل جبور کی تصنیف کردہ مبسوط تاریخ العرب

(۸) کارل بروکلمان — مشہور عیسائی مورخ — کی کتاب تاریخ الشعوب الاسلامیہ

(۹) پادری ابراہیم لوقا کی کتاب المسیحیۃ فی الاسلام

(۱۰) مستشرقین کی ایک جماعت (بورڈ) کی تصنیف کردہ وجہۃ الاسلام

(۱۱) مستشرقین کے جد امجد گولڈزیہر — یہودی — کی کتاب العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام

ع : قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

مگر اس کے باوجود مصنف موصوف اپنی کتاب کے آخر میں بڑے زور و شور سے دعویٰ کرتے ہیں :

---

[1] ان الشیاطین لیوحون الی اولیاءھم کی طرف اشارہ ہے۔ مترجم

(۱) میں نے اپنی علمی تحقیقات کی تائید اور نتائج فکر کی تقویت محکم ترین دلائل و براہین اور قوی ترین سند دل
(حوالوں سے کی ہے (ص ۳۵۴) (۲) اور یہ کہ میں نے (ان تحقیقات کے لئے) ایسے زبردست ماخذوں کی مراجعت
کی ہیں جن تک شک و شبہ کا گذر بھی نہیں ہو سکتا، تردد و تذبذب کے وہاں پر جلتے ہیں۔
اب ہم مصنف کے ان پانچ بنیادی اور مرکزی ماخذوں کا طائرانہ جائزہ لیتے ہیں جن کا ہم صفحہ ۱۶ پر ذکر کر آئے ہیں

(۲)

پروفیسر الوریہ کا پہلا اصلی ماخذ معتزلہ کی کتابیں

باقی رہے سنت کے متعلق ائمہ معتزلہ کے نظریات ــــ جن کو عہد حاضر کے اس محقق نے "روشن عقل کے مالک" کے نام سے یاد کیا ہے ــــ ہم نے اپنی اس زیر نظر کتاب کے ایک باب میں معتزلہ کا تصور سنت کے عنوان سے ان نظریات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان میں سے بعض لوگ تو سرے سے سنت کے منکر ہیں اور بعض لوگ ایسی شرطوں کے ساتھ مانتے ہیں جن کا وقوع ممکن نہیں گویا یہ بھی نہیں مانتے۔

معتزلہ کے متعلق مصنف کی رائے

ہماری تحقیق ان معتزلہ کے متعلق یہ ہے کہ "سرفہرست معتزلہ خاص کر وہ لوگ جنہوں نے صحابہ کرام کو ہدف طعن و تشنیع بنایا ہے وہ تو درحقیقت ــــ خوارج کی طرح ــــ دین سے نکلے ہوئے بے دین لوگ ہیں۔ چنانچہ ان میں کا ایک شخص ثمامہ بن اشرس ــــ جو نماز کے لئے لپک کر جانے والے مسلمانوں کو دیکھ کر کہتا ہے: "گدھے ہیں گدھے" اور اس کی شعوبیت ــــ نسلی عصبیت ــــ اور عربوں سے شدید نفرت کا یہ عالم ہے کہ یہی دریدہ دہن ثمامہ بن اشرس فخر کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بکواس کرتا ہے: ذرا اس عرب (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو تو دیکھو اس نے لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا" (العیاذ باللہ) تو بھلا اس نسل پرست اوباش گستاخ شخص ــــ اور اس جیسے لوگوں ــــ سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ صحابہ کرام کے حق میں کوئی کلمہ خیر کہیں گے اور اس سنت مطہرہ کے بارے میں ان ملحدوں سے کیا توقع ہو سکتی ہے جس کی حجیت کو ائمہ حدیث اور محققین سنت نے (قطعی دلائل سے) ثابت کیا ہے

معتزلہ مسلمانوں کا وہ فرقہ ہے جن کو یونانی فلسفہ، یونانی منطق اور ان فلسفیانہ افکار و

خیالات نے جو ہندی فلسفہ ۔ ویدانت ۔ سے عربی زبان میں ترجمہ ہو کر آئے تھے، نیز فارسی ۔ زرتشتی ۔ ادب نے اسلام سے حقیقی معنی میں منحرف اور دین سے بے دین بنایا ہے اسی لئے یہ سب کے سب یا ان کی اکثریت بڑے فخر سے اپنے آپ کو نسلاً ایرانی کہتے ہیں۔

چنانچہ انھوں نے ایک طرف قرآن کریم کو یونانی فلسفہ کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی غرض سے قرآن میں جا بجا تاویلیں کر کے قرآنی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف جو حدیثیں اس اصنامی یونانی عقلیت سے متفق نہیں ہو سکتی تھیں ان کا صاف انکار کر دیا یہ تو وہ فرقہ ہے جو یونان کے فلسفیوں کو عقل کا پیغمبر مانتا ہے جن سے خطا یا غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔

یہی ہے وہ سر سخت دشمن دین و ایمان فرقہ جس کے ساتھ عام علماء اسلام کی ایک زمانہ تک ذہنی و فکری جنگ جاری رہی ہے، اور یہی ہیں وہ لوگ جن کو عہد حاضر کے استشراقی ذہن کے مالک محقق ابوریہ علماء کے نام سے یاد کرتے ہیں اور عقل صریح کا مالک قرار دیتے ہیں بلکہ ان ملحدوں کو امام مالکؒ، امام شافعیؒ امام بخاریؒ، امام مسلمؒ اور فقیہ مدینہ سعید بن مسیبؒ وغیرہم جیسے فقہاء اسلام اور ائمہ حدیث کی صف میں لاکھڑا کرتے ہیں۔

معتزلہ کی علماء اسلام سے عداوت

تاریخ اسلام سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ استاذ ابوریہ جس فرقہ کے لوگوں کو قابل ترجیح عقل کے مالک علماء" کے لقب سے یاد کرتے ہیں یہی وہ فرقہ ہے جس نے (عباسی عہد خلافت میں اپنی ریشہ دوانیوں کے ذریعہ) اسلامی حکومت ۔ عباسی سلطنت ۔ میں اقتدار اعلیٰ حاصل کر کے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے اور اس عہد کے عباسی خلفاء کو ائمہ اسلام اور علماء حق کے خلاف خوب ورغلایا اور بھڑکایا ہے تاکہ وہ انکو (اپنی حکومت کا مخالف جانکر زیادہ سے زیادہ ایذائیں اور تکلیفیں پہونچائیں دس دس بارہ بارہ سال تک جیل خانوں میں ڈال کر وحشیانہ سزائیں دیں۔

بہر حال ابن قتیبہ کی کتاب تاویل مختلف الحدیث کی مراجعت کرنے والا ہر قاری محسوس کرے گا کہ ابن قتیبہ نے اپنی کتاب میں سنت کے خلاف انہی معتزلہ کے جو اقوال بغرض تردید نقل کئے ہیں استاذ ابوریہ نے اپنی معیاری تصنیف اضواء علی السنۃ المحمدیہ میں انہی اقوال کو اگل دیا ہے اور انتہائی دیدہ دلیری سے ان کو ابن قتیبہ کی طرف منسوب کر دیا ہے

غرض ابوریہ ابن قتیبہ کی طرف منسوب کر کے جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ درحقیقت صحابہ اور محدثین کے خلاف معتزلہ کے اقوال ہیں جن کو ابن قتیبہ نے نقل کیا ہے اور پھر ان کی پرزور تردید کی ہے یہی ابن قتیبہ کی اس کتاب کا موضوع ہے۔ لیکن استاذ ابوریہ ان تمام اقوال کو ابن قتیبہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

یہ ہے "معیاری علمی تحقیق" اور یہ ہے عہد حاضر کے مغرب زدہ محققین کی علمی دیانت

⑤

استاذ ابوریہ کی علمی تحقیق کا دوسرا ماخذ شیعہ مصنفین کی کتابیں

رہا شیعہ مصنفین کی کتابوں پر پروفیسر ابوریہ کا اعتماد، تو اس سلسلہ میں ان کی تحقیقات کا تنقیدی جائزہ لینے سے پہلے میں بطور تمہید ایک حقیقت کو واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، وہ یہ ہے کہ:

صحابہ کرام کی خانہ جنگیوں کے اصلی محرکات

تاریخ اسلام میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرات معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان مسئلہ خلافت پر جو خون ریز معرکے ہوئے ہیں ان کو ہم انتہائی رنج و افسوس کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ پھر ان جنگوں کے جو دور رس نتائج برآمد ہوئے ہم آج تک ان کے اصلی محرکات کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔ اور مجھے تو اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ ابتداء میں ان فتنوں کی آگ کو بھڑکانے میں، پھر اس کے بعد اپنی مکاریوں اور دسیسہ کاریوں کے ذریعہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کے مسلمانوں کے درمیان اختلاف اور نزاع کے میدان کو وسیع سے وسیع تر بناتے ہیں، دشمنان خدا یہودیوں اور ان بیشتر مفتوح عجمی قوموں کا ہاتھ کار فرما تھا جن کے ملکوں پر اسلام اور مسلمانوں نے اقتدار اعلیٰ حاصل کیا تھا۔

اور میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کے سواد اعظم کا ــــ جو درحقیقت اہل سنت یعنے حاملین سنت ہیں ــــ معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ کے ساتھ انتہائی عدل و انصاف اور ادب و احترام پر مبنی تھا۔ اس لئے کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن عظیم

میں تعریف کی ہے اور ان سے اپنی رضامندی کا اظہار فرمایا ہے اور جو ہجرت کی اور (اسلام و مسلمانوں کی) نصرت کی سعادت وفضیلت ان کو حاصل ہے اس کو نمایاں طور پر بیان فرمایا اور سراہا ہے، لہٰذا یہ بات نہ ممکن الوقوع ہے نہ عقل میں آنے والی ہے اور نہ ہی خدا اور رسول کے دین کی عظمت وفضیلت کے شایان شان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات پاتے ہی یکدم ان مہاجرین وانصار کے اندر وہ رذائل وشنائع پیدا ہو جائیں جن کی تصویر شیعہ مصنفین اپنی کتابوں میں کھینچتے ہیں۔

صحابہ کرام کے متعلق شیعہ مصنفین کا رویّہ

یہ شیعہ حضرات ان مہاجرین وانصار اور عام صحابہ کرام کے متعلق جو کچھ اپنی کتابوں میں لکھتے اور اپنی مجلسوں میں بیان کرتے ہیں اگر آپ اس کو پڑھیں یا سنیں تو آپ یقیناً یہ کہیں گے کہ یہ لوگ ایک نبی کے صحابی تو کیا ہو سکتے ہیں یہ تو چوروں اور ڈاکوؤں کی کوئی ٹولی تھی جن کا نہ کوئی دین وایمان تھا نہ ہی کوئی سلیم انسانی فطرت اور ضمیر تھا جو ان کو جھوٹ سے، سازشوں سے، دنیا پر مرمٹنے سے اور اس کے مال ومنال اور لذائذ پر جان دینے سے، روکتا اور باز رکھتا:

لشد ما تحلبا شطریها [1]	دونوں نے (ابو بکر وعمر نے) اس (دنیا) کے دودھ سے بھرے ہوئے تھنوں کا ایک ایک قطرہ نکال لیا تھا۔

(یعنے دونوں ہاتوں سے خوب دولت سمیٹی، اور رنگ رلیاں منائیں العیاذ باللہ)

حالانکہ صحابہ کرام کی صحیح اور محقق تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ دنیا کے تمام قدیم اور جدید ادوار میں انسانیت نے جن نسلوں کو اس روئے زمین پر آج تک دیکھا اور جانا پہچانا ہے ان میں سب سے زیادہ خدا ترس، سب سے زیادہ اعلیٰ سیرت اور سب سے زیادہ شریف اخلاق وکردار کے مالک صحابہ کرام ہوئے ہیں۔

---

[1] نہج البلاغۃ کے مصنف نے اس فقرہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا ہے کہ انھوں نے شیخین رضی اللہ عنہما کے متعلق یہ کہا تھا۔

پھر مشرق سے مغرب تک اسلام انہی صحابہ کرام کی فداکاریوں سے، انہی کی بے لوث جنگ آزمائیوں سے اور اللہ کی اور اس حق کی راہ میں جس پر وہ ایمان لائے تھے اپنے گھر بار اور وطن کو قربان کر دینے سے ہی پھیلا ہے (یعنے دُنیا کی تمام قومیں انہی صحابہ کے ملکوتی اخلاق وکردار، فداکاری وجاں نثاری سے متاثر ہو کرہی اسلام کے برحق ہونے پر ایمان لائی ہیں، اور اسلام دُنیا کے چپہ چپہ پر پھیلا ہے اگر یہ حضرات بقول شیعہ چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح دنیا اور اُس کی لذتوں پر مرمٹنے اور جان دینے والے ہوتے تو دُنیا کی کوئی بھی قوم اسلام کو قبول نہ کرتی)۔

وقت کا تقاضہ

اور یہ تو کھُلی ہوئی بات ہے کہ ظاہری سطح پر مسلمانوں میں اس تفرقہ اور خانہ جنگی کا باعث اور سبب صرف یہ نزاع تھا کہ خلافت اور ریاست سلطنت کا صحیح حقدار کون ہے؟ جو نہ صرف ہمارے اس دور میں؛ بلکہ صدیوں سے مسلمان قوموں کے ہاتوں سے ایسی چھنی کہ پھر نصیب نہ ہوئی اس لئے کہ آج تو ہم دُنیا کے تمام مسلمانوں پر سامراج مسلط ہے اور سامراجی حکومتوں اور قوموں کے شکنجہ میں ہم سب گرفتار ہیں، نہ درحقیقت ہمارا کوئی ملک ہے جس کے لئے ہم آپس میں لڑیں نہ خلافت ہے جس کی خاطر ہم آپس میں جھگڑے کریں، لہٰذا اس وقت اور اس صورت حال کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اپنے آپس کے تمام اختلافات ونزاعات کو یکسر مٹا کر اپنی منتشر قوتوں کو اکٹھا کریں مختلف نظریات اور مکاتب فکر کو ایک دوسرے کے قریب لائیں اور دُنیا کے سارے مسلمانوں کو صرف اسلام کے نام پر متفق ومتحد کریں اور پچھلے نامبارک دور میں جو نزاعات واختلافات ہوئے اور ان کے نتیجہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برگزیدہ مخلصین اور صحابہ کرام کے، شریعت کے حاملین (محدثین) اور اُس کے علمبرداروں کے، خلاف ان خانہ جنگیوں کے نتیجہ میں جو جھوٹی سچی باتیں گھڑی گئی ہیں اُن پر ٹھنڈے دل سے نظر ثانی کریں۔

شیعہ سُنی اتحاد

ہمیں خوشی ہے کہ اب سُنی اور شیعہ دونوں فرقوں کے علماء نے عام مسلمانوں میں ایک دوسرے کے قریب ہونے کے ناگزیر جذبہ کو دیکھکر باہمی اتحاد کی کچھ کوششیں شروع کردی ہیں اور دونوں فرقوں کے سربراہ اپنے مکتب فکر کے سیاسی

منکرین کو صلح صفائی کی دعوت دیتے رہتے ہیں۔

چنانچہ سُنّی علماء نے تو اس مبارک مقصد کے لئے عملی کام بھی شروع کر دیا ہے اور اس راہ میں پہلا قدم یہ اُٹھایا گیا ہے کہ اُنھوں نے شیعہ فقہ کا مطالعہ اور عام مسلمانوں کے نزدیک معتبر مذاہب سے اُس کے تقابل کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ نیز اس تقابلی مطالعہ کو کالجوں میں پڑھائے جانے والے نصاب میں اور فقہ اسلامی پر لکھنے والے مولفین کے موضوعات میں شامل کر لیا ہے۔ میں خود بھی ـــ جب سے میں نے جامعہ میں پڑھانا شروع کیا ہے ـــ شخصی طور پر اپنے جامعہ کے اسباق میں اور جدید تالیفات میں اس نہج پر کام کر رہا ہوں۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ علماء شیعہ نے اس سلسلہ میں اب تک کوئی عملی قدم نہیں اُٹھایا۔ اور اپنی محفلوں اور مجلسوں میں بھی جو کچھ اُنھوں نے زبانی کام کیا ہے وہ بہت معمولی سی نرمی اور ظاہری حسن سلوک سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس اب تک ان کی اکثریت صحابہ کرام کو گالیاں دینے اور ان کے خلاف بدگمانی پھیلانے میں برابر مصروف ہے ان کے اسلاف کی کتابوں میں جو بھی روایات اور واقعات درج ہیں ان کو نہایت عقیدت مندی کے ساتھ مانتے ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض کا حال تو یہ ہے کہ اس شیعہ سُنّی اتحاد کے متعلق کہنے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں چنانچہ ایک طرف تو وہ سُنّی اور شیعہ کو ایک دوسرے سے قریب لانے کے موضوع پر بڑا جوش وخروش دکھلاتے ہیں لیکن دوسری طرف وہ ایسی کتابیں بھی شائع کرتے رہتے ہیں جو صحابہ کرام پر طعن و تشنیع سے بھری پڑی ہیں یا جن میں ایسے صحابہ کو خاص طور پر لعن طعن کا نشانہ بنایا گیا ہے جنکو جمہور اہل سنت عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ایک عبرتناک واقعہ

چنانچہ ۱۹۵۳ء میں ایک مرتبہ مجھے سید عبدالحسین شرف الدین مرحوم کے مکان پر شہر "تستر" میں ـــ جو کوہ "عامل" کی ترائی میں واقع ہے ـــ جانے اور ان سے ملاقات کرنے کا اتفاق ہوا۔ اُس وقت ان کے پاس کچھ شیعہ علماء بھی موجود تھے تو اس مجلس میں شیعہ اور سُنّی دونوں فرقوں کے درمیان اتحاد و اتفاق بڑھانے کی ضرورت پر سیر حاصل گفتگو ہوئی اور طے پایا کہ اس مقصد کے سلسلہ میں سب سے زیادہ موثر تدبیر یہ ہے کہ دونوں طرف کے علماء اور سر کردہ حضرات اسی خیر سگالی کے جذبات کے تحت ایک دوسرے سے

ملاقاتوں کا سلسلہ جاری کریں اور اپنے اپنے حلقہ میں ایسی کتابیں شائع کریں جو شیعہ سنی اتحاد کی ضرورت اور ترغیب پر مشتمل ہوں سید عبدالحسین ~~رحمہ اللہ~~ اس خیال کے بڑے پر جوش حامی اور معتقد تھے۔ چنانچہ اسی مجلس میں یہ بھی طے پایا کہ اس مقصد کے لئے سنی اور شیعہ علماء کی ایک کانفرنس بھی بلائی جائے۔ اس کے بعد میں چلا آیا اور اپنے دل میں اس اتفاقی ملاقات اور تبادلہ خیال کے جو نتائج برآمد ہوئے اُن پر اپنے دل میں بیحد خوش تھا کچھ ہی عرصہ بعد مجھے "بیروت" جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں کے سیاسی، تجارتی اور ادبی حلقوں کے سرکردہ شیعہ حضرات سے بھی ملاقاتیں ہوئیں اور اس باہمی اتحاد کے موضوع پر کافی اُمید افزا گفتگوئیں اور تبادلۂ خیال ہوا۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس خیال کو عملی شکل دینے کے لئے حالات سازگار نہ ہوسکے اور میں کوئی عملی قدم نہ اُٹھا سکا۔

بلکہ اس واقعہ کو ابھی کچھ دن ہی گذرے تھے کہ اچانک مجھے بتلایا گیا کہ موصوف سید عبدالحسین نے حال میں ہی کوئی کتاب شائع کی ہے جس میں حضرت ابو ہریرہؓ کو خوب دل کھول کر گالیاں دی گئی ہیں۔ مجھے اب تک انتہائی کوشش کے باوجود وہ کتاب تو دستیاب نہ ہوسکی اس لئے براہ راست تو اس کے پڑھنے کا موقعہ نہیں ملا ہے لیکن اُس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اُسے میں خوب اچھی طرح سمجھ گیا ہوں اس لئے کہ استاذ ابوریہ نے اس کے کچھ اقتباسات اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں اور مصنف کی بڑی تعریف کی ہے صرف اس لئے کہ اس جلیل القدر صحابی کے بارے میں مصنف کی رائے استاذ ابوریہ کے ساتھ متفق ہے۔

شیعہ حضرات کے قول و فعل میں تضاد

استاذ عبدالحسین کی بالمشافہ گفتگو میں اور ان کی اس کتاب میں، جو اس موقف (شیعہ سُنی اتحاد) سے متعلق تضاد میں نے مشاہدہ کیا اس پر مجھے بڑا تعجب ہوا اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ فریقین کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور ماضی کو بھلا دینے کے بارے میں درحقیقت کوئی دلچسپی نہیں رکھتے (اور ان کی وہ بالمشافہ گفتگو اور جوش و خروش کا اظہار تقیہ پر مبنی تھا) اور اس تجربہ کے بعد تو مجھے ان تمام شیعہ حضرات کا بھی یہی موقف نظر آتا ہے جو اس شیعہ سُنی اتحاد کے بڑے بلند بانگ دعوے کیا کرتے ہیں۔

اس لئے کہ ایک طرف تو وہ سُنّی اکثریت کے علاقوں کے دورے کر رہے ہیں "قاہرہ" میں رسالے نکال رہے ہیں اور علماء ازہر کے ایک گروہ سے اس موضوع پر مقالات اور مضامین لکھا رہے ہیں دوسری طرف اس دعوت اتحاد کا کوئی عملی ثبوت نہ علماءِ عراق کے حلقوں میں نظر آتا ہے نہ ایران وغیرہ دوسرے شیعہ ملکوں کے علماء کے حلقوں میں بلکہ عملی طور پر شیعہ مکتب فکر کے تمام پیرو علماء ہوں یا عوام اسی پر مصر نظر آتے ہیں کہ ان کی کتابوں میں صحابہ کرام کے اس باہمی نزاع کی جو جھوٹی تصویر پیش کی گئی ہے اور اُن پر جو شدید طعن و تشنیع اور بہتان تراشیاں کی گئی ہیں وہی صحیح ہیں۔

گویا ان حضرات کی جانب سے فریقین کو قریب لانے کی دعوت کا اصلی مقصد اہل سنت کو شیعہ مکتب فکر سے قریب لانا (اور شیعہ بنانا ہے) نہ کہ دونوں فرقوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا۔

ایک بہت اہم اور قابل غور بات یہ ہے کہ ہر ایسی علمی تحقیق جس کا تعلق تاریخ سنت یا مختلف اسلامی مذاہب اور مکاتب فکر سے ہو اور وہ شیعہ مکتب فکر کے نظریات سے ٹکراتی ہو، اس کے مصنف پر شیعہ علماء بڑی ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اس کے خلاف احتجاج کے لئے شیعہ سُنّی اتحاد کی آڑ لیتے ہیں مصنّف کو متعصب کہتے ہیں اور باہمی اتحاد و اتفاق کی جو کوششیں مصلحین کر رہے ہیں ان میں رکاوٹ ڈالنے کا اس پر الزام لگاتے ہیں، لیکن یہ تمام ملامت دسرزنش کرنے والے اور غصہ اتارنے والے حضرات، کسی ایسی کتاب کو جیسی مرحوم عبدالحسین شرف الدین نے لکھی ہے جس میں ایک ایسے جلیل القدر صحابی کے حق میں جس کی احادیث جمہور اہل سنت کے نزدیک معتبر ہیں ہرزہ سرائی اور طعن و تشنیع کی گئی ہے، باہمی اتحاد کی کوشش کرنے والوں کی مساعی میں رکاوٹ ڈالنے کا موجب ہرگز نہیں کہتے۔

شیعہ مصنفین کا یہ طرز عمل صرف حضرت ابوہریرہ کے خلاف لکھی ہوئی مذکورہ بالا کتاب تک ہی منحصر نہیں ہے بلکہ "عراق" و "ایران" وغیرہ شیعہ ممالک میں آئے دن ایسی کتابیں چھپتی اور شائع ہوتی رہتی ہیں جن میں حضرت عائشہ صدیقہ پر، صدیق اکبرؓ پر، عمر فاروقؓ پر اور عام صحابہ کرامؓ پر ایسی دریدہ دہنی کے ساتھ جرح و تنقید اور طعن و تشنیع کی جاتی ہے جس کو ایک

باضمیر اور سلیم الفطرت انسان سُن بھی نہیں سکتا۔

پروفیسر البوریہ کی کتاب باہمی اتحاد کیلئے سخت مضر ہے

گویا اس طرح کی کتابیں درحقیقت گزشتہ زمانہ کی تلخیوں کی یاد تازہ کرنے اور باہمی نزاع وخصومت کی آگ کو نئے سرے سے بھڑکانے کی غرض سے لکھی جاتی ہیں استاذ البوریہ کی زیر نظر کتاب اضواء علی السنۃ المحمدیہ بھی اسی قسم کی کتابوں میں سے ایک ہے۔
اس کتاب میں بھی ایک جلیل القدر صحابی کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اگر شیعہ حضرات اس کی طرف متوجہ ہو جائیں تو بلاشبہ یہ کتاب بھی نئے سرے سے دشمنی کا دروازہ کھول دینے کا سبب بن سکتی ہے ورنہ کم از کم ازسرنو نکتہ چینی اور ردّ وقدح کا سامان تو یہ کتاب ضرور ہی بہم پہنچاتی ہے اور اس قسم کی کتابیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے بارے میں شیعوں کے موقف کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ تو مذکورہ بالا کتاب ـــــ اضواء علی السنۃ میں مصنف نے جو شیعہ مصنفین کی کتابوں پر اعتماد کیا ہے اور اُن کو اپنی تحقیق کا مدار بنایا ہے اس پر جو ہم گرفت کریں گے اور حدیث کے بارے میں شیعہ مکتب فکر کے "نظریہ سنت" پر جو ہم بحث کرینگے ہماری یہ بحث وتنقید اوّلاً علمی اور تاریخی دائرہ میں رہ کر ہوگی اور یہ مُسلم ہے کہ جب علم مطالعہ اور تحقیق کے میدان میں حقائقِ تاریخ وواقعات پر گفتگو ہوا کرتی ہے تو اس میں کسی قسم کی چشم پوشی، رَوا داری اور رُورعایت نہیں برتی جاتی۔
ثانیاً یہ کہ اس بحث وتحقیق سے ہمارا مقصد اُن تاریخی غلطیوں کی نشاندہی کرنا ہوگا جن کو مصنف نے بطور ثبوت شیعہ مصنفین کی کتابوں سے پیش کیا ہے (اور یہ دونوں باتیں یقیناً شیعہ مکتب فکر کے لئے ناگوار ہوں گی اور وہ اس پر چراغ پا ہوں گے)

زیر طبع کتاب میں شیعہ تصوّرِ سنّت اور مصنف کی احتیاط کوشی

لیکن یہ حقیقت ہے کہ سنت سے متعلق شیعہ مکتب فکر کے نظریہ پر جو میں نے اس کتاب میں بحث کی ہے اس کو میں اب سے بہت پہلے لکھ چکا تھا اور درحقیقت یہ ایک علمی مقالہ تھا جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کی غرض سے علماء کے سامنے ایک علمی ادارہ میں پیش کیا گیا تھا، اُس وقت عوام کے سامنے اُسے پیش کرنا مدنظر نہ تھا۔

اس کے باوجود جو میں اس کتاب کی اشاعت کو — جسے اب طباعت کیلئے بھیج رہا ہوں۔
ایک عرصہ تک ٹالتا رہا اس کے متعدد وجوہ تھے

(۱) جن میں سے ایک وجہ یہ تھی کہ میں اس مقالہ کے ساتھ ایک تمہید کا اضافہ کرنا چاہتا تھا جس میں اس بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا تھا کہ میری نظر میں شیعہ اور سُنی مکتب فکر کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی ضرورت و اہمیت کس قدر ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ اس مقالہ کے لکھنے سے میرا مقصد شیعہ حضرات کے جذبات احساسات کو ٹھیس لگانا یا ان کی دیرینہ عداوت کی آگ کو بھڑکانا ہرگز نہیں ہے صرف اس لئے کہ میں تو ہمیشہ سے ہی باہمی میل جول کو بڑھانے اور ماضی کی تلخیوں کو مٹانے کا داعی رہا ہوں اور اب بھی ہوں۔

واقعہ یہ ہوا کہ میرے اس مقالہ کی میرے پاس ایک ہی کاپی تھی جس کو اتفاقاً ایک علمی ماہنامہ نے، اس مقالہ کی بعض تحقیقات کو شائع کرنے کی غرض سے مجھ سے لے لیا تھا جن صاحب نے اس کو مجھ سے بغرض اشاعت لیا تھا ان کو میں نے یہ بات اچھی طرح تبلادی تھی کہ اس مقالہ میں کچھ بحثیں ایسی ہیں جن کی وضاحت کے لئے میں بطور تمہید کچھ لکھنا اور اضافہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں، مگر جس زمانہ میں، میں بغرض علاج بیروت گیا ہوا تھا وہاں مجھے اچانک معلوم ہوا کہ (۱) اس رسالہ نے سُنت سے متعلق شیعہ مکتب فکر کا نظریہ شائع کر دیا (۲) اور یہ کہ شیعہ حلقوں میں اس کا اثر اچھا نہیں پڑا ہے چنانچہ بعض شیعہ رسائل نے اس پر تنقید بھی شائع کی ہے۔

اس صورت حال کی اطلاع مجھے اپنے وقت کے بڑے شاعر استاذ احمد صافی نجفی نے دی جن کی علمی فضیلت اور ادبی ذوق کا میں دل سے قدرداں ہوں تو میں نے اس سلسلہ میں اپنا نقطہ نظر اُن پر واضح کیا اور تبلایا کہ مقالہ کا یہ حصہ میرے علم میں لائے بغیر شائع کیا گیا ہے

بہر صورت میں ایک بار پھر اس طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کتاب میں جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ صرف ایک تاریخی جائزہ ہے جو ہر سنت کی تاریخ لکھنے والے، اور اس کی جمع و تدوین کے مراحل سے گذرنے والے کے لئے ناگزیر ہے۔ ایک ایسا محقق جو خود بھی اپنے علم و فن کا احترام کرتا ہو اور دوسرے علماء و محققین کے سامنے اپنا علمی کام کو لائق احترام صورت میں پیش کرنا چاہتا ہو وہ اس قسم کے تاریخی جائزہ اور نقد و تبصرہ کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتا۔ چنانچہ

اس کتاب میں صرف وہی حقائق میں نے بیان کئے ہیں جن کی علمی تحقیق (سائنٹفک ریسرچ) تائید کرتی ہے اور علمی و تحقیقی بنیادوں پر ہی وہ قائم ہیں۔

اکابر شیعہ کے متعلق مصنّف کا رویہ

اس کے باوجود میں نے اس کتاب میں کسی بھی ایسی شخصیت کی برائی نہیں کی جس کا شیعہ حضرات احترام کرتے ہوں اور اس کو عظمت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہوں حالانکہ جمہور صحابہ کرام کے ساتھ، شیعہ مصنفین کا طرز عمل اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم خود حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زبردست عقیدت و محبت رکھتے ہیں ان کی عظمت اور قدر و منزلت ہمارے دلوں میں راسخ ہے۔ اسلام اور علم و فضل کے دائرہ میں ان کا مرتبہ و مقام ہمیں خوب اچھی طرح معلوم ہے۔ اسی طرح ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ائمہ اہل بیت سے بھی ان کے شایان شان عقیدت و محبت رکھتے ہیں اور ان کے علم و فضل کا بھی کما حقہ احترام کرتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر شیعہ حضرات بھی عام صحابہ کرام اور حاملین سنت کے ساتھ ایسا ہی طرز عمل اختیار کریں جو ہم ان کے بزرگوں کے ساتھ اختیار کئے ہوئے ہیں جس کے نتیجہ میں دونوں فرقے آپس میں متفق و متحد ہو جائیں۔

شیعہ مکتب فکر کے علماء میں جو حضرات مخلصین ہیں اور دل سے اس شیعہ سُنی اتحاد کے خواہاں ہیں ان کی خدمت میں مکرر اس خیر سگالی کی دعوت کو پیش کرتا ہوں — میں جانتا ہوں، ان میں بھی بہت سے ایسے علماء ہیں جو واقعی مسلمانوں کے ان ہر دو فرقوں کو متحد کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور ہماری استدعا تو تمام دُنیا کے مسلمانوں سے یہ ہی ہے — کہ آیئے ہم سب مل کر ان ہمہ گیر عالمی مسائل کا مقابلہ کریں جن سے آج پورا عالم اسلامی دوچار ہے یعنے آج تو اسلامی ممالک میں ایسی تباہ کن تحریکیں (سوشلزم اور کمیونزم) چلائی جا رہی ہیں جو یکساں طور پر سُنی اور شیعہ دونوں فرقوں کی نئی نسل کے دلوں سے اسلامی عقائد کی جڑیں ہی کھوکھلی کر رہی ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شیعہ نوجوانوں کے دل و دماغ اُن سے بہت زیادہ متاثر ہو رہے ہیں اگر یہی صورت حال قائم رہی اور متفقہ مساعی کے ذریعہ روک تھام نہ کی گئی تو وہ نہ سُنی رہیں گے نہ شیعہ بلکہ اسلام سے بھی منحرف ہو جائیں گے۔

ہمارے بعض عرب ملکوں میں اس وقت جو واقعات پیش آ رہے ہیں وہ میرے اس خیال کی تائید کرتے ہیں۔ اس لئے میں پھر اپنی اس دعوت کو پیش کرتا ہوں کہ جلد از جلد دونوں فرقوں کو قریب

لانے اور اسلام کے نام پر متحد کرنے کے لئے ہمیں صرف زبانی باتیں نہیں بلکہ ٹھوس عملی بنیادوں پر کام کرنا چاہیئے۔

اس عملی اقدام میں سرفہرست یہ کام ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کی قدر و منزلت اور عزت و احترام پر متفق و متحد ہو جانا چاہیئے جن کے ہاتوں ہم تک یہ دین اسلام پہونچا ہے اور جن کے ذریعہ خدا نے ہمیں کفر کی تاریکیوں سے ایمان کی روشنی میں آنے کی توفیق دی ہے۔

(۶)

پروفیسر ابو ریہ کا تیسرا ماخذ، مستشرقین

عہد حاضر کے مستشرقین سے ملاقات اور اس کے تاثرات،

۱۹۵۶ء میں مجھے اتفاقاً یورپ کا سفر پیش آیا۔ اس سفر میں یورپ کی بیشتر یونیورسٹیوں میں جانے کا اتفاق بھی ہوا اور حضرات مستشرقین سے ملاقاتیں، علمی مذاکرے اور تبادلہ خیالات کا بھی خوب موقعہ ملا۔ میں اس سفر سے پہلے اپنی اسی کتاب (السنۃ ومکانتها فی التشریع الاسلامی) میں ان مستشرقین کے بارے میں کچھ لکھ چکا تھا اس سفر کے خاتمہ پر ان مستشرقین کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا تھا اس پر میرے یقین و اذعان میں کافی اضافہ ہوا اور پورے اسلامی ورثہ (اسلامی تعلیمات) پر خواہ وہ شرعی ہو خواہ ثقافتی، ان مستشرقین کی جانب سے جو مجھے خطرہ تھا اس کا یقین کامل ہو گیا اور اس کا محرک اصلی صرف یہ ہے کہ ان مستشرقین کے قلوب ایک ایسے مہلک تعصب سے لبریز ہیں جو انھیں کھائے جا رہا ہے اور یہ حضرات اسلام، عرب اور عام مسلمانوں کے خلاف حسد و بغض کی آگ میں برابر جل رہے ہیں۔

(۱) لندن یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اسلامیات پروفیسر اینڈرسن سے ملاقات:-

اس سفر میں سب سے پہلے جس مستشرق سے میری ملاقات ہوئی وہ مشہور و معروف پروفیسر اینڈرسن تھے یہ صاحب لندن یونیورسٹی کے تحت "ادارہ علوم مشرقی" میں عالم اسلامی میں رائج "پرسنل لاء" (اسلامی عائلی قوانین) سے متعلق شعبہ کے صدر ہیں۔ پروفیسر اینڈرسن نے مجھے خود بتلایا کہ وہ کیمبرج یونیورسٹی کے "کلیہ دینیات" کے فارغ التحصیل ہیں اور دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں مصر کے اندر تعینات برطانوی افواج کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے عربی زبان و ادب صرف ایک سال کی مدت میں محض ان ہفتہ وار درسی لیکچروں کے ذریعہ حاصل کیا تھا جو امریکن یونیورسٹی قاہرہ میں ازہر کے بعض علماء ہفتہ میں صرف ایک گھنٹہ دیا کرتے تھے۔ اسی طرح مذکورۃ الصدر فوجی ملازمت کے سلسلے میں مصری عوام کے ساتھ اختلاط و ارتباط کے نتیجہ میں مقامی عربی زبان سیکھ لی تھی اور احمد امین مرحوم، ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور احمد ابراہیم مرحوم جو اسلامی تعلیمات عامہ پر لیکچر دیا کرتے تھے ان کے ذریعہ آپ نے اسلامی علوم میں تخصّص کی سند (ڈاکٹری کی ڈگری) حاصل کی تھی۔ عربی زبان و ادب کی اسی "مہارت" اور اسلام پر اسی "گہرے اور عمیق تحقیق و مطالعہ" کی بدولت آپ کو "پروفیسر" کے لقب سے سرفراز کیا گیا اور اسی کے نتیجہ میں جنگ عظیم کے بعد پروفیسر اینڈرسن فوجی ملازمت سے لندن یونیورسٹی کے شعبۂ "پرسنل لا" کی کرسی صدارت پر فائز و متمکن ہوئے (یہ ہے پروفیسر موصوف کی عربی زبان و ادب اور اسلامی تعلیمات کا مبلغ علم، بقول شاعر ؎

گر ہمیں مکتب است ہمیں ملا
کار طفلاں خراب خواہد شد

میں اس وقت ان بزرگ کی اسلام دشمنی اور مسلمانوں کے خلاف ان کے بغض و تعصب کے وہ تمام نمونے اور کارنامے تو بیان کرنا نہیں چاہتا جن کا مجھ سے ڈاکٹر محمود غرابہ نے — جو اس زمانے میں لندن میں "مرکز ثقافت اسلامی" کے ڈائریکٹر تھے — بذات خود تذکرہ کیا ہے یہاں میں صرف اس واقعہ کے ذکر پر اکتفا کروں گا جو پروفیسر اینڈرسن نے خود مجھ سے بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ازہر یونیورسٹی مصر کا ایک فارغ التحصیل طالب علم لندن یونیورسٹی سے اسلامی

"قانون میں تخصص" (پی، ایچ، ڈی) کی ڈگری حاصل کرنے کی غرض سے پروفیسر موصوف کے پاس آیا۔ پروفیسر انڈرسن نے اس امیدوار کو صرف اس وجہ سے امتحان میں ناکام اور اس ڈگری کے دینے سے انکار کر دیا کہ اس نے اپنا مقالہ "اسلام میں عورت کے حقوق" کے موضوع پر پیش کیا تھا اور اس مقالہ میں اس نے دلائل و براہین سے ثابت کیا تھا کہ "اسلام نے عورت کو مکمل انسانی حقوق دیئے ہیں" پروفیسر موصوف کی زبان سے یہ واقعہ سنکر مجھے بڑا تعجب اور حیرانی ہوئی اور میں نے اُن سے عرض کیا: اتنی سی بات پر آپ نے کس طرح اس طالب علم کو ناکام اور تخصص کی ڈگری سے محروم کر دیا؟ حالانکہ آپ حضرات تو اپنی یونیورسٹیوں میں آزادی فکر اور آزادی رائے کے بڑے حامی اور علم بردار ہیں۔" انڈرسن نے جواب دیا: "یہ طالب علم یوں کہا کرتا تھا: اسلام عورت کو یہ کچھ دیتا ہے اور اسلام نے عورت کے لئے یہ کچھ تجویز کیا ہے" پروفیسر موصوف فرماتے ہیں: کیا وہ اسلام کا سرکاری نمائندہ تھا؟ کیا وہ ابو حنیفہ اور شافعی تھا؟ کہ اس قسم کے دعوے کرے اور اس طرح اسلام کا نام لے؟ دراں حالیکہ عورت کے حقوق کے بارے میں جو اس طالب علم کے نظریات تھے خود قدماء فقہاءِ اسلام نے ان کی تصریح نہیں کی تھی یقیناً یہ طالب علم خود فریبی میں مبتلا تھا جبکہ وہ یہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہ اسلام کو ابو حنیفہ اور شافعی سے بھی زیادہ سمجھتا ہے۔"

یہ ہے مستشرق موصوف (کی اسلام دشمنی) کا بیان جو اب تک زندہ و پائندہ اور سرسبز شاداب ہیں۔ مجھے علم نہیں کہ وہ اب بھی لندن یونیورسٹی میں اپنے عہدہ پر برقرار ہیں یا ریٹائر کر بیٹھ گئے؟

(۲) "ایڈنبرگ یونیورسٹی" کے صدر شعبۂ اسلامیات" سے ملاقات:-

اسکاٹ لینڈ کی "ایڈنبرگ یونیورسٹی" کے شعبۂ اسلامیات" کے صدر سے بھی اس سفر میں ملنے کا اتفاق ہوا یہ صاحب ایک پادری مستشرق ہیں جو عام شہری لباس میں رہتے ہیں تاہم انھوں نے اپنا "دینی لقب" بھی اصلی نام کے ساتھ مکان کے دروازہ پر لکھا ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ پروفیسر (عام مستشرقین کی بہ نسبت) بڑے خوش اخلاق اور خوش گفتار ثابت ہوئے لیکن بہرحال "پادری" تھے)

(۳) "گلاسکو یونیورسٹی" کے صدر شعبۂ اسلامیات" سے ملاقات:-

اسی اسکاٹ لینڈ میں گلاسکو یونیورسٹی کے عربی اور اسلامیات کے شعبہ کے صدر بھی ایک "پادری" تھے۔ یہ بزرگ فلسطین میں تقریباً بیس سال تک "عیسائی تبلیغی مشن" کے سربراہ رہ چکے تھے اسی لئے عربی بے تکان بولتے تھے۔ یہ بات خود انھوں نے اثناء ملاقات میں بتلائی ویسے اس سے بیشتر بھی میں ان سے ۱۹۴۵ء میں لبنان کے "بحمدون" نامی مقام پر "اسلامی مسیحی کانفرنس میں مل چکا تھا۔

(۴) آکسفورڈ یونیورسٹی کے صدر شعبہ "اسلامیات" سے ملاقات:-

آکسفورڈ یونیورسٹی میں شعبہ "اسلامیات و عربی زبان و ادب" کے صدر بھی ایک یہودی مستشرق ہیں جو رک رک کر بمشکل عربی بول سکتے ہیں۔ یہ صاحب اس سے قبل دوسری جنگ عظیم میں لیبیا کے اندر "برطانوی محکمہ اطلاعات" میں بھی کام کر چکے تھے اور اسی زمانہ میں یہاں رہ کر عوامی عربی زبان کچھ سیکھ لی تھی یہی آپ کی وہ صلاحیتیں (اور علمی قابلیت) ہیں جنہوں نے آپ کو اس شعبہ "عربی و اسلامیات" کی کرسی صدارت پر فائز و متمکن بنا دیا تھا۔ تعجب خیز اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مستشرق موصوف نے مشرقی علوم کے طلبہ کو پڑھانے کے لئے جو نصاب مقرر کیا ہوا تھا اس میں علامہ زمخشری کی تفسیر "کشاف" کے ساتھ قرآن حکیم کی چند آیات کی تفسیر بھی داخل تھی حالانکہ بخدا یہ صاحب خود ایک معمولی اخبار کی سیدھی سادھی عربی عبارت بھی اچھی طرح سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس نصاب میں علاوہ تفسیر کشاف کے بخاری اور مسلم کی کچھ احادیث، حنفیہ اور حنابلہ کی اُمہات کتب کے فقہی ابواب بھی داخل تھے میں نے (از راہ حیرت (و استعجاب) مستشرق موصوف سے اس نصاب کی تدریس کے ماخذوں۔ کتابوں۔ کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے خود بتلایا کہ "میں یہ نصاب گولڈ زیہر، مرجلیوث اور شاخت جیسے مستشرقین کی کتابوں کی مدد سے پڑھاتا ہوں"

ان مستشرقین نے اسلام اور مسلمان دشمنی کی بنا پر جو پُر فریب اور بظاہر خوش آیند نصاب تجویز کر رکھے ہیں انکی اصل حقیقت اور راز نہاں کو بے نقاب کرنے کے لئے ان مستشرق مصنفین کے نام ہی کافی ضمانت ہیں۔

(۵) کیمبرج یونیورسٹی کے صدر شعبہ "عربی و اسلامیات" پروفیسر آربری سے ملاقات:-

کیمرج یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے شعبہ کے صدر مشہور و معروف مستشرق پروفیسر "آربری" ہیں یہ صرف عربی زبان و ادب کے ڈاکٹر ہیں۔ اثنائے گفتگو میں اُنھوں نے آخر اس امر کا اعتراف کیا کہ "فی الحقیقت ہم مستشرقین اسلامی تحقیقات میں اکثر و بیشتر ٹھوکریں کھاتے اور غلطیاں کرتے ہیں درحقیقت ہمیں اس میدان میں قدم ہی نہ رکھنا چاہیئے کیونکہ آپ لوگ یعنے عرب مسلمان علمی تحقیقات کے اس موضوع (اسلامیات) میں ہم (مستشرقین) سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں"۔

(۶) مانچسٹر یونیورسٹی کے صدر شعبۂ "اسلامیات" پروفیسر وِلسن سے ملاقات:۔

انگلستان کے مشہور شہر مانچسٹر میں پروفیسر وِلسن سے ملنے کا اتفاق ہوا یہ اس وقت سننِ ابی داؤد کا مقابلہ ایک مخطوطہ (قلمی نسخہ) سے کر رہے تھے۔ "تاریخ حدیث" پر بھی اُنھوں نے بعض "تحقیقی مقالات" لکھے ہیں جن میں وہ اکثر و بیشتر مقامات پر انہی ناانصاف و بددیانت مستشرقین کی رائے سے متفق ہیں چنانچہ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے دلائل و براہین سے ان کے سامنے واضح کر دیا کہ زمانہ ماضی میں مستشرقین نے "اسلام و اسلامیات" کے موضوع پر جو تحقیقات کی ہیں وہ سراسر ناانصافی و بددیانتی پر مبنی ہیں حقیقت سے ان کو کوئی لگاؤ نہیں۔ اس کے بعد میں نے (بطور تمثیل) گولڈزیہر کے نظریات پر کڑی تنقید کی اور اس کی "تاریخی تحقیقی" غلطیوں کو دلائل سے ثابت کیا۔ اس کے جواب میں مستشرق موصوف یہ کہنے پر مجبور ہوئے: بلاشبہ اس عہد کے مستشرقین گولڈزیہر سے کہیں زیادہ اسلامی ماخذوں سے واقف ہیں کیونکہ آج وہ اسلامی تصنیفات و تالیفات طبع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں جن کا گولڈزیہر کے عہد میں کسی کو پتہ بھی نہ تھا"۔ اس پر میں نے مستشرق موصوف سے کہا "مجھے اُمید ہے کہ اب آپ حضرات — مستشرقین — کی علمی تحقیقات اس دور میں گولڈزیہر اور مرجلیوث اور ان جیسے مستشرقوں کی بہ نسبت زیادہ حق و انصاف پر مبنی اور دیانت سے قریب تر ہوں گی" یہ سُنکر اُنھوں نے میری تائید کی اور کہا "مجھے بھی اسی کی توقع ہے"۔

(۷) لیڈن یونیورسٹی کے صدر شعبۂ "اسلامیات" یہودی مستشرق پروفیسر شاخت سے ملاقات:۔

ہالینڈ کی لیڈن یونیورسٹی میں میری ملاقات ایک یہودی مستشرق پروفیسر شاخت سے ہوئی یہ مستشرق ہمارے اس دور میں اسلام کے خلاف دجل وفریب، دسیسہ کاری اور حقائق کو مسخ کرنے میں معروف مستشرق گولڈزیہر کے پیغام کا سب سے بڑا امتاد اور علمبردار ہے۔ ان کے ساتھ بھی کافی دیر تک بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری رہا اور میں نے ان کے سامنے خاص طور پر گولڈزیہر کی فحش اغلاط اور ہماری کتابوں سے نصوص (صریح عبارتوں) کے نقل واقتباس میں مسخ وتحریف کی نشاندہی کی، شروع میں تو مستشرق موصوف یہ سُن کر بڑے تلملائے اور بڑی شدومد سے اس تحریف کا انکار کیا لیکن جب میں نے گولڈزیہر کی کتاب "تاریخ سنت" سے ایک مثال نکال کر ان کے سامنے رکھی — جس کو میں نے اپنی اس کتاب (السنة ومكانتها في التشريع الاسلامي) میں بھی نقل کیا ہے — اور ان کو بتلایا کہ دیکھئے کس طرح گولڈزیہر نے امام زہری کے مذکورہ ذیل قول میں تحریف کی ہے۔ امام زہری کا قول تھا:

ان هؤلاء الامراء اكرهونا على كتابة "الاحاديث" — بیشک ان امراء نے ہمیں (معہود حدیثوں کے لکھنے دااملا کرانے پر مجبور کر دیا)

گولڈزیہر امام زہری کے قول کو حسب ذیل صورت میں نقل کرتا ہے:-

"ان هؤلاء الامراء اكرهونا على كتابة احاديث" — بیشک یہ امراء ہمیں حدیثیں لکھنے (یعنی وضع کرنے) پر مجبور کرتے ہیں

(دیکھئے لفظ الاحادیث سے الف لام حذف کر دینے سے معنی میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا)

اس پر تو مستشرق موصوف بہت چونکے چونکہ ہم ان کے ذاتی کتب خانے میں بیٹھے یہ گفتگو کر رہے تھے۔ اس لئے انھوں نے فوراً گولڈزیہر کی مذکورہ بالا کتاب نکال کر اسکی مراجعت کی آخر (انتہائی ندامت وخجالت کے ساتھ) اعتراف کیا "آپ صحیح کہتے ہیں واقعی گولڈزیہر نے یہاں غلطی کی ہے" اس پر میں نے ان سے کہا "کیا یہ محض ایک "غلطی" ہے؟ بہتان نہیں ہے؟" یہ سُنکر پروفیسر شاخت بھڑک اٹھے اور کہنے لگے "آپ گولڈ کے ساتھ اس قدر سوءِ ظن کیوں رکھتے ہیں"؟ اس پر میں نے گولڈزیہر کے اختراع کردہ زہری، اور

عبدالملک بن مروان کے موقف (ساز باز) پر بحث و تنقید شروع کر دی اور وہ تاریخی حقائق شاخت کے سامنے پیش کئے جن سے گولڈ کے مزعومہ نظریہ کی سراسر تردید ہوتی ہے ۔ اس مسئلہ کو میں نے اپنی کتاب (السنة ومكانتها في التشريع الاسلامی) میں پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ اس مسئلہ پر بھی کافی بحث وتمحیص اور نقد وجرح کے بعد وہ یہودی مستشرق (شاخت) بولا "بیشک یہ بھی گولڈ زیہر کی غلطی ہے" اور پھر زچ ہو کر کہنے لگا : کیا اہل علم سے غلطیاں نہیں ہوا کرتیں ؟ میں نے جواب دیا : یقیناً یہ گولڈ زیہر ایک خاص قسم کے استشراقی مکتب فکر کا موسس و بانی ہے اور اس مکتب فکر میں تشریع اسلامی کے موضوع پر تحقیق و تنقید کی بنیاد صرف تاریخی حقائق و واقعات پر رکھنے کا مدعی ہے ۔ پھر اس نے امام زہری پر بحث وتحقیق کرتے وقت اپنے اس اساسی اصول کی پابندی کیوں نہیں کی ؟ اور اس نے زہری کے بارے میں یہ فیصلہ کس طرح کر دیا کہ مسجد اقصیٰ کی فضیلت والی حدیث امام زہری نے ابن زبیر کے مقابلہ پر عبدالملک کو خوش کرنے کے لئے وضع کی تھی ؟ حالانکہ عبدالملک سے امام زہری کی ملاقات ابن زبیر کے قتل کے سات سال بعد ہوئی تھی ؟ اس پر شاخت کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا اور ہاتھ پر ہاتھ رگڑنے لگا ۔ شدید غیظ وغضب اور پریشانی وسراسیمگی کے آثار اس کے چہرہ سے عیاں تھے ۔ آخر میں نے ہی اس گفتگو اور بحث کو یہ کہہ کر ختم کیا : یقیناً اس قسم کی غلطیاں جنکو آپ غلطیاں کہتے ہیں گذشتہ صدی میں ۔ اس سے قبل کہ ہم مسلمان ان تصانیف کو ان کے مصنفین کی وفات کے بعد پڑھیں اور غلطیوں کی نشاندہی اور گرفت کریں ۔ کافی شہرت پاچکی ہیں اور تمام مستشرقین ان کو "علمی تحقیقات" سمجھکر صدیوں ایک دوسرے سے نقل کرتے چلے آئے ہیں لیکن اب تو ہم آپ حضرات مستشرقین سے امید کرتے ہیں کہ اپنی ان دیرینہ غلطیوں پر ہمارے تنقیدی تبصرے بغور تمام آپ ضرور پڑھیں گے تاکہ آپ تو اپنی زندگی میں ان اغلاط کے "حقائق علمیہ" بننے سے پہلے ان کی تصحیح کرلیں (اور اس رسوا کن دام فریب میں نہ گرفتار ہوں اور آپ کو اس طرح خجالت وندامت کا منہ نہ دیکھنا پڑے)

یاد رہے کہ یہ میں نے اس لئے کہا کہ یہ یہودی مستشرق گذشتہ دنوں قاہرہ یونیورسٹی

ہیں جو پہلے "فواد یونیورسٹی" کہلاتی تھی پر وفیسر رہ چکا ہے اور اس نے بھی "تاریخ تشریع اسلامی" کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جو ساری کی ساری اس کے پیر و مرشد گولڈزیہر کے انداز پر وسیسہ کاری اور مسخ و تحریف سے لبریز ہے۔

(۸) سوئیڈن یونیورسٹی کے صدر شعبہ اسلامیات پروفیسر نیبرج سے ملاقات:-

سوئیڈن کی اپسلا یونیورسٹی میں مستشرقین کے شیخ المشائخ پروفیسر نیبرج سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ میرا خیال ہے کہ یہی مستشرق وہ صاحب ہیں جن کی نگرانی میں عرصہ ہوا "تالیف و ترجمہ قاہرہ" نے ابن خیاط کی کتاب الانتصار کو مرتب اور شائع کرایا تھا۔ بہر صورت کوئی دیر تک ہماری گفتگو اور تبادلہ خیالات کا سلسلہ جاری رہا جو تمام تر مستشرقین کی تحقیقات و نظریات اور اسلام و تاریخ اسلام پر ان کی تصنیفات و تالیفات سے متعلق تھا۔ یہاں بھی مستشرقین کے بارے میں میری تمام تر گفتگو اور نقد و جرح کا محور گولڈزیہر ہی بنا رہا ہیں نے گولڈ کی فحش اغلاط اور حقائق و واقعات میں تحریف کی متعدد مثالیں ان کے سامنے رکھیں۔ یہ سب سنکر انھوں نے جو کچھ کہکر اپنا پیچھا چھڑایا وہ یہ ہے "بیشک پچھلی صدی میں گولڈزیہر کو کافی علمی شہرت حاصل تھی اور واقعی وہ مستشرقین کا مرجع بنا رہا ہے لیکن ہمارے اس دور میں جبکہ آپ کے ملک (مصر) سے اسلامی علوم پر کثیر تعداد میں کتابیں شائع ہو چکی ہیں اب گزشتہ صدی کیطرح کوئی بھی گولڈ کو علمی تحقیقات کا مرجع نہیں سمجھتا ہماری رائے میں گولڈزیہر کا زمانہ گزر چکا"

اس سفر کے دوران مذکورۃ الصدر یونیورسٹیوں کے علاوہ مجھے بلجیک، ڈنمارک، ناروے، فنلینڈ، جرمنی، سوئٹزرلینڈ اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں جانے کا موقع بھی ملا، اور جو مستشرقین اس وقت ان یونیورسٹیوں میں موجود تھے ان کو قریب سے دیکھنے اور مذاکرات و تبادلۂ خیالات کرنے کا بھی اتفاق ہوا۔

مستشرقین سے ملاقات اور تحریک استشراق کے عمیق مطالعہ اور مشاہدہ سے پیدا شدہ تاثرات

مستشرقین کے متعلق جو واقعات و مشاہدات میں نے اوپر بیان کئے نیز اس سفر میں جو

یادداشتیں میں نے مرتب کی ہیں ان کی روشنی میں حسب ذیل حقائق مجھ پر منکشف ہوئے ہیں۔

(۱) تقریباً تمام مستشرقین یا تو "پادری" ہیں یا "استعماری" نمائندے (ایجنٹ) یا "یہودی" ہیں الاماشاء اللہ شاید ہی کوئی اس سے مستثنیٰ ہو۔

(۲) اُن غیر استعماری یورپین ممالک میں جہاں استعمار کا تسلّط نہیں ہے مثلاً اسکنڈے نیویا وغیرہ وہاں مستشرقین کی تحریک، استعماری ملکوں کی بہ نسبت بہت کمزور اور بے ضرر ہے (بالفاظ دیگر فتنۂ استشراق کی آگ کو ہوا دینے اور بھڑکانے والے استعماری حکومتیں اور استعمار پسند قومیں ہیں)

(۳) غیر استعماری ملکوں میں عہد حاضر کے مستشرقین گولڈ زیہر اور اس کے نظریات سے ـــ اُس کے خبیث اغراض و مقاصد کی حقیقت کھل جانے کے بعد ـــ اپنی بے تعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔

(۴) تحریک استشراق اپنی عام شکل میں کلیسا سے چلتی ہے۔ اور استعماری ملکوں میں کلیسا اور وزارت خارجہ کے پہلو بہ پہلو پھولتی پھلتی اور نشو و نما پاتی ہے اور ان ہر دو اداروں کی پوری تائید و حمایت ہمیشہ اس کو حاصل رہتی ہے۔

(۵) استعماری ملک مثلاً برطانیہ، فرانس وغیرہ ہمیشہ تحریک استشراق کو تقویت پہونچانے، استحکام بخشنے اور زیادہ سے زیادہ وسعت دینے خصوصاً اسکے تقلیدی رُخ (کورانہ پیروی) کو فروغ دینے کے نہ صرف خواہاں بلکہ حریص رہتے ہیں کیونکہ یہ تحریک ہی اسلام کی عمارت کو منہدم کرنے اور مسلمانوں کی شہرت کو مسخ کرنے اور داغ دار بنانے کا کامیاب ترین حربہ ثابت ہوئی ہے چنانچہ فرانس میں بلاشیر اور ماسینیون جو ہمارے زمانے میں فرانسیسی مستشرقین کے سرخیل اور شیخ المشائخ ہیں اس وقت بھی فرانسیسی وزارت خارجہ میں "عرب اور مسلمانوں سے متعلق سیاسی امور" کے ماہرین و مشیرین کی حیثیت سے کام کرتے ہیں اور انگلستان میں بھی جیسا کہ میں اپنا مشاہدہ بیان کر چکا ہوں میں نے بچشم خود دیکھا کہ مستشرقین کی اس تحریک سرغنہ، استشراق کو لندن، آکسفورڈ، کیمبرج، اڈنبرگ، گلاسکو وغیرہ یونیورسٹیوں میں باعزت مقام حاصل ہے اور بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے

ان یونیورسٹیوں میں یہودی، استعمار پرست انگریز اور مشنری مبلغین ہی ہیں جو اس تحریک کی نگرانی و سرپرستی کرتے ہیں۔ یہ لوگ اس بات کے نہ صرف در پے بلکہ حریص ہیں کہ یورپ میں مشرقی علوم کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کے لئے خصوصاً عرب اور دیگر اسلامی ممالک کے اُن طلبہ کے لئے جو تخصُّص (پی، ایچ، ڈی) کی ڈگری حاصل کرنے آتے ہیں، اوّل نمبر پر گولڈ زیہر اور مرجلیوث کی اور اُن کے بعد شاخت کی تصانیف ہی اسلامی تحقیقات کا اصلی ماخذ اور واحد مرجع بنی رہیں (تاکہ اسلام اور اس کی تعلیمات ان کے ذہنوں میں اسی مسخ شدہ صورت میں جاگزیں ہوں جس میں یہ دشمنانِ اسلام پیش کرنا چاہتے ہیں اور اسلام اور اس کی تعلیمات کی حقیقی اور اصلی شکل و صورت سے وہ بکلی بے خبر اور نا آشنا رہیں) چنانچہ وہ کبھی کسی ایسے مقالہ پر کسی کو تخصُّص کی ڈگری دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے جس کا موضوع اسلام کے ساتھ انصاف کرنا اور ان مستشرقین کی فریب کاریوں کو بے نقاب کرنا ہو۔

مستشرقین کے بدترین تعصب کا ایک واقعہ :۔

(۱) ڈاکٹر امین مصری نے جو جامعہ ازہر کے کلیۃ اصول الدین اور قاہرہ یونیورسٹی کے کلیۃ الادب اور ادارۂ تربیت کے فارغ التحصیل ہیں ہم سے ان تمام زحمتوں اور پریشانیوں کا حال بالتفصیل بیان کیا جو اُنھیں اپنے مقالہ کے موضوع کو انتخاب کرنے کے سلسلہ میں پیش آئی تھیں وہ اس مقالہ کو انگلستان کی یونیورسٹیوں میں پیش کر کے فلسفہ میں تخصُّص (پی، ایچ، ڈی) کی ڈگری لینا چاہتے تھے

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چار سال ہوئے جب ڈاکٹر امین مصری فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے اور اس پر تخصُّص (ڈاکٹری) کی سند لینے کے لئے انگلستان گئے تھے جب وہاں پہنچکر ان کو وہاں کے نصاب بالخصوص اسلامی علوم سے متعلق درسی کتابوں خصوصاً شاخت کی تصانیف میں چھپے ہوئے دجل و فریب اور اسلام کے خلاف ظلم و ناانصافی کا علم ہوا تو یہ دیکھکر ان کا دل دہل گیا اور اُنھوں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ ان کے مقالۂ تخصُّص کا موضوع "شاخت کی تصانیف پر نقد و جرح" ہونا چاہیئے چنانچہ وہ پروفیسر انڈرسن صدر شعبہ اسلامیات کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس مقالہ

کی تیاری میں ان کا نگراں بننا منظور کر لیں لیکن اس متعصب مستشرق نے صاف لفظوں میں اس سے انکار کر دیا کہ ان کے مقالہ کا موضوع "شاخت کی تصانیف پر تنقید" کسی قیمت پر نہیں ہو سکتا۔ تاہم ڈاکٹر امین مصری نے انڈرسن کو آمادہ کرنے کی بے سود کوشش جاری رکھی۔ آخر جب وہ لندن یونیورسٹی سے مایوس ہو گئے تو کیمبرج یونیورسٹی گئے اور وہاں کے اسلامی علوم کے اساتذہ اور پروفیسروں سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں "شاخت کی تصانیف پر تنقید" کے موضوع پر مقالہ لکھنا چاہتا ہوں وہ بھی اس پر رضامند ادر آمادہ نہ ہوئے۔ ڈاکٹر امین موصوف کا خیال تھا کہ شاید آخر میں وہ ان سے اتفاق کر لیں گے لیکن انھوں نے صاف لفظوں میں کہدیا: اگر آپ تخصّص میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو شاخت پر تنقید کا خیال دماغ سے نکال دیجئے اس لئے کہ یونیورسٹی ہرگز آپ کو اس کی اجازت نہ دے گی"۔ تب ہار کر ڈاکٹر امین نے اپنا موضوع تبدیل کیا اور "محدثین کے نزدیک نقد حدیث کے معیار" پر مقالہ لکھنے کا فیصلہ کیا اس موضوع سے انھوں نے بھی اتفاق کیا۔ اور اسی موضوع پر مقالہ لکھکر وہ تخصّص، (ڈاکٹری) کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور اب دمشق یونیورسٹی کے ماتحت کلیۃ الشریعہ میں استاذ (پروفیسر) ہیں۔

مستشرقین اور خاص کر گولڈ زیہر کی تصانیف اور اس کے نظریات کے سلسلہ میں جو حقائق و واقعات میں نے بچشم خود اس سفر میں مشاہدہ کئے اور جس نتیجہ پر میں پہنچا ہوں یہ تو اس کا ایک اجمالی خاکہ ہے باقی اس کتاب (السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی) میں تو ایک مستقل باب میں نے اس موضوع پر نقد وجرح کی غرض سے علیحدہ قائم کیا ہے اور اس میں اس یہودی مستشرق کے دجل وفریب، حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش صریح اور قطعی عبارتوں میں تحریف، اپنا مطلب نکالنے کے لئے تاریخی واقعات میں قطع برید، ان ماخذوں پر اعتماد جو علم وفن کی نظر میں بے قیمت ہیں اور ان علمی ماخذوں کی تکذیب وتردید جو ہمارے ائمہ اور علماء محققین کے ہاں مسلّم ہیں وغیرہ دسائس کو پوری تحقیق وتدقیق اور دلائل وبراہین کے ساتھ بیان کیا ہے۔

افسوسناک صورتِ حال یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ عالم اسلامی کے وہ طلبہ جو اپنے اپنے ملکوں کی درس گاہوں میں عموماً انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور پھر وہ (پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے) انہی انگریزی یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں تو "اسلامیات" کے اِن طلبہ کے سامنے تخصّص کی سند (ڈاکٹریٹ کی ڈگری) حاصل کرنے کے لئے ان زہرآلود ماخذوں — کتابوں — کے علاوہ دوسرے صحیح ماخذ ہوتے ہی نہیں کہ اُن کو پڑھ کر وہ تخصّص کی سند حاصل کرسکیں اور عربی وہ جانتے نہیں (کہ حقیقت حال ان پر منکشف ہو) لامحالہ ان کے ذہنوں میں یہی راسخ ہو جاتا ہے کہ یہ دسائس ہی وہ حقائق ہیں جو خود ہمارے فقہاء و علماء کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

137

اس صورتِ حال کا علاج اس لئے وقت کی اہم ترین ضرورت کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے عرب ملکوں کی یونیورسٹیاں انگریزی زبان میں "اسلامیات" پر تخصّص کی سند (ڈاکٹریٹ کی ڈگری) دینے کے لئے مختلف علوم و فنون کے علیحدہ علیحدہ شعبے قائم کردیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ اس صورت میں عالم اسلامی کے طلبہ کی نظریں یورپ کی یونیورسٹیوں سے ہٹ کر عرب ملکوں (کی درسگاہوں) کی طرف مرکوز ہو جائیں گی اور اس طرح ہم ان استعمار پرست یہودیوں اور متعصب مستشرقین کے دسائس کے زہریلے اثرات سے عالم اسلامی کے طلبہ کو محفوظ رکھ سکیں گے (اور گمراہ ہونے سے بچا سکیں گے)

اور بھی زیادہ خطرناک صورتِ حال اس مسئلہ کا اس سے بھی زیادہ خطرناک پہلو یہ ہے کہ ان مستشرقین اور خصوصاً اس یہودی مستشرق گولڈ زیہر کی نام نہاد "تحقیقات" سے صرف غیر عربی دان طلبہ ہی نہیں بلکہ ہمارے متعدد فضلاء و مصنفین بھی جیسے ڈاکٹر احمد امین رحمہ اللہ، ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر اور استاد محمود ابوریہ بھی دھوکا کھا گئے ہیں (اور اس یہودی کے دامِ فریب میں پھنس گئے ہیں (۱) چنانچہ میں نے اپنی اسی کتاب (السنة ومکانتها فی التشریع الاسلامی) میں استاذ احمد امین کی تحقیقات پر خصوصیت کے ساتھ علیحدہ فصل میں بحث کی ہے اور ان کی وہ تمام غلطیاں واضح طور پر

بیان کی ہیں جو گولڈ زیہر پر اعتماد کا اور اس کے نظریات سے تاثر کا نتیجہ ہیں۔

دوسرا سبق آموز واقعہ

(۲) اسی طرح ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر ــــ جو آجکل لندن میں "مرکز ثقافت اسلامی" کے ڈائرکٹر ہیں ــــ کا واقعہ ہے لیکن اس سے قبل کہ میں ان کے ساتھ اپنے زمانہ تلمذ کا یہ واقعہ بیان کروں، ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کی بعض خوبیوں اور خصوصیات کا اعتراف کروں، موصوف بڑے فاضل انسان ہیں نہایت پسندیدہ اخلاق اور شگفتہ مزاج کے حامل ہیں اور جب ان پر حق واضح ہو جائے تو اس کے اعتراف میں انھیں کوئی باک نہیں ہوتا۔

۱۹۳۹ء میں جب ہم کلیۃ الشریعۃ کے شعبہ تخصص فی الفقہ والاصول وتاریخ التشریع میں ایم۔ اے کے درجہ میں پڑھتے تھے اس وقت شیخ مراغی رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں مشائخ واساتذہ ازہر کی جانب سے ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر کو ہمیں تاریخ التشریع الاسلامی پڑھانے کے لئے مقرر کیا گیا۔ موصوف اسی زمانے میں جرمنی سے تعلیم مکمل کر کے آئے تھے۔ اس سے قبل وہ کلیۃ اصول الدین کے شعبہ "تاریخ" سے فارغ التحصیل اور (مدرس وتدریس کے) مجاز ہو چکے تھے اور جیسا کہ مجھے یاد ہے جرمنی میں چار سال قیام کر کے "فلسفہ" میں تخصص کی سند (پی، ایچ، ڈی کی ڈگری) بھی لیکر آئے تھے

بہر صورت ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنا پہلا درس اس عنوان واعلان کے ساتھ شروع کیا: "میں تمہیں فقہ اسلامی کی تاریخ پڑھاؤں گا لیکن ایسے علمی اور تحقیقی طرز پر جس سے ہنوز ازہر نا آشنا ہے اور میں تمہارے سامنے اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ جامعہ ازہر میں تقریبًا چودہ سال پڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے کے باوجود بھی میں اسلام کو نہیں سمجھا تھا لیکن جرمنی میں چار سال تعلیم پانے کے بعد اب میں نے اسلام کو سمجھا ہے"۔

استاذ محترم کی اس تمہیدی تقریر پر ہم تمام طلبہ کے کان کھڑے ہو گئے اور ہم نے آپس میں فیصلہ کیا کہ ہمیں اپنے اس نو وارد استاذ کے لیکچروں کو پورے غور اور اہتمام کے ساتھ سننا چاہیئے ممکن ہے کہ انھوں نے فی الحقیقت اسلام کے متعلق ایسی نادر تحقیقات حاصل کی ہوں جن سے ازہر کے کان ہنوز نا آشنا ہیں۔ چنانچہ استاذ موصوف نے اس

تمہیدی تقریر کے بعد اپنا درس (لکچر)، سنت نبوی علیہ الصلوۃ والسلام کی تاریخ پر دینا شروع کیا مگر وہ یہ درس اپنے سامنے رکھی ہوئی ایک ضخیم کتاب سے تحت اللفظ ترجمہ کر کے دے رہے تھے۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ گولڈ زیہر کی کتاب دراسات اسلامیہ ہے اور محترم استاذ درس میں اس کی عبارتیں بعینہٖ نقل کرتے اور ان کو اس طرح پیش کرتے تھے کہ گویا وہ ان کی اپنی علمی تحقیقات ہیں۔

بہرحال ان کے درس (لیکچروں) کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا مگر جہاں جہاں ہم طلبہ پر اس کی غلطیاں ظاہر ہوتی رہیں ہم اثناء درس ہی میں ان پر تنقید اور گرفت کرتے رہے، لیکن پروفیسر موصوف اس کتاب کے مندرجات کے بارے میں گولڈ زیہر کی مخالفت کرنے اور اس کے کسی بھی نظریہ اور تحقیق کو غلط تسلیم کرنے پر کبھی تیار نہیں ہوتے تھے۔

غرض طلبہ اور پروفیسر میں یہی کش مکش کا سلسلہ جاری تھا یہاں تک کہ وہ حدیث میں امام زہریؒ کی روایات کے اور بنو امیہ کے حق میں زہری پر وضع حدیث کے اتہام پر پہنچے۔ اس پر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے امام زہریؒ کے متعلق اپنی مختصر سی معلومات کے مطابق ان سے خوب جم کر بحث و مناقشہ کیا اور ان کو بتلایا کہ امام زہریؒ سنت کے مسلم امام اور باجماع علماء حدیث وہ ثقہ ہیں اور امت کو ان پر اعتماد ہے لیکن پھر بھی وہ اپنی رائے سے نہ ہٹے۔ آخر میں نے ان سے امام زہری سے متعلق گولڈ زیہر کی پوری عبارت کے عربی ترجمہ کی درخواست کی جو خود محترم استاذ نے اپنے ہاتھ سے دو ورق میں لکھ کر مجھے دیدی اور میں نے اسی وقت سے مصر کے عام کتب خانوں میں امام زہری کی سیرت سے متعلق مستند معلومات کی، اور اس یہودی مستشرق نے جو الزامات امام زہری پر لگائے تھے ان کی حقیقت معلوم کرنے کی جستجو شروع کردی اور اس سلسلہ میں ازہر اور دارالکتب المصریہ میں "تراجم" سے متعلق کوئی مخطوطہ (قلمی نسخہ) ایسا نہ چھوڑا جس کی مراجعت نہ کی ہو اور امام زہریؒ سے متعلق اقتباسات نہ لئے ہوں۔ اس کوشش و کاوش اور تلاش و جستجو میں میرے پورے تین ماہ صرف ہو گئے روزانہ کلیۃ الشریعۃ سے درس کے بعد متصل اس کام میں لگ جاتا اور آخر شب تک مشغول رہتا۔ جب میرے پاس اس سلسلہ میں معلومات کا کافی ذخیرہ جمع ہو گیا تو میں نے ایک دن اپنے محترم استاذ ڈاکٹر عبدالنفاد سے عرض

کیا: مجھ پر یہ حقیقت مدلل طور پر واضح ہو چکی ہے کہ گولڈ زیہر نے متقدمین کی صریح عبارتوں میں کھلی ہوئی تحریف کی ہے" (اور میرے پاس اس کا مکمل ثبوت موجود ہے) اس پر انھوں نے پھر وہی کہا: "ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ مستشرقین اور خصوصیت کے ساتھ گولڈ زیہر انتہائی انصاف پسند، اہل علم ہیں نہ وہ صریح عبارتوں میں تحریف کر سکتے ہیں اور نہ حقائق میں"

تب میں نے جمعیت الھدایۃ اسلامیۃ مصر کے ہال میں —— جو قدیم سرائے عابدین کے پاس واقع ہے —— اس موضوع پر عام علماء کے مجمع میں مقالہ پڑھنے کا پختہ فیصلہ کر لیا۔ جمعیت نے اس علمی اور تحقیقی مقالہ میں شرکت کے لئے ازھر کے علماء اور طلبہ کے نام دعوت نامے جاری کر دیئے چنانچہ اس اجتماع میں اساتذہ و طلبۂ ازھر بہت بڑی تعداد میں موجود تھے ہمارے محترم پروفیسر ڈاکٹر حسن علی عبدالقادر بھی —— جن سے میں نے خصوصی طور پر اس مقالہ کو سننے کے لئے تشریف لانے اور اس پر اپنی رائے ظاہر کرنے کی استدعا کی تھی —— اس اجتماع میں تشریف فرما تھے چنانچہ حسب وعدہ موصوف نے پوری توجہ اور غور کے ساتھ اس مقالہ کو —— جو پورا کا پورا گولڈ زیہر کے امام زہری پر الزامات و اتہامات کی تردید سے متعلق تھا —— سنا۔ میں نے یہ مقالہ ان الفاظ پر ختم کیا تھا: "اس موضوع پر یہ میری قطعی رائے ہے اور امام زہری کے متعلق یہی رائے ہمارے تمام علماء اسلام کی ہے، اگر محترم ڈاکٹر عبدالقادر ہماری اس رائے سے متفق و مطمئن نہ ہوں اور اس پہ کچھ تبصرہ کرنا چاہتے ہوں تو میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں"۔ چنانچہ محترم ڈاکٹر صاحب موصوف اُٹھے اور بآواز بلند —— کہ تمام حاضرین سن سکیں —— فرمایا: "مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ میں اس سے پہلے نہیں جانتا تھا کہ زہری کون ہیں؟ یہ حقیقت مجھ پر آج کھلی ہے اور جن حقائق کا مقالہ نگار نے اظہار کیا ہے ان پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے"

اس کے بعد مجمع منتشر ہو گیا اور ہم سب جلسہ گاہ سے صدر "جمعیت" مذکور استاذ خضر حسین رحمۃ اللہ علیہ کے —— جو بعد میں جامع ازہر کے استاذ اکبر (شیخ الازھر) کے عہدہ پر بھی فائز ہوئے ہیں —— کمرے میں آئے اور ہمارے محترم استاذ ڈاکٹر صاحب موصوف نے استاذ خضر حسین رحمہ اللہ کے سامنے مجھ سے خطاب کر کے فرمایا: آپ کی اس تحقیق نے

مستشرقین کی تحقیقات میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ اور آپ مجھے اس مقالہ کی ایک کاپی (نقل) دیں تاکہ میں اسے جرمنی کے ان علمی رسائل میں شائع کراؤں جو مستشرقین کی تحقیقات کی اشاعت کا اہتمام کرتے ہیں .... اور مجھے یقین ہے کہ اس سے مستشرقین کے حلقوں میں ایک ہلچل مچ جائے گی اس عزت افزائی پر میں نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ اور موصوف کے کلمات تحسین کو ایک استاذ کی اپنے شاگرد کی مربیانہ حوصلہ افزائی تصور کیا۔

کچھ دن بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے مجھے اپنے مکان پر ملاقات کے لئے بلایا وہاں ہم نے اس بات کا متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ آئندہ موسم گرما میں گولڈ زیہر کی کتاب کا ترجمہ اور اس کی تردید دونوں مل کر لکھیں گے۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے شروع میں ہی قاہرہ میں مقیم "برطانوی فوجی ادارہ" کی جانب سے مجھے گرفتار کر لیا گیا اور میں مسلسل سات سال قاہرہ سے دور رہا (اور یہ عزم صورت تکمیل نہ اختیار کر سکا) اسی زمانے میں ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر نے اپنی معروف کتاب "نظرة عامة فی تاریخ الفقه الاسلامی" تصنیف کی اور شائع فرمائی۔ مجھے اس کتاب کی اشاعت کی اطلاع تین سال بعد ملی جبکہ دوران جنگ میں ہی مجھے اس حبس بے جا سے رہائی نصیب ہوئی۔

یہ استاذ محترم ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر کے ساتھ خادم کا ایک سبق آموز علمی واقعہ ہے۔ اور یہی واقعہ میری اس کتاب (السنة ومکانتها فی التشریع الاسلامی) کی تالیف کا محرک ہے۔ میں اس واقعہ کو بیان کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتا اسلئے کہ یہ واقعہ انصاف پسند اہل علم کے لئے بہترین سبق آموز ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے مستشرقین خصوصاً گولڈ زیہر کے بارے میں اپنی سابق رائے سے رجوع فرما لیا ہے اور گولڈ زیہر کے متعلق دیانتداری، اخلاص کے ساتھ حق جوئی اور نصوص صریح عبارتوں میں تحریف نہ کرنے کے بارے میں انھوں نے اپنی رائے اور حسن ظن کو ضرور تبدیل کر دیا ہے۔

(۳) استاذ ابوریہ میرے علم میں استشراق زدہ مصنفیں میں تیسرے شخص ہیں جنہوں نے "سنت نبوی" علیہ الصلوٰۃ والسلام کی "تاریخ" پر قلم اٹھایا ہے اور گولڈ زیہر اور دائرۃ المعارف الاسلامیۃ وغیرہ کے مصنفین کی مسموم تحقیقات سے متاثر ہیں، مجھے امید ہے کہ جو حقائق

واقعات و مشاہدات میں نے اوپر بیان کئے ہیں ان کو اور جو علمی اور تحقیقی نقد و جرح میں نے اپنی اس کتاب (السنة ومکانتها فی التشریع الاسلامی) میں خود اُن پر، احمد امین مصری پر اور مستشرقین پر کی ہے اس کو ٹھنڈے دل سے ایک جویائے حق کی طرح ضرور مطالعہ فرمائیں گے اور اس کے بعد مجھے توقع ہے کہ وہ اپنی اُن بہت سی رایوں اور "نظریات" سے ضرور رجوع فرمالیں گے جنکی بنیاد پر اُنھوں نے اپنی کتاب "اضواء علی السنة المحمدیة" تالیف کی ہے اور مجھے قوی اُمید ہے کہ انشاء اللہ وہ ضرور ایسا کریں گے۔

مستشرقین کے سلسلہ میں آخری بات مستشرقین کے متعلق آخری بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے :

صلیبی لڑائیوں کے یورپ کی سیاسی اور حربی شکستِ فاش اور رسوا کُن ناکامی پر خاتمہ کے فوراً بعد سے ہی یورپ کا ذہن و فکر دوسرے طریقوں اور ہتھکنڈوں سے اسلام اور مسلمانوں سے اس شکستِ فاش کا انتقام لینے کی تدابیر پر برابر غور کرتا رہا ہے چنانچہ ان یورپین دماغوں نے پہلا طریقہ تو (مسلمانوں کی ایمانی قوت اور دینی صلابت کو کمزور کرنے اور اسلام کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کرنے کی غرض سے) یہ اختیار کیا کہ تمام تر اسلامی عقائد و تعلیمات کو "علمی تحقیق" کے عنوان سے بحث و نظر اور جرح و تنقید کا نشانہ بنانا شروع کر دیا (اسی کا دوسرا نام "تحریک استشراق" ہے) اور اسی منتقمانہ غور و فکر کی فضا میں جو قرون وسطیٰ کے اندر تمام مسیحی حلقوں پر مسلّط تھی، یورپین اقوام کے دماغوں میں اسلامی ممالک پر طاقت و قوت اور سیاسی ہتھکنڈوں کے ذریعہ تسلّط و تغلّب اور قبضہ و اقتدار حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا (یہ دوسرا طریقہ تھا جس کا معروف نام تحریک استعمار ہے)

بدقسمتی سے یہ وہ زمانہ تھا جب تمام عالم اسلامی سیاسی، دفاعی، اقتصادی اور ثقافتی اعتبار سے تیزی کے ساتھ انحطاط و سقوط کی طرف جا رہا تھا۔ چنانچہ یورپین اقوام نے (ساز گار فضا پاکر) عالم اسلامی کے اہم ممالک و مراکز پر یکے بعد دیگرے مقاومتی حملے شروع کر دیئے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی عالم اسلامی کے اہم ممالک و مراکز پر یورپ کا سیاسی غلبہ اور قبضہ پورے طور پر ہونے بھی نہ پایا تھا کہ ان ملکوں میں (استعماری سیاست کی تقویت اور پشت پناہی کی غرض سے) "تمام تر اسلامی تعلیمات اور تاریخ اسلام پر مغربی تحقیق و تنقید (تحریک استشراق)

پوری قوت کے ساتھ بڑھنے اور (استعمار کے زیر سایہ) پھلنے پھولنے لگی چنانچہ گزشتہ صدی میں تمام اسلامی ورثہ — تصنیفات و تالیفات — پر خواہ وہ مذہبی ہو خواہ تاریخی یا ثقافتی اہل مغرب کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ (عمل جراحی) پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا (اور وہ ہر لحاظ سے خاکم بدہن اسلام کو مسخ کر چکے تھے)

مغربی تحقیق و مطالعہ کی راہ میں دو زبردست فطری رکاوٹیں

فطری طور پر مغربی تحقیق و مطالعہ کی حق و انصاف تک رسائی کی راہ میں دو زبردست قدرتی رکاوٹیں[1] حائل ہیں۔

(۱) اول متعصبانہ مذہبی تعصب، جو یورپ کے تمام سیاسی مدبرین اور فوجی قائدین کے رگ و ریشہ میں پیوست اور ہمیشہ ان کے دماغوں پر مسلط اور کارفرما رہا ہے چنانچہ پہلی جنگ عظیم میں جب متحدہ مغربی افواج بیت المقدس میں فاتحانہ داخل ہوئیں تو اس وقت "لارڈ النبی" کی زبان سے بیساختہ یہ کلمہ نکلا — جس کو بعد میں مسیحی حلقوں میں بڑی شہرت حاصل ہوئی ہے — "آج صلیبی جنگ ختم ہوئی ہے" (یعنی بیت المقدس میں مسیحی افواج کا فاتحانہ داخلہ یہ ہے صلیبی جنگ کا خاتمہ) یہ تو فوجی اعتبار سے ہے، باقی رہا مذہبی بغض و تعصب تو وہ تو ہمیشہ سے اہل مغرب کی اسلام اور اس کی تہذیب و تمدن سے متعلق اکثر و بیشتر تصانیف میں کارفرما رہا ہے اور رہے گا (وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا) یہی وجہ ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے بارے میں حق و انصاف ہمیں اکثر مغرب کے ان علماء و مفکرین اور اُدبا و مصنفین کی تصانیف میں ملتا ہے جو ان مسیحی اقوام اور یہودیوں کے مذہبی تسلط سے آزاد ہیں چنانچہ ہم اس کی ایک زندہ مثال غوستاف لوبون کی کتاب حضارۃ العرب پیش کرتے ہیں۔ اہل مغرب کی تصنیفات میں یہی وہ سب سے عظیم کتاب ہے جو اسلام اور

---

[1] اس تحلیل و تجزیہ سے ثابت ہوا کہ مستشرقین کی کوئی بھی علمی اور تحقیقی کوشش و کاوش اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں نہ آج تک ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ ان کی ہر علمی تحقیق کی تہ میں اسلام کے خلاف کوئی نہ کوئی دجل و فریب ضرور چھپا ہوتا ہے۔ اُمید ہے کہ استشراق زدہ حضرات مستشرقین کے متعلق اپنی "رائے" اور "حسن ظن" پر نظر ثانی فرمائیں گے۔ مترجم

اس کی تہذیب و تمدن کے متعلق انتہائی حق و انصاف کے ساتھ لکھی گئی ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ غستاف لوبون ایک مادہ پرست فلسفی ہے وہ کسی بھی مذہب کو نہیں مانتا دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ (مذہبی تعصب سے آزاد ہونے کی وجہ سے) اسلامی تمدن پر حق و انصاف کی نظر سے روشنی ڈالتا ہے اسی لئے اہل یورپ (اس سے جلتے ہیں اور) اپنے علمی حلقوں میں، جس قدر و منزلت کا وہ اپنے علم کی وجہ سے مستحق ہے اس نظر و احترام سے اسے نہیں دیکھتے۔

بہرحال غوستاف لوبون بلاشبہ انیسویں صدی کا، معاشرتی علوم اور تاریخ کا عظیم ترین وسیع النظر عالم ہے اس کے باوجود مغربی علماء و مفکرین خصوصاً فرانسیسی علماء صرف مذکورہ بالا وجہ (بے تعصبی) کی بنا پر لوبون کے ساتھ ناانصافی کا برتاؤ کرتے ہیں۔

(۲) دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اہل یورپ کو جس غیر معمولی مادی اور علمی طاقت و قوت اور اقتدار اعلیٰ تک رسائی میسر آگئی اس نے یورپ کے علماء و مفکرین، محققین و مورخین اور اہل قلم ادباء و شعراء کے نفوس میں حد سے زیادہ عُجب و خود پسندی اور کبر و غرور کو اس قدر راسخ کر دیا ہے کہ ان کا یہ مستقل عقیدہ بن گیا کہ مصری تہذیب کے علاوہ باقی تمام تہذیبوں کا سرچشمہ یورپین تہذیب و تمدن ہے اور اہل یورپ کی عقلیت ہی وہ دقیقہ رس عقلیت ہے جو سلامت روی کے ساتھ منطقی اسلوب پر حقائق کو سوچ سمجھ سکتی ہے۔ رہی دنیا کی دوسری قومیں خصوصاً اہل اسلام تو ان کی عقلیت نہایت بسیط اور سیدھی سادی ہے یا زیادہ صحیح لفظوں میں "جزئیاتی" ہے جیسا کہ مشہور مستشرق گب نے اپنی کتاب وجهة الاسلام میں مسلمانوں کی عقلیت کے متعلق یہی لفظ استعمال کیا ہے۔ ان (برخود غلط مفکرین) کی مراد اس تعبیر سے یہ ہے کہ اسلامی عقلیت حقائق کو جزئیات کی صورت میں ادراک کرتی ہے، حقائق کا کلی اور اصولی ادراک مسلمانوں کے بس کا نہیں۔

یورپین اقوام نے ان قوموں کی عقلیت کے متعلق یہ فیصلہ اس وقت کیا تھا جب اُن استعمار کے شکنجہ میں گرفتار قوموں پر انہوں نے تسلط حاصل کیا تھا اور ان میں مادی اور علمی کمزوری، جہالت اور زندگی کے ہر شعبہ میں پسماندگی، کو بچشم خود کارفرما دیکھا تھا۔

افسوسناک ماضی

جدید تعلیمیافتہ طبقہ کے مستشرقین کی علمی تحقیقات سے متاثر ہونے کے اسباب:۔

جب اس بیسویں صدی کے اوائل میں ہمارا (اہل مصر کا) سابقہ مغربی تہذیب وتمدن سے پڑا اور (بدقسمتی سے) یہ تہذیب ہمارے درمیان بھی پھیل گئی تو اس وقت علماء شریعت کے علاوہ باقی تمام جدید تعلیم یافتہ اور مہذب طبقہ نے اپنے اُس اسلامی ورثہ (اسلامی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن) پر — جو قدیم کتابوں میں بے ترتیبی کے ساتھ بکھرا ہوا تھا اور یورپین علمی اور تحقیقی کتابوں کی طرح منظم ومرتب نہ تھا — علمی اور تحقیقی گفتگو اور تبادلۂ خیال کے لئے اپنے سامنے کوئی ہموار راستہ بجز ان مستشرقین کی تصانیف کے نہ پایا، جنہوں نے ہماری ثقافت اور علوم وفنون کے مطالعہ میں، اور اپنے کتب خانوں میں ان کے ماخذوں کی تلاش و جستجو میں اپنی عمریں صرف کردی تھیں یہاں تک کہ بعض بعض مستشرقین ہماری ثقافت کے کسی ایک پہلو پر کتاب تصنیف کرنے میں بیس بیس سال لگے رہے ہیں اور ہمارے قدیم علماء کی کتابوں میں جو ماخذ بھی ان کے ہاتھ لگے ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔

علمی اور تحقیقی کاموں میں علماء مغرب کے اس انہماک کے ساتھ مسلسل لگے رہنے کی عادت نے جو ان کی فطرۃ ثانیہ بن گئی ہے اور خود کو کلی طور پر ایسے کاموں کے لئے فارغ کر لینے کی قدرت نے (جس کے وسائل ان کو پورے طور پر استعماری حکومتوں کی جانب سے میسر ہیں) نیز ان مذہبی اور استعماری اغراض ومقاصد نے جن کی میں نشاندہی کر چکا ہوں، ان مستشرقین کو ہماری ثقافت (علوم وفنون اور تہذیب وتمدن) کو ایسے مرتب ومنظم اسلوب پر پیش کرنے کی استطاعت بخشدی تھی جس کو دیکھ کر ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی نگاہیں خیرہ، آنکھیں چکا چوند اور عقلیں مغلوب ومسحور ہو گئیں۔ خاص کر جب انھوں نے ان مستشرقین کی تصانیف کے اور ہماری قدیم علمی کتابوں کے اسلوبوں میں مقابلہ اور موازنہ کیا تو وہ ان مستشرقین کے علم اور وسعتِ معلومات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ (اسلامی موضوعات پر) انہی مستشرقین کی تصانیف سے استفادہ کرنے اور اقتباسات لینے لگے اس اعتماد پر کہ یہ مستشرقین ہمیشہ حق بات ہی کہتے ہیں اور ہماری جن مسلّمہ اور ثابت شدہ حقائق سے انھوں

نے اختلاف کیا ہے اُن میں انہی کا فیصلہ صحیح اور انہی کی رائے صائب ہے کیونکہ یہ لوگ اپنی تحقیقات میں دقیق علمی اسلوب کے ساتھ چلتے ہیں اور کہیں اس سے انحراف نہیں کرتے یہی وہ نقطہ ہے جس سے ان مغربی علماء (مستشرقین) کی تحقیقات اور ان کی آراء و نظریات پر اعتماد کی ابتدا ہوتی ہے۔

جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی کوتاہ کاری اور اس کے وجوہ واسباب

یہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کبھی اُن اصلی اسلامی ماخذوں کی طرف رجوع اور استفادہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا جن سے خود یہ مستشرقین اور مغربی مفکرین استفادہ کرتے ہیں اس کی متعدد وجوہ ہو سکتی ہیں:۔

(۱) یا تو (استعداد اور اہلیت نہ ہونے کی وجہ سے) ہمارے اصلی ماخذوں کی طرف رجوع اور ان سے استفادہ ان کے لئے دشوار اور وقت طلب ہے۔

(۲) یا یہ حضرات علمی اور تحقیقی کاموں میں بھی عجلت پسند ہیں اور "کئے کرائے کام" کی تلاش میں رہتے ہیں۔

(۳) یا جو حقائق ہمارے علمی اور دینی حلقوں میں مسلم اور معروف ہیں ان کی مخالفت، کرنے کا شوق اور نئی تحقیقات پیش کرنے کا بھوت ان پر سوار ہے

سیاسی اور مذہبی بیداری اور ذہنی غلامی سے آزادی کا آغاز

ایک عرصہ تک ہم ان مغربی محققین اور مستشرقین کے مقابلہ میں اپنے نقص، کمزوری اور اپنے سے بے اعتمادی، کے شکار اور اس کے برعکس ان کی عظمت، برتری اور اُن کے ساتھ حسن ظن کے معتقد رہے یہاں تک کہ جب (ہمارے ملک میں) سیاسی بیداری کی تحریکیں شروع ہوئیں اور مغربی تسلط سے، سیاسی آزادی کا آغاز ہوا تو ہمیں اپنی فکری آزادی کی ضرورت کا شعور، اپنے شخصی وجود (کی عظمت) کا احساس، اپنی قومی تہذیب و تمدن اور مذہبی ورثہ (اسلامی عقائد و علوم) کی قدر و قیمت کا شعور اور اپنے دینی ورثہ۔ عقائد و تشریع اسلامی ــــ کے باب میں اب تک ان (دشمنانِ دین و ملت) مستشرقین پر اعتماد اور تکیہ کرتے رہنے پر رسوائی اور شرمندگی کا احساس، پوری شدت کے ساتھ ہمارے

اندر پیدا ہوا اور یہ بیداری اور آزادی کی لہر ہمارے تمام مذہبی وغیر مذہبی تعلیم یافتہ حلقوں میں عام طور پر پھیل گئی، تب ہم نے ان مستشرقین کی علمی تحقیقات اور اُن کے پسِ پشت ان کے ناپاک دینی تعصّب اور استعماری اغراض و مقاصد کی حقیقت بے نقاب کرنی شروع کر دی اب ہم اس آزادی فکر کی اس کوشش و کاوش کی راہ میں برابر چل رہے ہیں لیکن ابھی تک اس تحریک کی قوت اور استقلال پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا ہے اس لئے کہ سنت اللہ یہی ہے کہ (ارتقا کی منزلیں تدریجی طور پر طے کی جاتی ہیں)

خوش آئند مستقبل

ایمان افروز تمنائیں اور اُمیدیں

اس کے باوجود ہمیں کامل یقین ہے کہ ہم خدا کے حکم سے آزادی کی اس منزل پر ایک نہ ایک دن پہنچکر رہیں گے یہاں تک کہ ایک دن وہ آئے گا کہ ہماری آنے والی نسلیں اس پر تعجب کریں گی کہ ہم کتنے سادہ لوح تھے جو ان مستشرقین کے دام فریب میں اس حد تک پھنس گئے اور عنقریب وہ دن بھی آئے گا کہ ہم اہل مغرب کے ورثہ (یورپین مذاہب وعقائد اور تہذیب و تمدن) کے تنقیدی مطالعہ کی طرف متوجہ ہونگے اور ان کے مذہب وملت، علوم وفنون اور تہذیب و تمدن کو معیار تنقید پر پرکھیں گے اور وہ دن بھی کچھ دور نہیں ہے جب ہماری آنے والی نسل خود ان اہل مغرب کے وضع کردہ معیاروں کو ان کے عقائد وعلوم کے جانچنے اور پرکھنے میں استعمال کرے گی تب وہ کہیں گے: کہ ارے خود ان مستشرقین کے معتقدات وعلوم، ہمارے معتقدات وعلوم دینیہ کے مقابلے میں ــ جن کو یہ مستشرقین، ساقط و ناقابل اعتبار کہا کرتے تھے ــ کس قدر ہیچ و پوچ، لچر اور بے حقیقت ہیں۔

ذرا سوچئے کہ تنقید کے وہ علمی معیار جو مستشرقین قرآن وحدیث کے پرکھنے میں استعمال کرتے ہیں اگر مسلمان انھی معیاروں پر ان کی مقدس کتابوں اور روایتی علوم کے پرکھنے میں برتنے لگیں تو ان کے پاس ان مقدس کتابوں اور تاریخی علوم کی کچھ قدر و قیمت باقی رہے گی؟ ان کے پاس ان کے برحق ہونے کا کوئی ثبوت باقی رہے گا؟

ذرا سوچئے کہ اگر نقد وجرح کے ان علمی معیاروں کو جنہیں مستشرقین ہماری تاریخ

اور ہمارے ائمہ کے جانچنے کے لئے اپنائے پھرتے ہیں اگر مسلمان آئندہ زمانے میں اس مغربی تمدن اور اس کے مذہبی مقدسات نیز ان کے فاتحین، رؤساء، اور علماء محققین کے جانچنے پرکھنے میں استعمال کرنے لگیں تو اس کا نتیجہ جس شک وشبہ اور سوءظن کی صورت میں ظاہر ہوگا کیا وہ اس نتیجہ سے جو مستشرقین ہمارے تمدن اور اکابر تمدن کو پرکھ کر نکالتے ہیں، بدرجہا بدرجہا بدتر نہ ہوگا؟ اور کیا اس نمائشی مغربی تمدن کے بوسیدہ لباس کا تار و پود نہ بکھر جائے گا؟ اس معیار پر جرح وتنقید کے بعد کیا اس (یورپین) تہذیب وتمدن کے حامیوں، علمبرداروں، اور علماء ومفکرین، ادبا وشعراء اور سیاسی مدبرین کے چہروں کے رنگ فق نہ ہو جائیں گے؟ نہ ان کے پاس کوئی مذہبی تقدس نظر آئے گا (نہ سیاسی تدبر) اور نہ اخلاق نہ ضمیر۔

مقالہ نگار کی ایک تمنا اور مستشرقین کے منہ میں لگام ڈالنے کی تدبیر

بسا اوقات میرا جی چاہا کرتا ہے کہ کاش، ہم میں سے کچھ اہل علم حضرات اس یورپین تہذیب وتمدن اور اس کے علماء ومفکرین کی تاریخ اسی انداز و اسلوب پر لکھنے کے لئے خود کو فارغ کر لیتے جس اسلوب پر یہ مستشرقین لکھتے ہیں اور وہ انداز و اسلوب یہ ہو کہ:۔

(۱) ہر گری پڑی روایت کی تلاش وجستجو میں رہنا۔

(۲) صریح اور قطعی عبارتوں کو غلط معنی پہنانا۔

(۳) خوبیوں کو برائیوں کے قالب میں ڈھالنا۔

(۴) جو بھی خیر وخوبی ان اہل مغرب سے ظہور میں آئی ہو اس میں شک وشبہ پیدا کرنا۔

اگر میری یہ آرزو کبھی پوری ہو جائے تو یقیناً یہ مغربی تہذیب وتمدن اور اس کے سربرآوردہ رجال کار ایک ایسی مضحکہ خیز صورت اور ذلت آمیز شکل میں منظر عام پر آئیں کہ غیروں سے پہلے خود یہ مستشرقین اس کو مکروہ سمجھیں گے آپ کے خیال میں ہم میں سے کوئی اس بار گراں کو اٹھانے کے لئے تیار ہوگا یعنی اہل یورپ جن تنقیدی معیاروں کا جس اسلوب سے استعمال کیا کرتے ہیں ـــ جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ـــ انہی تنقیدی معیاروں کو

اُسی انداز سے خود ان کی، ان کے معتقدات کی، ان کے تہذیب و تمدن کی تصویر کشی کے لئے استعمال کرنے کی ذمہ داری لے؟ تاکہ یہ مستشرقین بچشم خود اس تصویر کو دیکھیں مطالعہ کریں اور اس کے بعد محسوس کریں کہ یہ طریقۂ جرح و تنقید جس سے وہ ہماری تاریخ و تمدن ہمارے دین و مذہب کی "حقیقت" معلوم کرنے کے لئے استعمال کرنے کے مدعی ہیں وہ کس طرح خود ان کے لئے وبالِ جان و ایمان بن گیا۔ تب جاکر ممکن ہے کہ یہ مستشرقین اس مسخ و تحریف کرنے، ناواقف لوگوں کو گمراہ کرنے اور کسی تہذیب و تمدن کی عمارت کو مسمار کرنے کے ذلیل اور کمینے مشاغل کے سلسلے کو مزید جاری رکھنے میں کچھ شرم و عار محسوس کریں۔

اب وقت آگیا

بہرحال میرا عقیدہ ہے کہ اب وہ زمانہ گیا جب ہم اپنے علوم اور تاریخ کے جاننے کے لئے ان مستشرقین کے ماخذوں (کتابوں) پر اعتماد کیا کرتے تھے حالانکہ اُن کے ماخذ خود ہماری کتابوں اور تصنیفوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں۔ اور اگر اس سے پہلے ہمیں ان ماخذوں کا علم نہ تھا تو بخدا اب تو وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی پیتیاتیوں سے اپنے ماخذوں سے جہالت کے رُسواکن داغ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹا ڈالیں اور اُن ماخذوں سے استفادہ کرنے میں، ہماری زبان و ادب سے ناآشنا ان اجنبیوں یعنی مستشرقین پر بھروسہ کرنے کے عار کو اپنے دامن سے ہمیشہ کے لئے دھو ڈالیں اور یہ دشمن دین و ایمان متعصب مستشرق ہمارے دین و علماء دین کے متعلق جو شک و شبہ اور سوءِ ظن رکھنے کی ہم سے توقع کرتے ہیں اس بداعتقادی کے رُسواکن عیب و عار کو اپنے سے دور کردیں اور ان کی توقعات کو خاک میں ملا دیں۔ بخدا اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس علمی کارنامہ کو انجام دیں، اس لئے کہ اب ہم نے شک و شبہ اور سوءِ ظن کے گرد و غبار میں دبے ہوئے اپنے علمی خزانوں کو اس گرد و غبار سے پاک و صاف کرکے علمی دُنیا کے سامنے بکھیر دیا ہے اور باعزت بیداری، شخصی خوداعتمادی اور عزت نفس کے احساس و شعور سے ہمارے قلوب لبریز و سرشار ہیں۔

اور اگر اس کے بعد بھی کسی کو ان مستشرقین کے علم و فہم اور ہمارے علوم کے متعلق،

اُن کی رائے کے ساتھ حُسن ظن باقی ہے تو اس کو چاہیئے کہ وہ اس کتاب (السنة ومكانتها فی التشریع الاسلامی) یا اور اسی قسم کی دوسری کتابوں کا ــــ جو ان مستشرقین کی دسیسہ کاریوں کا پردہ چاک کر رہی ہیں ــــ بغور تمام مطالعہ کرے تو اس مطالعہ سے ان مستشرقین کی اصلی صورت، اور اُس کے برعکس اِن کی وہ مصنوعی صورت جس میں یہ خود کو پیش کرتے ہیں، دونوں کھل کر سامنے آجائیں گی۔

ایک شبہ کا ازالہ

واضح رہے کہ اگر ایک طرف ہم گولڈ زیہر جیسے محرفین اور گمراہ کُن شخصیتوں کے ساتھ شدت اور سختی کا برتاؤ کرتے ہیں تو دوسری طرف ہم ان انصاف پسند مصنفین کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے بلکہ سراہتے ہیں، جنہوں نے ہماری قدیم کتابوں کی نفیس حقائق ومعلومات کو ہو بہو شائع کیا ہے اور مسلسل "حق وحقیقت" کی تلاش وجستجو میں لگا رہنا ان کی پسندیدہ عادت بن گئی ہے اس لئے کہ "علم" کسی خاص قوم کی جاگیر نہیں ہے اور "اسلام" تو اللہ کا دین ہے اور تمام عالم کے لئے ہے، یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی قوم اس کی فہم وبصیرت کو اپنے لئے مخصوص (ریزرو) کرلے بلکہ اس کو جو چاہے اور جس طرح چاہے سمجھے اور استفادہ کرے شرط صرف یہ ہے کہ وہ "علما" کی صفات کا حامل ہو یعنی انصاف پسند ہو حق کی تلاش میں نیک نیت ہو اور تعصب وہوائے نفس سے اس کا ضمیر پاک ہو۔

خاتمہ کلام اور غستاف لبولون کا منصفانہ بیان

آخر میں، مستشرقین سے متعلق اس بحث کو میں محقق غستاف لوبون کے حقیقت افروز بیان پر ختم کرتا ہوں اس بیان میں موصوف نے ہمارے ورثہ (اسلامی علوم اور تہذیب وتمدن) کے متعلق علماء مغرب (مستشرقین) کی ناانصافیوں کے اور ہمارے تمدن کی برتری سے اُن کے انکار کے حقیقی اسباب کا تجزیہ کیا ہے۔

علامہ غوستاف لوبون اپنی کتاب حضارۃ العرب میں، اسلامی تمدّن کی مغرب (یورپ) پر اثر اندازی اور جدید مغربی تمدّن کی نشو ونما میں اس کی کارفرمائی کو دلائل وبراہین سے ثابت کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"یہ تمام دلائل پڑھنے کے بعد ایک قاری یہ سوال کرتا ہے کہ دورِ حاضر کے علما اور محققین جو بظاہر آزادئ فکر اور آزادئ رائے کو ہر دینی اور مذہبی معیار سے بڑھکر رہنما اصول قرار دیتے ہیں، عرب تمدن کے ان اثرات کا کیوں انکار کرتے ہیں؟ یہ سوال جو میں خود بھی کبھی کبھی اپنے دل سے کیا کرتا ہوں، اس کا جواب میرے پاس صرف ایک ہی ہے (اور وہی اس سوال کا آخری اور حقیقی جواب ہے) اور وہ یہ ہے کہ ہماری ذہنی اور فکری آزادی درحقیقت صرف بعض ظاہری چیزوں تک محدود و منحصر ہے اور بعض موضوعات (مباحث) میں تو ہم یقیناً اپنے دعوے کے برعکس ذہنی اور فکری طور پر قطعاً آزاد نہیں ہیں۔

اس لئے کہ ہر انسان کی ہمارے نزدیک دو شخصیتیں ہوتی ہیں ایک "عصری شخصیت" جس کو مخصوص طرزِ تعلیم اور مخصوص اخلاقی اور ثقافتی ماحول نے جنم دیا ہے دوسری وہ قدیم اور "لاشعوری شخصیت" جو غیر محسوس طریق پر اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں پر جمی ہوئی ہے اور پتھر کی لکیر کی طرح انمٹ ہے — اس لئے کہ وہ ماضئ بعید اور زمانہائے دراز کی پیداوار ہے۔ یہی اور صرف یہی لاشعوری شخصیت ہے جو اکثر و بیشتر انسانوں کے اندر سے بولتی ہے اور "ضمیر کی آواز" کہلاتی ہے اور یہی لاشعوری شخصیت ان کے قلوب میں مختلف ناموں سے "معتقدات" کو برقرار و پائیدار رکھتی ہے اور یہی شخصیت اُن تمام افکار و آراء کا ان پر القا کرتی رہتی ہے۔ یہی آراء و نظریات ہوتے ہیں جو صرف ظاہر میں آزاد نظر آتے ہیں اسی لئے ان کا احترام کیا جاتا ہے

حق یہ ہے کہ یورپ چند صدی تک برابر جن کو اپنا سب سے بڑا خوفناک دشمن سمجھتا رہا ہے وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیرو ہیں۔ اس لئے کہ جیسے وہ ہم (اہل یورپ) کو اپنے جنگی اسلحہ سے خوفزدہ کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ شارل مارتل اور صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں ہو چکا ہے —— یا قسطنطنیہ کی فتح کے بعد (تمام یورپ کو فتح کر لینے کی) دھمکیاں دیا کرتے تھے

اسی طرح وہ اپنے دوسری تہذیبوں کو متاثر کرنے والے اسلامی تمدن کی عظمت و برتری کو جتلا کر ہم (اہل یورپ) کو ذلیل و خوار سمجھی کیا کرتے تھے۔ ہم ان کے اس مادی و روحانی تغلب و تسلط سے ابھی کل ہی تو آزاد ہوئے ہیں (اتنی جلدی اس عداوت اور دشمنی کو کیسے بھول سکتے ہیں)

غرض اسی طرح مسلسل کئی صدیوں تک اسلام اور مسلمانوں کے خلاف (عداوت اور دشمنی کے) موروثی اوہام و خیالات کی تہ پر تہ جمتی رہی ہے اسی لئے وہ ہمارے قومی مزاج کا جزو لاینفک اور طبیعت ثانیہ بن گئی ہے اور ہماری فطرت میں ایسی ہی راسخ ہوگئی ہے جیسے یہودیوں کی فطرت میں نصرانیوں کی عداوت و کینہ، جو کبھی چھپ تو جاتا ہے لیکن اس کی گہرائی اور پائیداری میں مطلق فرق نہیں آتا۔

پھر جب ہم مسلمانوں کے خلاف اپنے موروثی اوہام و خیالات میں ایک اور موروثی وہم کا اضافہ کر لیتے ہیں جو صدیاں گذرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے مکاتب فکر و نظر کی اس قابل نفرت کی کارفرمائی سے برابر بڑھتا رہا ہے جو ہمیں بتلاتی ہے کہ قدیم گزشتہ زمانے میں صرف یونان اور لاطین (ایتالیہ) علوم و آداب کا واحد سرچشمہ تھے اور بس، تو اس تجزیہ کے بعد ہم بآسانی اس حقیقت کا راز پاسکیں گے کہ یورپ کے تمدن کی تاریخ پر عربوں کے عظیم الشان اثرات کا عام طور پر ہم (یورپین اقوام) کیوں انکار کرتے ہیں؟ حتیٰ کہ بعض فضلاء مغرب تو اس تصور کو بھی اپنے لئے موجب ننگ و عار محسوس کرتے ہیں کہ مسیحی یورپ اپنے تاریک دور توحش سے نجات حاصل کرنے میں ان "کافروں" کا (یعنی مسلمانوں کا اس لئے کہ اہل مغرب مسلمانوں کو اسی لقب سے یاد کرتے ہیں) کس قدر ممنون احسان ہے تو بھلا ایسا کھلا ہوا عار تو مشکل ہی سے (یورپین اقوام کے لئے) قابل قبول ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد لوبون اپنی اسی کتاب (حضارۃ العرب) کے حاشیہ میں اسی بحث کے سلسلہ

سے تو سیو رنیان کی ایک تقریر[۵] کا ذکر کرتا ہے جو رنیاں نے اسلام کے موضوع پر "سوربون" میں کی تھی اور اس کو بو لون بطور مثال پیش کرتا ہے کہ دیکھئے ایک فاضل محقق کے ذہن میں بھی یہ بے حقیقت موروثی اوہام وخیالات باطلہ کس طرح ثقافت کے ساتھ گھل مل گئے ہیں اور اس کے دماغ میں ایسی ہلچل مچا رکھی ہے کہ وہ بہت سے تاریخی امور کے متعلق فیصلہ کرنے میں پریشان ومضطرب نظر آتا ہے یعنی وہ ایک طرف تو چھ سو سال تک علوم وفنون کے عربوں کے زیر سرپرستی منازل ارتقا طے کرنے کا اعتراف کرتا ہے لیکن دوسری طرف یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اسلام نے سائنس وفلسفہ پر انتہائی ظلم کیا ہے اور اپنے مفتوحہ ممالک میں فلسفہ کا بالکل گلا گھونٹ دیا۔ فاضل ریناں کی اس تقریر میں جو اس نے مذکورہ ذیل الفاظ پر ختم کی ہے۔ اسی قسم کے اور بھی بہت سے تضاد پائے جاتے ہیں وہ الفاظ یہ ہیں:

"ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں کسی مسجد میں خوف سے لرزتا، کپکپاتا داخل نہ ہوا ہوں یا میں نے اپنے دل میں اس پر حسرت نہ محسوس کی ہو کہ میں مسلمان نہیں ہوں"۔[۶]

(۷)

پروفیسر ابوریہ کی کتاب کا چوتھا ماخذ قصے کہانیوں کی ادبی کتابیں

رہے وہ قصے کہانیاں جن کو پروفیسر ابوریہ نے بعض ادب کی کتابوں سے نقل کیا ہے تو ان کا تو وجود ہی اس "علمی تحقیق" — سائنٹیفک ریسرچ — میں جس کا انہیں دعویٰ ہے ہمارے لئے سب سے زیادہ تعجب خیز ہے (کجا قصے کہانیاں کجا علمی تحقیق)۔

عجیب بات یہ ہے کہ پروفیسر موصوف ان تمام علمی حقائق کو تو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں جن کو محتاط ائمہ حدیث، ائمہ فقہ اور ائمہ مجتہدین نے اپنی محققانہ تصنیفات وتالیفات میں روایت کیا ہے

---

[۵] یہ وہ تقریر ہے جس کی مفتی محمد عبدہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی زمانے میں مشہور ومعروف تردید کی ہے۔

[۶] حضارۃ العرب ترجمہ پروفیسر عادل زعیتر رحمہ اللہ ص ۶۸۸ تا ۶۹۰ دوسرا ایڈیشن۔

صرف اس لئے کہ وہ حقائق ان کے دل کو نہیں لگتے ، اور ان کے بجائے وہ ایسی کتابوں کا رُخ کرتے ہیں جو رجال ـــ حدیث کے راویوں ـــ کی تاریخ کو منضبط کرنے کے لئے نہیں لکھی گئیں اور نہ ہی ان کی تصنیف کا مقصد رُوات حدیث کی سیرت ، اور حالات زندگی کو بیان کرنا تھا بلکہ وہ کتابیں تو صرف اس لئے تالیف کی گئی تھیں کہ ایسے عجیب وغریب واقعات ، قصے اور کہانیاں یکجا جمع کر دی جائیں جن کو لوگ اپنی مجلسوں میں سُنا کر مزے لیں اور دل بہلائیں۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ تو اپنی خواہشات ، رجحانات اور خیالات و اذواق کے مطابق ان کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ لُطف اندوز ہوں ایسی کتابوں کو محقق موصوف سامنے رکھتے ہیں اور ان قصوں کہانیوں سے ایسے اہم دعووں کے لئے دلائل و شواہد اخذ کرتے ہیں کہ اگر وہ صحیح ثابت ہو جائیں تو سنت کا وجود ہی سرے سے ختم ہو جائے۔

گولڈ تسیہر کی سُنّت

کیا علمی تحقیق ـــ سائنٹیفک ریسرچ ـــ کا یہی طریق کار ہے ؟ ہاں یہ یہودی مستشرق گولڈ تسیہر کی سنت ضرور ہے جو موطا مالک کی روایتوں کی تو تکذیب کرتا ہے اور دَمیری کی کتاب حیٰوۃ الحیوان میں جو کچھ لکھا ہے اس کی تائید کرتا ہے۔

ہمارے علماء کے نزدیک ـــ جو ابوریہ کی تحقیق کے مطابق محققین کے زمرہ سے خارج ہیں ـــ تو یہ مُسلم ہے کہ حدیث کا علم فقہ کی کتابوں سے اخذ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح تفسیر کا علم لغت کی کتابوں سے نہیں اخذ کیا جا سکتا کیونکہ ہر علم کے اپنے اپنے ماخذ الگ ہوتے ہیں جن سے اس علم کے حقائق و مسائل کا پتہ چلتا ہے

جدید فن تاریخ میں بھی یہ بات مانی جاتی ہے کہ تاریخ کے حقائق و واقعات صرف ایسی تاریخی کتابوں سے لئے جائیں گے جو ثابت شُدہ اور قابل اعتماد ہیں جو شخص ایسے ماخذوں سے تاریخی واقعات اخذ کرے گا جو قابل اعتبار و اعتماد نہیں ہیں اس کی تحقیق کی کوئی علمی قدر و قیمت نہیں ہوگی اور نہ ہی جو مصنف یہ رویہ اختیار کرے گا ، قابل احترام علماء اور محققین کے نظروں میں اس کا کوئی مقام و احترام ہوگا۔

اب آپ ہی بتلائیے ہم محقق موصوف پروفیسر ابوریہ کے بارے میں کیا کہیں جو

انتہائی اہم موضوع ــــ حفاظت حدیث ــــ پر قلم اُٹھانے چلے ہیں اور ایک ایسے شخص کو گرانا چاہتے ہیں جس کا مقام سنت کی تاریخ میں چودہ سو سال سے مُسلم ہے اور لاکھوں انسانوں کی نظروں میں صحابہ کے عہد سے لیکر ہمارے زمانہ تک انتہائی عزت، اعتماد اور احترام کا مالک رہا ہے

اور پروفیسر ابوریہ اپنی اس انتہائی اہم تحقیق اور نئی دریافت میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جلیل القدر صحابی پر اس عظیم یورش میں، اعتماد کرتے ہیں اور ثبوت پیش کرتے ہیں ثعالبی کی کتاب ثمار القلوب سے، بدیع الزماں ہمدانی کی مقامات سے، اسی طرح وہ ابونعیم اصبہانی کی کتاب حلیۃ الاولیاء کی گری پڑی سندوں والی روایتوں پر بھروسہ کرتے ہیں اور اپنی "علمی تحقیق" کے لئے اُن سے ثبوت مہیا کرتے ہیں. حالانکہ ابونعیم نے یہ کتاب ــ حلیۃ الاولیاء ــــ مسلمان صوفیاء اور زہد و تقویٰ کا میلان رکھنے والے عبّاد و زہّاد کے لئے لکھی ہے اس کتاب میں صحیح، سند والی روایتیں بھی ہیں اور غیر صحیح سند والی بھی ــــ حلیۃ الاولیاء کے مصنف رحمہ اللہ نے یہ دعویٰ کہیں نہیں کیا کہ اُنھوں نے اس کتاب کو اس لئے تصنیف کیا ہے کہ رجال حدیث کی تاریخ کے لئے اس کتاب سے استفادہ کیا جائے. جن حضرات نے اس کتاب حلیۃ الاولیاء کو پڑھا ہے اور اس کی سندوں کی چھان بین کی ہے وہ جانتے ہیں کہ ہم نے اس کتاب اور اس کی سندوں کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

پروفیسر ابوریہ کی اس حرکت کے متعلق ہم اس کے سوا اور کیا کہیں کہ اگر اُنھیں اس کا علم تھا کہ اس قسم کی کتاب کی روایات پر اعتماد کرنا علمی تحقیق سے ناآشنا لوگوں کا فعل ہے تب تو اُنھوں نے خود ہی اپنا مقام علمی تحقیق سے ناآشنا مصنفین کے زمرہ میں تجویز کر دیا اور اگر ان کو اس کا علم نہ تھا تو اُنھوں نے خود ہی اپنی اس علمی تحقیق کی قدر و قیمت کا فیصلہ کر دیا جو اس ایک ہزار سال کے طویل عرصہ میں کسی مصنف کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئی۔

یہ ہے ان ماخذوں ــــ تصانیف و نظریات ــــ کی حقیقت جن کے ذریعہ محقق عصر پروفیسر ابوریہ نے جمہور علماء و محدثین کی ہزار سالہ تحقیق سنت کے برعکس سنت کے متعلق اپنی تحقیق بلکہ نئی دریافت کے لئے ثبوت فراہم کیا ہے۔

باقی جن لائق اعتماد ماخذوں — کتابوں — کا انھوں نے اپنی شمار فہرستِ کتب حوالہ میں ذکر کیا ہے ان کے متعلق ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ان کتابوں کی عبارتوں میں موصوف نے تحریف اور قطع برید سے کام لیا ہے یا ان کو بے محل استعمال کیا ہے اور ان کو وہ معنی پہنائے ہیں جو ان کے لکھنے والوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آئے ہوں گے۔ عصر حاضر کا یہ وہ علمی کمال ہے جس پر شیطان بھی رشک نہیں کر سکتا۔ اور یہ وہ خصلت ہے جس کے مالک مصنف کی ہرگز تعریف نہیں کی جا سکتی۔

اس سلسلہ میں کم سے کم جو کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ پروفیسر ابوریہ نے — اصولِ حدیث کی اصطلاح کے مطابق — اپنے پڑھنے والوں کے لئے تدلیس (دھوکہ دہی) سے کام لیا ہے اور خود مصنف کا دعویٰ ہے — جسے انھوں نے امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے — کہ جس شخص نے ایک دفعہ بھی تدلیس کی ہو اس کی کوئی بات بھی نہیں مانی جاتی اور اعتماد اٹھ جاتا ہے۔

(۸)

پروفیسر ابوریہ کی "تحقیق سنت" سے برآمد شدہ نتائج

اور ان کا تنقیدی جائزہ

آخر میں پروفیسر ابوریہ کی تحقیق سنت سے جو نتائج نکلتے ہیں ان کا خلاصہ اور اس پر اپنی رائے ذیل میں درج کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

(۱) اول یہ کہ پروفیسر ابوریہ کی تحقیق کے مطابق سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مدون نہیں ہوئی، ان کی رائے میں اس کا سبب یہ تھا — جیسا کہ جمہور علماء کا خیال ہے — کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اس کی ممانعت فرما دی تھی۔ یہاں تک تو مصنف جدید و قدیم جمہور محققین کے ساتھ ہیں۔

(۲) دوم یہ کہ مصنف کی رائے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سنت کا مدون نہ ہونا ہی مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان اختلاف پیدا ہونے کا سبب بنا اور اسی کوتاہی نے حدیث میں جھوٹ بولنے اور حدیثیں گھڑنے کا دروازہ کھول دیا جس

سے سب سے بڑا نقصان یہ پہونچا کہ واقعی اور حقیقی سنت ضائع ہو گئی۔

اس تحقیق سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مصنف کے زعم کے مطابق گویا ان دونوں دینی مضرتوں کی ذمہ داری — العیاذ باللہ — نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس پہ عائد ہوتی ہے اور لازمی طور پر اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ اگر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو اتنی سوجھ بوجھ بھی ہوتی جتنی استاذ ابوریہ کو اپنی اس علمی تحقیق میں حاصل ہے تو دین کو یہ نقصان نہ پہونچتے۔

میں نہیں کہہ سکتا پروفیسر ابوریہ اپنی علمی تحقیق کے اس ناگوار ترین نتیجہ کو پسند کریں گے کہ نہیں؟ میرے خیال میں تو ایک ادنیٰ مسلمان کو بھی جو خدا پر، روز قیامت پر اور اس کے رسول معصوم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہو اس کی خودرائی اور خودسری اس حد تک نہیں لے جاسکتی۔

ہم زیادہ سے زیادہ مصنف کی طرف سے معذرت یہ کر سکتے ہیں کہ "لازم مذہب نہیں ہوتا" یعنے کسی شخص کے مسلک پہ لازمی نتیجہ کے طور پر جو امر مرتب ہو اس امر کو اس شخص کا مسلک نہیں کہا جاتا۔ جیسا کہ ہمارے علماء کلام رحمہم اللہ نے فرمایا ہے۔ بالفاظ دیگر مصنف کی طرف سے صفائی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ ان کی تحقیق سے جو قبیح — ملحدانہ — نتیجے نکلتے ہیں وہ ان کا اعتقاد نہ رکھتے ہوں۔

(۳) مصنف کی تحقیق علمی کا حاصل یہ ہے کہ صحیح احادیث اگرچہ وہ مصنف کے معیار کے مطابق صحیح بھی ہوں تب بھی وہ عام اور مُسلّم دین کا مصداق نہیں ہیں جس کا اتباع تمام مسلمانوں پر لازم ہو اس لئے کہ عام اور مُسلّم دین تو وہ ہے جو قرآن عظیم سے ثابت ہے اس لئے کہ قرآن عظیم متواتر ہے یا پھر وہ امور جو عملی سنت — عملی توارث — سے ثابت ہوں کیونکہ ایسی عملی سنت — فعلی حدیثیں — عملی توارث کی وجہ سے متواتر بن جاتی ہیں۔

باقی عملی سنت کے ماسوا یعنے سنت قولیہ — قولی احادیث — پر عمل کرنا تمام مسلمانوں پر ضروری اور لازم نہیں ہے بلکہ ہر مسلمان کو اختیار ہے کہ اس قسم کی احادیث میں سے جو چاہے لے لے اور جو چاہے چھوڑ دے اس لئے کہ ان احادیث کو ترک کر دینا موجب کفر نہیں ہے اور جس چیز کی حقیقت یہ ہو اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کی ہر مسلمان کے لئے گنجائش ہے۔

اس کے علاوہ کہ مصنف کی تحقیق کا یہ خطرناک حاصل اور نتیجہ کتاب اللہ۔ قرآن عظیم کے مریح مخالف اور اسلامی شریعت کے کل ورثہ۔ احکام شرعیہ۔ کا خاتمہ کر دینے کے مرادف ہے، یوں بھی یہ نظریہ تو اسلامی عقائد اور اسلامی شریعت میں انتشار و فوضویت۔ انارکی اور خود رائی۔ کی طرف ایک کھلی دعوت ہے جس کا کوئی بھی ایسا شخص ہرگز قائل نہیں ہو سکتا جس کو اپنی شخصیت کا اپنے دین کا اور اپنی قوم کے اجتماعی وجود اور ہستی کا ذرا بھی پاس ہو۔

رہا پروفیسر ابوریہ کا اپنے اس نظریہ کی تائید میں امام محمد عبدہ اور ان کے شاگرد رشید سید رشید رضا رحمہما اللہ کے اقوال کا سہارا لینا، تو ان دونوں بزرگوں کے بارے میں ہماری مخصوص رائے ہے جس کو ہم نہ کسی کے سر تھوپنا چاہتے ہیں اور نہ ہی اس کی وجہ سے ان دونوں بزرگوں کی قدر و منزلت اور دینی مساعی کو ذرا بھی ٹھیس لگانا چاہتے ہیں وہ یہ کہ:

بلاشبہ شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ ہمارے عہد حاضر کے سب سے بڑے مسلمانوں کی اصلاح کی تڑپ رکھنے اور اس کے لئے جان توڑ کوشش کرنے والے لوگوں میں سے تھے وہ اپنے زمانہ میں اسلام کے عظیم فلسفی، اسلام کی لسان ناطق۔ ترجمان اسلام۔ اور عقل متفکر۔ دانشور اسلام۔ تھے ان کی ہستی حریم اسلام کی حفاظت کے لئے ایک خارا شگاف تلوار تھی جس نے اسلام کے ہر دشمن سے، یورپ کے ہرافترا پرواز سے اور خاص کر سامراجی قوموں سے حریم اسلام کا دفاع کیا ہے نیز ان کی ہستی اسلام کی ایک ایسی جگمگاتی ہوئی منارۂ نور۔ سرچ لائٹ۔ تھی جس نے مسلمانوں کے اس جمود کو توڑا ہے جو عالم اسلامی پر سینکڑوں برس سے چھایا ہوا تھا۔

ان تمام فضائل و کمالات کے باوجود وہ حدیث کے علم میں بڑی حد تک کم مایہ اور تہیدست تھے، ان کی رائے تھی کہ اس زمانہ میں عقلی اور منطقی دلائل و براہین اسلام کے دفاع کے لئے بہترین ہتھیار ہیں۔

ان دونوں عوامل کی بنا پر سنت اور اس کے راویوں کے بارے میں نیز حدیث پر عمل اور اس کی اہمیت کے بارے میں ان کے مخصوص نظریات تھے جن کو ابوریہ جیسے ابن الوقت محقق اپنے لئے سہارا بنا سکتے ہیں تاکہ ان کا نام لیکر حدیث اور راویان حدیث کے بارے میں اپنے (استشراقی) افکار و خیالات کو مسلمانوں کے سامنے پیش کر سکیں۔

سید رشید رضی رحمہ اللہ کے متعلق ان کے مقالات و تصنیفات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً تو وہ بھی اپنے استاذ شیخ محمد عبدہ کے نقطۂ نظر سے ہی متاثر تھے اور اس کے نتیجہ میں شیخ محمد عبدہ کی طرح شروع میں وہ بھی حدیث سے تہیدست اور علوم حدیث سے نابلد تھے لیکن اپنے استاذ محمد عبدہ کی وفات کے بعد جب اُنھوں نے اپنے استاذ کی جگہ خود اصلاح کا علَم اپنے ہاتھ میں لیا تو اس وقت اُنھوں نے فقہ اور حدیث وغیرہ علوم روایت کی گہرائیوں میں اُترنا اور اسلام کی حمایت اور مسلمانوں کی اصلاح میں ان علوم سے کام لینا شروع کردیا یہاں تک کہ عالم اسلام کے کسی بھی گوشہ میں جو بھی دینی مشکلات مسلمانوں کو پیش آئیں ان کے حل کرنے کے لئے ان کی طرف رجوع کیا جاتا تو دینی ضرورت کے تقاضہ سے ان کے پاس حدیث کا بہت کافی ذخیرہ جمع ہوگیا اور علوم حدیث میں بھی مہارت تامہ حاصل کرلی اور بالآخر وہ سنت کے بھی زبردست علمبردار بن گئے خصوصاً مصر میں تو وہ حدیث و علوم حدیث کی مہارت میں بھی ممتاز شخصیتوں میں شمار ہونے لگے اور حدیث میں یہ ممتاز مقام ان کو اس لئے بھی حاصل ہوا کہ اس زمانہ میں جامعہ ازہر کے علماء حدیث اور علوم حدیث کی طرف سے بے اعتنائی برت رہے تھے اور ان کا شغف اور تبحر اس زمانہ میں فقہ، کلام لغت وغیرہ فنون میں بہت زیادہ تھا۔

میں نے سید رشید رضا رحمہ اللہ کا آخری زمانہ پایا ہے۔ میں ان کے مکان پر بغرض استفادہ آیا جایا کرتا تھا میں ان کے عمیق علم، فہم شریعت اور سنت کے دفاع میں ان کی مہارت سے استفادہ کیا کرتا تھا۔ بحیثیت ایک شاگرد کے ان کی سوانح حیات لکھنے کا جو فرض مجھ پر عائد ہوتا ہے اس کے پیش نظر اپنے کو اس امر کی گواہی دینے پر مجبور پاتا ہوں کہ سید رشید رضا سنت — احادیث قولیہ — پر شدت کے ساتھ عمل کرنے والے اور فقہی مذاہب میں جو چیزیں سنت کے خلاف ہیں ان کا شدت سے انکار کرنے والے علماء میں سے تھے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر سید رشید رضا اس وقت زندہ ہوتے جب پروفیسر ابوریہ نے اپنی کتاب شائع کی ہے تو سب سے پہلے سید رشید رضا اس کتاب کے بیشتر حصوں کا رد لکھتے۔

(۴) پروفیسر ابوریہ کی اس جدید "علمی تحقیق" کا چوتھا حاصل اور نتیجہ یہ ہے کہ ائمہ اسلام

اور فقہاءِ اُمت میں سے جن علما نے اسلامی قانون کے سلسلہ میں حدیث کے ساتھ اعتنا اور اہتمام کیا وہ سنت کی چھان بین کر کے صحیح اور غیر صحیح روایتوں کو الگ کرنے کے اہل نہ تھے اور ان کے برعکس اربابِ ادب و لُغت اُدبا اور عقلیت پرست معتزلہ بیشک نقدِ حدیث کے اہل تھے۔

سنت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے باب میں پروفیسر ابوریہ کی دینی غیرت وحمیت اور اللہ عز وجل کے دین کے معاملہ میں ان کے تقویٰ اور پرہیزگاری کا جائزہ لینے اور اندازہ لگانے کے لئے پروفیسر موصوف کے ان نظریات اور اُن کے اس لازمی نتیجہ کا نقل کر دینا ہی بہت کافی ووافی ہے اس پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

(۵) پروفیسر ابوریہ کی سنت سے متعلق اُس علمی تحقیق کا جو اُنھوں نے اس کتاب میں پیش کی ہے پانچواں لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پورے تیرہ سو سال تک صحابہ، تابعین، فقہاءِ اسلام اور ائمہ حدیث سب کے سب حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کی احادیث پر اعتماد کرنے میں دھوکا کھاتے رہے ہیں وہ ان کی اخلاقی پستی، نسلی حقارت اور راموں کو خوش کرنے کے لئے جھوٹ بولنے کی جرأت کو مطلق نہ سمجھ سکے۔ پروفیسر ابوریہ نے جس حقیقت کو آج تیرہ سو سال بعد سمجھ لیا یہ حضرات پوری تیرہ صدیوں میں اس کو نہ سمجھ سکے۔

کس قدر حسرتناک ہے مسلمانوں کی یہ محرومی اور سیاہ بختی کہ وہ ان پوری تیرہ صدیوں میں پروفیسر ابوریہ جیسے محقق کی صائب رائے اور دقیقہ رس نظر سے محروم رہے۔

اور کس قدر افسوسناک ہے اسلام کی یہ کور بختی کہ اسے مسلسل تیرہ سو سال تک ان کو ایسے بھولے بھالے، عقل و بصیرت سے کورے ائمہ اور علماء نصیب ہوئے جنہوں نے اپنی کتابوں میں، اپنی فقہ میں، .... اور اپنے اجتہادات میں ایسے کم مایہ شخص پر اعتماد کیا جو ذلیل وحقیر تھا، پیٹو تھا جھوٹا تھا اور جو ہر وقت مال ومتاع جمع کرنے اور تر لقمے فراہم کرنے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔

(۶) پروفیسر ابوریہ کی اس علمی تحقیق — سائنٹیفک ریسرچ — کا چھٹا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ چونکہ سنت — ذخیرۂ احادیث — میں موضوع روایتیں داخل ہوگئیں، معتبر راویاں

حدیث نے خود اپنے اقوال بھی حدیثوں میں شامل کر دیئے نیز شذوذ، نکارت اضطراب اور روایت بالمعنیٰ جیسی خامیاں اور کمزوریاں بھی روایت حدیث میں سرایت کر گئیں اس لئے حدیث کا سارا کا سارا ذخیرہ مشکوک و مشتبہ ہوگیا، حدیث کے صحیح مجموعے ــ کتب حدیث ــ بھی قابل اعتماد اور لائق اعتبار نہ رہے۔

یہ وہ نتیجہ ہے جو پروفیسر ابوریہ کی کتاب کا پڑھنے والا ہر وہ قاری آپ سے آپ نکالتا ہے جس کو حدیث اور علوم حدیث سے واقفیت نہ ہو اور یہی وہ نتیجہ ہے جس کے لئے متعصب یہودی اور عیسائی مستشرقین گذشتہ ادوار میں سر توڑ محنتیں کر چکے ہیں اور اس زمانہ میں بھی اس کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔

اس کے باوجود پروفیسر موصوف کا دعویٰ ہے کہ یہ کتاب ــ اضواء علی السنۃ المحمدیہ ــ انھوں نے قولی سنت ــ احادیث قولیہ ــ کی حمایت اور دفاع کے لئے اور ان کو موضوع احادیث اور خارجی اقوال کی آمیزش سے پاک و صاف کرنے کی غرض سے لکھی ہے اور ان کا مقصد اللہ کی رضا اور خوشنودی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

خدارا کوئی ہمیں بتلائے ہمارے تو تصور سے بھی باہر ہے کہ کسی عمارت کی بنیادوں میں شکوک و شبہات کے رخنے ڈال کر بھی اس کو مضبوط و مستحکم کیا جا سکتا ہے؟ اور اسلامی شریعت کی خدمت کا حق اسلام کے دشمنوں اور اس کی عمارت کے مسمار والوں کے ساتھ مل کر اور ان کی ہاں میں ہاں ملا کر بھی ادا کیا جا سکتا ہے؟ وفوق کل ذی علم علیم وانا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۷) پروفیسر ابوریہ کی علمی تحقیقِ سنت کا ساتواں لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انھوں نے اسرائیلیات سے متعلق ان تمام احادیث و آثار کو مشکوک و مشتبہ قرار دیا ہے جو ان امور و واقعات کو بیان کرتی ہیں جو یہود و نصاریٰ کی ان کتابوں ــ تورات و انجیل ــ میں مذکور ہیں جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہیں اور دعویٰ کیا ہے کہ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ حدیث کے خلاف دسیسہ کاریوں میں یہود و نصاریٰ کا ہاتھ ضرور ہے۔ یعنی یہ احادیث یقیناً کسی یہودی یا نصرانی کی گھڑی ہوئی ہیں۔

باقی رہیں وہ احادیث و آثار جن میں تورات و انجیل سے متعلق ایسے امور مذکور ہیں جن کا موجودہ تورات و انجیل میں ذکر نہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ تمام احادیث و آثار جھوٹ ہیں اس لئے کہ موجودہ تورات و انجیل ان کی تکذیب کرتی ہیں۔

بالفاظ دیگر اسرائیلیات سے متعلق وہ تمام احادیث و آثار جو موجودہ تورات و انجیل کے اندر موجود مطابق ہیں وہ تو کسی یہودی یا نصرانی کی گھڑی ہوئی ہیں اور جو احادیث و آثار موجودہ تورات و انجیل کے موافق و مطابق نہیں ہیں وہ سراسر جھوٹ ہیں۔

واہ واہ، کیا کہنا ہے اس علمی تحقیق ——— سائنٹفک ریسرچ ——— کا، یہ بھی جھوٹ وہ بھی جھوٹ، چلئے قصہ ختم ہوا اسرائیلیات سے متعلق احادیث و آثار کا۔

اور یہ تو تھا، پروفیسر ابو ریہ کے علمی موقف کا وہ تناقض اور تضاد ہے جس کو ایک واقعی حق اور حقیقت کا متلاشی عالم کبھی اختیار کر ہی نہیں سکتا۔

سنئے، تورات و انجیل اور انبیاء سابقین کی دوسری کتابوں کے بارے میں اللہ جل و علیٰ نے ہمارے سامنے دو واضح حقیقتیں پیش فرمائی ہیں۔

(۱) اول یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں کو ان انبیاء کرام علیہم السلام پر نازل کیا ہے اور تمام ادیان سابقہ میں ان کے اصول یکساں رہے ہیں۔ فروعات میں بیشک تفاوت ہوا ہے۔

(۲) دوم یہ کہ ان ادیان کے پیروؤں نے ان کتابوں کو بدل ڈالا ہے اور ہمیشہ ان میں تحریف اور قطع برید کرتے رہے ہیں۔ قرآن عظیم اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

یحرفون الکلم عن مواضعہ ——— وہ الفاظ کو ان کی جگہ سے بدل دیتے ہیں

ان دونوں حقیقتوں کے پیش نظر ہر صاحب ایمان عالم کا طریق کار اسرائیلیات سے متعلق احادیث کے بارے میں یہ ہوتا ہے کہ جب بھی اس کے سامنے اسرائیلیات سے متعلق کوئی ایسی حدیث آتی ہے جس کی سند صحیح ہو تو وہ اس کو کتاب اللہ ——— قرآن عظیم سے ملا کر دیکھتا ہے اگر وہ قرآن کے موافق ہوتی ہے تو اس کے دل کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ واقعی یہ حدیث صحیح ہے اور اس کے برحق ہونے کا وہ اعتقاد رکھتا ہے اور اگر وہ حدیث قرآن کے مخالف ہوتی ہے ——— اسرائیلیات سے متعلق کسی ایسی حدیث کا جو قرآن کے خلاف ہو صحیح احادیث میں مطلق وجود نہیں ہے ——— تو اس

کو رد کردیتا ہے (اور نہ قبول کرنا اس کے لئے جائز ہوتا ہے) چاہے کتنے ہی اس کے رجال ــــ راوی ــــ ثقہ ہوں۔

اسی طریق کار پر ہمارے علماء حدیث صحابہ کرام کے عہد سے آج تک عمل پیرا رہے ہیں وہ اہل کتاب کی وہ ہی روایات لیتے اور قبول کرتے ہیں جو قرآن کریم کے ثابت شدہ صحیح احادیث کے اور دین کے تمام قاعدوں کے معارض اور مخالف نہ ہوں اور جو اسرائیلی روایات ان اصول ومبادی کے خلاف ہوتی ہیں ان کو رد کر دیتے ہیں۔

لیکن ہمارے عہد حاضر کے محقق پروفیسر آبوریہ نے ایک اور ہی اصول اختراع کیا ہے وہ یہ کہ تورات وانجیل سے متعلق امور پر مشتمل، ہر حدیث خفیہ طور پر یہود ونصاری کی طرف سے اسلام میں داخل کی گئی ہے۔

اور اس اصول کے تحت اُنھوں نے ان تمام روایتوں کی تکذیب وتردید کی ہے جو حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ صحابہ کرام کعب احبار سے لیکر روایت کرتے ہیں کہ: تورات وانجیل میں صاف اور صریح لفظوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک کی تصریح موجود ہے اور اس سلسلہ میں اُنھوں نے اُن مسلمان یہودیوں پر الزام لگایا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں یا آپ کے بعد اسلام لائے ہیں کہ یہ ان کی گھڑی ہوئی حدیثیں ہیں۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ پروفیسر ابوریہ ــــ بزعم خود ــــ ایک محقق عالم ہوتے ہوئے ان کو یہ الزام لگانے کی جرأت کیسے ہوگئی جبکہ قرآن کریم ایک سے زیادہ آیتوں میں اس کی تصریح کر رہا ہے سورۂ اعراف میں ارشاد ہے:۔

الذین یتبعون النبی الامی الذی	جو لوگ اس نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے
یجدونہ مکتوبا عندھم	پاس تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔
فی التوراۃ والانجیل	

اس آیت کریمہ میں آپ کا نام تورات وانجیل میں لکھا ہوا ہونے کی تصریح موجود ہے

اسی طرح سورۂ صف کی آیت کریمۂ ذیل میں آپ کا نام نامی احمد بتلاتے ہیں اور آپ کی بعثت کی بشارت دیتے ہیں۔ ارشاد ہے:۔

واذ قال عیسیٰ بن مریم یا بنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم مصدقا لما بین یدی من التوراۃ ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد

جب مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا: اے اولاد اسرائیل! میں تمہاری طرف بھیجا ہوا اللہ کا رسول ہوں اس تورات کی تصدیق کرتا ہوں جو میرے سامنے ہے اور اس رسول کی بشارت دیتا ہوں جو میرے بعد آئے گا. جس کا نام احمد ہے۔

سورۃ فتح کی آیت کریمہ میں اللہ جل جلالہٗ تورات وانجیل میں بطور تمثیل آپ کی اور آپ کے صحابہ کی صفات کے مذکور ہونے کی تصریح فرماتے ہیں:۔

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود، ذلک مثلھم فی التوراۃ ومثلھم فی الانجیل کزرع اخرج شطأہ فآزرہ فاستغلظ فاستوی علی سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار۔

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے معاملہ میں انتہائی سخت ہیں، آپس میں انتہائی مہربان ہیں تم ان کو ہمیشہ رکوع کرتے سجدہ کرتے (یعنی وقتہ نماز پڑھتے) دیکھو گے وہ صرف اللہ کے فضل کے طلبگار رہتے ہیں، ان کی (خاص) نشانی ان کے چہروں میں سجدوں کے آثار (انوار) ہیں یہ تو ان کی مثال (صفت) تورات میں (مذکور) ہے اور انجیل میں ان کی مثال ایک کھیتی کی سی ہے جس نے (زمین سے پہلے) اپنی کونپل نکالی پھر اس کی کمر کو مضبوط کر لیا پھر وہ اور موٹی ہو گئی پھر وہ اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہو گئی کسانوں کو بھلی لگنے لگی تاکہ ان مسلمانوں کے ذریعہ کافروں کو غیظ وغضب کی آگ میں جلائے۔

مذکورہ بالا آیت صاف اور صریح طور پر بتلا رہی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی صراحتاً تورات و انجیل میں موجود تھا بلکہ آپ کا اور آپ کے صحابہ کا ذکر تو بغرض تعریف وتوصیف بطور تمثیل بھی تورات وانجیل میں مذکور تھا۔ پھر اس میں کون سے اچنبھے کی بات ہے اور اس میں کیا تناقض وتضاد ہے؟ اگر وہ اہل کتاب جو اسلام لا چکے تھے یہ روایت کریں کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی یا تمام صحابہ کے یا بعض صحابہ کے اوصاف کا ذکر تورات و انجیل میں موجود ہے، ایک مسلمان کی عقل کے لئے اس میں کوئی استبعاد و انکار کی وجہ نہ ہونی چاہئے جبکہ قرآن ان روایات کی صحت کی شہادت دے رہا ہے۔

اگر ان علماء اہلِ کتاب کی مذکورہ بالا روایات ہمیں آج اُس تورات و انجیل میں نہیں ملتیں، جو یہود و نصاریٰ کے پاس موجود ہے تو کیا یہ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ حدیثیں جھوٹی ہیں؟ یا یہ اس امر کی دلیل اور تصدیق ہے کہ قرآن نے ان کتابوں کے بارے میں جو خبر دی ہے کہ ان لوگوں نے ان کتابوں میں تحریفیں کر ڈالی ہیں اور ان کو بدل ڈالا ہے؟

بات کچھ بھی ہو، پروفیسر ابوریہ کو دو باتوں میں سے ایک کا اعتراف ضرور کرنا پڑیگا کہ یا تو وہ (قرآن کی تصریحات کے برعکس) اس کا اقرار کریں کہ یہ دونوں کتابیں صحیح ہیں اور اپنی اصلی صورت میں موجود ہیں تو وہ بیشک ان تمام روایات کو جھوٹا کہہ سکتے ہیں جو آج ہم ان دونوں کتابوں میں نہیں پاتے، اور یا وہ اس امر کا اعتراف کریں کہ ان دونوں کتابوں میں تحریف اور تبدیلی ہو چکی ہے تو ان کو ان تمام صحیح روایات کو تسلیم کرنا پڑے گا جو ہمیں آج ان دونوں کتابوں میں نہیں ملتیں۔

لیکن اگر ابوریہ یہ کہتے ہیں کہ "ان روایات میں جو خبریں دی گئی ہیں اور وہ تورات و انجیل کے مطابق اور موافق ہیں تو یہ مطابقت اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے گھڑنے والے یہود و نصاریٰ ہیں اور جن روایات میں دی ہوئی خبروں کا وجود ان دونوں کتابوں میں نہیں ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ جھوٹی ہیں اس لئے کہ یہ ان دونوں کتابوں میں نہیں ملتیں" تو یہ تو کھلا ہوا تضاد، ہٹ دھرمی اور سینہ زوری ہے، نیز یہ محض "اٹکل پچو" قیاس آرائی ہے نہ کہ علمی تحقیق و تنقیح۔

(۸) پروفیسر ابوریہ کی سنت سے متعلق انوکھی علمی تحقیق کا آٹھواں لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حدیث کی چھان بین میں سلف صالحین کی "تمام تر کوتاہیوں" پہ تنقید کرنے کے بعد وہ (ان کوتاہیوں یا سلف کی اس "حرکت" کی تلافی کے لئے وہ) ہمارے سامنے نقدِ حدیث کے لئے ایک اصول پیش فرماتے ہیں کہ کسی حدیث کے صحیح ہونے کا معیار یہ ہے کہ اس حدیث کو عقلِ صریح — خالص عقل — کی کسوٹی پہ پرکھا جائے اگر وہ عقلِ صریح کے موافق ہو تو اسے قبول کر لیا جائے ورنہ رد کر دیا جائے۔

حدیث کو عقل کی کسوٹی پہ پرکھ کر دیکھنے کا قصہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ یہ تو بہت پرانا راگ

ہے۔ پروفیسر ابوریہ سے بہت پہلے معتزلہ کے ایک عقلیت پرست فرقہ نے اس آواز کو بلند کیا ہے اور اس پر عمل بھی کر کے دکھلایا ہے چنانچہ انھوں نے ہر اس حدیث کو رد کر دیا ہے جس کو ان کی عقل نے پسند نہیں کیا۔

عہد حاضر میں مستشرقین نے بھی معتزلہ کی صدائے بازگشت کے طور پر یہی نعرہ بلند کیا ہے اور بدقسمتی سے عہد حاضر کے ہمارے مسلمان مصنفین میں سے پروفیسر ابوریہ سے پہلے استاذ احمد امین رحمہ اللہ نے بھی ان مستشرقین کی پیروی کی ہے اور مثال کے طور پر چند صحیح احادیث کی نشاندہی بھی کی ہے کہ یہ احادیث ۔ ان کی رائے میں عقل میں آنے والی نہیں ہیں۔ ہم نے اس کتاب میں اس دعوے اور اس کے تحت پیش کردہ احادیث پر باقاعدہ مناقشہ کیا ہے اور تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ چنانچہ آپ اس مناقشہ کو اس کتاب میں ایک مستقل عنوان کے تحت پڑھیں گے۔

اور آج پروفیسر ابوریہ بھی اپنے ان عقلیت پرست اسلاف کی صدا بصدا یہی آواز بلند کر رہے ہیں اور احادیث کو قبول کرنے یا رد کرنے کے بارے میں عقل کو معیار بنا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر ہمارے قدیم علماء اس اصول پر عمل کرتے تو سنت میں جو بہت سی ملی جلی چیزیں رہ گئی ہیں ان سے سنت کو پاک وصاف کرنے میں وہ کامیاب ہو جاتے

آج کل کے تعلیمیافتہ لوگوں کی نظر میں ۔ جو پروفیسر کے نزدیک بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں ۔ یہ دعویٰ اپنی دلفریبی کے لحاظ سے بہت مقبول اور پسندیدہ معلوم ہوتا ہے لیکن اگر اس کا دقیق تجزیہ کیا جائے تو نہ اس کا کوئی معتدبہ فائدہ ہے نہ علوم شرعیہ میں اس کا کچھ حاصل ہے بلکہ اس کا اصلی نتیجہ احادیث کو قبول کرنے یا رد کرنے کے معاملہ میں سوائے خودرائی، خودسری، اور انتشار (انارکی) کے اور کچھ نہیں ہے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ پروفیسر ابوریہ کی عقل صریح سے کیا مراد ہے؟ اس عقل کے حدود اربعہ کیا ہیں؟ اور اس عقل میں اتفاق رائے کی وسعت کس حد تک ہے؟

عقل صریح سے اگر پروفیسر موصوف کی مراد وہ بدیہی امور ہیں جن کو ہر عقل مانتی ہے، تو تاریخ سنت میں یہ معیار ابتداء سے ہی کارفرما رہا ہے چنانچہ احادیث کو پرکھنے والے علماء نے موضوع احادیث کے پہچاننے کی کچھ علامات بتلائی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جس حدیث کا متن عقل

صریح کے، دین کے قطعی امور کے، تاریخ کے، یا اصول طب وغیرہ تجرباتی امور کے مخالف ہو وہ موضوع ہے اور اسی اصول کی بنیاد پر انھوں نے ہزاروں حدیثوں کی نفی کی ہے اور ان کے موضوع ہونے کا حکم لگایا ہے۔

اور اگر خلاف عقل سے پروفیسر ابوریہ کی مراد اس کے علاوہ کچھ اور ہے مثلاً یہ کہ عقل جس حدیث کو عجیب و غریب اور بعید از قیاس سمجھے، تو یاد رکھئے عقل کے کسی چیز کو بعید اور ناقابل یقین سمجھنے کی حقیقت کچھ نہیں یہ تو ایک اضافی ؟ ہے۔ جو عموماً تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور ماحول وغیرہ کے تابع ہوتی ہے جس کی نہ کوئی ضابطہ حد بندی کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی عقلی معیار اس کی تحدید کر سکتا ہے

بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ایک انسان کے نزدیک بالکل انوکھی، بعید از قیاس اور ناقابل یقین ہوتی ہیں لیکن دوسرے شخص کے نزدیک وہی چیزیں بالکل معمولی اور مانوس ہوتی ہیں۔ جس زمانہ میں ہمارے ملک میں موٹر کار کسی نے بچشم خود نہیں دیکھی تھی صرف اس کا نام سُنا تھا تو لوگوں کو موٹر کار پر اس لئے تعجب ہوتا تھا اور یقین نہ آتا تھا کہ وہ بغیر گھوڑوں وغیرہ کے آپ سے آپ کیسے چلتی ہے؟ حالانکہ اُسی زمانہ میں موٹر اہل یورپ کے لئے ایک معمولی چیز تھی صرف اس لئے کہ وہ اس سے مانوس تھے شب و روز اس سے کام لیتے تھے۔ ایک بیابانوں میں زندگی بسر کرنے والا صحرا نشین بدو شہروں میں ریڈیو کا نام سُنکر تعجب کیا کرتا تھا، ریڈیو کو شہریوں کے من گھڑت اور جھوٹوں میں سے ایک جھوٹ سمجھا کرتا تھا اور جب سب سے پہلے اس نے ریڈیو کی آواز سُنی تو وہ سمجھا کہ یہ اسمیں شیطان بول رہا ہے بالکل اس طرح جیسے ایک بچہ یہ سمجھتا ہے کہ ریڈیو میں کوئی آدمی بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ غرض انسانی عقل ہر نامانوس چیز کو اول اول ناقابل یقین سمجھتی ہے، اور مانوس ہو جانے کے بعد اسی چیز کو بدیہیات کی طرح یقینی سمجھنے لگتی ہے۔

اسلام میں یہ قطعی طور پہ ثابت شدہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں کوئی بھی بات ایسی نہیں ہے جس کو عقل سلیم قبول نہ کرے اور اس کے محال ہونے کا فیصلہ کرے، ہاں اسلام میں بھی — ہر سماوی دین کی طرح — بعض چیزیں ایسی ضرور ہیں جنکو عقل حیرت کی نگاہ سے دیکھتی اور ناقابل یقین سمجھتی ہے بلکہ ان کا تصور بھی نہیں کر سکتی جیسے نبوت سے متعلق امور، معجزات وغیرہ، حشر و نشر جنت و دوزخ وغیرہ لہٰذا ایک مسلمان کی شان یہ ہے کہ جب بھی اسلام سے متعلق کوئی ایسی بات

...... سُنے تو جس بات کا عقل سلیم انکار کرتی ہو تو وہ بھی اس کا انکار کر دے، اور جس بات کو عقل نامانوس ہونے کی وجہ سے بعید سمجھتی ہو تو اس کے ماننے کے معاملہ میں جلد بازی سے کام نہ لے یہاں تک کہ غور و فکر کے بعد اس کے جھوٹ یا سچ ہونے کا یقین آجائے۔

اسلام میں کسی امر کے یقین — یقینی علم — حاصل کرنے کا ذریعہ حسب ذیل تین امور میں سے کوئی ایک امر ہوتا ہے۔

(۱) یا تو ایسی سچی خبر ہو جس پر سننے والا اس لئے یقین کرتا ہے کہ خبر دینے والا قطعی طور پر سچا ہے جیسے خداوند تعالیٰ نے اپنی کتابوں میں بہت سی خبریں دی ہیں یا پیغمبروں نے بہت سی باتیں بتلائی ہیں

(۲) یا وہ امر ایسے امور میں سے ہو جن کا تعلق تجربہ اور مشاہدہ سے ہے تو اس کا یقین تجربہ اور مشاہدہ سے ہوگا اس اطمینان کے بعد کہ تجربہ اور مشاہدہ غلطی سے محفوظ ہے۔

(۳) اور جن اُمور کے متعلق نہ کوئی سچی خبر ہو نہ صحیح تجربہ و مشاہدہ تو ان میں عقل سلیم کا فیصلہ معتبر ہے

یہ قرآن عظیم کا اعجاز ہے کہ اس نے علم یا یقین حاصل کرنے کے ان تینوں قاعدوں کو ایک ہی آیت میں جمع کر دیا ہے، ارشاد ہے۔

ولا تقف ما لیس لک بہ علم ان السمع والبصر والفؤاد کل اولٰئک کان عنہ مسئولا (الاسراء ۳۶)	جس چیز کا تمہیں علم (یقین) نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو، بیشک کان، آنکھ اور دل ہر ایک سے اس کے بارے میں باز پرس ہو گی۔

اول لفظ سمع سے اشارہ خبر صادق کی طرف ہے پھر لفظ بصر سے اشارہ مشاہدہ اور تجربے کی طرف ہے اس کے بعد لفظ فؤاد سے اشارہ عقل سلیم کے فیصلہ کی طرف ہے۔

یہی تینوں علمی عناصر ہیں جن سے ہر امر کے متعلق علم اور یقین حاصل ہوتا ہے۔ تمہیں انسانی زندگی میں کوئی بھی علم و یقین ایسا نہیں ملے گا جو ان تینوں عناصر میں سے کسی ایک سے حاصل نہ ہوتا ہو۔

جو علم و یقین ان عناصر کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے حاصل ہو قرآن اس کا نام علم نہیں رکھتا بلکہ وہ یا تو ظن — غالب گمان — ہوتا ہے یا وہم و خیال۔

نصوص شریعت میں سے جو قطعی تعلیمات اصول عقائد سے تعلق رکھتی ہیں ان کے اندر تو یقینی

علم کا ہونا ناگزیر ہے جس کے معنی ہیں وہ قطعی اور پختہ یقین جو واقعہ کے مطابق ہو اور قطعی دلیل سے حاصل ہو۔ جیسے اللہ پر اس کی صفات پر نبوت اور اس سے متعلق امور پر انبیا پر، فرشتوں پر اور جنت و دوزخ پر ایمان لانا۔

اور جو نصوص شریعت فروعی تعلیمات (عملی احکام) سے متعلق ہوں ان میں ظن — گمان غالب — کافی ہے (اسی گمان غالب پر انسانی زندگی کے تمام کام چلتے ہیں) کیونکہ ان فروعی احکام میں سے اکثر کے بارے میں علم — قطعی یقین — کی شرط پوری نہیں ہوتی۔ شریعت اور علوم شریعت کی بصیرت رکھنے والوں کے نزدیک یہ بالکل مسلم اور متفق علیہ امر ہے۔

جن احادیث کو ہمارے علماء رحمہم اللہ نے صحیح کہا ہے ان کا نہ عقل انکار کرتی ہے نہ ان کو محال سمجھتی ہے کیونکہ:۔

(۱) ان احادیث کا تعلق یا تو عقائد سے ہے، ایسی حدیثوں کا لازماً قرآن کریم کے مطابق و موافق ہونا ضروری ہے اور یہ ہم بتا چکے ہیں کہ ہمیں پورا یقین ہے کہ قرآن عظیم میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے بارے میں عقل سلیم باطل، فاسد یا محال ہونے کا فیصلہ کرتی ہو۔

(۲) یا پھر ان احادیث کا تعلق شرعی احکام سے ہے جن میں عبادات، معاملات اور آداب و اخلاق وغیرہ داخل ہیں۔ ان احادیث میں بھی کوئی حدیث جس کو ہمارے علماء نے صحیح کہا ہو ایسی نہیں ہے جس کا عقل سلیم انکار کرتی ہو یا محال سمجھتی ہو۔

(۳) یا ان احادیث کا تعلق گزشتہ اقوام کے واقعات سے ہے یا عالم غیب کے ان امور سے تعلق ہے جو انسانی عقل و نظر کے تحت آتے ہی نہیں جیسے آسمانوں کی کیفیات و تفصیلات، حشر کے واقعات یا جنت و دوزخ وغیرہ کے احوال یہ امور عقل کے دائرۂ ادراک سے باہر ہیں عقل ان کے باطل یا محال ہونے کا فیصلہ کر ہی نہیں سکتی ہاں ان احادیث میں بعض ایسی چیزیں ضرور آجاتی ہیں جو عقل و نظر کی دسترس سے باہر ہیں اُن کو عقل انسانی بعید ضرور سمجھتی ہے۔

لہٰذا ایسے امور سے متعلق احادیث جب ایسے ثابت شدہ طریقوں — سندوں — سے پہونچیں جن سے ہمیں ان کی صحت کا یقین آجائے تو ان پر اعتقاد رکھنا تو ضروری ہے اور اگر ایسے طریقوں — سندوں — سے پہونچیں جن سے صرف گمان غالب حاصل ہو تب بھی ایک مسلمان

کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ ان کی تکذیب و تردید میں جلد بازی سے کام لے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ اُس بات میں جس کا عقل انکار کرتی ہے اور اُس بات میں جس کو عقل بعید سمجھتی ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتے اور دونوں کے انکار و تکذیب میں جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔ حالانکہ عقل جس بات کا انکار کرتی ہے اس کی وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ وہ عقل کے نزدیک محال ہے اور جس چیز کو بعید سمجھتی ہے اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے ادراک کے دائرہ اور دسترس سے باہر ہوتی ہے۔

اور زمین آسمان کا فرق ہے اُن چیزوں میں جن کو عقل محال سمجھتی ہے اور اُن چیزوں میں جو عقل کے ادراک کے حدود سے باہر ہیں۔

علاوہ ازیں تاریخ کے تتبع اور انسان کے علمی و ذہنی ارتقاء کی چھان بین ہمیں بتلاتی ہے کہ بہت سی ایسی چیزیں جن کا اب سے پہلے عقل کے لئے تصور کرنا بھی دشوار تھا آج ان کو ہر انسان آسانی اور واضح طور پر سمجھتا ہے اس کے برعکس بہت سی ایسی باتیں ہیں جو حقائق واقعیہ سمجھی جاتی تھیں آج وہ خرافات کی فہرست میں داخل ہو چکی ہیں کل تک جو چیز محال تھی آج وہ واقعہ بن چکی ہے یہ اتنی واضح حقیقت ہے کہ اس کی مثالیں بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، کیونکہ ہم اس دور سے گذر رہے ہیں جس میں انسان نے راکٹوں کے ذریعہ چاند کے متعلق معلومات بھی حاصل کر لی ہیں اور اب وہ چاند پر اور دوسرے سیاروں پر پہنچنے اور اترنے کی تیاریاں کر رہا ہے لیکن اگر اس قسم کی باتیں کوئی شخص قرون وسطیٰ میں یا آج سے صرف سو سال پہلے سوچتا بھی تو اس کو پاگل سمجھا جاتا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جو عقلیت پرست لوگ ہر حدیث کے صحیح یا جھوٹ ہونے کے بارے میں عقل کو حکم بنانے کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں وہ درحقیقت عقل کی نظر میں محال چیزوں اور بعید از فہم چیزوں کے درمیان بالکل فرق نہیں کرتے اور ان کی عقلوں میں جو چیز بھی انوکھی اور بعید از فہم معلوم ہوتی ہے وہ فوراً اس کی تردید و تکذیب کرنے بیٹھ جاتے ہیں یہ وہ جلد بازی اور دیدہ دلیری ہے جو ایک طرف اپنی عقلوں پر مغرور ہونے کا نتیجہ ہے اور دوسری طرف عقل کا بھوت ان پر سوار ہے اور تیسری طرف یہ خرد باختہ لوگ عقل کو ایسی چیزوں کے بارے میں بھی فیصلہ کرنے

کا مجاز بنانے پر تلے ہوئے ہیں جو درحقیقت عقل کے تحت آتی ہی نہیں۔

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جمہور محدثین نے جن احادیث کو صحیح قرار دیا ہے یہ عقلیت پرست لوگ ان میں سے اکثر احادیث کی تکذیب محض عقل کا سہارا لیکر کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ صرف وہی حدیثیں ہیں جن کا تعلق یا گذشتہ اقوام کے واقعات سے ہے یا غیبی امور سے۔

اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:۔ پروفیسر ابوریہ نے حضرت ابوہریرۃؓ کی احادیث کے نمونہ کے طور پر ان کی ایک روایت نقل کی ہے جس سے وہ اپنے دعوے "حدیث میں ابوہریرۃ کے جھوٹ بولنے" کی تائید و توثیق کرنا چاہتے اور یہ کہ ابوہریرۃ نے بہت سی باتیں اسرائیلیات سے لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی ہیں۔

وہ حدیث حسب ذیل ہے:۔

امام مسلم نے حضرت ابوہریرۃؓ کے واسطہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ:۔

جنت میں ایک درخت ایسا ہے کہ اس کے سایہ میں سوار سو سال تک چلتا رہے

اس حدیث کو پروفیسر ابوریہ بعید از عقل قرار دیتے ہیں بلکہ وہ ضمناً اس حدیث کے جھوٹ ہونے کا بھی دعوی کرتے ہیں صرف اس لئے کہ اس حدیث کے راوی ابوہریرہ ہیں اور موصوف کے زعم کے مطابق ابوہریرۃ کی یہ عادت تھی کہ وہ کعب احبار سے اسرائیلی روایات سنکر ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے۔

آپ پروفیسر ابوریہ سے ذرا یہ تو پوچھئے کہ: جناب ذرا بتلائیے یہ حدیث بعید از عقل کیوں ہے؟ کیا اس وجہ سے بعید از عقل ہے کہ اس حدیث میں جنت کے اندر ایک ایسے درخت کے موجود ہونے کا ذکر ہے جس کے سایہ میں ایک سوار سو سال تک چل سکتا ہے، تو کیا جنت غیبی امور میں سے نہیں ہے؟ کیا کسی بھی عقل پرست کی طاقت ہے کہ وہ جنت میں جو کچھ ہے اس کی تفصیلات میں کچھ جان سکے بجز اس کے جو خدا اور اس کے رسول نے ہمیں بتلایا ہے۔

علاوہ ازیں کیا اس عالم شہادت ـــ مشاہد دنیا ـــ میں ایسی چیزیں موجود نہیں ہیں جن کی بڑائی اور وسعت کو انسانی علم اب تک نہیں پا سکا بلکہ انسانی عقل ان کے تصور پر بھی قادر

نہیں ہے؟ کیا آج فلکیات کے ماہرین ہمیں یہ نہیں بتلاتے کہ آفتاب کا حجم ہماری زمین کی بہ نسبت کئی لاکھ گنا بڑا ہے؟ اور یہ آفتاب اُن لاکھوں آفتابوں میں سے ایک ہے جو ہمارے آفتاب سے کئی لاکھ گنا بڑے ہیں؟ کیا یہ ماہرین ہمیں یہ نہیں بتلاتے کہ اس وسیع وعریض فضا میں ایسے آفتاب بھی ہیں کہ "روشنی" کے لاکھوں بلکہ اس سے بھی زیادہ برس گذرنے کے بعد بھی اب تک ان کی روشنی زمین تک نہیں پہونچی؟ اس زمانہ میں یہ ماہرینِ فلکیات جن علمی حقیقتوں کا آج انکشاف کررہے ہیں اگر یہ حضرات انکی اشاعت نہ کرتے تو کیا انسانی عقل ان باتوں کی تصدیق کرتی؟ تو پھر تعجب ہے کہ پروفیسر موصوف اس بات کی تو تصدیق کرتے ہیں کہ ماہرین فلکیات اس عجیب وغریب کائنات کی وسعت کو اُس حد تک سمجھتے اور جانتے ہیں جہاں تک روئے زمین کی سب سے بڑی عقل انسانی کا خیال تک بھی نہیں پہونچ سکتا لیکن افسوس ہے کہ وہ اس کی تصدیق نہیں کرسکتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ جن کا تعلق وحی آسمانی سے تھا اور جن کا علم اس عجیب وغریب کائنات کے پیدا کرنے والے سے ماخوذ تھا۔ وہ یہ فرماتے ہیں کہ جنت میں ایک ایسا درخت ہے جس کے سایہ میں سو سال تک ایک سوار چلتا رہے

پھر ان روشنی کے لاکھوں برسوں کے سامنے ان سو برسوں کی حقیقت ہی کیا؟

اب قابل غور بات یہ ہے کہ پروفیسر ابوریہ اور ان کے مغرب زادہ ہمنواؤں کے سامنے اصل مسئلہ کیا ہے۔

(۱) آیا اصل مسئلہ یہ ہے کہ دین وشریعت میں عقل سے کام لیا جائے یا نہ لیا جائے۔

(۲) یا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس "مخلوق عقل" کو خالق کے بجائے معبود مان لیا جائے اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیا جائے یا عقل کو اس کے خالق کا بندہ اور فرمانبردار رکھا جائے؟

(۳) یا یہ فکرِ آزاد کے مالک دین وشریعت میں لال بجھکڑ حضرات یہ چاہتے ہیں کہ دین و شریعت کے معاملہ میں تو اپنی عقلوں کو معبود بنالیں اور جو وہ کہے اسی پر ایمان لائیں، اور دین وشریعت کے علاوہ بقیہ امور ومعاملات میں اپنی عقلوں سے کلی طور پر دستبردار ہوجائیں اور جو اہل مغرب کہدیں بے چون وچرا اس پر ایمان لے آئیں خدا ہی جانے یہ کیا

چاہتے ہیں ان کا طرزِ عمل تو تیسری صورت کی ترجمانی کرتا ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک اور مثال لیجئے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک اور حدیث ہے جس کی امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں اور امام مسلمؒ نے صحیح مسلم میں تخریج کی ہے مگر پروفیسر ابوریہ اسکی صحت کا انکار کرتے ہیں وہ مرفوع حدیث یہ ہے:۔

ایک مرتبہ جنت اور دوزخ میں جھگڑا ہوا دوزخ نے کہا: میں تجھ سے برتر ہوں اس لئے کہ جتنے بڑے بڑے اور مغرور و متکبر لوگ ہیں وہ خاص طور پر میرے لئے چن لئے گئے ہیں تو جنت اس پر کہنے لگی: واقعی یہ کیا بات ہے، میرے ہاں صرف دنیا کے کمزور اور گرے پڑے بے حیثیت لوگ ہی آئیں گے؟ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے جنت سے فرمایا: تو جانتی نہیں؟ تو تو میری خاص رحمت (کا مقام) ہے اپنے بندوں میں سے جن پر میں رحم کرنا چاہوں گا تیرے ہی ذریعہ اُن پر رحم کروں گا (اور تیرے پاس بھیجونگا) اور دوزخ سے فرمایا: تو تو سرتاپا قہر و عذاب (کا مقام) ہے، اپنے بندوں میں سے جنکو میں عذاب دینا چاہوں گا تیرے ہی ذریعہ عذاب دوں گا اور تیرے پاس بھیجوں گا۔ بہرحال تم میں سے ہر ایک کو بھرنا ضرور ہے چنانچہ دوزخ کا پیٹ اس وقت تک نہیں بھرے گا جبتک خدا اس پر اپنا پاؤں نہ رکھے گا، تب وہ کہے گی بس، بس تو اس وقت وہ بھر جائے گی۔ (یعنے اللہ جل جلالہٗ کے قہر و غضب پر رحم و کرم غالب آجائے گا تو دوزخ کا پیٹ بھر جائے گا) اور اس کا ایک حصہ دوسرے حصہ سے مل جائیگا" (اور جہنمی اس کے درمیان پس جائیں گے) ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس حدیث کو بعید از عقل و قیاس سمجھنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

اگر عقل و قیاس سے بعید ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس حدیث میں آیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ دوزخ کے اوپر اپنا پاؤں رکھیں گے (یعنے اس حدیث میں خدائے پاک و برتر کی طرف "قدم" (پیر) کی نسبت کی گئی ہے اور اللہ اس سے پاک و منزہ ہے) تو یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ نہ صرف قدم، بلکہ خود قرآن مجید میں خدائے قدوس کی طرف ہاتھ کی، چہرہ کی، آنکھ کی اور آنے وغیرہ افعال کی نسبت کی گئی ہے اور قرآن و حدیث میں اس قسم کے الفاظ کا مفہوم کیا ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں علماء اسلام کے مختلف مسلکوں کا بھی سب ہی کو علم ہے کہ سلف صالحین کا

مسلک تو یہ ہے کہ ان الفاظ کو اپنے ظاہری معنی ہی میں رکھا جائے اور ان میں کوئی تاویل نہ کی جائے مگر اسی کے ساتھ ساتھ کسی بھی چیز میں انسان کے ساتھ مشابہت سے بھی خدائے قدوس کو پاک و منزہ مانا جائے۔ اس کے برعکس علماء متاخرین اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو انسان کے ساتھ کسی بھی چیز میں مشابہت سے پاک اور مبرا قرار دینے کے بنیادی اور متفق علیہ اصول پر قائم رہتے ہوئے اس قسم کے الفاظ کے ظاہری معنی کے خدائے پاک کی شان کے منافی ہونے کی وجہ سے ان میں تاویل کرتے ہیں اور خدا کی شایانِ شان ان کی مراد بتلاتے ہیں مثلاً وہ ہاتھ سے قدرت مراد لیتے ہیں۔ یہ تقدیس وتنزیہ کا اصول سب ہی کے نزدیک مسلم ہے اور رہے گا اس لئے اس قسم کے الفاظ کی نسبت کے بارے میں جو جواب قرآنِ عظیم میں دیا جائے گا وہی حدیث میں بھی دیا جائے گا۔

اور اگر اس حدیث میں استبعاد کی وجہ جنت و دوزخ کا آپس میں حجت کرنا ہے تو خود قرآن مجید میں زمین و آسمان کے بارے میں اسی طرح "باتیں کرنا" وارد ہے زمین و آسمان کے متعلق ارشاد ہے:۔

ائتیا طوعا او کرھا قالتا اتینا طائعین — تم دونوں خوشی سے یا ناخوشی سے (ہمارے حکم کی تعمیل کے لئے) آؤ انھوں نے کہا: ہم بخوشی حاضر ہیں

اور اگر استبعاد و انکار کی وجہ یہ ہے کہ اس حدیث میں وارد ہے کہ خداوند عالم دوزخ کے پاس آئیں گے (یعنے خداوند قدس کی جانب "آنے گی" نسبت باعث انکار ہے) تو قرآن مجید میں بھی قیامت کے دن "آنا" آیت ذیل سے ثابت ہے ارشاد ہے:۔

جاء ربک والملک صفا صفا (الفجر ۲۲) — اور آئے گا تیرا پروردگار، اور فرشتے صف در صف (اکھٹے) ہوں گے۔

نیز قرآن کریم میں جہنم سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا بات چیت کرنا بھی ذیل کی آیت کریمہ سے ثابت ہے ارشاد ہے:۔

یوم نقول لجھنم: ھل امتلئت فتقول: ھل من مزید (ق ۳۰) — جس دن ہم جہنم سے کہیں گے: کیا تو بھر گئی تو وہ کہے گی: کیا ابھی اور بھی ہیں۔

غرض خدائے واحد لا شریک لہٗ کی ذات اور صفات کے مسئلہ میں عقل کو حَکَم بنانا خود بے عقلی اور حماقت کی دلیل ہے اور عموماً اس کا نتیجہ ان فریب خوردگان عقل و خرد کے حق میں لادینی اور دہریت کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔

اس لئے عقل کی خیر تو اسی میں ہے کہ وہ صرف ان چیزوں میں غور و فکر کرے جن میں وہ غور و فکر کی قدرت اور اہلیت رکھتی ہے۔ اور جبکہ یہ مُسلّم ہے کہ انسانی عقل خود انسان کی زندگی کے اسرار سمجھنے سے عاجز ہے اور اس عجیب و غریب کائنات کی وسعتوں میں سے کسی بھی ایک چیز حتیٰ کہ ایک ریت کے ذرہ کی برابر چیز کی حقیقت و ماہیت پر احاطہ کرنے سے بھی قاصر ہے تو بھلا اس کی کیا مجال ہے کہ وہ اس پوری کی پوری کائنات کے پیدا کرنے والے کی حقیقت کو جان سکے کیا آپ کے خیال میں یہ ممکن ہے کہ ایک چیونٹی جو ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں رینگتی ہے وہ اس ہمالیہ پہاڑ کی اونچائی، چوڑائی، چکلائی اور قطر کا تصور کر سکے۔

خدا احمد صافی نجفی شاعر کو اپنی رضا اور خوشنودی سے نوازے جس کا حسب ذیل شعر میں نے خود اس کی زبان سے سُنا ہے۔

یعترض العقل علی خالق	یہ انسانی عقل پیدا کرنے والے پر اعتراض کرتی ہے؟
من بعض مخلوقاتہ العقل	حالانکہ یہ عقل تو خود اس کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے

ایک دوسرے پہلو سے اصل مسئلہ کا جائزہ

آیئے اب ان احادیث کی صحت کو عقل کے معیار پر پرکھنے کے مسئلہ کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھئے۔

چلئے ہم مانے لیتے ہیں کہ احادیث کی صحت کے بارے میں عقل کو حَکَم بنانا درست ہے، لیکن ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ جس عقل کو آپ حَکَم بنانا چاہتے ہیں وہ کونسی اور کس کی عقل ہے؟

کیا اس عقل سے آپ کی مراد فلسفیوں کی عقل ہے؟ ان فلسفیوں میں تو خود آپس میں اتنا شدید اختلاف ہے کہ ہر بعد والا اپنے سے پہلے فلسفی کے عقلی فلسفہ کی تردید کرتا ہے۔

یا اس عقل سے آپ کی مراد ادیبوں کی عقل ہے؟ ادیبوں کو بھلا عقل و خرد سے کیا واسطہ؟ ان کی تو تمام تر توجہ تو — خدا انہیں معاف کرے — زیادہ سے زیادہ انوکھی، اور

دل چسپ باتیں، ہنسنے ہنسانے والے ادبی قصے اور کہانیاں بیان کرنے پر مرکوز ہوتی ہے

یا اس عقل سے آپ کی مراد طب (ایلوپیتھی) یا انجینئرنگ یا ریاضیات کے ماہرین کی عقل ہے؟

بھلا ان فنون کے ماہرین کو عقل اور نظر وفکر سے کیا علاقہ؟ ان فنون اور ان میں مہارت کا تعلق تو صرف عملیات (پریکٹیکل تھیوری) اور تجربیات سے ہوتا ہے۔

یا آپ کی مراد اس عقل سے حضرات محدثین کی عقل ہے؟ یہ اعتراف تو آپ کیوں کرنے لگے آپ تو پہلے ہی ان حضرات محدثین کو بے عقلی اور سیدھے پن کا سرٹیفکٹ دے چکے ہیں۔

یا آپ کی مراد فقہاء اور ائمہ مجتہدین کی عقل ہے؟ اول تو عقلیت کے اعتبار سے ان حضرات کے مسلک اور مکاتب فکر بہت مختلف اور متنوع ہیں علاوہ ازیں انکی عقلیت بھی آپ کی رائے میں محدثین کی عقلیت کی طرح برائے نام ہے چنانچہ محدثین کی طرح فقہا کو بھی آپ عقل وخرد سے کورا کہتے ہیں۔

یا اس عقل سے آپ کی مراد ملحدین اور لادینی کے علمبرداروں کی عقل ہے؟ تو یہ خدا ناشناس لوگ تو آپ کے خدا پر ایمان کو ہی آپ کی حماقت اور خرافات قرار دیتے ہیں۔

یا اس عقل سے آپ کی مراد اللہ کے وجود پر ایمان رکھنے والوں کی عقل ہے؟ تو آیئے ذرا خدا پر ایمان رکھنے والوں کے مختلف فرقوں کا جائزہ لیں۔

ان اللہ کو ماننے والوں میں سے ایک گروہ کا تو عقیدہ یہ ہے کہ خدا انسان کے وجود میں حلول کر کے ہی معبود بنتا ہے

ایک گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا کی روح کسی انسانی جسم میں اتر آتی ہے اور وہ معبود بن جاتا ہے۔

بعض کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا اور مخلوق ایک کامل وحدت ہے

بعض کا عقیدہ ہے کہ خدا تین اقانیم (عناصر) والی ایک ذات ہے۔

بعض کا عقیدہ یہ ہے کہ گائے، چوہے، اور بندر کی بھی عبادت کرنی چاہیے یہ بھی خدا ہیں ممکن ہے آپ فرمائیں: ہم تو ان مومنوں کی عقل کو حکم مانتے ہیں جو دین اسلام کے پیرو ہیں اور ایک خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔"

تو ہم آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ ان مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر (فرقوں) میں سے

آپ کس مکتب فکر (فرقہ) کی عقل سے مطمئن ہیں؟

اہل سنت والجماعت کی عقل سے؟ یہ تو نہ شیعہ گوارا کریں گے نہ معتزلہ اس کو پسند کریں گے۔

یا شیعہ مکتب فکر (فرقہ) کی عقل سے؟ اس کو نہ خوارج گوارا کریں گے اور نہ اہل سنت والجماعت۔

یا معتزلہ کی عقل سے؟ اس سے مسلمانوں کی اور تمام جماعتیں اتفاق نہیں کریں گی۔

اب آپ ہی فرمائیں: کس کی عقل کو آپ حکم بنانا پسند کرتے ہیں؟

ہمیں یقین ہے کہ پروفیسر ابوریہ فرمائیں گے کہ میں تو انہی معتزلہ کی عقل کو پسند کرتا ہوں اس لئے کہ یہی لوگ صریح اور خالص عقل کے مالک ہیں"

تو ہم پروفیسر ابوریہ کی خدمت میں ایک حدیث بطور مثال پیش کرتے ہیں جس کو معتزلہ کی عقل صریح نے ٹھکرا دیا ہے۔

ابن قتیبہ اپنی کتاب تاویل مختلف الحدیث میں بیان کرتے ہیں کہ معتزلہ نے جن احادیث کا انکار کیا ہے ان میں سے ایک حدیث یہ ہے کہ: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو آپ کی زرہ چند سیر جو کے عوض ایک یہودی کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی" معتزلہ کا دعویٰ ہے کہ نظر (عقلی نظر وفکر) اس حدیث کی تکذیب کرتی ہے [1]

اس کے بعد ابن قتیبہ نے معتزلہ کی اس نظر کا اس خوبی کے ساتھ تنقیدی جائزہ لیا ہے کہ ہر شخص بڑی آسانی سے اور خالص عقلی نقطہ نظر سے معتزلہ کی اس رائے کی تکذیب و تردید کر سکتا ہے علاوہ ازیں ابن قتیبہ نے اس حدیث کو عقل و نظر کے معیار پر پورا اور معقول ثابت کیا ہے۔

اب فرمائیں پروفیسر ابوریہ کہ عقلی نقطۂ نظر سے معتزلہ کے اس حدیث کو رد کرنے کے متعلق ان کی اور اُن کے ہمخیال عقلیت پرستوں کی کیا رائے ہے؟

---

[1] صفحہ ۱۷۶

علاوہ ازیں ابن قتیبہ نے اپنی کتاب میں ان تمام احادیث کا تتبع کیا ہے جن کا معتزلہ کی عقلیت انکار کرتی ہے اور ان کے جوابات دیئے ہیں جن میں سے بیشتر احادیث کو وہ عقل کے موافق ثابت کرنے میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے ہیں ہماری تحقیق کے مطابق جن احادیث کا جواب دینے میں ابن قتیبہ کامیاب نہیں ہوئے ہیں علماء حق کے پاس ان کے قابل قبول اور عقل کے معیار پر پورے جوابات موجود ہیں۔

ہم قارئین کی بصیرت کے لئے اس مباحثہ کی ایک مثال پیش کرتے ہیں جو "حدیث کے حامی" ابن قتیبہ اور فلاں "معتزلی" کی عقل کے درمیان ہوا ہے۔

ابن قتیبہ لکھتے ہیں :-

معتزلہ کہتے ہیں کہ ایک حدیث ہے جس کے آخری حصہ نے اول حصہ کو ناقابل اعتبار بنا دیا ہے، وہ حدیث یہ ہے :-

تم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی شخص سو کر اُٹھے تو اپنا ہاتھ پانی (کے برتن) میں ہرگز نہ ڈالے جب تک اس کو تین دفعہ نہ دھو لے، کیونکہ تم میں سے کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے ہاتھ نے رات کہاں گزاری"۔

معتزلہ کہتے ہیں: یہ حدیث درست ہوتی اگر اس کے آخر میں یہ جملہ نہ ہوتا کہ "تم میں سے کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ اسکے ہاتھ نے رات کہاں گذاری" اسلئے کہ ہم میں سے ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ اسکے ہاتھ نے بھی وہیں رات گزاری ہے جہاں اس کے سارے بدن نے رات گزاری ہے، جہاں اس کے پیر نے، اس کے کان نے، اس کی ناک اور تمام اعضاء بدن نے رات گزاری ہے، اس جملہ کی معقولیت کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ اہم بات یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ شاید اس نے سوتے میں شرمگاہ کو چھولیا ہو، سو بیداری میں بھی اگر آدمی اپنی شرمگاہ کو چھولے تو اس کا وضو نہیں ٹوٹتا چہ جائیکہ سوتے میں (لہٰذا یہ احتمال ہاتھ کو دھوئے بغیر پانی میں ڈالنے کی ممانعت کی معقول وجہ نہیں بن سکتا) اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ لوگ جس بات کو نہیں جانتے اور وہ ان سے سرزد ہو جائے تو خدا اس پر مواخذہ نہیں کرتا، دیکھئے سونے والا نیند میں کبھی اُلٹی سیدھی باتیں بکنے لگتا ہے کبھی

اپنی بیوی کو طلاق دیدیتا ہے، کبھی کفریہ کلمات بک دیتا ہے اور کبھی کسی پر اتہام لگا دیتا ہے لیکن نہ دنیوی احکام میں اس پر کوئی مواخذہ ہوتا ہے اور نہ اخروی احکام میں۔

ابن قتیبہ معتزلہ کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہیں:

ہم تو یہی کہتے ہیں کہ ہمارے مناظر صاحب کے حسب حال ذیل کی مشہور مثل ہے:

حفظت شيئاً و غابت عنك اشياء — تجھے تو بس ایک ہی بات یاد ہے اور باقی سب باتیں بھول گیا۔

ان حضرت کو یہ تک نہیں معلوم کہ بہت سے فقہاء کا اسی حدیث کی بنا پر نیز ایک دوسری حدیث کی بنا پر مذہب ہی یہ ہے کہ سوتے میں یا جاگتے میں، شرمگاہ کو چھو لینے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ دوسری حدیث یہ ہے:

جس شخص نے اپنی شرمگاہ کو چھو لیا اس کو چاہیئے کہ وہ وضو کرے۔

اگرچہ ہمارا (احناف کا) یہ مسلک نہیں ہے (تاہم یہ کہنا کہ شرمگاہ کو چھو لینے سے وضو نہیں ٹوٹتا مناظر کی بے خبری کی دلیل ہے)

ہمارے نزدیک تو اس حدیث میں شرمگاہ کو چھونے پر جس وضو کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد ہاتھ دھونا ہے (جیسا کہ زیر بحث حدیث میں تین مرتبہ ہاتھ دھونے کی تصریح ہے) کیونکہ شرمگاہوں سے ہی نجاستیں نکلتی ہیں اور وضو ٹوٹتے ہیں۔

آگے چلکر ابن قتیبہ کہتے ہیں: جب مذکورہ بالا حدیث میں شرمگاہ کو چھونے پر وضو کرنے سے مراد ہاتھ دھونا ہوا تو اس سے معلوم ہوا کہ زیر بحث حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سو کر اٹھنے والے کو یہ حکم کہ برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے تین مرتبہ ہاتھ دھو لینے چاہئیں" اس لئے دیا ہے کہ اس کو پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے ہاتھ نے رات کہاں گذاری یعنے کچھ بعید نہیں ہے کہ اس کا ہاتھ سوتے میں آگے یا پیچھے شرمگاہ سے لگ گیا ہو اور کوئی نجاست ہاتھ کو لگ گئی ہو۔ اور سو کر اٹھنے والے کو خاص طور پر یہ حکم اس لئے دیا کہ سونے والے کا ہاتھ بسا اوقات (کھجانے وجانے کے لئے) ایسی جگہوں پر پہونچ جاتا ہے اور اس کو خبر بھی نہیں ہوتی اس کے برعکس بیداری میں اگر کسی کا ہاتھ ایسی جگہوں پر پہونچ جاتا ہے اور

کوئی نجاست لگ جاتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے اور وہ اس کو بغیر دھوئے نہیں لئے پھرتا بلکہ فوراً دھولیتا ہے ورنہ کم ازکم برتن میں ڈلنے، کھانا کھانے یا کسی سے مصافحہ کرنے سے پہلے تو ضرور دھولیتا ہے[۱]

دیکھا آپ نے یہ ہے ایک معتزلی کی خالص عقل اور ایک محدث کی عقل نارسا کا نمونہ،

میں اس پر اتنا اضافہ ضروری سمجھتا ہوں کہ حفظان صحت کے مسلمہ اصول کے تحت اس مسئلہ میں اس محدث کی عقل کو ایک ماہر طب کی عقل کی تائید و حمایت حاصل ہے نہ کہ معتزلی کی عقل کو (یعنے حفظان صحت کے مسلمہ اصول، حدیث مذکورہ کی صحت کی تائید کرتے ہیں)

آخری بات

تصحیح حدیث کے سلسلہ میں آخری اور فیصلہ کُن بات یہ ہے کہ ائمہ حدیث اور مسلمانوں کے فقہانے حدیث کی تصحیح کے وقت اپنی عقلوں کو بالائے طاق نہیں رکھدیا ہے، ہاں اُنھوں نے اُس حد پر روک ضرور دیا ہے جہاں شریعت کے حکم کے مطابق اور اُن ارباب عقل وخرد کے فیصلہ کے مطابق عقل کو روک دینا چاہیئے جو اپنی عقلوں کے فریب خوردہ نہیں ہیں۔

مصنّف کے متعلق ناقد کی رائے

اب آخر میں خود مولف — پروفیسر الوریہ — کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہتا ہوں مگر خدا شاہد ہے کہ ان سطور کو لکھ کر میں ان کے "حق" کو ملیا میٹ کرنا نہیں چاہتا۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ میں مولف کے اس دعوے کو جو اُنھوں نے اپنی کتاب کے مقدمہ اور خاتمہ میں کیا ہے جھٹلانا نہیں چاہتا بلکہ تصدیق کرتا ہوں کہ وہ سچ کہتے ہیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ اُنھوں نے یہ تمامتر کوشش و کاوش اور محنت و مشقت صرف اپنی ان علمی تحقیقات کے ذریعہ رسول اللہ علیہ وسلم کی سنت کا دفاع کرنے کی غرض سے اور جھوٹے

---

[۱] صفحہ ۱۶۰ تا ۱۶۲ معمولی سے اختصار کے ساتھ۔

لوگوں اور دشمنوں نے جو دین کی صورت بگاڑ کر اس کی آبرو اور شہرت کو نقصان پہونچایا ہے اس سے دین کو بچانے کی غرض سے اٹھائی ہے۔"

اس لئے کہ میرے لئے کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ میں ان کی نیت پر حملہ کروں اور ان کی اغراض و مقاصد کے متعلق اپنی رائے سے کوئی فیصلہ کردوں اور انھوں نے "حسن نیت" کا دعویٰ کیا ہے اس کو جھٹلاؤں لیکن میری یہ رائے ضرور ہے کہ ان کی نیت کے ساتھ کچھ ان کے اپنے شخصی رجحانات ضرور کارفرما ہیں جس کی بنا پر انھوں نے اپنی اس خالص علمی تحقیق میں ان رجحانات کا اثر قطعاً قبول کیا ہے۔ اگر پروفیسر ابوریہ کی یہ علمی تحقیق ان ذاتی دلچسپیوں اور شخصی رجحانات کی آمیزش سے خالی اور پاک و صاف ہوتی تو وہ اس تخریبی نتیجہ کے بجائے کسی اور تعمیری نتیجہ پر پہونچتے۔

(۲) دوم یہ کہ مولف نے بڑے نمایاں طور پر اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ "انھیں اپنی اس علمی تحقیق (سائنٹیفک ریسرچ) کے دوران کتابوں کے مطالعہ اور واقعات کی چھان بین میں بہت سی مشقتیں اٹھانی پڑی ہیں۔"

بلاشبہ کسی علمی تحقیق اور چھان بین میں ایک محقق کی کاوشیں اور کوششیں علمی دنیا کی طرف سے شکریہ اور اعتراف کی مستحق ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے صحابہ کرام کے عہد سے لیکر ہمارے زمانہ تک کے تمام محدثین اور علماء سنت کی مساعی جمیلہ کا نہایت بیدردی کے ساتھ مختلف پہلوؤں سے انکار کیا ہے۔

(۱) اوّل یہ کہ احادیث کی چھان بین میں ان کی کوتاہی اور نقد حدیث میں عقل کو حکم بنانے سے ان کی لاپروائی و بے اعتنائی پر خوب خوب ماتم کیا ہے۔

(۲) دوم یہ کہ مدرج، مضطرب، شاذ اور معلل حدیثوں کے پہچاننے میں ان کی لاثانی کوششوں کو ــــ جو علمی دنیا میں ان کی علمی بیداری اور احتیاط کوشی کے مفاخر میں شمار ہوتی ہیں ــــ انھوں نے الٹا احادیث میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کا ذریعہ بتلایا ہے حالانکہ وہ علمی دنیا میں احادیث پر اعتماد حاصل کرنے کا محکم ذریعہ ہیں۔

ان علماء حدیث کی تیرہ سو برس بلکہ اس سے بھی زائد زمانہ کی ان جہود و مساعی کا انکار

——— جن کی دنیا میں نہ کوئی نظیر موجود ہے نہ مثال۔ نیز دنیا کی کوئی بھی دوسری قوم ان جیسی کاوشوں اور کوششوں کا سوواں حصہ بھی پیش نہیں کر سکتی ——— انتہائی مقام عبرت ہے خود اپنے شہر میں بیٹھکر چند سال موجود و میسر کتابوں کی ورق گردانی کرتے ہیں اور کتاب کی ترتیب ابواب میں معمولی سی مشقت اٹھاتے ہیں اور ان کی یہ حقیر سی محنت و مشقت، علم پر، تعلیمیافتہ طبقہ پر اور دینی مطالعہ کرنے والے لوگوں پر احسان جتلانے کے لائق قرار پاتی ہے اور ابوریہ اس پر خدا سے اجر و ثواب عظیم کی امید رکھنے کے مستحق بنتے ہیں۔ ایک طرف یہ حقیر سی کوشش و کاوش ہے دوسری طرف متقدمین علماء حدیث کی کوششیں اور کاوشیں ہیں کہ ایک ایک عالم حدیث ہزار ہزار میل پیدل چل کر جاتا اور سفر کی مصیبتیں جھیلتا، دسیوں سال عالم اسلامی کے چکر کاٹتا اور شمع و قندیل کی روشنی میں راتوں جاگتا تب جاکر صیانت حدیث و سنت کی غرض سے کوئی کتاب لکھتا۔ کیا ان محیر العقول کاوشوں اور کوششوں کے سامنے پروفیسر ابوریہ کی اپنے گھر میں بیٹھکر چند سالہ کوشش و کاوش بھی کسی شمار میں آسکتی ہے؟ اخلاص کا عالم یہ ہے کہ ایسی حوصلہ شکن محنتیں اور مشقتیں اٹھانے کے بعد بھی متقدمین علماءِ حدیث اپنی ان کاوشوں کا احسان مسلمانوں پر نہیں جتاتے بلکہ وہ صرف خداوند تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے طالب ہوتے ہیں۔

کیا یہی ان بزرگوں کے احسان عظیم کا اعتراف ہے کہ ابوریہ جیسے کم حوصلہ انسان اٹھکر ان حضرات پر کوتاہ کاری کا الزام لگائیں صرف اس بناپر کہ ان بزرگوں نے آج سے ایک ہزار سال پہلے مصنف کی جیسی کتاب کیوں نہیں لکھی جس کا لکھنا ان کے لئے ضروری تھا۔

پروفیسر ابوریہ کی کتاب اضواء علی السنۃ المحمدیہ کا ہر پڑھنے والا اس سوال کا جواب دے سکتا ہے۔

(۳) سوم یہ کہ مؤلف نے ——— اپنے منہ میاں مٹھو کے بمصداق ——— اپنی اس کتاب کی تعریف و توصیف میں انتہائی مبالغہ بلکہ خودستائی سے کام لیا ہے

فرماتے ہیں: "یہ اپنی نوعیت کا پہلا مبسوط مقالہ ہے جو علمی تحقیق (سائنٹیفک ریسرچ) کے اصولوں پر لکھا گیا ہے۔ یہ اپنے موضوع پر پہلی پیش کش ہے اس معیار کی علمی تحقیق اس سے

قبل کسی لکھنے والے کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آئی ہوگی"۔

اس کے آگے لکھتے ہیں: "بالخصوص اس لئے کہ اس قسم کی تصنیف کا اس سے پہلے کوئی ایسا علمی نمونہ نہ تھا جس کو سامنے رکھکر ہم کتاب لکھتے اور نہ ہمارے سامنے علمی تحقیق کی کوئی ایسی شاہراہ تھی جس پر ہمارے پیش رو چلے ہوں کہ ہم بھی ان کے نقش قدم پر چل سکتے حالانکہ اس جیسی کتاب تو آج سے ایک ہزار سال پہلے تصنیف ہونی چاہیئے تھی"۔

دنیا جانتی اور مانتی ہے کہ کسی اعلیٰ مرتبہ کے عالم کی سب سے زیادہ نمایاں خوبی اس کی تواضع اور انکساری ہوتی ہے اس کے برعکس خدا اور مخلوق کی نگاہ میں ایک عالم کی سب سے زیادہ مبغوض خصلت اور قابل نفرت صفت اپنے علم اور علمی مساعی پر اُس کا تفاخر اور تعلّی ہوتی ہے۔ قواعد شریعت کی رو سے بھی انسان کا اپنے عمل پر فخر کرنا اور اترانا اس کے اجر و ثواب کو برباد کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے علما کے اخلاق تو یہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنی تصانیف کے مقدمہ میں ہی اس کا اعتراف کیا کرتے ہیں کہ اس تصنیف و تالیف اور تحقیق میں غلطیوں اور لغزشوں کا امکان ہے، اور پڑھنے والوں سے درخواست کیا کرتے ہیں کہ جب اہل علم کو ان کی کتاب میں کوئی غلطی نظر آئے وہ اس کی اصلاح کر دیں اور مؤلف کے لئے دعا مغفرت فرمائیں۔

میں نہیں چاہتا کہ نفسیاتی پہلو سے اس کتاب کے بارے میں مؤلف کی اس خودستائی کے داعیہ اور محرک کی نشاندہی کروں ــ اس لئے کہ مؤلف ــ جیسا کہ ان کی کتاب سے ظاہر ہے ــ نفسیاتی تحلیل کے بھی بہت بڑے ماہر ہیں، میں تو یہاں صرف ابن عطاء اللہ سکندری کا ایک ملفوظ نقل کرتا ہوں فرماتے ہیں:

> تمہارا ایک ایسے جاہل کی صحبت میں رہنا جو خود پسند نہ ہو اُس عالم کی صحبت میں رہنے سے بہت بہتر ہے جو خود پسند اور مغرور ہو، اور ایسے عالم کا علم بھی کوئی علم ہے جو مغرور اور خود پسند ہو اور ایسے جاہل کی جہالت بھی کوئی جہالت ہے جو خود پسند نہ ہو اور اپنے کو نادان سمجھتا ہو۔

(۴) چہارم یہ کہ جن اہل علم کے بارے میں مؤلف کو یقین تھا کہ وہ ان کی اس نام نہاد

علمی تحقیق کی تردید میں قلم اٹھائیں گے ان کے بارے میں مؤلف نے پہلے سے پہلے ہی انتہائی درشتی، بدگوئی اور دشنام طرازی کا مظاہرہ کیا ہے چنانچہ وہ متوقع ناقدین کے بارے میں لکھتے ہیں:-

اس کتاب پر تنقید اور معارضہ (تردید) کے لئے وہ لوگ اٹھیں گے جن کے افکار وخیالات متعفن ہو چکے ہیں۔ اور جن کی عقلیں پتھر کی طرح جامد ہو چکی ہیں۔

کتاب کے آخر میں اس کتاب کی تصنیف میں اپنی کاوشوں اور کوششوں پر شیخیاں مارنے کے بعد فرماتے ہیں:-

اگر یہ بکواس کرنے والے جہالت کے علمبردار جو گدھے کی طرح کتابیں لادے پھرتے ہیں، اس کتاب کو دیکھکر دل تنگ ہوں — جن کی کیفیت یہ ہے کہ انھیں اپنے "جھوٹے علم" پر حق کی یورش کا ہمیشہ خطرہ لگا رہتا ہے، اور جنھیں ہر وقت اس بات کا اندیشہ کھائے جاتا ہے کہ علم صحیح کے نور نے اگر ان کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اور گہرائیوں تک پہونچنے والے دلائل کی روشنی نے ان کا پردہ چاک کر دیا تو ان کی یہ سڑی ہوئی دقیانوسی علمیت جس کے ذریعہ وہ لوگوں کا مال کھا رہے ہیں ناکارہ ہو جائے گی اور وہ بھوکے مر جائیں گے — تو ایسے لوگوں کی تنگدلی اور بیزاری کی ہمیں قطعا پروا نہیں کیونکہ ان جیسے لوگوں کی نہ ہماری نظر میں کوئی قیمت ہے اور نہ ہمارے حساب میں ان کا کوئی وزن ہے۔

حالانکہ خود انھوں نے جلیل القدر صحابی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر حرف گیری اور عیب چینی کے سلسلہ میں جو گندا اچھالا ہے وہ عنقریب آپ کے سامنے آجائے گا۔ حضرت ابوہریرۃ کے حق میں خود مصنف نے ایسے فحش اور تہذیب سے گرے ہوئے الفاظ استعمال کئے ہیں جن سے بازاری لوگ بھی بچتے ہیں، مستشرقین میں سے یہود و نصاریٰ نے بھی ایسے فحش الفاظ ان کے حق میں استعمال نہیں کئے۔

میں نہیں سمجھتا کہ آیا یہی اس علمی تحقیق (سائنٹیفک ریسرچ) کے ضوابط ہیں جو آج تک کسی مصنف کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئی کہ ایک علم و تحقیق کا دعوے دار تہذیب و شائستگی

عاری ہو، دشنام طراز ہو اور اُن لوگوں پر بدترین فقرے کسے اور غیر مہذب حملے کرے جن کی تاریخ لکھنے وہ بیٹھا ہے یا جو لوگ اسکی تردید کریں گے
میں جن آداب سے واقف ہوں وہ تو یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے :۔

حیا ایمان کا خاصہ ہے اور ایمان کا مقام جنت ہے اور بد کلامی قساوت قلبی ہے اور قلبی قساوت کا مقام دوزخ ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ پروفیسر ابوریہ اس حدیث پر اس لئے طعن و تشنیع کریں گے کہ اس کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں، تاہم ہم ان کی خاطر سے ایک اور حدیث پیش کرتے ہیں جس کو ابوہریرہ نے نہیں، زید بن طلحہ بن رُکانہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے وہ یہ ہے: ہر مذہب کے کچھ مخصوص اخلاق ہوتے ہیں، اسلام کا مخصوص خلق حیاء ہے" واقعی سچ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

بہرحال پروفیسر ابوریہ کی کتاب اضواء علی السنۃ المحمدیہ پر یہ ایک اجمالی تبصرہ ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس کتاب کا تفصیلی جائزہ لے سکتا لیکن میری تندرستی نے جو خاص طور پر اس مقدمہ کے لکھنے کے وقت شدید خطرہ میں ہے۔ مجھے مجبور کر دیا کہ میں تفصیلی تنقید کی حسرت اپنے دل میں ہی لیجاؤں اور سر دست انہی حقائق کے بیان پر اکتفا کروں جو اہل علم کے نزدیک تاریخ سنت اور تدوین حدیث کے سلسلہ میں مُسلم اور ثابت شدہ ہیں یہ مدلل و مبرہن حقائق ابوریہ کی کتاب میں جو خرافات بھری پڑی ہیں ان کی واضح تردید و تکذیب کے لئے بہت کافی ہیں۔
نیز میں اس لئے بھی اسی مثبت جواب پر اکتفا کرتا ہوں کہ بعض فاضل علما اس کی کتاب کا رد بہتر طریقے سے لکھ چکے ہیں (۱)

---

(۱) ان کتابوں میں سے پہلی کتاب ظلمات ابی ریہ امام اضواء السنۃ المحمدیہ مصنفہ فضیلۃ الاستاذ محمد عبدالرزاق حمزہ۔ یہ بڑی قیمتی اور قابل قدر کتاب ہے کاش یہ درشت الفاظ و کلمات سے خالی ہوتی۔

میں اللہ تعالیٰ شانہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں حق کی راہ دکھائے اور اس پر ہمیں ثابت قدم رکھے اور ہمیں خطاؤں، لغزشوں سے محفوظ رکھے اور ہمارے جملہ امور میں رشد و ہدایت عطا فرمائے۔

مصطفیٰ حسنی السباعی

(۱) صدر شعبہ فقہ اسلامی و مذاہب فقہیہ جامعہ دمشق

(۲) استاذ احوال شخصیہ (پرسنل لا)

کلیتہ الشریعة وکلیة الحقوق دمشق

۱۵ر شعبان ۱۳۷۶ھ، ۱۲ر فروری ۱۹۶۰ء

---

(۲) دوسری کتاب الانوار الکاشفہ لما فی کتاب اضواء علی السنة المحمدیہ من الزلل والتضلیل والمجازفہ مصنفہ عالم محقق عبدالرحمٰن بن یحییٰ المعلمی الیمانی ہے

ابھی — تقریباً ایک ماہ پہلے — مجھے ان دونوں کتابوں کا علم ہوا ہے اللہ تعالیٰ ان دونوں حضرات کو جزاء خیر عطا فرمائیں۔

پہلا باب

اس میں چار فصلیں ہیں

فصل اوّل

سُنّت کے لغوی معنی اور اُسکی اصطلاحی تعریف

سنت کے لغوی معنی سنت عربی لغت میں "طریقہ کار" اور "طرز عمل" کو کہتے ہیں خواہ اچھا ہو یا بُرا۔ اسی مفہوم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آیا ہے :-

جس شخص نے کسی اچھے طریقہ کو رائج کیا تو اس شخص کو خود اپنے عمل کا بھی ثواب ملے گا اور قیامت تک جو لوگ اس پر چلیں گے ان کا ثواب بھی ملے گا (اس کے بغیر کہ خود اُس کے ثواب میں کوئی کمی ہو) اور جس شخص نے کسی بُرے طریقہ کو رائج کیا تو اس شخص کے ذمہ خود اپنا بوجھ (گناہ) بھی ہوگا اور ان تمام لوگوں کا بوجھ (گناہ) بھی ہوگا جو قیامت تک اس پر چلیں گے (اس کے

بغیر کہ خود اس کے گناہ میں کوئی کمی ہو) [۱]

ایک دوسری حدیث میں اس طرح آیا ہے :-

تم لوگ : اپنے سے پہلی اُمتوں کے طریقوں پر چل کر رہو گے قدم بقدم اور دست بدست [۲]

سنت کے اصطلاحی معنی محدثین کی اصطلاح میں : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بھی آپ کا قول، فعل یا بیان سکوتی، نیز آپ کی کوئی بھی جسمانی صفت یا اخلاقی کیفیت یا سیرت وخصلت — خواہ آپ کی بعثت سے پہلے کی ہو یا بعد کی — نقل کی گئی ہو، اس کو سُنت کہتے ہیں [۳]

اس اصطلاح کے اعتبار سے سُنت، "حدیث" کے مرادف (ہم معنی) ہے جیسا کہ بعض علماء حدیث کی رائے ہے۔

علماءِ اصول کی اصطلاح میں : ہر اس قول یا فعل یا بیان سکوتی کو سنت کہتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کی طرف منسوب کر کے نقل کیا گیا ہو (اور اس سے کوئی حکم شرعی ثابت ہوتا ہو)

قول کی مثال :- بیان احکام شرعیہ کے سلسلہ میں مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر، جو بھی آپ نے ارشاد فرمایا وہ سب "سنت قولی" میں داخل ہے مثلاً آپ کا یہ فرمانا :

انما الاعمال بالنیات [۴] — اعمال کا دارومدار تو بس نیتوں پر ہے

اسی طرح آپ کا یہ فرمان :-

لا وصیۃ لوارث [۵] — وارث کے حق میں کوئی وصیت نہیں کی جاسکتی۔

فعل کی مثال :- عبادات وغیرہ کی کیفیات سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] صحیح مسلم [۲] صحیحین بخاری ومسلم [۳] قواعد التحدیث ص ۳۵-۳۸ وتوجیہ النظر ص ۲۔ [۴] صحیحین ۱۲

[۵] اس حدیث کو دار قطنی نے حضرت جابرؓ کے واسطہ سے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث (باقی صفحہ ۹۲ پر)

کے وہ تمام افعال واعمال جو صحابہ کرام نے آپ کی طرف منسوب کر کے بیان کئے ہیں وہ سب "سنت فعلی" کی مثال ہیں جیسے نماز ادا کرنے کی کیفیت، حج کے مناسک (مخصوص افعال واعمال حج) روزوں کے آداب، ایک مرافعہ (مقدمہ) میں گواہ اور قسم پر فیصلہ فرمانا وغیرہ،

تقریر (بیان سکوتی) کی مثال :۔ وہ تمام افعال واعمال تقریر ــ بیان سکوتی کی مثال ہیں جو صحابہ کرام سے صادر ہوئے اور آپ نے بطور اظہار رضامندی ان پر سکوت فرمایا یا پسندیدگی اور تائید کا اظہار فرمایا۔

اظہار رضامندی کے طور پر سکوت کی مثال

غزوۂ بنی قریظہ کے موقعہ پر عصر کی نماز کے بارے میں صحابہ کرام کے اجتہاد پر آپ کا سکوت فرمانا، اظہار رضامندی کے طور پر تقریر (سکوت) کی مثال ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (بنی قریظہ کے محاصرہ کے لئے جانے والے) صحابہ سے فرمایا تھا۔

لا یصلین احد کم العصر الا فی بنی قریظۃ — بنی قریظہ کے سوا تم میں سے کوئی شخص عصر کی نماز نہ پڑھے

تو بعض صحابہ نے اس ممانعت کو حقیقت پر محمول کیا اور عصر کی نماز (بنی قریظہ پہونچکر) غروب کے بعد پڑھی اور کچھ صحابہ نے اس ممانعت کا مطلب یہ سمجھا کہ آپ کا مقصد صحابہ کو جلد از جلد پہونچنے پر برانگیختہ کرنا ہے (نماز عصر کو قضا کرنا مقصود نہیں ہے) اس لئے انھوں نے راستہ میں وقت پر ہی عصر کی نماز پڑھی۔ جب ان دونوں فریقوں کے اس مختلف عمل کی آپ کو اطلاع ملی تو آپ نے بطور تائید ہر دو فریق کے فعل پر سکوت فرمایا اور کسی کے عمل پر بھی سرزنش نہ فرمائی۔

اظہار پسندیدگی کی مثال

حسب ذیل واقعہ اظہار پسندیدگی کے طور پر تقریر (سکوت) کی مثال ہے۔ مروی ہے کہ :۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۹۱) ــــ کافی مشہور ہے یہاں تک کہ ابن حزم نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ حدیث "متواتر" ہے۔ امام شافعیؒ نے کتاب الام میں جو اس پر بحث کی ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث متواتر ہے ۱۲

(ایک موقعہ پر) خالد بن ولید نے اس (بھنی ہوئی) گوہ کو کھا لیا جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کی گئی تھی مگر آپ نے اس کو تناول نہیں فرمایا تھا تو بعض صحابہ نے دریافت کیا کہ: کیا یہ گوہ حرام ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا: نہیں (حرام تو نہیں ہے) لیکن ہماری سرزمین میں یہ گوہ ہوتی نہیں اس لئے مجھے اچھی نہیں لگتی (جس کو اچھی لگے وہ کھا سکتا ہے یہ فرمانا خالد بن ولید کے فعل کی تائید اور تقریر ہے)

سُنت کے ایک اور اصطلاحی معنی

سنت کا اطلاق محدثین کے نزدیک ہر اس امر پر بھی ہوتا ہے جس کا ثبوت کسی بھی شرعی دلیل سے موجود ہو خواہ قرآن مجید میں ہو خواہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو یا صحابہ کرام نے اس میں اجتہاد کیا ہو جیسے قرآن کریم کو یکجا جمع اور مرتب کرنا یا ایک طریقہ یعنے لغتِ قریش کے مطابق قرآن پڑھنے پر لوگوں کو آمادہ کرنا یا (اسلامی حکومت کے لئے) دفاتر قائم کرنا اسی معنی میں لفظ سنت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس فرمان میں استعمال ہوا ہے:

تم سنت پر میری اور میرے بعد خلفاء راشدین کی سُنت پر عمل کرنا لازم ہے۔

سنت کے اس معنی کے مقابلہ میں بدعت کا لفظ بولا جاتا ہے (یعنے ہر وہ امر جس کا ثبوت کسی بھی دلیل شرعی سے نہ ہو وہ بدعت ہے)

فقہہ کی اصطلاح میں سُنّت کے معنی

فقہاء کی اصطلاح میں سُنّت کا مصداق ہر وہ حکم ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تو ہو لیکن نہ فرض ہو نہ واجب۔ سُنّت کا لفظ اس معنی کے اعتبار سے احکام فقہیہ خمسہ[1] میں سے فرض، واجب وغیرہ کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض اوقات فقہا بھی سنت کا لفظ بدعت کے مقابلہ پر استعمال کرتے ہیں چنانچہ فقہا کے حسب ذیل قول میں سنت کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے "طلاق سنت یہ ہے اور طلاق بدعت یہ ہے"۔

سنت کے اصطلاحی معانی میں اختلاف کیوجہ

سنت کی اصطلاحی تعریف میں یہ اختلاف علماء شریعت کے موضوعات

[1] فقہی اصطلاح کے اعتبار سے احکام شرعیہ کی پانچ قسمیں ہیں فرض[1]، واجب[2]، سنت[3]، مستحب[4] یا مندوب، مباح[5] از مترجم

بحث اور علمی و فنی مقاصد کے اختلاف پر مبنی ہے ہر گروہ نے اپنے موضوع بحث اور علمی مقاصد کے مناسب تعریف کی ہے

چنانچہ علماء حدیث نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی سیرت، اخلاق و خصائل، حالات و واقعات اور اقوال و افعال سب کو نقل (اور محفوظ) کیا ہے خواہ ان کا تعلق کسی حکم شرعی کے ثبوت سے ہے یا نہیں کیونکہ ان کا موضوع بحث رسول اللہ صلی اللہ کی ذات معصوم ہے اس حیثیت سے کہ آپ (امت کے) وہ پیشوا اور رہنما ہیں جن کے متعلق اللہ جل شانہ نے خبر دی ہے کہ: آپ (امت کے لئے زندگی کا) نمونہ اور (دین کے) پیشوا ہیں۔"

علماء اصول نے رسول اللہ صلی اللہ کی ذات گرامی کو ایک ایسے صاحب شریعت پیغمبر کی حیثیت سے دیکھا جو اپنے بعد میں آنے والے مجتہدین کے لئے احکام شرعیہ اخذ کرنے کے قواعد و ضوابط تجویز کرتا اور ایک مکمل دستور زندگی لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے چنانچہ انھوں نے آپ کے صرف انہی اقوال و افعال اور سکوتی بیانوں کو محفوظ کرنے کا اہتمام کیا جن سے احکام شرعیہ ثابت ہوتے ہیں۔

علماء فقہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے صرف اس حیثیت سے بحث کی کہ آپ کا ہر قول و فعل کسی نہ کسی شرعی حکم کو متعین کرتا ہے اس لئے کہ فقہا کا موضوع بحث بندوں کے افعال و اعمال سے متعلق شرعی احکام کی نوعیت کو بیان کرنا یعنے فرض یا واجب ہونے حرام یا مکروہ ہونے مباح یا جائز ہونے کو متعین کرنا ہے۔

مصنف کے نزدیک سنت کے معنی

ہمارے موضوع بحث کے اعتبار سے ہماری مراد سنت سے وہی ہے جو علماء اصول کے پیش نظر ہے اس لئے کہ اسی مفہوم کے اعتبار سے سنت کی حجیت اور شرعی قانون میں اس کے مقام سے بحث ہوتی ہے اگرچہ سنت کو تاریخی اعتبار سے ثابت کرنے کے لئے ہم نے محدثین کی اصطلاح کے تحت سنت کے عام مفہوم و مصداق سے بھی بحث کی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا وجوب آپکی زندگی میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں صحابہ کرام قرآن حکیم کی جو آیات رسول اللہ صلی اللہ

سے سیکھتے اُن سے شرعی احکام کا استفادہ کیا کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر قرآن عظیم کی آیات "مجمل" نازل ہوتیں جن کی کوئی تفصیل نہ ہوتی یا "مطلق" ہوتیں جن کے ساتھ کوئی قید نہ ہوتی۔ مثلاً نماز پڑھنے کا حکم قرآن عظیم میں مجمل طور پر مذکور ہے نہ رکعتوں کا بیان ہے نہ نماز کی ہیئت کا ذکر ہے اور نہ ہی نماز کے اوقات پر روشنی ڈالی ہے اسی طرح زکوٰۃ کا حکم بھی قرآن کریم میں بالکل مجمل ہے نہ اموال زکوٰۃ کا ذکر ہے کہ کون کونسے مال میں زکوٰۃ آتی ہے، نہ مال زکوٰۃ کی کم سے کم حد یعنے نصاب کا ذکر ہے جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے نہ ہی مقدار زکوٰۃ اور شرائط وجوب زکوٰۃ کا بیان ہے۔

یہی حال بیشتر بلکہ تمامتر احکام کا ہے جن کو اُس وقت تک نافذ نہیں کیا جا سکتا، جب تک کہ ان کے ارکان و شرائط کی نیز ان کو فاسد و باطل کرنے والے اُمور کی وضاحت نہ کی جائے اس لئے واضح اور تفصیلی احکام جاننے اور اُن پر عمل کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرنا صحابہ کرام کے لئے ناگزیر تھا اور اسی کے وہ مامور تھے (اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انہی تمام جوابات اور قولی و فعلی بیانوں کا نام ہی سنت ہے جو آپ کی حیات میں ہی حجت شرعیہ تھی)

اسی طرح بہت سے ایسے واقعات پیش آتے جن کے متعلق قرآن میں کوئی واضح حکم موجود نہ ہوتا تو لازمی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہی ان واقعات کے احکام کا بیان ممکن تھا اس لئے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اللہ کے احکام پہونچانے کے لئے ہی بھیجے گئے تھے اور آپ ہی شریعت خداوندی کے مصالح اس کی حدود، اس کے طور طریقوں اور اغراض و مقاصد کو تمام مخلوق سے زیادہ جاننے والے اور واقف کار تھے (اس لئے یہ تمام احکامات بھی مصداق سنت ہیں اور حجت شرعیہ)

چنانچہ اللہ جل و علی نے اپنی کتاب کریم میں قرآن مجید کے متعلق رسول کی ذمہ داری یہی بتلائی ہے کہ وہ قرآن کی تفصیلات بتانے والے اور اس کی آیات کے معانی و مصادیق کی وضاحت کرنے والے ہیں۔ ارشاد ہے:-

وانزلنا الیک الذکر لتبین   اور ہم نے یہ ذکر (قرآن) آپ پر اس لئے اُتارا ہے

للناس ما نزل الیھم	کہ آپ لوگوں کو وضاحت کے ساتھ اس چیز (دین)
ولعلھم یتفکرون	کو بتلادیں جو ان کی طرف اُتاری گئی اور تاکہ وہ اس
(النحل آیت ۴۴)	میں غور وفکر کریں۔

اسی طرح اللہ نے آپ کا فرض یہ بھی بتلایا ہے کہ جب لوگوں کے درمیان حق کے بارے میں اختلاف ہو تو آپ حق کی وضاحت فرما دیں ارشاد ہے:۔

وما انزلنا علیک الکتاب	اور ہم نے آپ پر یہ کتاب صرف اس لئے اُتاری ہے
الا لتبین لھم الذی	کہ جن اُمور میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں آپ لوگوں
اختلفوا فیہ وھدی و	پر ان کی وضاحت کر دیں، اور ایمان لانے والوں
رحمۃ لقوم یومنون (النحل آیت ۶۴)	کی رہنمائی اور رحمت کی غرض سے (اُتاری ہے)

چنانچہ ہر اختلافی معاملہ میں آپ کے فیصلہ کو ماننا اور اس پر تسلیم خم کرنا اُن پر لازم قرار دیا۔ ارشاد ہے:۔

فلا وربک لا یومنون	تو (یوں ہی) نہیں، قسم ہے تمہارے رب کی یہ لوگ
حتی یحکموک فیما شجر	ایماندار نہ ہوں گے جب تک کہ یہ اپنے آپس
بینھم ثم لا یجدوا فی	میں واقع ہونے والے ہر جھگڑے میں تم سے
انفسھم حرجا مما قضیت	تصفیہ نہ کرائیں، اور پھر تمہارے فیصلے سے یہ لوگ
ویسلموا تسلیما	اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی نہ محسوس کریں، اور
(النساء آیت)	پورے طور پر (زبان سے بھی دل سے بھی) اسکو
	تسلیم نہ کرلیں:۔

(لہذا آپ کے تمام فیصلے بھی سنت کا مصداق اور حجت شرعیہ ہیں)

حکمت کا مصداق سنت ہی ہو سکتی ہے

اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتلا دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو چیزیں اللہ کی طرف سے دی گئی ہیں ایک قرآن عظیم اور دوسرے حکمت (سنت) تاکہ آپ ان دونوں کے ذریعہ لوگوں کو دین کے احکام سکھلائیں۔ ارشاد ہے:۔

لقد منّ اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا منھم تیلو علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین

{ آل عمران آیت ۱۶۴ }

حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر بڑا ہی احسان فرمایا ہے کہ انہی میں سے ایک پیغمبر کو بھیجا، جوان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سُناتا ہے اور ان (کے ظاہر و باطن) کو (آلودگیوں سے) پاک وصاف کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بالیقین یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے تھے۔

جمہور علما کے نزدیک حکمت کا مصداق سنّت ہے

جمہور علماء اور محققین کی رائے یہ ہے کہ حکمت قرآن کے علاوہ کوئی چیز ہے اور اس سے مراد دین الٰہی کے وہ اسرار اور شریعت خداوندی کے وہ احکام ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو (بذریعہ وحی غیر متلو) باخبر کیا ہے[1]۔ اور یہ حضراتِ علما و محققین حکمت کا مصداق سنت ہی بتلاتے ہیں۔

امام شافعی کا استدلال

چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

تو اللہ تعالیٰ نے ایک تو کتاب کا ذکر فرمایا ہے وہ تو قرآن ہے، اور ایک حکمت کا۔ تو اس حکمت کے بارے میں قرآن کے اُن اہل علم (مفسرین) سے

---

[1] اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب کی طرح حکمت بھی آپ پر اُتاری ہے ارشاد ہے:۔

وانزل اللہ علیک الکتاب والحکمۃ وعلمک ما لم تکن تعلم وکان فضل اللہ علیک عظیما۔

اور اللہ نے تم پر کتاب (اُتاری ہے) اور حکمت اُتاری ہے اور تمکو ان چیزوں (اسرار و حکم) کا علم دیا ہے جن کو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر تو اللہ کا بڑا ہی فضل و احسان ہے۔

یہ آیت کریمہ کتاب کے ساتھ حکمت یعنے سنت کے منزّل من اللہ ہونے کی قطعی دلیل ہے۔ ۱۲ مترجم

جو میرے نزدیک پسندیدہ علماء ہیں، میں نے سنا ہے وہ فرماتے ہیں کہ :
حکمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے" ان علماء
قرآن کی یہ رائے (کہ حکمت کا مصداق سنت ہے) اللہ جل مجدہ کے ارشاد
سے قریب تر ہے ___ واللہ اعلم ___ کیونکہ (اس آیت کریمہ میں اول) قرآن
کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد حکمت کو لایا گیا ہے۔

اس آیت کی ابتدا میں) اللہ جل جلالہٗ نے رسول کے، مخلوق
کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دینے پر اپنے احسان[۱] کا اظہار فرمایا ہے لہٰذا
یہاں اس کے سوا اور کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا ___ واللہ اعلم ___ کہ حکمت
سے مراد "رسول اللہ کی سنت" ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے حکمت کو کتاب
کے ساتھ بالکل متصل ذکر فرمایا ہے اور اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے
(اپنی اطاعت کے ساتھ) اپنے رسول کی اطاعت کو بھی فرض فرمایا ہے
اور لوگوں پر آپ کے ہر حکم کی پیروی کو لازم قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ کتاب
اللہ اور سنت رسول اللہ کے علاوہ اور کسی ... قول کو فرض کہا ہی نہیں
جا سکتا۔ کیونکہ ہم اس سے پہلے بتلا چکے ہیں کہ اللہ جل شانہٗ نے

---

[۱] یعنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر چار احسان فرمائے ہیں
(۱) اللہ کی آیات پڑھکر سنانا (کہ رسول کی وساطت کے بغیر اس کا امکان ہی نہ تھا کہ انسانوں تک
اللہ کا کلام پہونچ سکے)۔
(۲) ان کے نفوس کو کفر و شرک اور فسق و فجور کی گندگیوں سے پاک و صاف کرنا
(۳) کتاب اللہ کی تعلیم دینا (یعنے اس کے معانی و مطالب سمجھانا)
(۴) حکمت کی تعلیم دینا یعنے احکام شرعیہ کی تفصیلات اور ان کے مصالح و حکم سے آگاہ کرنا۔ اس لئے
کہ جیسے کتاب اللہ کے معانی و مطالب صاحب وحی و الہام رسول کے سوا اور کوئی نہیں بتلا سکتا اسی طرح
احکام شرعیہ کی تفصیلات اور مصالح و حکم بھی صاحب شریعت رسول کے سوا اور کوئی نہیں بتلا سکتا ۱۲ مترجم

ایمان بالرسول کو ایمان باللہ کے ساتھ متصل[1] قرار دیا ہے

(الرسالہ ص ۳۸)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اُن کو اس امر کا قطعی یقین ہے کہ حکمت کا مصداق سنت ہی ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے حکمت کا کتاب پر عطف کیا ہے (یعنے "کتاب اور حکمت" فرمایا ہے) اور دو چیزوں کا ایک دوسرے پر عطف ان کی مغائرت (الگ الگ ہونے) کو چاہتا ہے۔ علاوہ ازیں حکمت سے مراد سنت کے علاوہ اور کوئی

---

[1] دوسرے لفظوں میں یوں کہئے :۔ اللہ پر ایمان لانے کے ساتھ ہی رسول پر ایمان لانا بھی فرض ہے، اور اللہ کی اطاعت کے ساتھ ہی رسول کی اطاعت بھی فرض ہے، اللہ کی اطاعت کے وجوب کے لئے اللہ کی کتاب — قرآن — کا وجود لابدی ہے تو رسول کی اطاعت کے وجوب کے لئے رسول کی سنت یعنے آپ کے اقوال و افعال اور اوامر و نواہی کا وجود بھی ناگزیر ہے یہی سنت حکمت ہے جو اللہ نے کتاب کے ساتھ اُتاری ہے۔ رسول نہ اپنی طرف سے کوئی بات کہتا ہے نہ کوئی کام کرتا ہے، جو کہتا ہے وہ بھی وحی الہی ہے جو کرتا ہے وہ بھی وحی الہی کے تحت کرتا ہے قرآن اس کی شہادت دیتا ہے "قول" کے متعلق ارشاد ہے :۔

وما ینطق عن الھوٰی	اور وہ (تمہارا نبی) اپنی طرف سے کوئی
ان ھو الا وحی یوحی	بات نہیں کہتا وہ (جو کچھ کہتا ہے وہ)
	تو وحی ہے جو اس کے پاس بھیجی گئی ہے

"فعل" کے متعلق آپ کی زبان سے ارشاد ہے :۔

ان اتبع الا ما یوحی	میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں
الی۔	جو میرے پاس وحی بھیجی جاتی
	ہے۔

لہٰذا حکمت کا مصداق سنت کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا اور اس لحاظ سے سنت بھی قرآن کی طرح منزل من اللہ اور قرآن کے بعد حجت ہے واللہ اعلم۔ ۱۲ مترجم

چیز لینا درست ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اس آیت کریمہ میں اللہ جل شانہٗ نے ہم کو حکمت کی تعلیم دینے پر اپنے احسان عظیم کا اظہار فرمایا ہے اور احسان کا مصداق وہی چیز ہو سکتی ہے جو بجائے خود اپنا وجود رکھتی ہو اور سرتا سر درست اور برحق ہو لہٰذا حکمت کا اتباع بھی قرآن کے اتباع کی طرح واجب ہو گا اور یہ حقیقت ہے کہ ہم پر صرف قرآن عظیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ السلام کا اتباع ہی لازم قرار دیا گیا ہے تو اب قطعی طور پر متعین ہو گیا کہ حکمت کا مصداق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اقوال و افعال اور اوامر و نواہی اور فیصلے ہی ہو سکتے ہیں جو آپ نے تشریع یعنے بیان احکام شریعت کے سلسلہ میں صادر فرمائے ہیں

ایک اور استدلال جب صورت حال یہ ہے تو (اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن عظیم کے ساتھ کوئی اور چیز بھی دی گئی ہے جس کا اتباع بھی اُمت پر فرض ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف (فرائض منصبی) کے سلسلہ میں ذیل کی آیت کریمہ میں اس کی تصریح کی گئی ہے:

یأمرھم بالمعروف[۱]	وہ (نبی آخر الزماں) ان کو بھلے کاموں کا
وینھٰھم عن المنکر[۲]	حکم دیتا ہے اور بُرے کاموں سے منع
ویحل لھم الطیبات[۳]	کرتا ہے۔ پاک اور حلال چیزوں کو ان
ویحرم علیھم الخبائث[۴]	کے لئے حلال کرتا ہے اور خبیث چیزوں
ویضع عنھم اصرھم[۵]	کو اُن پر حرام کرتا ہے اور اُن کے پر جو بوجھ
والاغلال التی کانت	اور ان کی گردن پر جو (شدید احکام)
علیھم (الاعراف ۱۵۷)	کے طوق تھے ان کو دور کرتا ہے

اور جبکہ "یحل" کے الفاظ عام ہیں تو یہ تحلیل و تحریم ان تمام چیزوں پر مشتمل ہونی چاہیئے جن کا ماخذ خواہ قرآن کی کوئی نص (صریح آیت) ہو یا (قرآن کے علاوہ) وحی (غیر متلو) اُن کا ماخذ ہو جو اللہ نے آپ کے پاس بھیجی ہو۔ اس کی تائید مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے بھی ہوتی جس کی تخریج امام ابو داؤد نے سنن ابی داؤد میں کی ہے:

اس کے الفاظ یہ ہیں :-

اَلَا اِنِّی اوتیت الکتاب	آگاہ ہو، مجھکو کتاب بھی دی گئی ہے اور اسی کے
ومثلہٗ معہ	ساتھ اس جیسی اور چیز (وحی) بھی عطا کی گئی ہے[1]

ایک اور استدلال اس کی قطعی دلیل یہ ہے کہ آیت کریمہ ذیل میں مسلمانوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور تعمیل حکم ہر اس چیز میں فرض کی گئی ہے جس کا آپ حکم دیں یا جس سے آپ منع فرمائیں۔ ارشاد ہے

ما اتاکم الرسول فخذ وہ	اور رسول جو حکم تمہیں دے اسکو قبول کرو اور جس
وما نہاکم عنہ فانتہوا	چیز سے تم کو منع کرے اس سے باز آؤ اور اللہ سے
واتقوا اللہ (الحشر ۲)	ڈرتے رہو۔

علاوہ ازیں اللہ جل مجدہٗ نے بہت سی آیتوں میں رسول کی اطاعت (کہا ماننے) کو اپنی اطاعت کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد ہے :-

واطیعوا اللہ والرسول لعلکم	اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی تاکہ تم پر رحم کیا
ترحمون (آل عمران ۱۳۲)	جائے (رحمت کے مستحق ہو جاؤ)

ذیل کی آیت کریمہ میں رسول جس چیز کی طرف بھی بلائے اس کو اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے ارشاد ہے :-

یا ایہا الذین آمنوا استجیبوا اللہ	اے ایمان والو! تم بات مانو اللہ کی اور رسول کی
والرسول اذا دعاکم لما یحییکم	جب وہ (رسول) تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو
(الانفال ۲۴)	تمہیں زندگی بخشتی ہے

یہاں تک کہ اللہ جل جلالہٗ نے رسول کی اطاعت کو اپنی اطاعت اور رسول کی پیروی کو اپنی محبت کا سبب قرار دیا ہے ارشاد ہے :-

---

[1] احادیث کی مزاولت رکھنے والے جانتے ہیں کہ بیشتر احکام شرعیہ وحی غیر متلو کے ذریعہ آپ نے نافذ فرمائے ہیں (ملاحظہ کیجئے "سنت کا تشریعی مقام قرآن عظیم کی روشنی میں" ۱۲ مترجم)

(۱) من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (النساء: ۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی۔

(۲) قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم (آل عمران: ۳۱)

تم کہدو: اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔

اسی لئے اللہ جل شانہٗ نے رسول کے حکم کی مخالفت سے بیحد ڈرایا ہے۔ ارشاد ہے:۔

فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبھم فتنۃ او یصیبھم عذاب الیم (الاحزاب: ۶۳)

جو لوگ اُس (رسول) کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں انھیں ضرور ڈرنا چاہیئے۔ اس سے کہ وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں یا دردناک عذاب انکو آگھیرے

بلکہ اس بات کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ آپ کی مخالفت کفر ہے ارشاد ہے:۔

قل اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول فان تولوا فان اللہ لا یحب الکافرین (آل عمران ۳۲)

تم کہدو: اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو پس اگر تم (اللہ اور رسول کی اطاعت سے) روگردانی کرو گے تو یاد رکھو کہ اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

حد یہ ہے کہ خدا نے مسلمانوں کو تو ذرا بھی اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ آپ کے کسی فیصلے کیا آپ کے احکامات کی ذرا بھی مخالفت کریں، ارشاد ہے:۔

وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالا بعیدا (الاحزاب: ۳۶)

اور ایمان دار مرد اور ایمان دار عورت سے تو یہ بالکل بعید ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کردیں تو ان کو اپنے معاملہ میں اختیار ہو (کہ چاہے مانیں چاہے نہ مانیں) اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ تو درحقیقت (حق سے) بہت دور گمراہی میں جا پڑا۔

اسی لئے باہمی اختلاف اور نزاع کے موقعوں پر رسول اللہ کو حکم (ثالث) بنانے سے انحراف کو منافقت کی علامت قرار دیا ہے (اور اطاعت کو علامتِ ایمان) ارشاد ہے:-

(۱) ویقولون آمنا باللہ وبالرسول واطعنا ثم یتولی فریق منھم من بعد ذالک وما اولئک بالمؤمنین

اور وہ (منافق علانیہ) کہتے ہیں ہم تو ایمان لے آئے اللہ پر اور رسول پر اور ہم نے اطاعت اختیار کرلی ہے پھر اس کے بعد بھی ان میں سے ایک گروہ (خدا اور رسول کے حکم سے) روگردانی کرتا ہے اور وہ تو ایمان والے ہیں ہی نہیں۔

(۲) واذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم اذا فریق منھم معرضون۔

اور جب انھیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو اچانک اُن میں کا ایک گروہ منحرف ہوجاتا ہے۔

(۳) انما کان قول المومنین اذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا واطعنا واولئک ھم المفلحون

اسکے سوا نہیں کہ ایمان والوں کو تو جب خدا اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ (رسول) ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان کا کہنا تو یہ ہوتا ہے کہ وہ فوراً کہہ دیتے ہیں: ہم نے سُن لیا (جو کچھ آپ نے فرمایا) اور مان لیا (جو آپ نے فیصلہ دیا)، یہی ایمان والے ہیں فلاح پانے والے۔

بلکہ اللہ جل شانہ نے تو ایمان کے لوازم میں سے یہ قرار دیا ہے کہ جب وہ (کسی اجتماعی مجلس میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوں تو آپ سے اجازت لئے بغیر وہاں سے جائیں بھی نہیں ارشاد ہے:-

انما المومنون الذین آمنوا باللہ ورسولہ واذا کانوا معہ علی امر جامع لم یذھبوا

اس کے سوا نہیں کہ ایمان والے تو صرف وہ لوگ ہیں جو (دل وجان سے) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور جب وہ رسول کے ساتھ کسی

حتی یستئاذنوہ ان الذین یستئذنونک اولئک الذین یومنون باللہ ورسولہ فاذا استئاذنوک لبعض شانہم فاذن لمن شئت منہم واستغفر لہم اللہ ان اللہ غفور رحیم

(النور: ۶۲)

اجتماعی کام میں (شریک اور موجود) ہوتے ہیں تو جب تک اس رسول سے اجازت نہیں لے لیتے وہاں سے جاتے بھی نہیں۔ درحقیقت جو لوگ (بوقت ضرورت) آپ سے اجازت مانگتے ہیں یہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔ پس جب یہ لوگ تم سے اپنے کسی کام کے لئے (جانے کی) اجازت مانگیں تو ان میں سے جس کو تم چاہو اجازت دیدو اور (اس کوتاہی پر) تم ان کے لئے اللہ سے مغفرت کی دعا کرو، بیشک اللہ تو بہت بخشنے والا، بڑا ہی مہربان ہے۔

مذکورہ بالا آیت سے حافظ ابن قیمؒ کا اتباع سنت پر استدلال

حافظ ابن قیم کہتے ہیں:۔

جب اللہ تعالیٰ نے اس بات کو بھی ایمان کے لوازم میں سے قرار دیا کہ جب اہل ایمان آپ کے ساتھ (کسی کام میں شریک) ہوں تو بغیر آپ سے اجازت لئے کہیں نہ جائیں تو یہ بات بدرجہ اولیٰ ایمان کے لوازم میں سے ہونی چاہیئے کہ وہ کوئی بھی قول اور کوئی بھی علمی مسلک آپ کی اجازت کے بغیر نہ اختیار کریں اور آپ کی اجازت کا علم انہی احادیث کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے جو آپ سے مروی ہیں کہ آپ نے اجازت دی ہے (یا نہیں) اسی کا نام اتباع سنت ہے)

مذکورہ بالا بحث کا نتیجہ

انہی وجوہ کی بنا پر صحابہ کرام کے لئے ضروری اور لازمی تھا کہ وہ (احکام شریعت معلوم کرنے اور اُن پر عمل کرنے کی غرض سے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کریں جو اُن کے سامنے (اللہ تعالیٰ

کے منشا کے مطابق) قرآن عظیم کے مجمل احکام کی تفصیل بیان کرتے اور دشوار و مشکل مضامین کی وضاحت فرماتے تھے نیز اُن کے آپس کے جھگڑے چکاتے تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی آپ کے احکامات، اوامر و نواہی کی حدود کی پوری پوری پابندی کیا کرتے تھے، اپنے تمام اعمال و افعال، عبادات و معاملات میں آپ کی مکمل پیروی کرتے تھے بجز ان امور کے جن کے متعلق اُنھیں معلوم ہوتا کہ یہ آپ کے ساتھ مخصوص ہیں۔

چنانچہ صحابہ آپ سے نماز کے احکام اس کے ارکان اور قیام وقعود، رکوع و سجود کی ہیئتوں اور صورتوں کو سیکھتے، صحابہ کا یہ تجسس اور اتباع آپ کے اس حکم کی تعمیل پر مبنی تھا جو آپ نے ان کو دیا ہوا تھا کہ "تم اس طرح نماز پڑھا کرو جیسے مجھے پڑھتا ہوا دیکھتے ہو۔" اسی طرح آپ کے اِس حکم کی تعمیل میں کہ "تم مجھ سے حج کے احکام سیکھ لو" انھوں نے آپ سے حج کے طریقے اور اس کے مخصوص احکام سیکھ لئے تھے۔

بلکہ اگر کسی صحابی کے متعلق معلوم ہوتا کہ وہ (کسی بھی وجہ سے) آپ کی پیروی نہیں کرتا تو آپ اس پر ناراض ہوتے۔

چنانچہ امام مالک نے مؤطا میں عطاء بن یسار کی ایک روایت نقل کی ہے کہ:-

ایک صحابی نے اپنی بیوی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ مسئلہ دریافت کرنے کے لئے بھیجا کہ اگر کوئی روزہ دار روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لے لے تو اس کا کیا حکم ہے؟ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے اس عورت کو بتلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی روزہ کی حالت میں اپنی بیویوں کا بوسہ لے لیتے ہیں۔ وہ عورت اپنے شوہر کے پاس واپس گئی اور اس کو بتلایا (کہ حضور علیہ السلام بھی ایسا کر لیتے ہیں)، تو اس پر اس صحابی نے کہا: "میں تو رسول اللہ کی طرح نہیں ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے لئے جو چاہیں حلال کر دیں"۔ اس صحابی کی یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک بھی پہونچ گئی تو اس پر آپ نے بڑی ناراضگی کا اظہار فرمایا، اور ارشاد فرمایا:- "میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس

(کے احکام) کی حدود کو جاننے (اور اُن پر عمل کرنے) والا ہوں"۔ [1]

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام پر اس وقت بھی ناراض ہوئے تھے جب آپ نے "صلح حدیبیہ" کے موقعہ پر صحابہ کو سر منڈوانے اور احرام کھول دینے کا حکم دیا اور انھوں نے اس کی تعمیل نہ کی تو اس وقت صحابہ کی یہ حرکت آپ کو بہت ناگوار معلوم ہوئی اور (حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کے مشورہ دینے پر) آپ نے خود سبقت فرمائی، حلق کرایا اور احرام کھولدیا تو یہ دیکھکر تمام صحابہ آپ کے اقتداء کی طرف دوڑ پڑے (اور سب نے احرام کھولدیئے)

صحابہ کرام کا جذبۂ اتباع

اور روایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کے آپ کا اقتداء کرنے کا تو یہ عالم تھا کہ جو کام بھی آپ کرتے تھے وہی کام وہ بھی کرنے لگتے تھے اور جس کام کو آپ چھوڑ دیتے تھے اس کو وہ بھی چھوڑ دیتے تھے اس کے بغیر کہ وہ آپ سے کوئی سبب، علت یا حکمت دریافت کریں۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے وہ کہتے ہیں:۔

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ (فرامین پر مہر لگانے کی غرض سے) ایک سونے کی انگوٹھی بنوائی تو صحابہ نے بھی (آپ کو انگوٹھی پہنے ہوئے دیکھکر) سونے کی انگوٹھیاں بنوالیں۔ اس کے بعد آپ نے اس انگوٹھی کو اُتار پھینکا اور فرمایا: میں اب کبھی سونے کی انگوٹھی نہیں پہنوں گا" تو صحابہ نے بھی اپنی انگوٹھیاں اُتار کر پھینکدیں [1]

قاضی عیاض نے شفاء کی شرح [2] میں بروایت حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ واقعہ نقل کیا ہے کہ:۔

> ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا رہے تھے کہ اچانک

---

[1] امام شافعیؒ نے اس واقعہ اور حدیث کو الرسالہ میں بھی نقل کیا ہے: ص ۴۰۴ ج ۱۲

[2] یہ ٹائپ کی غلطی یا سبقت قلم ہے قاضی عیاض کی کتاب خود شفا ہے نہ کہ اس کی شرح باقی یہ حدیث صحاح ستہ میں موجود ہے۔ البتہ اُس میں بائیں جانب رکھنے کا ذکر نہیں۔

آپ نے نماز میں ہی اپنے نعلین (چپّل) اُتار کر بائیں جانب رکھ دیئے جب لوگوں نے یہ دیکھا تو اُنھوں نے بھی اپنے چپل اُتار دیئے۔ تو جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: تم نے اپنے چپل کیوں اُتار دیئے؟ صحابہ نے جواب دیا: ہم نے دیکھا کہ آپ نے (نماز میں ہی) چپل اُتار دیئے (تو ہم نے بھی اُتار دیئے) آپ نے فرمایا: مجھے تو جبرئیل نے بتلایا تھا کہ میرے چپلوں میں گندگی لگی ہوئی ہے (اس لئے میں نے اُتار دیئے تھے)

ابن سعد نے طبقات میں بیان کیا ہے کہ:-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں ظہر کی دو رکعتیں پڑھائی تھیں کہ (نماز میں ہی) آپ کو مسجد حرام — بیت اللہ — کی طرف رُخ کر لینے کا حکم ہوا تو آپ مسجد حرام کی طرف گھوم گئے (اور شمال سے جنوب کی طرف رُخ کر لیا) تو صحابہ بھی آپ کے ساتھ گھوم گئے[1]

بلکہ روایات سے تو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام کے اتباع و پیروی کی نوبت یہاں تک پہونچ گئی تھی کہ وہ دُنیا کے کاموں میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور تعمیل حکم کیا کرتے تھے چنانچہ امام ابوداؤدؒ اور حافظ ابن عبدالبرؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق روایت کیا ہے کہ:-

ایک مرتبہ جمعہ کے دن ابن مسعود مسجد نبوی میں آئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے تو ابن مسعود نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سُنا: "بیٹھ جاؤ" تو وہ فوراً مسجد کے دروازے میں ہی بیٹھ گئے یعنے جہاں سنا وہیں بیٹھ گئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر ان کو قریب بلایا اور فرمایا: عبداللہ بن مسعود (آگے) آجاؤ۔

---

[1] الطبقات الکبریٰ ج ۲ ص ۷۔ روایات میں تحویل قبلہ کے بارے میں قدرے اختلاف ہے کہ ابتداءً تحویل قبلہ کا حکم کہاں پیش آیا؟ فتح الباری میں اس کی تحقیق دیکھ لی جائے۔

غرض صحابہ کرام کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی زندگی میں یہی معاملہ تھا کہ وہ آپ کے ہر قول، فعل اور تقریر (بیان سکوتی) کو شرعی حکم سمجھتے تھے ان میں سے کوئی بھی اُس کے خلاف نہیں کرتا تھا یعنے ان میں سے کوئی بھی اپنے لئے یہ جائز نہیں سمجھتا تھا کہ وہ قرآن عظیم کے حکم —— ما اتاکم الرسول فخذوہ و ما نہاکم عنہ فانتھوا —— کی خلاف ورزی کرے۔

صحابہ کن امور میں آپ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے

صحابہ کرام اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی معاملہ میں رجوع (لینے سوال وجواب) بھی کرتے تھے تو وہ صرف اُن دینوی امور میں جن کے اندر آپ کا قول یا فعل اجتہادی ہوتا تھا۔ اس کی مثال ہمیں غزوہ بدر میں ملتی ہے جب حباب بن المنذر صحابی نے آپ سے اُس جگہ کے متعلق گفتگو کی جس کو آپ نے اپنی رائے سے لشکر کے قیام کے لئے منتخب فرمایا تھا یا پھر صحابہ اس وقت گفتگو کرتے جب کسی دینی معاملہ میں آپ خود اجتہاد کرتے (اور صحابہ سے مشورہ لیتے) اور اللہ تعالیٰ نے اس کی تائید۔ یا ممانعت نہ فرمائی ہوتی جیسا کہ حضرت عمر نے غزوۂ بدر کے قیدیوں اور صلح حدیبیہ کے بارے میں آپ سے گفتگو کی اور آپ کی رائے سے اختلاف کیا تھا۔ یا کبھی آپ کا فیصلہ یا حکم عقلاً مستبعد معلوم ہوتا تو صحابہ محض اس کی حکمت و مصلحت معلوم کرنے کے لئے آپ کی طرف رجوع کرتے یا پھر اس امر کو آپ کے ساتھ مخصوص گمان کرکے اپنے لئے اس کی پیروی کو ضروری نہ سمجھتے (اور اس سلسلہ میں گفتگو کرتے) یا پھر ایسے امر میں آپ سے رجوع کرتے جس کا آپ ان کو حکم دیتے اور وہ یہ سمجھتے کہ یہ آپ نے مباح ہونے کی وجہ سے فرمایا ہے ورنہ اَوْلیٰ اس کے علاوہ دوسرا امر ہے۔

ان مذکورہ بالا صورتوں کے علاوہ باقی تمام صورتوں میں آپ کے حکم کے سامنے فوراً سر جھکا دیتے اور بے چون و چرا پیروی کیا کرتے تھے اور مکمل طور پر اس کے پابند رہتے تھے۔

رسول اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی اطاعت کا وجوب

صحابہ کرام پر، اللہ جل شانہٗ کے قرآن عظیم میں حکم فرمانے کے تحت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت — آپ کا کہا ماننا — اور اتباع — پیروی کرنا — جیسے آپ کی زندگی میں فرض تھا ایسے ہی آپ کی وفات کے بعد بھی، صحابہ کرام پر بھی اور بعد میں آنے والے تمام مسلمانوں پر بھی آپ کی سنت کی پیروی کرنا بھی فرض ہے اس لئے کہ جن نصوص — صریح آیات — سے آپ کی اطاعت کا فرض ہونا ثابت ہے وہ عام ہیں نہ وہ آپ کی زندگی کے ساتھ مقید ہیں اور نہ صرف صحابہ کرام کے ساتھ محدود ہیں (اس لئے کہ آپ پوری نسل انسانی کے لئے نبی ہیں، اور قیامت تک کے لئے نبی ہیں لہذا آپ کی اطاعت پوری نسل انسانی پر فرض ہے اور قیامت تک کے لئے فرض ہے)

علاوہ ازیں صحابہ کرام اور بعد کے آنے والے مسلمانوں کے درمیان اطاعت وپیروی کی علّت (وجہ) مشترک ہے اور وہ یہ کہ یکساں طور پر دونوں ایک ایسے رسول کے (امتی اور) پیرو ہیں جس کی اطاعت اور پیروی کا اللہ تعالیٰ نے بلاتخصیص دونوں کو یکساں طور پر حکم دیا ہے اور اس لئے بھی کہ اطاعت وپیروی کی علّت (وجہ) آپ کے زمانۂ حیات اور بعد از وفات دونوں زمانوں کے لئے بلاتخصیص عام اور شامل ہے کیونکہ ہر زمانہ میں آپ کا ہر قول، ہر فعل ہر حکم ایک ایسے معصوم صاحب شریعت رسول سے صادر شدہ ہے جس کی اطاعت وفرمانبرداری کا ہر زمانہ میں خدا نے تمام مسلمانوں کو یکساں حکم دیا ہے لہذا آپ کے زندہ رہنے یا وفات پا جانے سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔[1]

---

[1] اسی لئے اللہ جل شانہٗ نے متنبہ فرمایا:

وما محمد الا رسول افان مات	اور محمد رسول ہی تو ہیں، تو کیا اگر وہ وفات پا گئے یا
او قتل انقلبتم علی اعقابکم	قتل (شہید) ہو گئے تو تم الٹے پاؤں لوٹ جاؤ گے
ومن ینقلب علی عقبیہ	(مرتد ہو جاؤ گے)؟ اور جو کوئی (باقی صفحہ ۱۱۰ پر)

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی کوئی مسلمان آپ سے دریافت کرنے لگا ہے اس کو اپنی سنت کی پیروی کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

چنانچہ جب آپ نے (اپنی وفات سے چند ماہ پہلے) معاذ بن جبل کو یمن کا عامل (حاکم) بنا کر روانہ فرمایا ہے تو آپ نے معاذ بن جبل سے دریافت فرمایا:

جب کوئی مقدمہ فیصلہ کے لئے تمہارے پاس آئے گا تو کیسے فیصلہ کروگے؟ معاذ نے جواب دیا: "میں اللہ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا"۔ آپ نے فرمایا: اگر اس کا حکم تمہیں کتاب اللہ میں نہ ملا؟ معاذ نے جواب دیا: تو میں اللہ کے رسول کی سنت سے (فیصلہ کروں گا) آپ نے فرمایا: اگر رسول کی سنت میں بھی نہ ملا؟ معاذ نے عرض کیا، تو میں اپنی رائے سے (کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی روشنی میں) اجتہاد کروں گا اور اس اجتہاد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔ اس جواب پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (بطور تائید و تحسین) معاذ کے سینہ پر (کمر پر) ہاتھ مار کر فرمایا: سب تعریفیں تو اللہ کے لئے ہی سزاوار ہیں جس نے اللہ کے رسول کے فرستادہ (حاکم) کو اس امر کی توفیق عطا کی جس کو اللہ کا رسول پسند کرتا ہے۔

اس حدیث کو امام احمد، ابو داؤد، ترمذی، دارمی، بیہقی (نے مدخل میں) ابن سعد نے (طبقات میں) اور حافظ ابن عبد البر نے روایت کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد وجوب عمل بالسنۃ کے دلائل

چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے بعد اپنی سنت پر عمل کرنے کے واجب ہونے پر امت کو اتنی بہت سی حدیثوں[۱] میں متنبہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۹):

فلن یضر اللہ شیئاً — اُلٹے پاؤں لوٹے گا (دین سے پھرے گا) وہ اللہ کا ہرگز کوئی نقصان نہیں کرے گا۔ مترجم ۱۲

[۱] احادیث کے علاوہ خود قرآن کریم کی آیت کریمہ ذیل بھی اس امر کی قطعی دلیل ہے (باقی صفحہ ۱۱۱ پر)

فرمایا ہے کہ وہ تمام حدیثیں معنوی اعتبار سے تواتر کی حد تک پہونچ چکی ہیں۔

ان میں سے ایک روایت جس کو حاکم اور ابن عبدالبر نے عبداللہ بن عمر ابن عوف عن ابیہ عن جدہ کی سند سے نقل کیا ہے یہ ہے کہ :۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے ایک اللہ کی کتاب دوسرے میری سنت (۱)

اسی طرح بیہقی نے اس حدیث کو حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے اور مسلم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ :۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جب تک اس کتاب اللہ میں جو تم کو دی گئی ہے کوئی حکم موجود ہے تو اس پر عمل کرنا ضروری اور لابدی ہے اس کے ترک کرنے میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۱۰) ——— کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کی سنت کی اطاعت امت پر فرض ہے ارشاد ہے :۔

واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول	اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے
واولی الامر منکم فان	میں سے حکمرانوں کی پس اگر کسی چیز میں تمہارا (حکمرانوں سے)
تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی	نزاع ہو جائے تو اس کو اللہ کی طرف اور رسول کی
اللہ والی الرسول۔	طرف لوٹا دو۔

اس لئے کہ جس طرح ردالی اللہ کے معنی ہیں کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنا اسی طرح ردالی الرسول کے معنی ہیں سنت رسول کی طرف رجوع کرنا اور جس طرح کتاب اللہ کی طرف رجوع آپ کے زمانہ حیات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اسی طرح سنت رسول کی طرف رجوع بھی آپ کے زمانہ حیات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اسلئے کہ یہ اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنے کا حکم ولاۃ امور (حکمرانوں) اور امت کے ہر نزاع کو طے کرنے کے لئے دیا گیا ہے خواہ آپ کی زندگی میں نزاع ہو خواہ آپ کی وفات کے بعد رہتی دنیا تک۔ اطاعت رسول میں تو کوئی جاہل یہ کہہ بھی سکتا ہے کہ یہ حکم آپ کی زندگی کے ساتھ مخصوص ہے مگر ردالی الرسول تو آپ کی وفات کے بعد ہی متصور ہے آپ کی زندگی میں آپ کے موجود ہوتے تو اس نزاع کی نوبت ہی نہیں آسکتی۔ واللہ اعلم (مترجم)

(۱) جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۸۰

کوئی بھی عذر قابل قبول نہیں ہو سکتا اگر کتاب اللہ میں کوئی حکم موجود نہ ہو تو پھر نبی ــــ علیہ الصلوٰۃ والسلام ــــ کی سنت اس مسئلہ میں فیصلہ کن ہوگی۔

اور امام بخاری اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ:

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری ساری امت جنت میں داخل ہو جائے گی بجز اس شخص کے جو انکار کرے گا۔ صحابہ نے دریافت کیا: یا رسول اللہ وہ کون ہے جو انکار کرے گا؟ (یعنی اس سے کیا مراد ہے؟) آپ نے فرمایا: جس شخص نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی تو درحقیقت اس نے (جنت میں داخل ہونے سے) انکار کر دیا۔

ابو عبداللہ حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ:

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا: تحقیق شیطان اس بات سے تو مایوس ہو چکا ہے کہ تمہاری اس زمین ــ عالم اسلامی ــ میں اسکی عبادت کی جائے لیکن وہ اسی پر خوش ہے کہ اس (عبادت) کے علاوہ اور ایسے اعمال میں اس کی اطاعت کی جائے گی جن کو تم معمولی بات سمجھتے ہو گے، اس سے تم ہوشیار رہنا میں نے تو تمہارے لئے ایسی چیز چھوڑ دی ہے کہ اگر تم اسکو مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ وہ اللہ کی کتاب ہے اور اس کے رسول کی سنت"۔

ابن عبدالبر نے حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ:

(۵) (ایک روز) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی اسکے بعد ایسا دلوں میں اتر جانے والا وعظ فرمایا جس سے آنکھیں بہہ پڑیں اور دل ہل گئے تو کسی نے آپ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول آپ کا یہ وعظ و نصیحت تو ایسا ہے جیسے کسی رخصت ہونے والے کی باتیں ہوتی ہیں (اگر ایسا ہی ہے) تو آپ ہمیں وصیت فرمائیے؟ آپ نے ارشاد فرمایا: تم پر امیر کی بات سننا اور اطاعت کرنا لازم ہے اگرچہ تمہارا امیر کوئی حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ تم میں سے جو بھی زندہ رہیگا اسکے سامنے بہت سے اختلافات آئیں گے اس لئے تم پر (ان اختلافات کے وقت) میری سنت کی پیروی اور ان خلفاء

کی سنت کی پیروی لازم ہے جو سیدھے راستے پر چلنے والے اور ہدایت یافتہ ہیں، اس سنت کو اپنے دانتوں سے مضبوطی سے پکڑ لینا اور نئی پیدا ہونے والی باتوں سے بچنا کیونکہ ہر بدعت (نئی بات) گمراہی ہے (۱)

سنت کو امت تک پہونچانے میں صحابہ کا اہتمام

اسی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سنت کو امت تک پہونچانے کا بڑا اہتمام فرمایا ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ان کے پاس ایک عظیم امانت تھی جسے انھیں اپنے بعد آنے والی نسلوں کے سپرد کرنا تھا۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے علم کو دوسروں تک پہونچانے کی بڑی ترغیب دی ہے چنانچہ آپ کا ارشاد ہے :۔

خدا اس شخص پر رحمتیں نازل فرمائے جس نے مجھ سے کوئی بات — حدیث — سنی اور پھر اس کو ہو بہو اسی طرح دوسروں تک پہونچادیا جیسے اس نے مجھ سے سنا، اس لئے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جس کو بات — حدیث — پہونچائی جاتی ہے وہ مجھ سے سننے والے کی بہ نسبت اس کو زیادہ یاد رکھنے والا ہوتا ہے۔ (۲)

---

(۱) جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۸۲، امام ترمذی، ابوداؤد، امام احمد، ابن ماجہ نے بھی اس حدیث کی تخریج کی ہے، حافظ ابونعیم نے کہا ہے کہ شامیوں کی صحیح حدیثوں میں یہ حدیث سب سے اچھی حدیث ہے۔

(۲) جامع بیان العلم ج ۱ ص ۳۹۔ ابن حبان نے اپنی صحیح میں اس حدیث کی تخریج کی ہے اور ابوداؤد نے سنن میں ترمذی نے جامع ترمذی میں بھی روایت کیا ہے اور اس کو "حسن" بھی کہا ہے۔ نسائی، ابن ماجہ اور بیہقی نے بھی اس حدیث کو کسی قدر تقدیم وتاخیر اور الفاظ کی زیادتی کے ساتھ روایت کیا ہے۔ مولانا محمد یوسف بنوری فرماتے ہیں: امام بخاری نے صحیح بخاری کی کتاب العلم میں اور کتاب المناسک وغیرہ میں ایک طویل حدیث کے ذیل میں بھی اس حدیث کو ابوبکرہ کی روایت سے نقل کیا ہے۔

صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو کس طرح حاصل کیا کرتے اور یاد رکھا کرتے تھے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے درمیان اس طرح زندگی گزارتے تھے کہ آپ کے اور ان کے درمیان کوئی حجاب حائل نہ تھا آپ صحابہ سے مسجد میں، بازار میں، گھر میں اور سفر وحضر میں، غرض ہر وقت اور ہر حالت میں ملتے جلتے رہتے تھے۔ صحابہ کی نظروں میں آپ کے شب و روز کے اقوال وافعال انتہائی توجہ اور وقعت واہمیت کا مرکز تھے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ـــ جب سے اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ ان کو رشد وہدایت سے نوازا اور کفر و شرک کی تاریکیوں سے نجات دلا کر نور ایمان وہدایت سے سرفراز فرمایا تھا ـــ اُس وقت سے ہمہ وقت صحابہ کی دینی اور دنیوی زندگی کا محور اور مثالی نمونہ بن گئی تھی۔ آپ کے اقوال وافعال اور اعمال واخلاق کی تلاش وجستجو اور ان کی پیروی کی حرص ان میں یہاں تک پہونچ چکی تھی کہ بعض (ایسے) صحابہ (جو معاشی وسائل میں مشغول رہنے کی وجہ سے روزانہ آپ کی خدمت میں موجود نہ رہ سکتے تھے وہ) باری باری آپ کی مجلس میں حاضر اور شریک ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ کا طریق کار ہمارے سامنے ہے امام بخاریؒ نے بسند متصل حضرت عمر بن الخطابؓ کا واقعہ نقل کیا ہے:۔

> حضرت عمر فرماتے ہیں: قبیلہ بنو اُمیّہ بن زید ـــ یہ قبیلہ عوالی میں آباد تھا ـــ کا ایک انصاری میرا پڑوسی تھا اور ہم عوالی سے باری باری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے ایک دن وہ آتا اور ایک دن میں آتا جس دن میں آپ کی خدمت میں حاضر رہتا تو اس دن بارگاہ نبوت کی تمام باتیں ـــ آپ کے اعمال وافعال اور ارشادات ـــ اس کو تبلاتا اور جس دن وہ آتا وہ بھی ایسا ہی کرتا (اور دن بھر کے تمام واقعات مجھے تبلاتا)

صحابہ کرام کا یہ طرز عمل اور یہ اہتمام اس امر کی انتہائی روشن دلیل ہے کہ صحابہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم (کی ذات گرامی کی ہر نقل و حرکت) کو پیروی کی نظر سے دیکھتے اور آپ کی ہر عمل کو رہنمائی حاصل کرنے کی نیت سے یاد رکھا کرتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک یہ بات طے شدہ تھی کہ آپ کی پیروی اُن پر لازم ہے اور آپ کے ہر امر و نہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا اُن کا فرض ہے۔

اسی لئے جو قبائل مدینہ سے دور بستیوں میں آباد تھے وہ اپنے قبیلہ کے چند افراد (بطور وفد) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے تاکہ وہ اللہ کے رسول سے اسلام کے ضروری احکام سیکھیں اور واپس آ کر اپنی قوم کو سکھلائیں اور پورے قبیلہ کی رہنمائی کریں (اس قسم کے وفود کا ذکر متداول کتب حدیث میں بکثرت آتا ہے)

بلکہ ایک ایک صحابی پیش آمدہ مسائل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرعی حکم معلوم کرنے کے لئے دور دراز کی مسافت طے کر کے آپ کی خدمت میں آتا اور مسئلہ معلوم کر کے واپس چلا جاتا اور اس دور دراز سفر میں کسی بھی دوسری چیز کی طرف نظر اُٹھا کر نہ دیکھتا (یعنے اس طویل سفر سے کوئی دنیاوی منفعت حاصل کرنے کی کوشش نہ کرتا) چنانچہ امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ:-

> عقبہ کو کسی عورت نے یہ بتلایا کہ اُس نے عقبہ اور اس کی بیوی دونوں کو بچپن میں دودھ پلایا ہے۔ عقبہ مکہ میں تھے فوراً وہاں سے مدینہ روانہ ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ مسئلہ دریافت کیا کہ اگر کوئی مرد کسی ایسی عورت سے بے خبری میں شادی کر لے جو اس کی رضاعی بہن ہو اور بعد میں دودھ پلانے والی عورت بتلائے کہ میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اب کیونکر مناسب ہے جبکہ کہا گیا (یعنے جبکہ مشہور ہو گیا کہ وہ عورت تمہاری رضاعی بہن ہے) چنانچہ عقبہ نے اُسی وقت اپنی بیوی سے مفارقت اختیار کر لی اور اس عورت نے دوسرے مرد سے نکاح کر لیا۔

ازواجِ مطہرات کی طرف رجوع

صحابہ کرام کا معمول یہ بھی تھا کہ وہ (بوقت ضرورت) ازدواجی زندگی سے متعلق امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے دریافت کرلیا کرتے تھے (تاکہ ازدواجی امور میں بھی آپ کی پیروی کریں) کیونکہ ازواج مطہرات ہی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درون خانہ زندگی کا کما حقہ علم تھا (اور براہ راست آپ سے دریافت کرنے میں ایک گونہ بے ادبی تھی) اس سلسلہ کا ایک صحابی کا واقعہ ہم اس سے پہلے نقل کرچکے ہیں کہ اُنھوں نے اپنی بیوی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ مسئلہ دریافت کرنے کے لئے بھیجا کہ کوئی روزہ دار اگر اپنی بیوی کا بوسہ روزہ کی حالت میں لے لے تو اس کا کیا حکم ہے؟ تو حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے اسکو بتلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی روزہ کی حالت میں بوسہ لے لیا کرتے ہیں"۔

جیسا کہ خود عورتیں بھی آپ کی ازواج مطہرات کے پاس جایا کرتی تھیں اور بعض اوقات عورتیں خود ہی (اُن کی موجودگی میں) عورتوں سے متعلق جو مسائل آپ سے پوچھنا چاہتی تھیں دریافت کرتی تھیں تو ایسے موقعہ پر جب بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی عورت کو کوئی شرعی حکم صراحت کے ساتھ خود نہ بتا سکتے تو اپنی کسی زوجہ کو حکم دیتے کہ وہ اس عورت کو سمجھا دیں جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ ایک عورت نے آپ سے دریافت کیا کہ وہ حیض سے کس طرح طہارت حاصل کرے؟ تو آپ نے فرمایا: روئی کا ایک مشک کی خوشبو میں بسا ہوا ٹکڑا لو اور اس سے طہارت حاصل کرلو۔ اس عورت نے پوچھا اس سے کیونکر طہارت حاصل کروں؟ تو آپ نے پھر وہی الفاظ دہرا دیئے لیکن وہ عورت پھر بھی نہ سمجھی تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف اشارہ فرمایا کہ تم اس عورت کو مقصد سمجھا دو اور وہ یہ تھا کہ صاف روئی کا مشک لگا ہوا ایک ٹکڑا لو اور اس کو خون کے مقام پر رکھو اگر وہ بے داغ اور سفید نکلے تو یہ طہر کی علامت ہے[۲]۔

---

[۱] بخاری اور مسلم کی حدیثوں میں اس "کرسف" سے کام لینے کی صورت تتبعی بہا اثر الدم تبلائی ہے یعنے اس خوشبودار کرسف سے دم حیض کے بقایا اثرات بدبو وغیرہ کا ازالہ کرلیا کرو یہ طہر کی علامت نہیں بلکہ دم حیض کے دیرپا اثرات کے ازالے اور تکمیل غسل انقطاع دم حیض کی تدبیر ہے۔ اُس عورت کے سوال کے الفاظ ہیں کیف اغتسل من المحیض مصنف رحمہ اللہ کے پاس زمانہ اسارت میں غالباً حدیث کی متداول کتابیں نہیں ہیں اسی لئے یہ سہو ہوا ہے۔ [۲] بخاری، مسلم اور نسائی نے حضرت عائشہ سے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

تمام صحابہ اخذ حدیث میں یکساں نہ تھے

یہ دوسری بات ہے کہ تمام صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور احوال زندگی کے فہم وعلم میں یکساں اور ایک معیار پر نہ تھے اس لئے کہ ان میں شہری بھی تھے، اور دیہاتی بھی (ظاہر ہے کہ دیہاتی اور شہری عقل وفہم اور علم ومعرفت میں یکساں نہیں ہو سکتے) پھر کچھ ان میں تجارت پیشہ تھے اور کچھ صنعت کار (یہ لوگ یقیناً اپنی معاشی مصروفیتوں کی وجہ سے ہمہ وقت آپ کے پاس نہیں رہ سکتے تھے) پھر بعض صحابہ مدینہ میں رہتے تھے اور بعض مدینہ کی مضافاتی بستیوں میں، یہ لوگ اکثر وبیشتر آپ کے پاس موجود نہ رہ سکتے تھے اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنکو ہمہ وقت عبادت وطاعت الٰہی میں مصروف رہنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا (یہ لوگ بیشک ہمہ وقت موجود رہتے اور آپ کے اقوال وافعال سُنتے اور دیکھتے تھے)

علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (روزانہ کسی مقررہ وقت میں) ایسے عام اجتماعات منعقد نہیں فرمایا کرتے تھے جن میں سارے صحابہ جمع ہوں ایسے عام اجتماع شاذ ونادر ہی ہوا کرتے تھے یا عیدین اور جمعہ کی نمازوں میں ایسے عام اجتماعات ہوتے تھے یا کبھی کبھی اور دنوں میں بھی (حسب ضرورت) آپ سب کو جمع فرما لیا کرتے تھے (اس لئے بھی تمام صحابہ کا آپ کے اقوال وافعال کے علم اور واقفیت میں برابر ہونا ممکن نہ تھا) چنانچہ امام بخاری حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ:۔

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ایک وعظ کے بعد دوسرا وعظ کئی کئی دنوں میں فرمایا کرتے تھے تاکہ ہم اکتا نہ جائیں۔

اسی لئے مشہور تابعی مسروق فرمایا کرتے تھے:

> میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی صحبت میں بیٹھا ہوں میں نے ان کو پانی کے تالابوں کی طرح مختلف پایا۔ کوئی تالاب (اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ) ایک ہی آدمی کو سیراب کرتا ہے، کوئی دو کو، کوئی دس کو، اور کوئی تالاب (اتنا بڑا ہوتا ہے کہ) سو آدمیوں کو سیراب کرتا ہے اور کچھ تالاب ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر روئے زمین کے تمام رہنے والے بھی اُن پر (پانی پینے کے لئے)

اُترآئیں تو سب کو سیراب کردیں (ایک بھی پیاسا نہ لوٹے)

اور یہ تو قدرتی بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا سب سے زیادہ علم اُنہی صحابہ کو ہونا چاہیئے جو ابتدائی دور میں اسلام لائے تھے (اور ان کو دوسروں کی بہ نسبت آپ کی صحبت زیادہ عرصہ تک نصیب ہوئی تھی) جیسے خلفاء اربعہ، عبداللہ بن مسعود وغیرہ یا پھر اُن صحابہ کو آپ کی سنت کا علم اوروں سے زیادہ ہونا چاہیئے جو آپ کی خدمت میں زیادہ سے زیادہ وقت گذارتے تھے (اور یہی ان کا مقصد زندگی تھا) جیسے حضرت ابوہریرہ یا وہ صحابہ جو (اپنے طبعی شغف کی وجہ سے بالالتزام) آپ سے حدیثیں سُنکر لکھ لیا کرتے تھے۔ جیسے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص وغیرہ

عہد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں سنت کی تدوین کیوں نہیں ہوئی؟

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کچھ حدیثیں لکھی گئی تھیں؟

تمام اربابِ سیرت، علماء سنت اور عام مسلمانوں میں سے کسی بھی دو شخصوں کا آج تک اس میں اختلاف نہیں ہوا کہ (پورے عہد نبوت میں) قرآن عظیم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی توجہ کا اہم ترین مرکز بنا رہا ہے اسی اہتمام و توجہ کے نتیجہ میں لوگوں نے پورے قرآن کو اپنے سینوں میں بھی مکمل طور پر محفوظ کرلیا اور (اس زمانہ کے دستور کے مطابق) چمڑے کے ٹکڑوں (وسلیٹوں) پر کھجور کے پٹھوں پر، اور پتھر کے ٹکڑوں وغیرہ پر پورا کا پورا قرآن لکھ بھی لیا (اور زبانی یاد بھی کرلیا) یہاں تک کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو اس وقت قرآن عظیم لفظ بلفظ محفوظ اور مرتب شکل میں لکھا ہوا موجود تھا اس میں کوئی کمی نہ تھی بجز اس کے کہ اس کو ایک "مصحف" کی شکل میں یکجا جمع کرنا باقی تھا۔

قرآن کی طرح سُنت کے مدون نہ ہونیکے اسباب

باقی رہی سنت تو اس کی تدوین کی یہ صورت یقیناً نہ تھی حالانکہ

سنت عہد نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں بھی تشریع اسلامی ـــ اسلامی قانون شرعی ـــ کا نہایت اہم ماخذ تھی، اس کے باوجود اس میں بھی کسی کا اختلاف نہیں کہ سنت کی تدوین قرآن عظیم کی طرح رسمی طور پر (یعنے بارگاہ نبوت کی جانب سے باضابطہ طور پر) نہیں ہوئی،

(۱) غالبًا اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے درمیان تیئس ۲۳ سال بقید حیات رہے، اس طویل عرصہ میں آپ کے شب و روز کے تمام اقوال و افعال، اوامر و نواہی اور تمام احوال و معاملات کو کسی ایک نوشتہ کی صورت میں یا چمڑے کے ٹکڑوں (وسلیوں) پر لکھنا اور محفوظ کرنا بیحد دشوار (بلکہ عادتًا ناممکن) تھا، کیونکہ اس دشوار کام کے انجام دینے کے لئے صحابہ کی ایک بڑی جماعت کو مستقل طور پر صرف اسی کام کے لئے فارغ ہونے کی ضرورت تھی اور یہ بھی سب ہی کو معلوم ہے کہ عہد نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں لکھنا جاننے والوں کی تعداد اتنی قلیل تھی کہ انگلیوں پر شمار کئے جاسکتے تھے اور چونکہ قرآن عظیم تشریع اسلامی ـــ اسلامی قانون ـــ کا پہلا اور اساسی ماخذ بھی تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (کی نبوت کی طرح آپ) کا ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ بھی تھا اس لئے ان لکھنا جاننے والے صحابہ کو قدرتی طور پر قرآن کے علاوہ سنت و سیرت وغیرہ سے صرف نظر کر کے صرف قرآن کے لکھنے اور محفوظ کرنے پر اپنی زیادہ سے زیادہ توجہ صرف کرنی ناگزیر تھی تاکہ وہ بعد کے آنے والے مسلمانوں کو قرآن پاک اس طرح تحریری شکل میں، مکمل طور پر مرتب کیا ہوا پہونچا سکیں کہ اس میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی کا امکان نہ رہے

(۲) علاوہ ازیں سنت کے باضابطہ طور پر مدون نہ ہونے کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ عرب (اپنے جغرافیائی محل وقوع کی بنا پر) ایک غیر تعلیمیافتہ اور مکتب ناآشنا اُمی قوم تھی اس لئے وہ ان تمام چیزوں میں جن کی حفاظت اور یادداشت مطلوب ہوتی تھی، (لکھنے لکھانے کے بجائے) صرف اپنے حافظوں اور قوت یادداشت پر اعتماد کرنے کے عادی تھے لہٰذا ان کے لئے قرآن کو ـــ جو تھوڑا تھوڑا، آیتوں اور چھوٹی بڑی سورتوں کی شکل میں نازل ہو رہا تھا ـــ یاد کرنے اور یاد رکھنے پر اپنی تمامتر توجہ صرف کر دینا آسان اور فطری امر تھا، خود قرآن (اپنی شان اعجاز کی کشش سے) تدریجًا ان میں اس امر کا جذبہ بھی

پیدا کر رہا تھا کہ وہ اس کو زبانی یاد بھی کریں، تلاوت بھی کیا کریں اور سینوں میں محفوظ بھی رکھیں

پس اگر سنت ـــ جس کا دائرہ تفصیلات کے اعتبار سے قرآن عظیم کی بہ نسبت بہت وسیع، متنوع اور بیشمار پہلوؤں پر حاوی ہے اور جو ابتداء رسالت سے لیکر آپ کی وفات تک کے (تیئیس سالہ زندگی کے) تمام تشریعی اقوال و افعال اور احوال پر مشتمل ہے ـــ کی تدوین بھی قرآن کی طرح کی جاتی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ صحابہ کرام کو قرآن کی حفاظت ـــ یاد کرنے یاد رکھنے اور لکھنے ـــ کے ساتھ ساتھ سنت کی حفاظت پر بھی اپنی پوری توجہ مرکوز کرنی پڑتی اور اس میں جو دشواری پیش آتی اس کا کیا ٹھکانا، تصور بھی مشکل ہے۔

(۳) اس کے علاوہ قرآن اور سُنت کی بیک وقت تدوین میں افصح العرب والعجم صلی اللہ علیہ وسلم کے جامع اور ہمہ گیر اقوال ـــ جن کے متعلق ارشاد ہے: اوتیت جوامع الکلم۔ مجھے ہمہ گیر کلمات عطا کئے گئے ہیں ـــ کا قرآن کی آیات کے ساتھ نادانستہ اور غیر ارادی طور پر مختلط ـــ غلط ملط ـــ ہو جانے کا بہت قوی اندیشہ تھا اور یہ ایک ایسا سنگین خطرہ تھا جو اعداء اسلام کے لئے بآسانی کتاب اللہ میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کا دروازہ کھولدیتا (یعنے ایک چور دروازہ ان کے ہاتھ آجاتا) جس کی راہ سے وہ مسلمانوں میں گھس کر بآسانی قرآن عظیم کے احکام سے رستگاری حاصل کرنے اور اس کی گرفت سے آزاد ہوتے پر آمادہ کر سکتے ـــ (کہ "یہ خدائی احکام نہیں ہیں یہ تو رسول اللہ کے احکام ہیں جو آپ نے اُس وقت کے مسلمانوں کے لئے تجویز کئے تھے" جیسا کہ اعداء سنت آج احکام سنت کے متعلق یہی کہہ رہے ہیں)

الغرض (نزول قرآن کے زمانہ اور) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں سنت کی قرآن کی طرح باضابطہ طور پر تدوین نہ ہونے کے یہ اور اسی قسم کے بہت سے عوام کی نگاہوں سے اوجھل وجوہ و اسباب ہیں جنکو علما نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے

حدیثیں لکھنے سے ممانعت کیوجہ اور آپ کی اجازت سے کتابت حدیث کا ثبوت

اسی سے ہم حدیثیں لکھنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت کا راز بھی بآسانی سمجھ سکتے ہیں

جو صحیح مسلم میں (ج ۲ ص ۴۱۴ پر) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے اس طرح مروی ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سوائے قرآن کے مجھ سے اور کچھ نہ لکھو اور جس نے کچھ لکھ لیا ہو وہ اس کو مٹا دے

اس ممانعت سے (جو ایک واقعہ[1] پر مبنی ہے اور ایک سنگین فتنہ کے سدّباب کی غرض سے کی گئی ہے) یہ بات ہرگز لازم نہیں آتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ـــ

---

[1] یہی حدیث ممانعت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ذرا تفصیل کے ساتھ خطیب بغدادی نے (متوفی ۴۶۳ھ) تقیید العلم میں نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممانعت ایک واقعہ پر مبنی ہے اور یہ کہ ممانعت کی وجہ صرف یہ ہے کہ کتاب اللہ کے مقابلہ پر کتاب الرسول مدون نہ ہو جائے کہ یہی چیز سابقہ اُمتوں میں ہلاکت کا موجب ہوئی ہے حدیث کے الفاظ یہ ہیں:-

عربی	اردو
عن ابی ھریرۃ قال خرج علینا	ابوہریرۃ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم حدیثیں
ونحن نکتب الاحادیث فقال:	لکھ رہے تھے آپ نے دریافت فرمایا: یہ تم
ما ھذا الذی تکتبون؟	کیا لکھ رہے ہو؟ ہم نے عرض کیا یہ حدیثیں
قلنا: الاحادیث نسمع	ہیں جو ہم آپ سے سُنتے ہیں (فوراً لکھ لیتے ہیں)
منک، فقال: اکتاب	آپ نے ارشاد فرمایا: کیا اللہ کی کتاب کے
غیر کتاب اللہ؟ اتدرون	علاوہ اور کتاب (بھی ہو سکتی ہے) تمہیں
ما ضل الامم قبلکم	معلوم ہے تم سے پہلی اُمتوں کو صرف اسی
الا ان اکتتبوا من الکتب مع کتاب	چیز نے گمراہ کیا ہے کہ انھوں نے اللہ کی
اللہ تعالیٰ۔	کتاب کے ساتھ ساتھ اور کتابیں بھی بنا لیں۔

اسی طرح حافظ نور الدین ہیثمی (متوفی ۸۰۷ھ) مجمع الزوائد میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کرتے ہیں:-

عربی	اردو
قال کان عند رسول اللہ صلی اللہ	عبد اللہ بن عمرو نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(باقی صفحہ ۱۲۲ پر)

قرآن عظیم کی طرح باضابطہ اور سرکاری طور پر نہ سہی ـــ بے ضابطہ اور بطور خود ہی) صحابہ نے حدیثیں مطلق نہیں لکھیں خاص کر جبکہ بکثرت ایسی احادیث موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں ـــ

(بقیہ حاشیہ صفحہ علیہ وسلم ناس من اصحابہ وانا معھم وانا اصغرھم فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار" فلما خرج القوم قلت: کیف تحدثون عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقد سمعتم ما قال وانتم تنھمکون فی الحدیث عن رسول اللہ صلی صلی اللہ علیہ وسلم؟ فضحکوا وقالوا: یا ابن اخینا ان کل ما سمعنا عنہ عندنا فی کتاب

(رواہ الطبرانی مجمع الزوائد ص)

کی بارگاہ میں کچھ صحابہ موجود تھے ان میں، میں بھی موجود تھا مگر میں ان سب سے چھوٹا (کم عمر) تھا تو آپ نے ارشاد فرمایا: جس نے عمداً مجھ پر جھوٹ بولا اسے اپنا ٹھکانہ جہنم بنا لینا چاہیئے" جب اور سب لوگ چلے گئے تو میں نے ان سے کہا: تم لوگ کیسے (جرأت کے ساتھ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرتے ہو، درآں حالیکہ تم رسول اللہ صلی اللہ نے جو کچھ فرمایا سن چکے ہو پھر بھی تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں روایت کرنے میں منہمک رہتے ہو تو وہ میری اس بات پر مسکرائے اور کہا: بھتیجے! جتنی حدیثیں ہم نے آپ سے سُنی ہیں وہ سب ہمارے پاس کتاب میں (لکھی ہوئی) موجود ہیں۔

ان دونوں حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت بالالتزام قرآن کے ساتھ ساتھ آپ کی تمام حدیثوں کو بھی لکھ رہی تھی یعنی کتاب اللہ کے متوازی کتاب مدون ہو رہی تھی اس لئے آپ نے سختی کے ساتھ فرمایا: اکتاب غیر کتاب اللہ اور جو کچھ اس وقت تک لکھا گیا تھا، اس کے مٹا دینے کا حکم دیدیا مگر ساتھ ہی ساتھ صحابہ کے استفسار (افلا نحدث عنک تو کیا ہم آپ کی حدیثیں بیان بھی نہ کریں؟) پر آپ نے فرمایا حدثوا عنی ولا حرج ومن کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار۔ (باقی صفحہ ۱۲۳ پر)

(بلکہ آپ کی اجازت[۱] سے) حدیثیں لکھی گئی ہیں۔ (اور بڑی تعداد[۲] میں لکھی گئی ہیں)

چنانچہ امام بخاریؒ نے صحیح بخاری کتاب العلم کے ذیل میں حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ:-

قبیلہ خزاعہ نے فتح مکہ کے موقعہ پر بنولیث کے ایک آدمی کو اپنے ایک مقتول کے عوض میں مکہ کے اندر قتل کر دیا جب اس کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی تو آپ فوراً سوار ہو کر موقعہ پر تشریف لے گئے اور ایک خطبہ دیا اس میں فرمایا:-

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۲۲) مجھ سے حدیثیں بیشک روایت کرو اس میں کوئی حرج نہیں (مگر یاد رکھو) جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا اسے اپنا ٹھکانا جہنم میں ضرور بنا لینا چاہیئے۔

[۱] حدیثیں لکھنے کی اجازت سے متعلق احادیث اور تفصیلی بحث کے لئے مراجعت کیجئے اُردو مقالہ کتابت الحدیث وادوار تدوینہ مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ کراچی۔

[۲] عہد رسالت علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں آپ کی اجازت سے لکھی ہوئی احادیث کی تعداد کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حضرت ابوہریرۃ مسلّم طور پر سب سے زیادہ حدیثوں کے راوی ہیں وہ فرماتے ہیں:-

ما من اصحاب رسول اللہ علیہ وسلم اکثر حدیثا عنہ منی الا ما کان من عبد اللہ بن عمرو فانہ کان یکتب ولا اکتب	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں ایسا کوئی نہیں جسے آپ کی حدیثیں مجھ سے زیادہ یاد ہوں بجز عبد اللہ بن عمرو کے کہ وہ حدیثیں لکھ بھی لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا صرف یاد کرتا تھا
(صحیح البخاری ج ۱ ص ۲۲)	

حضرت ابوہریرۃ کی احادیث جو صرف مسند بقی بن مخلد کے واسطہ سے پہونچی ہیں ان کی تعداد ۵۳۷۴ ہے:

کان حدیث ابی ھریرۃ خمسۃ آلاف وثلاث مأتہ واربعۃ وسبعون	حضرت ابوہریرہ سے پانچ ہزار تین سو چوہتر حدیثیں مروی ہیں۔
(عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۴۶)	

(باقی صفحہ ۱۲۴ پر)

اللہ تعالیٰ نے مکہ سے قتل کو ۔ یا فیل (ہاتھی) کو ۔ روک دیا تھا (امام بخاری[1] ۔ کو اس میں شک ہے کہ آیا آپ نے "قتل" فرمایا تھا یا "فیل") مگر اللہ کے رسول کو اور مومنین کو (فتح مکہ کے لئے) مکہ پر مسلط فرما دیا ہے، (تاہم) مکہ نہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال تھا اور نہ میرے بعد کسی کے لئے حلال ہو سکتا ہے ۔ خوب اچھی طرح سُن لو کہ میرے لئے بھی دن کی ایک گھڑی (صبح سے دوپہر تک)

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۲۳) تو حضرت عبداللہ بن عمرو کی مکتوب حدیثوں کی تعداد سات یا آٹھ ہزار ہونی چاہیئے اور متداول کتب حدیث میں مدون کل صحیح احادیث کی تعداد دس ہزار ہے ۔

الاحادیث التی فی الدرجة الاولیٰ لاتبلغ عشرة آلاف (توجیہ النظر ص ۹۳)	اعلیٰ درجہ کی حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک نہیں پہونچی ۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے اس مکتوب ذخیرہ کا نام الصادقہ تھا اس کے متعلق وہ خود فرماتے ہیں

عن عبد اللہ بن عمرو قال: ھٰذہ الصادقة فیھا ما سمعت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولیس بینی و بینه احد (طبقات ابن سعد ص ۴۹۸ ج ۷)	حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے فرماتے ہیں یہ صادقہ ہے اس میں وہی روایتیں ہیں جو میں نے براہ راست آپ کی زبان مبارک سے سُنی ہیں اس طرح کہ میرے اور آپ کے درمیان کوئی (واسطہ) نہیں تھا ۔

اور یہ تمام حدیثیں اُنھوں نے اپنے یاد کرنے اور یاد رکھنے کے لئے لکھی تھیں فرماتے ہیں ۔

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص: قال کنت اکتب کل شیء اسمعه من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارید حفظه	میں جو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سُنتا اسے یاد کرنے کی غرض سے لکھ لیا کرتا تھا ۔

حدیثیں لکھنے والے صحابہ اور اُن کے عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کی اجازت سے لکھے ہوئے احادیث کے ذخیروں کی مزید تفصیل اور تحقیق کے لئے مذکورہ بالا مقالہ کی مراجعت کیجئے ۔

[1] حضرت مولینا محمد یوسف بنوری فرماتے ہیں: بخاری کی جانب سے شک نہیں ہے (باقی صفحہ ۱۲۵ پر)

کے لئے حلال کیا گیا ہے اور وہ بھی گھڑی ہے اب اس کے بعد کہ (حسب سابق) حرام ہے نہ مکہ کے کانٹے (دارد خودرو درخت) کاٹے جائیں اور نہ اس کے (دیگر خودرو) درخت کاٹے جائیں، نہ مکہ کی گری پڑی چیز کو اٹھایا جائے بجز مالک کو تلاش کرنے والے کے (کہ وہ اٹھا کر مالک کو پہونچا سکتا ہی) پس مکہ میں اگر کسی قبیلہ کا کوئی آدمی قتل کر دیا جائے تو اس قبیلہ کو دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے یا اس کی دیت (خون بہا عاقلہ سے) لے یا مقتول کے ورثاء قصاص لے لیں، تو اہل یمن میں سے ایک شخص (آپ کے سامنے) آیا اور اس نے درخواست کی: یا رسول اللہ آپ یہ (اعلان) مجھے لکھ دیجئے تو آپ نے حضرت علی کو حکم دیا کہ ابو شاہ کو (یہ اعلان) لکھ دو (۱)

اسی طرح یہ بھی (احادیث اور تاریخ وسیر) ثابت ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے زمانہ کے بادشاہوں اور جزیرۃ العرب کے (قبائلی) سرداروں کے نام خطوط لکھے ہیں جن میں ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی ہے (۲) اور بعض اوقات آپ فوجی دستوں کے سرداروں کے ہاتھ بھی (متحارب قبائل کو سر بمہر) خطوط بھیجتے اور ان کو حکم دیتے کہ وہ اس فرمان کو فلاں معین مقام سے گزرنے سے پہلے ہرگز نہ پڑھیں۔

اسی طرح یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ عہد نبوت میں بھی بعض صحابہ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے صحیفے (نوشتہ مجموعے) موجود تھے جن میں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے جو کچھ سنتے (یاد رکھنے کی غرض سے) لکھ لیا کرتے تھے۔ جیسے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کا صحیفہ جس کا نام انھوں نے صادقہ رکھا تھا چنانچہ امام احمدؒ نے (اپنی مسند میں) اور بیہقی نے مدخل میں حسب ذیل روایت[لے] نقل کی ہے:

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۴) بلکہ بخاری کے شیخ ابو نعیم کی جانب سے یہ شک ہے۔ صحیح بخاری میں اس کی تصریح ہے۔

(۱) حدیث کی تمام کتابوں میں یہ روایت موجود ہے (۲) ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۲۲-۵۶۔

لے حضرت مولینا محمد یوسف بنوری فرماتے ہیں یہ روایت تو صحیح بخاری کتاب العلم میں موجود ہے (باقی صفحہ ۱۲۶ پر)

ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن عمرو بن العاص کے علاوہ اور کوئی شخص بھی مجھ سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے واقف نہ تھا کیونکہ وہ ہر حدیث کو لکھ لیا کرتے تھے اور میں (زبانی یاد کرتا تھا) لکھتا نہ تھا۔

> عبد اللہ بن عمرو بن العاص کا (اس اہتمام کے ساتھ) حدیثیں لکھنا بعض صحابہ کی نظروں میں کھٹکنے لگا اور انھوں نے کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں تم وہ سب لکھ لیتے ہو؟ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات غصہ کی حالت میں بھی ہوتے ہیں تو (اس حالت میں) ایسی باتیں بھی فرما دیتے ہوں گے جنکو عام شرعی قانون نہیں بنایا جاسکتا)۔

اس پر عبد اللہ بن عمرو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کیا (اور ان صحابہ کا قول نقل کیا) تو آپ نے جواب میں فرمایا۔

> تم مجھ سے (سنی ہوئی) تمام باتیں لکھتے رہو (اور ان لوگوں کے کہنے کی پروا نہ کرو) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے میرے منہ سے تو جو بات بھی نکلتی ہے وہ حق ہوتی ہے (۱)

احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کا ایک صحیفہ (لکھا ہوا مجموعہ) موجود تھا جس میں عاقلہ (قاتل کے برادری والوں) پر دیت واجب ہونے وغیرہ کے احکام تھے (۲)

اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عُمّال (محصلین زکوٰۃ) کو فرامین لکھ کر دیئے تھے جن میں اونٹوں، بکریوں وغیرہ پر زکوٰۃ کی شرح تحریر تھی (۳)

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۲۵) ——— اور صحیفہ صادقہ کا ذکر مسند دارمی اور طبقات ابن سعد وغیرہ میں موجود ہے۔ ۱۲ مترجم

(۱) ابن عبد البر جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷۰   (۲) حوالہ سابق

(۳) حوالہ سابق

ممانعت کتابت حدیث اور اجازت کتابت حدیث سے متعلق حدیثوں میں تطبیق

اب اُن احادیث کے درمیان جن میں کتابت حدیث کی ممانعت ہے اور ان احادیث و آثار کے درمیان جن میں حدیثیں لکھنے کی اجازت دی گئی ہے، مطابقت و موافقت پیدا کرنے کے بارے میں اہل علم نے مختلف طریقے اختیار کئے ہیں اکثر علما کی رائے تو یہ ہے کہ کتابت حدیث کی ممانعت، اجازت کتابت حدیث سے منسوخ[1] ہو چکی ہے، اور کچھ[2] علماء یہ کہتے ہیں کہ ممانعت ان لوگوں کے ساتھ خاص تھی جن سے غلطی کرنے اور قرآن و سنت کے درمیان خلط ملط کر دینے کا اندیشہ تھا اور اجازت ان لوگوں کے ساتھ مخصوص تھی جن سے اس قسم کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔

مصنف کی رائے

اور میرا تو عقیدہ یہ ہے کہ احادیثِ ممانعت اور احادیثِ اجازت کے درمیان کوئی حقیقی تعارض ہے ہی نہیں جبکہ ہمیں تحقیق ہو چکا کہ ممانعت درحقیقت ایسی باضابطہ اور رسمی تدوینِ حدیث سے تھی جیسی قرآن عظیم کی ہو[2] رہی تھی اور اجازت یا مخصوص حالات اور مواقع سے متعلق احادیث لکھنے کی تھی، یا اُن صحابہ کو اجازت دی گئی ہے جو اپنے یاد کرنے اور[3] یاد رکھنے کے لئے احادیث لکھ رہے تھے(۱)

---

[1] جیسے زیارت قبور کی ممانعت، اجازت زیارت قبور سے منسوخ ہو چکی ۱۲

[2] جیسا کہ اکتاب غیر کتاب اللہ کے الفاظ سے قطعی طور پر واضح ہے جو آپ حضرات ابوہریرہؓ کی حدیث میں حاشیہ صفحہ ۱۲۲ پر پڑھ چکے ہیں۔ ۱۲۔

[3] جیسا کہ عبداللہ بن عمروؓ کے الفاظ ارید حفظہ سے واضح ہے۔ ۱۲ مترجم

(۱) اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو خطیب بغدادی نے اپنی کتاب تقیید العلم میں ص ۴۷ پر ضحاک سے روایت کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :-

لا تتخذوا للحدیث کراریس	حدیث کے لئے ایسی کاپیاں نہ بناؤ
ککراریس المصاحف	جیسے قرآن (کی سورتوں) کی کاپیاں
؟ ؟ ؟	ہوتی ہیں۔

خود حدیثیں لکھنے کی ممانعت والی مذکورہ بالا روایت پر غور کرنے سے بھی اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے کیونکہ یہ حدیث عام طور پر حدیثیں لکھنے کی ممانعت کے لئے آئی ہے اور تمام صحابہ کو مخاطب کر کے ممانعت[1] کی گئی ہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اس توجیہ پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ "پھر تو یہ حدیث اس بات کو چاہتی ہے کہ عام طور پر ممانعت کا حکم حرمتِ کتابت بحالہ باقی رہنا چاہیے جبکہ حدیثیں لکھنے کی اجازت خاص مواقع اور حالات کے اندر ہے اور خاص خاص لوگوں کے لئے ہے (یعنے مخصوص حالات و مواقع اور مخصوص اشخاص کے علاوہ عام طور پر اور عام لوگوں کے لئے حدیثیں لکھنا حرام ہونا چاہیے)

کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ[2] بن عمرو کو اپنے مکتوب "مجموعہ احادیث" کے بارے میں بلاتخصیص اپنی تمام حدیثوں کے لکھنے کی اجازت دی تھی چنانچہ وہ برابر آپ کی وفات تک آپ سے سُنی ہوئی تمام حدیثوں کو لکھتے رہے ہیں۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں بلاتخصیص آپ کی تمام حدیثیں لکھنے کی اجازت تھی صرف اتنا تھا کہ حدیثیں قرآن کی طرح باضابطہ اور رسمی طور پر نہ لکھی جائیں۔

(آخری عہد نبوت تک) کتابت حدیث کی اجازت کے باقی اور برقرار رہنے کی مزید

---

[1] اور اس وقت ممانعت کی گئی ہے جبکہ بعض صحابہ بالالتزام آپ کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی ہر بات کو لکھتے تھے جیسے قرآن کریم کی نازل شدہ ہر آیت کو لکھتے تھے جیسا کہ آپ حاشیہ صفحہ ۱۲۲ میں نقل شدہ حضرت ابوہریرۃ کی حدیث اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی حدیث میں پڑھ چکے ہیں ۱۲ مترجم

[2] یہ اجازت عبداللہ بن عمرو کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھی بلکہ انس بن مالک اور رافع بن خدیج وغیرہ کو بھی اسی طرح حدیثیں لکھنے کی اجازت دی تھی اور ان کے مکتوب مجموعوں کا اسی طرح ثبوت موجود ہے جیسے عمرو بن العاص کے الصادقہ کا مراجعت کیجئے اردو مقالہ کتابت و تدوین حدیث

۱۲ مترجم

توثیق اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو امام بخاریؒ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب مرض وفات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف شدت اختیار کرگئی تو آپ نے فرمایا: کوئی چیز جس پر لکھا جائے، میرے پاس لاؤ میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھے دیتا ہوں جس (پر عمل کرنے) کے بعد تم گمراہ نہ ہوگے" لیکن حضرت عمر درمیان میں حائل ہوئے اور دلیل یہ پیش کی کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کرب وبےچینی کا غلبہ ہے (ایسی حالت میں آپ کو زحمت دینا مناسب نہیں اگر کوئی ضروری چیز ہوگی تو سکون ہونے کے بعد آپ لکھا دیں گے چنانچہ اس واقعہ کے بعد آپ تین روز تک بقیہ حیات رہے ضروری ہدایتیں اور وصیتیں فرمائیں مگر لکھ کر کچھ نہیں دیا)

یہ واقعہ علماء کی اس رائے کی تائید کرتا ہے کہ (آپ کے فرمودات لکھنے کی) اجازت آخری حکم تھا نہ یہ کہ کتابت کی اجازت پہلے تھی اور بعد میں منسوخ ہوگئی جیسا کہ سید رشید رضا کی رائے ہے (۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حدیث کے بارے میں صحابہ کرام کا موقف

ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ امام ابوداؤدؒ اور امام ترمذیؒ نے حضرت زید بن ثابت کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ:-

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خدا اس شخص کو تروتازہ (اور خوش وخرم) رکھے جس نے مجھ سے کوئی میری بات سنی پھر اس کو یاد کیا اور پوری طرح یاد رکھا اور اس کے بعد (دوسروں تک) اس کو بالکل اسی طرح پہونچا دیا جیسے مجھ سے سنا، اس لئے کہ بہت سے وہ لوگ جن کو بات (حدیث) پہونچائی جاتی ہے وہ اس کو مجھ سے سننے (اور پہونچانے) والے کی بہ نسبت زیادہ اچھی طرح یاد رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ۂ

---

(۱) مجلۃ المنار ۲ حضرت مولانا بنوری فرماتے ہیں: امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں بھی اس کی تخریج کی ہے

(باقی صفحہ ۱۳۰ پر)

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سُن لو! جو تم میں سے اس وقت موجود ہیں ان کو چاہیئے کہ وہ غیر موجود لوگوں کو (میری باتیں) پہونچادیں ؎

غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح اپنے صحابیوں کو انتہائی احتیاط اور پورے حفظ و اتقان کے ساتھ سنت (کے ذخیرہ) کو بعد میں آنے والی نسلوں تک پہونچانے کی انتہائی تاکید کے ساتھ وصیت فرمائی ہے چنانچہ ضبط و اتقان اور احتیاط کے سلسلہ میں آپ کا ارشاد ہے:۔

آدمی کے لئے یہی گناہ کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کو (بلا تحقیق) بیان کردے (اسی حدیث کو امام مسلم نے صحیح مسلم کے مقدمہ میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے)

لہذا صحابہ کرام کے لئے اسکے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ پورے اہتمام سے آپ کے اس حکم کی تعمیل کریں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ امانت (سنت و حدیث) مسلمانوں تک پہونچادیں، خاص کر جب صحابہ کرام تمام (مفتوحہ) شہروں (اور ملکوں) میں پھیل گئے اور وہ تابعین کے لئے (حدیث رسول اللہ کے علم کا) مرکز اور (دور دراز شہروں سے) سفر کرکے اُن کے پاس پہونچنے والوں کیلئے مرجع بن گئے چنانچہ تابعین قدرتی طور پر اُن کے سفر و حضر کے حالات اور ان کی جائے قیام کی تلاش و جستجو میں رہنے لگے اور دور دراز سفروں کی مشقتیں اُٹھا کر (جہاں وہ ہوتے) ان کے پاس پہونچنے لگے۔

یہی وہ اسباب و عوامل ہیں جو حدیث کی نشر و اشاعت اور عام مسلمانوں تک اس کے پہونچنے کا محرک ثابت ہوئے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۲۹) اور الجزائری کے بیان کے مطابق تو یہ حدیث متواتر ہے۔ ۱۲ مترجم

؎ یہ حدیث تو حجۃ الوداع کے سہ روزہ خطبات کا ایک ٹکڑا ہے جو آپ نے منیٰ میں ایک لاکھ چوبیس ہزار مسلمانوں کے مجمع میں دیئے ہیں اور کانہا موعظۃ مودع — گویا آپ کا یہ خطبہ ایک (دنیا سے) رخصت ہونے والے کی نصیحت ہے — کے مطابق آپ کی آخری وصیت ہے اور معنوی اعتبار سے متواتر حدیث ہے۔ ۱۲

روایت حدیث کی کمی بیشی کے لحاظ سے صحابہ کے مختلف درجے

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے روایت کرنے میں مقدار احادیث کی زیادتی کمی کے اعتبار سے صحابہ کے مختلف درجے تھے (بعض نے کم یا بہت ہی کم حدیثیں روایت کی ہیں بعض نے زیادہ یا بہت زیادہ) چنانچہ مُقلّین (کم یا بہت کم روایت کرنے والوں) میں سے حضرت زبیر، حضرت زید بن ارقم اور حضرت عمران بن حصین ہیں۔

(۱) امام بخاری نے صحیح بخاری کی کتاب العلم میں حضرت عبداللہ بن زبیر کے متعلق روایت بیان کی ہے کہ اُنھوں نے اپنے والد حضرت زبیر سے کہا:

میں آپ کو اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرتے ہوئے نہیں سنتا جیسے فلاں، فلاں شخص بیان کرتے ہیں" تو اُنھوں نے جواب دیا:

اے میرے بچے! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (سفر میں ہوں آپ یا مقیم) کبھی جُدا نہیں ہوا کہ مجھے آپ کی حدیثیں معلوم نہ ہوں) لیکن میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سُنا:

جس شخص نے میری طرف منسوب کرکے کوئی جھوٹ بولا اسے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لینا چاہیئے۔

(اس ڈر اور خوف کی وجہ سے میں حدیثیں بیان نہیں کرتا کہ مجھ سے دانستہ یا نادانستہ طور پر کوئی جھوٹی بات آپ کی طرف منسوب نہ ہو جائے)

(۲) محدث ابن ماجہ سنن ابن ماجہ میں روایت کرتے ہیں کہ زید بن ارقم سے کہا جاتا کہ آپ ہم سے حدیثیں بیان کیجئے تو وہ کہتے: "(بھائی) اب ہم بوڑھے ہو گئے ہمارا حافظہ خراب ہو گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرنا بڑی سخت ذمہ داری کا کام ہے۔"

(۳) سائب بن یزید کہتے ہیں کہ: میں مکہ سے مدینہ تک (ایک سفر میں) حضرت سعد بن مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہا، میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بھی ان کی زبان سے نہیں سُنی۔

(۴) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان

کرنے کے بعد یہ فرما دیا کرتے تھے "یا جیسا آپ نے فرمایا" یہ آپ اس خوف سے فرما دیا کرتے تھے کہ کہیں کوئی جھوٹ بات آپ کی طرف منسوب نہ ہو جائے۔

قلت روایت حدیث کی وجہ

لہٰذا حضرت زبیر اور زید بن ارقم رضی اللہ عنہما اور ان جیسے قلیل الروایت صحابہ کا یہ طرز عمل (اور روایت حدیث سے احتراز) صرف اس خوف پر مبنی تھا کہ کہیں سے بلا قصد ہی سہی۔ ان سے حدیث میں کوئی خلاف واقعہ بات سرزد نہ ہو جائے۔ کچھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کا حافظہ اتنا قوی نہ تھا کہ وہ حدیث کو

---

۵۱ محمد بن سعد طبقات ابن سعد میں قلت روایت حدیث کی وجوہ و اسباب کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

محمد بن عمر الاسلمی فرماتے ہیں: کبار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے روایت حدیث کی قلت کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رحلت فرمانے کے بعد بہت کم عرصہ بقید حیات رہے اور اس سے پہلے وفات پا گئے کہ لوگوں کو ان سے روایت حدیث کی ضرورت پیش آئے) حضرت عمر بن الخطاب اور علی بن ابی طالب کو بھی کثرت سے حدیثیں روایت کرنے کے واقع اس لئے پیش آئے کہ ان کے عہد خلافت میں ان سے بکثرت مسائل دریافت کئے گئے (ان کے جوابات کے لئے ان کو حدیثیں بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی) اور (خلیفۃ المسلمین ہونے کی حیثیت سے) انھوں نے (پیش آمدہ معاملات میں بکثرت) فیصلے کئے (اور ان فیصلوں کے لئے حدیثیں بیان کرنی پڑیں) ویسے تو سب ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی (امت کے لئے) واجب الاقتدیٰ پیشوا تھے جو کچھ وہ کرتے تھے لوگ اس کو یاد رکھتے ان سے فتوے طلب کئے جاتے تو فتوے دیتے، (اور لوگ انھیں بطور سند یاد رکھتے) انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے حدیثیں سنی تھیں اس لئے (فرمان نبوی کی بنا پر) ان کو (امت تک پہونچانا ان کا فرض تھا) چنانچہ بڑی عمر والے صحابہ نے کم عمر صحابہ کی بہ نسبت بہت کم حدیثیں بیان کیں (صرف اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ بتقاضائے عمر بہت تھوڑے دن زندہ رہے اس لئے ان کو حدیثیں روایت کرنے کے واقعے بھی کم میسر آئے)۔

مثلاً حضرت ابوبکر صدیق (متوفی سنہ ۱۳ھ) حضرت عثمان (متوفی سنہ ۳۵ھ) حضرت طلحہ (متوفی سنہ ۳۶ھ)

باقی صفحہ ۱۳۳

بلفظہ بیان کرسکتے اور ہو بہو اُسی طرح روایت کر سکتے جیسے اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا۔ اس لئے ان حضرات کے نزدیک اللہ کے دین میں احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ وہ حدیثیں بیان نہ کریں یا کثرت سے بیان نہ کریں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۴۲) حضرت زبیر (متوفی ۳۶ھ) حضرت سعد بن وقاص (متوفی ۵۵ھ) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (متوفی ۳۱ھ) حضرت ابو عبیدۃ بن الجراح (متوفی ۱۸ھ) حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل (متوفی ۵۱ھ) حضرت ابی بن کعب (متوفی ۳۰ھ) حضرت سعد بن عبادۃ (متوفی ۱۵ھ) حضرت عبادۃ بن الصامت (متوفی ۳۴ھ) حضرت اسید ابن حضیر (متوفی ۲۰ھ) حضرت معاذ بن جبل (متوفی ۱۸ھ) اور ان کے ہم سن صحابہ، کہ ان سے اتنی زیادہ حدیثیں مروی نہیں ہیں جتنی انکی نسبت کم سن صحابہ سے مروی ہیں مثلاً حضرت جابر بن عبداللہ (۷۸ھ کے بعد) حضرت ابو سعید الخدری (۶۵ھ) حضرت ابوہریرہ (۵۹ھ) حضرت عبداللہ بن عمر (۷۳ھ) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (۶۵ھ) حضرت عبداللہ بن عباس (۶۸ھ) حضرت رافع بن خدیج (۷۴ھ) حضرت انس بن مالک (۹۳ھ) حضرت براء بن عازب (۷۲ھ) اور ان کے ہم سن صحابہ اس لئے کہ یہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد) مسلمانوں کے درمیان کافی عرصہ زندہ رہے اور ان کی عمریں دراز ہوئیں تو (قدرتی طور پر) لوگوں نے (شرعی احکام معلوم کرنے کے لئے) ان کی طرف رجوع کیا (اور ان کو حدیثیں بیان کرنے کے مواقع بھی بہت زیادہ میسر آئے۔)

غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کی حدیثوں کے حامل) کچھ تو آپ کے سامنے ہی وفات پا گئے کچھ آپ کے بعد بہت کم عرصہ زندہ رہے اس لئے یا ان سے حدیثیں بالکل ہی روایت نہیں کی گئیں یا بہت کم۔ علاوہ ازیں ان کو روایت حدیث کی ضرورت اس لئے بھی پیش نہیں آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ان کے زمانہ میں بکثرت موجود تھے۔

ان (کم روایت کرنے والوں) میں ایسے بھی بعض صحابی ہیں جن کو زیادہ حدیثیں بیان کرنے والوں کی بہ نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت، ہمنشینی (سفر و حضر میں رفاقت) اور حدیثوں کے سننے کے مواقع بہت زیادہ میسر آئے اس کے باوجود اُن سے یا حدیثیں بالکل ہی

(باقی صفحہ ۱۴۴ پر)

قلت روایت حدیث کی ایک اور وجہ

اس احتیاط کوشی پر ایک بات کا اور اضافہ کیجئے وہ یہ کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (ہمیشہ) اس کی ترغیب دیا کرتے تھے کہ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں کثرت سے نہ بیان کریں، مبادا لوگ قرآن کو چھوڑ کر حدیث میں مشغول ہوجائیں اور قرآن تو (اپنی کشش اعجاز کی وجہ سے) ہر آن تر و تازہ اور شاداب رہیگا اس لئے مسلمانوں کو تو (ابھی) قرآن کے ہی حفظ کرنے، ایک دوسرے کو پہونچانے، اس میں احتیاط برتنے اور اس کی تعلیم و تعلم پر توجہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۳ سے آگے) مروی نہیں ہیں یا بہت کم ہیں اس کی وجہ علاوہ صحابہ کی کثرت کے یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ حضرات (دانستہ یا نادانستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی بات منسوب ہوجانے کے ڈر سے) حدیثیں بیان کرنے سے گریز کرتے تھے یا عبادت الٰہی میں بہت زیادہ مشغول رہتے تھے یا کثرت سے غزوات و محاربات میں زندگی گزاری اور ان مشاغل کی وجہ سے حدیثیں بیان کرنے کے مواقع میسر نہ آئے۔

محمد بن سعد کے مذکورہ بالا بیان اور خود ان قلت سے روایت کرنے والے صحابہ کے بیان کو سامنے رکھ کر الحدیث والمحدثون کے مصنف ابو زہو نے کبار صحابہ کی قلت روایت کے آٹھ اسباب بیان کئے ہیں مگر انکی تنقیح اور دقیق تجزیہ کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ قلت روایت حدیث کے حقیقی سبب صرف دو ہیں :-

اوّل یہ، کہ یہ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد بہت تھوڑے عرصہ بقید حیات رہے جیسا کہ ان کے سنین وفات سے ظاہر ہے۔

دوم یہ، کہ یہ حضرات غایت ورع و تقویٰ اور احتیاط کی بنا پر اس امکان کو ہی ختم کردینا چاہتے تھے کہ ان کے ذریعے سے کوئی جھوٹی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہو۔ اور چونکہ حدیث کی روایت کرنے میں مشغول صحابہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امت تک پہونچانے میں مصروف تھے اسلئے یہ فرض کفایہ ادا ہو رہا تھا کتمان علم اور ضیاع حدیث کا اندیشہ نہ تھا۔ مزید تفصیل کیلئے مراجعت کیجئے اُردو مقالہ حفظ الحدیث وجهود الامة فيه زیر طبع مکتبہ اسلامیہ کراچی۔ مترجم

مرکوز کرنے کی کس قدر شدید ضرورت ہے؟ (پہلے حفظ قرآن کا حق ادا ہو جائے)
چنانچہ امام شعبیؒ نے حضرت کعب بن قرظہ سے روایت کیا ہے کہ:۔

ہم عراق جانے کے ارادہ سے (مدینہ سے) روانہ ہوئے تو حضرت عمرؓ بھی مقام صرار تک ہمارے ساتھ ساتھ چلے آئے پھر آپ نے وضو کیا اور (پانی کی قلت کی وجہ سے ہر عضو) دو دو مرتبہ دھویا، پھر فرمایا: تمہیں معلوم ہے میں تمہارے ساتھ (یہاں تک) کیوں آیا ہوں؟ انھوں نے جواب دیا: جی ہاں! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں اس لئے آپ (ہمیں رخصت کرنے کے لئے) ہمارے ساتھ (یہاں تک) آئے ہیں" حضرت عمر نے فرمایا: (صرف یہی بات نہیں ہے بلکہ میں تمہیں یہ نصیحت کرنے کے لئے آیا ہوں کہ) تم ایک ایسی بستی والوں میں جارہے ہو جو قرآن کو اس طرح پڑھتے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھناتی ہیں، تم اُن کو احادیث میں مصروف کرکے قرآن سے ہٹا دینا (بلکہ) تم ان کے سامنے قرآن کو ہی تجوید کے ساتھ پڑھانا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کم بیان کرنا، اب جاؤ میں تمہارے ساتھ ہوں (یعنی یہ لوگ نو مسلم ہیں تم ان کو یکسوئی کے ساتھ قرآن صحیح پڑھنے پڑھانے میں مشغول رکھنا ایسا نہ ہو کہ حدیثیں یاد کرنے میں ان کی توجہ بٹ جائے اور نہ قرآن ہی آئے نہ حدیث ہی) چنانچہ قرظہ بن کعب جب عراق پہونچے تو لوگوں نے ان سے کہا: آپ ہم سے حدیثیں بھی تو بیان کریں انھوں نے جواب دیا: حضرت عمر نے ہمیں اس سے منع کر دیا ہے۔

کثرت سے حدیثیں روایت کرنے والے صحابہ

اس کے برعکس صحابہ کرام میں ایسے لوگ بھی بکثرت موجود ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں کثرت سے روایت کیا کرتے تھے اور ان کی کثرت روایت کو محسوس کیا جاتا تھا جیسے (۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہ ان کا سینہ ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت سے ــــ احادیث رسول اللہ کا ایک ایسا لبریز سرچشمہ

تھا جس نے مسلمانوں میں موجزن ہو کر تشنہ کامانِ حدیث رسول اللہ کو سیراب اور ان کی علمی مجلسوں کو احادیث و آثار رسول اللہ سے لبریز کر دیا تھا۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی اپنے (باذن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عہد نبوت ہی میں لکھے ہوئے صحیفہ الصادقۃ سے بکثرت حدیثیں بیان کیا کرتے تھے (اور خود ابو ہریرہ کے اعتراف کے بموجب صرف عبداللہ بن عمرو ہی ایسے صحابی ہیں جن کی حدیثوں کی تعداد ابو ہریرۃ سے زیادہ ہے)

(۳) حضرت عبداللہ بن عباس (چونکہ خود عہد نبوت میں بہت کمسن تھے اس لئے) کبار صحابہ سے بڑے اہتمام کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ــ اقوال وافعال اور وقائع واحوال ــ دریافت کیا کرتے اور اس سلسلہ میں بڑی بڑی تکلیفیں اور مشقتیں اُٹھاتے تھے۔ چنانچہ حافظ ابن عبدالبر نے امام ابن شہاب زہری کی روایت سے نقل کیا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا:

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی کی حدیث ہم تک پہونچتی (یعنے ہمیں معلوم ہوتا کہ فلاں صحابی کو آپ کی ایک حدیث یاد ہے) تو اگر میں چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا کہ اس کے پاس پیغام بھیجدوں کہ وہ میرے پاس آکر مجھے حدیث سُنادے لیکن میں (نے ایسا کبھی نہیں کیا بلکہ میں) خود اس کے پاس اس کے گھر گیا ہوں اور (بعض اوقات ناوقت ہونے کی وجہ سے) پوری دوپہر اس کے دروازے پر گذاری ہے یہاں تک کہ وہ (بعد دوپہر خود گھر سے باہر آیا ہے اور میں نے اس سے حدیث سُنی ہے (یعنے اس کے آرام و راحت کی پروا کئے بغیر دروازہ کھٹکھٹاؤں یا آواز دوں: ایسا کبھی نہیں کیا کہ یہ احترام طلب حدیث کے منافی ہے)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے طلب حدیث میں اسی قسم کی بہت سی صبر آزما مشقتیں اور تکلیفیں اُٹھائی ہیں اور اس جانفشانی سخت کوشی اور عرق ریزی سے صحابہ کے پاس جو آپ کی احادیث تھیں ان کو حاصل کیا ہے اور اس کے بعد بغیر کسی بخل اور کوتاہی کے بیدریغ ان کو پھیلانا اور

دوسروں تک پہونچانا شروع کیا ہے۔

حضرت ابن عباس کے روایت حدیث میں احتیاط برتنے کی وجہ

مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب (فتنہ و فساد کے زمانہ میں) حدیثیں گھڑنے کا سلسلہ شروع ہوگیا تو انھوں نے عام طور پر راویان حدیث سے حدیثیں قبول کرنی اور روایت کرنی ترک کردی ہیں، چنانچہ امام مسلم صحیح مسلم کے مقدمہ ج ۱ص ۱۰ پر، بیان کرتے ہیں کہ:۔

> ایک شخص بشیر بن کعب حضرت ابن عباس کے پاس آئے اور اُن کے سامنے حدیثیں بیان کرنی شروع کردیں۔ حضرت ابن عباس نے آخر میں اُن سے کہا۔ فلاں فلاں حدیثیں ذرا پھر بیان کرو" انھوں نے وہ حدیثیں دہرادیں اور اس کے بعد کہا، میں نہیں سمجھتا کہ آپ (ان حدیثوں کے علاوہ) میری ساری حدیثوں کو پہچانتے (اور صحیح تسلیم کرتے) ہیں ؟ یا میری ساری حدیثوں کا انکار کرتے ہیں اور صرف ان حدیثوں کو پہچانتے (اور صحیح تسلیم کرتے) ہیں؟ تو اس پر ابن عباس نے جواب دیا: (اصل بات یہ ہے) کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے جھوٹ بولنے کی وبا نہیں پھیلی تھی تو ہم آپ کی احادیث (بڑے شوق و ذوق اور توجہ کے ساتھ) سنتے (اور روایت کرتے) تھے لیکن جب لوگوں نے ہر قسم کی جھوٹی، سچی حدیثیں بیان کرنی شروع کردیں تو ہم نے آپ کی احادیث کو (عام لوگوں سے) روایت کرنا چھوڑ دیا۔

بہرحال بعض صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کتنی ہی کثرت سے کیوں نہ بیان کی ہوں یہ حقیقت ہے کہ شیخین حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے زمانہ میں روایت حدیث کا سلسلہ بہت کم تھا۔ اس لئے کہ ایک طرف تو ان ہر دو حضرات کے طرز عمل نے صحابہ کو حدیثیں روایت کرنے میں انتہائی احتیاط اور چھان بین پر مجبور کردیا تھا دوسری طرف ہر دو حضرات پہلے قرآن (کے حفظ و ضبط اور صحت ادا) کو (ان نئے نئے مسلمانوں کے اہتمام و توجہ کا مرکز بنانا چاہتے تھے چنانچہ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: کیا تم حضرت عمر کے عہد میں بھی ایسے

ہی (کثرت سے) حدیثیں بیان کیا کرتے تھے جیسے آج بیان کرتے ہو؟ تو انھوں نے جواب دیا: اگر میں حضرت عمر کے زمانہ میں ایسی ہی کثرت سے حدیثیں بیان کرتا تو وہ مجھے اپنے کوڑے سے پیٹتے [۱]

عہد شیخین رضی اللہ عنہما میں روایت حدیث سے متعلق دو اہم بحثیں

اس موقعہ پر دو باتوں سے تفصیلی طور پر بحث کرنا ہمارے لئے ناگزیر ہے جو روایت حدیث کے بارے میں حضرت عمر کے موقف اور دوسرے صحابہ کے موقف سے متعلق ہیں۔

اول یہ کہ کیا حضرت عمرؓ نے کثرت سے حدیثیں بیان کرنے پر کسی صحابی کو کبھی قید کیا تھا؟

دوم یہ کہ کیا صحابہ کرام نے کسی صحابی سے حدیث روایت کرنے کے لئے کچھ شرطیں مقرر کی ہوئی تھیں؟

(۱) کیا کبھی حضرت عمرؓ نے کسی صحابی کو کثرت سے حدیثیں روایت کرنے پر قید میں ڈالا تھا

یہ بات عام طور پر مشہور اور زبان زد عوام ہے کہ حضرت عمرؓ نے تین بڑے بڑے صحابہ کو کثرت سے حدیثیں روایت کرنے پر قید کر دیا تھا۔ یہ تین حضرات عبداللہ بن مسعود، ابو الدرداء اور ابو ذر غفاری تھے۔

میں نے بہت کوشش کی کسی مستند کتاب میں اس روایت کا کچھ پتہ چل جائے مگر انتہائی تلاش کے باوجود مجھے یہ روایت کہیں نہیں ملی۔ اس کے برعکس اس روایت کے جعلی ہونے کے دلائل بالکل واضح اور عیاں ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ:۔

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کبار صحابہ میں سے تھے اور سب سے زیادہ قدیم الاسلام تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دل میں ان کی بڑی عزت وعظمت اور احترام تھا

---

[۱] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۲۱

حتیٰ کہ جب ان کو مدینہ سے عراق بھیجا ہے تو اہل عراق پر بڑا احسان جتلایا ہے کہ: میں نے عبد اللہ کو تمہارے پاس بھیجکر اپنے مقابلہ میں تم لوگوں کو ترجیح دی ہے (یعنے مجھے ابن مسعود کی ہر قدم پر ضرورت تھی اس کے باوجود میں ان کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں) حضرت عمرؓ کے پورے عہد خلافت میں عبداللہ بن مسعود کا مستقل قیام عراق میں رہا ہے، حضرت عمرؓ نے ان کو وہاں صرف اس لئے بھیجا تھا کہ یہ کوفہ اور بصرہ کے (نئے نئے اسلام میں داخل ہونے والے) باشندوں کو دین کی تعلیم دیں اور شریعت کے احکام سکھائیں اور ظاہر ہے کہ بعض احکام تو قرآن عظیم سے ماخوذ ہیں لیکن اکثر و بیشتر احکام سنت اور حدیث سے ماخوذ ہیں، پھر بھلا کون باور کرسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ ان کو حدیثیں بیان کرنے پر قید و بند میں ڈال سکتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے تو ان کو بھیجا ہی اس غرض سے تھا کہ قرآن و حدیث کی تعلیم و اشاعت کی خدمت انجام دیں۔

(۲) باقی رہے حضرت ابوذر اور حضرت ابوالدرداء تو ان کے بارے میں تو سرے سے کثرت سے حدیثیں بیان کرنے کا ثبوت ہی نہیں ہے، یعنے یہ ہر دو حضرات تو مکثرین ـ کثرت سے حدیثیں روایت کرنے والوں ـــ میں شامل ہیں ہی نہیں ان دونوں کا اس سلسلہ میں نام لینا ہی موضوع ہونے کی دلیل ہے۔ ہاں حضرت ابوالدرداء شام میں مسلمانوں کے معلم ضرور تھے جیسے ابن مسعود عراق میں تھے، تو جیسے حضرت عمرؓ کا ابن مسعود کو قید میں ڈالنا عقل میں آنے والی بات نہیں ہے اسی طرح ابوالدرداء کو قید کرنا بھی ہرگز قرین قیاس نہیں، کون باور کرسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ ان حضرات کو تعلیم دین کا معلم اور مفتی بنا کر بھیجنے کے بعد قید میں ڈال سکتے ہیں؟ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ حضرت عمر ابن مسعود اور ابوالدرداء سے یہ چاہتے تھے کہ وہ حدیثیں مسلمانوں سے پوشیدہ رکھیں اور اس کے نتیجہ میں دین کے بعض احکام (جو احادیث سے ماخوذ ہیں مسلمانوں سے) مخفی رکھیں؟ (استغفر اللہ یہ کتمانِ علم ہے جس کے مرتکب عالم کے منہ میں ـــ الجم بلجام من النار ـــ کے بموجب جہنم میں آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔

جہاں تک حضرت ابوذر کا معاملہ ہے تو انھوں نے تو جو احادیث روایت کی ہیں وہ تو

ابوہریرہ کی بیان کردہ احادیث کے عشر عشیر کو بھی نہیں پہونچتیں تو حضرت عمر جب ابوہریرہ کو قید نہیں کرتے تو ابوذر کو کیوں قید میں ڈالتے ہیں؟

اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ ابوہریرہ نے تو حضرت عمر کے ڈر کے مارے حدیثیں بیان کرنی چھوڑ دی تھیں (اس لئے اُن کے قید کرنے کی نوبت نہیں آئی) تو اس پر ہم دریافت کرتے ہیں کہ جب ابوہریرہ حضرت عمر سے ڈرتے تھے تو ابوذر اُن سے کیوں نہیں ڈرے (اور حدیثیں بیان کرنے میں اتنے بیباک کیوں تھے۔ کیا اُنھیں درّہ عمر کا خوف نہ تھا)

مختصر یہ کہ صحابہ میں سے جو حضرات کثرت سے حدیثیں بیان کرنے کے لئے مشہور تھے اور مکثرین میں شمار ہوتے تھے جیسے ابن عباس، ابوہریرۃ، عائشہ، جابر بن عبد اللہ، عبد اللہ بن مسعود سمیت ان میں سے کسی کے متعلق ہمیں کوئی ایسی روایت نہیں ملی جس سے معلوم ہوتا ہو کہ حضرت عمر نے اس بارے میں ان سے کوئی باز پرس کی ہو یا ذرہ برابر تعرض کیا ہو، اس کے برعکس یہ ضرور بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے جب کثرت سے حدیثیں بیان کرنی شروع کیں تو (ایک موقعہ پر) حضرت عمر نے ان سے کہا:

> کیا تم ہمارے ساتھ تھے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فلاں مقام پر تھے۔؟
>
> ابوہریرہ نے جواب دیا: جی ہاں، (علاوہ ازیں) میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سُنا ہے:۔
>
> جو شخص عمداً مجھ سے منسوب کر کے جھوٹ بولے، اسے اپنا ٹھکانہ دوزخ میں ضرور بنا لینا چاہیئے۔

اس پر حضرت عمر نے فرمایا: جب تمہیں یہ حدیث یاد ہے تو جاؤ حدیثیں بیان کرو۔

تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ عمر، ابوہریرۃ کو حدیثیں بیان کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیں جو صحابہ میں سب سے زیادہ حدیثیں بیان کرتے تھے اور ابن مسعود کو جیل میں بند کر دیں جو ابوہریرہ کی بہ نسبت بہت کم حدیثیں بیان کیا کرتے تھے یا ابوالدرداء اور ابوذر کو جیل میں ڈال دیں جو صحابہ میں کثرت روایت کے لئے مطلق مشہور نہ تھے

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

قید میں ڈالنے کی روایت کی حقیقت

(ان تمام عقلی دلائل وقرائن کے باوجود) بخدا، میں اس "قید میں ڈال دیتے" کی روایت کے بارے میں ایک زمانہ تک تردد واضطراب میں پڑا رہا اور غور وفکر کے ہر پہلو سے اس کا جائزہ لیتا رہا یہاں تک کہ ابن حزم کی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں مجھے یہ روایت مل گئی کہ "حضرت عمر نے ابن مسعود، ابو ذر اور ابو الدرداء کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرنے کی وجہ سے قید کر دیا تھا" مگر خود ابن حزم نے اس حدیث کو "منقطع" بتایا ہے اس لئے کہ ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف جو حضرت عمر سے اس حدیث کے نقل کرنے والے ہیں ان کا سماع (حدیث سننا) حضرت عمر سے ثابت نہیں۔ بیہقی نے بھی ابن حزم کی تائید کی ہے مگر یعقوب بن شیبہ اور طبری وغیرہ نے حضرت عمر سے ان کا سماع تسلیم کیا ہے۔ لیکن (تاریخی حقائق سے) ظاہر یہی ہوتا ہے، کہ ابراہیم کا سماع حضرت عمر سے ثابت نہ ہونا چاہیئے اس لئے کہ ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف کا انتقال ۹۹ھ یا ۹۵ھ میں ہوا ہے جبکہ ان کی عمر ۷۵ پچھتر برس کی تھی (اور حضرت عمر ۲۳ھ میں شہید ہوئے ہیں) اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت عمر کی خلافت کے بالکل آخری زمانہ میں یہ پیدا ہوئے ہیں) اور حضرت عمر کی شہادت کے وقت ان کی عمر پانچ، سات سال سے زیادہ نہ ہوگی) اس عمر میں حضرت عمر سے ان کا سماع باور نہیں کیا جا سکتا اس بنا پر یہ روایت قطعاً منقطع ہے نہ یہ حجت بن سکتی ہے نہ ہی قبول کی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد ابن حزم فرماتے ہیں :-

> یہ روایت تو (سند کے نقص کی طرف التفات کئے بغیر) بجائے خود کھلی ہوئی جھوٹی اور جعلی معلوم ہو رہی ہے اس لئے کہ (اس روایت کو صحیح تسلیم کر لینے کی صورت میں) حضرت عمر کا یہ اقدام دو احتمال سے خالی نہیں یا تو یہ کہا جائے کہ حضرت عمر نے ان صحابہ کو جھوٹی حدیثیں بیان کرنے کا مجرم قرار دیا تھا (اس لئے قید کیا) یہ تو اتنی سنگین بات ہے کہ اس کی سقوط محتاج بیان نہیں یا یہ کہا جائے کہ حضرت عمر نے ان صحابہ کو سرے سے حدیث بیان کرنے اور سنت کی تبلیغ واشاعت کرنے سے روکا ہے اور انکو (قید میں ڈال کر) سنت کے

چھپانے اور انکار کر دینے پر مجبور کیا ہے تو یہ اقدام تو بالکل ہی اسلام کے منافی ہے اور (ہمیں یقین ہے کہ) اللہ جل شانہ نے (اپنے رسول کے خلیفہ) امیرالمؤمنین عمر کو ان دونوں (دین و دیانت کے خلاف) اقداموں سے یقیناً محفوظ رکھا ہے (بہرحال) یہ تو ایسی بات ہے کہ کسی مسلمان کے زبان و قلم سے تو نکل نہیں سکتی اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عمر نے بغیر کسی جرم کے ان کو قید میں ڈال دیا تھا تو اس کے معنی تو یہ ہیں کہ حضرت عمر نے ان صحابہ پر صریح ظلم کیا۔ اب فریق مخالف (منکرین سنت) کو اختیار ہے کہ وہ ان جیسی ملعون روایات کو قبول کر کے (حضرت عمر کے حق میں) ان دونوں خبیث راستوں میں سے جس راستہ کو چاہیں اختیار کر لیں[1] (یعنے خواہ ان صحابہ کرام کو جھوٹی حدیثیں بیان کرنے کے جرم عظیم کا مرتکب کہیں اور چاہے حضرت عمر کو العیاذ باللہ خارج از اسلام یا مرتکب ظلم و عدوان قرار دیں)

(۲) کیا صحابہ کرام حدیث قبول کرنے کے لئے کچھ شرطیں لگایا کرتے تھے

(۱) حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں حضرت ابوبکر صدیق کے حالات میں لکھا ہے کہ:-

> جس شخص نے سب سے پہلے احادیث کے قبول کرنے میں احتیاط برتی ہے وہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے چنانچہ امام ابن شہاب زہری حضرت قبیصہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دادی حضرت ابوبکر کے پاس میراث میں سے اپنا حصہ مانگنے آئی تو حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا: نہ کتاب اللہ میں تیرے ۔۔ دادی کے ۔۔ لئے کوئی حصہ پاتا ہوں اور نہ جہاں تک مجھے معلوم ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرے ۔۔ دادی کے ۔۔ لئے کچھ فرمایا ہے۔ اس کے بعد آپ

---

[1] الاحکام ج ۲ ص ۱۹۳۔

نے صحابہ سے خطاب کر کے اس مسئلہ کو دریافت کیا تو حضرت مغیرہ رضؓ اٹھے اور انھوں نے کہا کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دادی کو ⅙ حصہ دیا کرتے تھے"، اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: کیا (اس بات کا سننے والا) تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟ تو اس سوال پر محمد بن مسلمہ رضؓ نے اس (دادی کو حصہ دینے) کی گواہی دی۔ تو حضرت ابوبکر رضؓ نے اس عورت کے لئے حصہ دینے کا حکم نافذ فرمادیا۔

(۲) حافظ ذہبی نے جریری عن ابی نضرۃ عن ابی سعید رضؓ کی سند سے یہ روایت بھی نقل کی ہے:- کہ (ایکمرتبہ) ابوموسیٰ اشعری رضؓ نے (اندر آنے کی اجازت کی غرض سے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دروازے کے پیچھے سے تین مرتبہ سلام کیا لیکن جب ان کو (جواب میں) اجازت نہ ملی تو وہ واپس ہوگئے حضرت عمر رضؓ نے فوراً ان کے پیچھے آدمی بھیجکر بلوایا، اور ان سے پوچھا: تم کیوں لوٹ گئے تھے؟ انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا ہے کہ: تم میں سے جب کوئی (دروازہ پر) تین مرتبہ سلام کرے اور اس کو جواب نہ ملے تو اس کو واپس آجانا چاہیئے" حضرت عمر رضؓ نے فرمایا: تمہیں اس پر گواہ پیش کرنے ہوں گے ورنہ میں تمہارے ساتھ ایسا ایسا سلوک کروں گا" (یعنے سزا دوں گا) تو ابوموسیٰ رضؓ ہمارے پاس سہمے ہوئے اس حالت میں آئے کہ ان کے چہرہ کا رنگ فق تھا ہم اکھٹے بیٹھے ہوئے تھے، ہم نے ان سے پوچھا: کیا بات ہے تمہیں کیا ہوا؟ انھوں نے ہمیں پورا واقعہ سنایا اور پوچھا: کیا تم میں سے کسی نے یہ حدیث سنی ہے؟ ہم نے جواب دیا: ہم سب نے سنی ہے" چنانچہ انھوں نے اپنے میں سے ایک شخص کو ان کے ساتھ کر دیا جس نے حضرت عمر کو اس (حدیث کے سماع) کی شہادت دی (۱)

(۳) حافظ ذہبی نے ہشام عن ابیہ عن المغیرۃ بن شعبہ کی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت

---

(۱) مسلم نے بھی اس روایت کی تخریج کی ہے۔

عمر نے (کسی کی ضرب سے) عورت کا حمل گر جانے (کی دیت ــ خون بہا ــ) کے بارے میں صحابہ سے مشورہ کیا تو حضرت مغیرۃ نے کہا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس (جرم کے بارے) میں ایک غلام (دیت میں دینے) کا فیصلہ فرمایا ہے۔"

حضرت عمر نے فرمایا: اگر تم سچے ہو تو ایک گواہ لاؤ جو اس کو جانتا ہو"۔ تو محمد بن مسلمہ نے گواہی دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فیصلہ فرمایا تھا۔

(۳) حافظ ذہبی نے ہی اسماء بن الحکم الفزاری سے یہ بھی روایت کیا ہے کہ: اسماء نے حضرت علیؓ سے سُنا وہ فرماتے تھے: میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے (بلا واسطہ) کوئی حدیث سنتا تھا تو اس حدیث سے جو بھی نفع خدا چاہتا پہونچا دیتا (یعنے خاطر خواہ فائدہ پہونچتا) لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ جب کوئی دوسرا آدمی (صحابی) مجھ سے آپ کی کوئی حدیث بیان کرتا تو میں اس سے قسم لیتا اگر وہ قسم کھالیتا تو میں اس کو سچ سمجھتا، ہاں حضرت ابو بکر صدیق نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی اور (مجھے یقین ہے کہ) وہ (صدیق ہیں) سچے ہیں کہ: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ: "جو بھی کوئی (اللہ کا) بندہ کوئی گناہ کر بیٹھے اور پھر فوراً وضو کر کے دو رکعت نماز (استغفار) پڑھے اور پھر (صدق دل سے) اللہ سے مغفرت چاہے تو اللہ اس کے گناہ ضرور بخش دے گا۔"

مذکورہ بالا روایات کی بنیاد پر قائم شدہ نظریہ

ان آثار و روایات سے بعض محققین یہ سمجھ بیٹھے کہ حضرت ابو بکر صدیق، عمر فاروق رضی اللہ عنہما کا دستور ہی یہ تھا کہ وہ صرف اس حدیث کو قبول کرتے تھے جس کو دو یا دو سے زیادہ راوی روایت کریں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا طرز عمل ہی یہ تھا کہ وہ راوی حدیث سے قسم لیا کرتے تھے۔

(سوء اتفاق سے) ان بعض محققین کا یہ نظریہ، عہد حاضر میں جن مصنفین نے تاریخ تشریع اسلامی اور تاریخ سُنّت پر کتابیں لکھی ہیں ان میں سے بیشتر مصنفین کے ذہنوں میں بھی منتقل ہو گیا حتیٰ کہ ان مصنفین کے نزدیک یہ نظریہ مسلمات میں سے شمار ہونے لگا وہ (شرائط قبول حدیث کے ذیل میں) اس کے سوا اور کچھ لکھتے ہی نہیں۔ اور اسی نظریہ کو

ہمارے اُن جلیل القدر اساتذہ نے بھی اپنا لیا ہے جنہوں نے جامع ازھر کے ماتحت کلیۃ الشریعہ میں مذکرۃ تاریخ التشریع الاسلامی تالیف کی ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے ائمہ کے عمل بالحدیث کی شروط میں تصریح کی ہے کہ: حضرت ابوبکر، عمر اور علی رضی اللہ عنہم کے نزدیک حدیث پر عمل کرنے کی یہی شرط تھی کہ شیخین گواہی طلب کرتے تھے اور حضرت علی قسم لیتے تھے)

اس نظریہ کی تردید

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان چند آثار کی بنیاد پر یہ قاعدہ بنا لینا یا نظریہ قائم کرلینا ایک علمی غلطی ہے جس کی دوسرے بہت سے آثار و روایات تردید کرتے ہیں جو اس امر پر شاہد ہیں کہ حضرت عمر نے اپنے زمانہ میں ایسی بہت سی حدیثیں قبول کی ہیں جنکو صرف ایک ہی راوی (صحابی) نے بیان کیا تھا اور حضرت علی نے بھی بغیر قسم لئے بعض صحابہ کی روایات قبول کی ہیں، حضرت ابوبکر صدیق کے متعلق بھی اسی قسم کی روایات موجود ہیں (کہ اُنھوں نے شہادت طلب کئے بغیر روایات کو قبول کیا ہے)

وہ روایات جن سے شیخین کا خبر واحد کو قبول کرنا ثابت ہوتا ہے

ذیل میں اس قسم کے آثار و روایات ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) امام بخاری و مسلم نے ابن شہاب عن عبد اللہ بن عامر بن ربیعۃ کی سند سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر نے (لشکر سمیت) شام کا سفر کیا جب مقام سرغ پر پہونچے تو ان کو اطلاع ملی کہ شام میں تو وباء پھیلی ہوئی ہے، تو عبد الرحمٰن بن عوف نے حضرت عمر کو بتلایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: اگر تم یہ سنو کہ کسی سرزمین میں وباء پھیلی ہوئی ہے اور تم وہاں موجود ہو تو وباء سے بھاگنے کی نیت سے وہاں سے مت نکلو" چنانچہ حضرت عمر مقام سرغ سے ہی واپس آگئے۔ ابن شہاب زھری کہتے ہیں کہ سالم بن عبد اللہ بن عمر نے بتلایا کہ حضرت عمر عبد الرحمٰن بن عوف کی حدیث کی وجہ سے ہی لوگوں کو لیکر واپس آگئے (اور شام کا سفر نہیں کیا)۔

[illegible]

(۲) مروی ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب یہ کہا کرتے تھے کہ دیت (خون بہا کی رقم)

عاقلہ (مقتول کی برادری) کے لئے ہے اور بیوی اپنے (مقتول) شوہر کی دیت میں سے بالکل وارث نہ ہوگی (اس لئے کہ وہ تو ورثا میں سے ہے) لیکن جب ضحاک بن سفیان نے ان کو بتلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریری طور پر ان کو یہ حکم لکھ کر بھیجا تھا کہ: اشیم ضبّی (مقتول) کی بیوی کو اس کی دیت میں سے حصہ دو لہ تو حضرت عمر نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔

(۳) ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر نے صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: میں اُس شخص کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں جس نے جنین (پیٹ کے بچے) کی دیت (خون بہا) کے متعلق (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) کچھ سُنا ہو (کہ وہ مجھے آپ کا حکم بتلائے) یہ سُنکر حمل بن مالک بن نابغہ اُٹھے اور کہا: میری دو کنیزیں آپس میں سوکنیں تھیں، ایک نے دوسری کے پیٹ پر بیلن مار دیا جس سے اس کا حمل گر گیا۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت ایک غلام یا باندی مقرر فرمائی تھی حضرت عمر نے فرمایا اگر میں یہ حدیث نہ سنتا تو میں کچھ اور فیصلہ کرتا ؎

(۴) ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر نے مجوسیوں کا ذکر فرمایا اور کہا میری سمجھ میں نہیں آتا میں ان مجوسیوں کے ساتھ کیا معاملہ کروں (مشرکین کا سا یا اہل کتاب کا سا) تو عبد الرحمن بن عوف نے کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے آپ فرما رہے تھے ان (مجوسیوں) کے ساتھ اہل کتاب کا سا معاملہ کرنا ؎

(۵) بیہقی نے ہشام بن یحییٰ مخزومی سے روایت کیا ہے کہ: قبیلہ ثقیف کا ایک

لہ الرسالہ ص ۴۲۶ طبع جدید، نیز امام احمد، ابو داؤد و ترمذی، ابن ماجہ اور مالک نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے

؎ الرسالہ ص ۴۲۷ ؎ الرسالہ ص ۴۳۰

آدمی حضرت عمر کے پاس آیا اور ان سے مسئلہ دریافت کیا کہ اگر (حج کے دوران) کسی عورت کو حیض آجائے اور وہ طواف زیارت کر چکی ہو تو کیا وہ پاک ہونے سے پہلے (طوافِ صدر کئے بغیر) واپس ہو سکتی ہے؟ حضرت عمر نے فرمایا: "نہیں" تو اس پر ثقفی نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس قسم کی عورت کے بارے میں مجھے اس کے خلاف فتویٰ دیا ہے (کہ واپس جا سکتی ہے) حضرت عمر نے اس کے ایک دُرّہ لگایا اور کہا:- جس چیز کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتویٰ دیدیا اس کے بارے میں تم مجھ سے کیوں فتویٰ پوچھتے ہو"(۱)

(۶) مروی ہے کہ حضرت عمر نے انگوٹھوں کی دیت (خون بہا) پندرہ اونٹ مقرر فرمائی اور اس کے قریب والی انگلی (انگشت شہادت) کی دس اونٹ، اسی طرح بیچ کی انگلی کی دس اونٹ اور جو انگلی چھنگلیا سے ملی ہوئی ہے اس کے نو اونٹ اور چھنگلیا کے چھ اونٹ۔ لیکن جب حضرت عمر سے اُس کتاب (تحریر) کا ذکر کیا گیا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزم کو دیتیں تحریر کر کے بھیجی تھیں اور اس میں آپ نے فرمایا تھا: ہر انگلی کے عوض میں انگوٹھے سے چھنگلیا تک دس اونٹ ہیں" تو حضرت عمر نے اپنے فیصلہ سے رجوع کر لیا اور وہی اختیار فرمایا (جو فرمان نبوی علیہ السلام، عمرو بن حزم کے نوشتہ میں تحریر تھا)

اصول فقہ کی بعض کتابوں میں یہ واقعہ اسی طرح منقول ہے۔ لیکن شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندیؒ نے فتح الملہم شرح صحیح مسلم کے صفحہ ۔ پر لکھا ہے کہ:

امام شافعی کی کتاب رسالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کو عمرو بن حزم کی اولاد کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نوشتہ کی اطلاع حضرت عمر کی وفات کے بعد ہوئی ہے اور اسی وقت انھوں نے حضرت عمر کے فیصلہ کو ترک (کر کے اس نوشتہ پر عمل) کیا ہے۔

---

(۱) سیوطی مفتاح الجنۃ ص ۳۱ ۔ ابن حزم نے بھی الاحکام میں ج ۲ ص ۱۲۴ پر اس کا ذکر کیا ہے۔

(۷) پر (ان سے سنکر) نیز حضرت عمر نے حضرت سعد بن ابی وقاص کی حدیث مسح علی الخفین (یعنی موزوں پر مسح) پر (اُن سے سُنکر) عمل کیا [۱]

(۸) (ایک مرتبہ) حضرت عمر نے ایک دیوانی عورت کو (زنا کے جرم میں) رجم (سنگسار) کرنے کا ارادہ کیا لیکن جب ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "رفع القلم عن ثلاثۃ" بتلایا گیا تو انھوں نے (اس عورت کو) رجم نہ کرنے کا حکم دیا [۲]

(۹) (اسی طرح ایک مرتبہ) حضرت عمر نے حاطب کی آزاد کردہ لونڈی کو (زنا کے جرم میں) سنگسار کرنے کا حکم دیا لیکن جب حضرت عثمان نے ان کو بتلایا کہ جاہل (قانون سے ناواقف) پر حد نہیں ہے تو آپ اس کو رجم کرنے سے رُک گئے۔

یہ روایات پہلی روایات کے مقابلہ میں قابل ترجیح ہیں

یہ تمام احادیث و آثار مشہور و معروف ہیں اور صحیح سندوں سے مروی ہیں، معتمد و معتبر ائمہ حدیث نے ان کو روایت کیا ہے اور ان سے واضح طور پر بغیر کسی قیل و قال کی گنجائش کے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک صحابی کی بیان کردہ حدیث کو بلا کسی تردد و توقف کے قبول فرمایا کرتے تھے۔ اور ان روایات کی تعداد اُن روایتوں سے بہت زیادہ ہے جن میں حضرت عمر نے دوسرے صحابی کی شہادت بھی طلب کی ہے اور یہ روایتیں صحت اور ثبوت میں بھی اُن سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اور جبکہ اور تمام صحابہ کا طرز عمل یہی تھا کہ وہ ایک صحابی کی روایت کو بلا تردد قبول کیا کرتے تھے تو ہمیں لازمی طور پر ان روایات کی جن میں شہادت طلب کی ہے کچھ نہ کچھ تاویل کرنی پڑے گی کیونکہ یہ خود ان کے معمول کے بھی خلاف ہیں اور عام صحابہ کے طرز عمل کے بھی خلاف ہیں۔

---

[۱] فتح الملہم ص ۷

[۲] الاحکام ج ۲ ص ۱۳

پہلی روایات کی توجیہ چنانچہ ان روایات کو بنظر غائر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مغیرہ بن شعبہ کی حدیث جو اسقاط کے بارے میں ہے وہ تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہشام عن ابیہ کے علاوہ حمل بن نابت کے طریق سے بھی مروی ہے اور اس میں تصریح ہے کہ مغیرہ بن شعبہ کی حدیث کو حضرت عمر نے بغیر کسی تردد کے قبول کر لیا تھا (اور مسلمہ کی شہادت کی نوبت نہیں آئی تھی) اب صرف ابوموسیٰ کی "استیذان" والی روایت رہ جاتی ہے تو لازمی طور پر ہم اس روایت میں طلب شہادت کو حضرت عمر کے مشہور و معروف طرز عمل پر محمول کریں گے کہ وہ خود بھی احادیث کی روایت میں انتہائی احتیاط برتتے تھے اور عام طور پر صحابہ کو بھی روایت حدیث کے بارے میں انتہائی احتیاط اور تثبت اختیار کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے لہٰذا ہم کہیں گے کہ حضرت ابوموسیٰ کے معاملہ میں اور مغیرہ بن شعبہ کے معاملہ میں — جبکہ ہم فرض کرلیں کہ اس کے معارض دوسری روایت نہیں ہے — حضرت عمر کا مقصد (شہادت طلب کرنے سے) عملی طور پر روایت و قبول حدیث کے بارے میں صحابہ کو انتہائی احتیاط اور تحقیق و تثبت کا درس دینا تھا کہ جب حضرت عمر، ابوموسیٰ اور مغیرہ بن شعبہ جیسے صحابیوں سے — جن کی جلالت شان تمام صحابہ میں معروف و مسلم ہے — دوسرے صحابی کی گواہی طلب کرتے ہیں تو جو لوگ صحابہ میں ان دونوں حضرات سے کم درجہ ہیں اُن کو نیز تابعین وغیرہ راویان حدیث کو تو احادیث و روایات کے روایت کرنے اور قبول کرنے میں بدرجہ اولیٰ انتہائی تحقیق و تثبت اور غور و فکر سے کام لینا چاہیئے۔

اس توجیہہ کے صحیح ہونے کی دلیل حضرت عمر کے مذکورہ بالا عمل (گواہی طلب کرنے) کا یہ قطعاً صحیح اور واقعات کے مطابق محمل ہے،

اس کی تائید خود حضرت عمر کے اس قول سے ہوتی ہے کہ حضرت عمر نے آخر میں ابوموسیٰ اشعری سے فرمایا: واضح ہو کہ اے ابوموسیٰ! میں تم پر (جھوٹ بولنے کی) تہمت نہیں لگاتا لیکن یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا معاملہ ہے (اس میں بیحد احتیاط کی ضرورت ہے) ایک اور روایت میں آیا ہے کہ جب حضرت ابی بن کعب نے (ابوموسیٰ اشعری سے گواہی طلب کرنے پر) ناگواری کا اظہار کیا تو حضرت عمر نے جواب دیا: میرا مقصد تو صرف روایت حدیث میں احتیاط اور تثبت کی طرف توجہ دلانا تھا۔

یہی توجیہ امام شافعی نے کی ہے

چنانچہ امام شافعیؒ نے اپنی کتاب الرسالہ میں حضرت عمر کے ایک صحابی کی روایت کو قبول کرنے سے متعلق روایات نقل کرنے کے بعد حضرت ابوموسیٰ کے واقعہ میں حضرت عمر کے اس طرز عمل کی ـــ کہ انھوں نے دوسرے صحابی کی گواہی طلب کی ـــ یہی توجیہہ کی ہے:

> چنانچہ امام شافعی فرماتے ہیں: رہی ابوموسیٰ کی حدیث تو وہ (گواہی طلب کرنا) تو صرف احتیاط پر مبنی تھا اس لئے کہ حضرت ابوموسیٰ، حضرت عمر کے نزدیک ثقہ اور امین تھے انشاء اللہ، اگر کوئی ہم سے یہ پوچھے کہ (آپ کے پاس) اس کی کیا دلیل ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ امام مالک نے ربیعہ کی سند سے ابوموسیٰ کی مذکورہ بالاحدیث ـــ جس کے ربیعہ کے علاوہ اور بھی مدینہ کے علماء راوی ہیں ـــ نقل کی ہے اور یہ کہ حضرت عمر نے فرمایا: آگاہ ہو کہ میں تمہیں متہم (جھوٹا) نہیں قرار دیتا بلکہ مجھے تو ڈر اس کا ہے کہ (کہیں) لوگ رسول اللہ کی طرف جھوٹی باتیں نہ منسوب کرنے لگیں(۱)

حضرت ابوبکر کے واقعہ کا جواب

یہ تو تھی حضرت عمر کے متعلق بحث باقی رہا حضرت ابوبکر صدیق کا معاملہ تو ان سے سوائے اس ایک (دادی کی میراث کے) واقعہ کے اور کوئی دوسرا واقعہ مطلق مروی نہیں جس میں انھوں نے دوسرے راوی کی گواہی مانگی ہو اور یہ ایک واقعہ اس نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتا کہ ان کا مسلک ہی یہ تھا کہ وہ صرف اسی روایت کو قبول کرتے تھے جس کے راوی دو ہوں۔ اس لئے کہ حضرت ابوبکر کے سامنے بکثرت ایسے مسائل پیش کئے گئے ہیں جن

---

(۱) الرسالہ ص ۴۳۴ ابن حزم کی رائے ہے کہ ابتداء میں تو حضرت عمر کا یہ طرز عمل تھا لیکن جب اُبَی بن کعب نے اس پر ناگواری کا اظہار کیا تو انھوں نے اس طرز عمل کو ترک کر دیا اور ایک صحابی کی روایت قبول کرنے لگے ملاحظہ ہو الاحکام ج ۲ ص ۱۴۰ (۲) ابن حزم نے تو اس روایت کو معلول بتلایا ہے وہ کہتے ہیں: یہ روایت منقطع ہے اس لئے صحیح نہیں الاحکام ج ۲ ص ۱۴۰

میں اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف رجوع کیا ہے (اور صحابہ سے ان کی سنی یا دیکھی احادیث دریافت کی ہیں) لیکن بجز اس ایک واقعہ کے اور کسی بھی موقعہ پر دوسرے راوی کی گواہی نہیں طلب کی۔

بلکہ امام رازیؒ نے تو محصول میں لکھا ہے کہ :۔

(ایک مرتبہ) حضرت ابوبکرؓ نے دو آدمیوں کے درمیان ایک فیصلہ دیا تو حضرت بلالؓ نے ان کو بتلایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو آپ کے فیصلہ کے خلاف فیصلہ صادر فرمایا تھا تو یہ سُنکر اُنھوں نے اپنے فیصلہ سے رجوع کرلیا (۱)

اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس سے ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے

حافظ ابن قیمؒ نے مقدمات کے فیصلوں کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا طریق کار یہ نقل کیا ہے کہ :۔

جب ان کے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو وہ پہلے کتاب اللہ (قرآن) میں غور وفکر کرتے اگر قرآن میں فیصلہ کرنے کے لئے کوئی نص مل جاتی تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے اگر کتاب اللہ میں کچھ نہ ملتا تو (اپنے علم کے مطابق)، رسول اللہ کی سنت (احادیث) میں غور وفکر کرتے اگر کوئی نص مل جاتی تو اس کے مطابق فیصلہ کردیتے اگر (اپنے علم کے مطابق) سنت میں بھی کچھ نہ ملتا تو دوسرے صحابہ سے دریافت کرتے کہ کیا تمہیں علم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ دیا ہے؟ تو بسا اوقات اس پر کوئی کھڑا ہوتا اور بتلاتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ فرمایا تھا اور اگر لوگوں سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی سنت (قول یا فعل) کا پتہ نہ چلتا تو بڑے بڑے ذی رائے صحابہ کو آپ جمع کرتے اور اُن سے مشورہ کرتے جس رائے پر وہ متفق ہوجاتے اسی کے مطابق فیصلہ فرمادیتے (۲)

---

(۱) المحصول ج ۲ قلمی نسخہ (۲) اعلام الموقعین ج ۲ ص ۵۱

مختصر یہ ہے کہ (ذخیرۂ روایات میں) ہمیں کوئی ایک بھی ایسی صریح روایت نہیں ملتی جس سے ثابت ہو کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کسی حدیث کو قبول کرنے کے سلسلہ میں دوسرے راوی کی شہادت مانگی ہو بجز اس دادی کی میراث کے مسئلہ کے۔

حضرت ابوبکرؓ کے واقعہ کی توجیہہ

غالب گمان یہ ہے کہ اس مسئلہ میں خاص طور پر حضرت ابوبکرؓ نے دوسری گواہی صرف ازراہ تحقیق وتثبت طلب کی ہے اس لئے کہ دادی کے حصہ کا ذکر قرآن عظیم میں صراحتاً مذکور نہیں ہے[۱] اس لحاظ سے یہ حکم ایک نیا شرعی حکم ہے اس کے نافذ کرنے میں انتہائی احتیاط اور غور وفکر کی ضرورت تھی (وہ اس طرز عمل سے مجتہدین کی رہنمائی کرنا چاہتے ہیں کہ جو حکم قرآن عظیم میں صراحتاً مذکور نہ ہو اس میں انتہائی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے) نہ یہ کہ ان کا مستقل معمول ہی یہ تھا کہ ہر حدیث کو وہ اسی وقت قبول کریں جبکہ اس کو دو راوی روایت کریں۔

امام غزالی اپنی کتاب المستصفی ج ۱ ص ۱۵۴ پر لکھتے ہیں:

> حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دادی کی میراث کے سلسلہ میں حضرت مغیرہؓ کی حدیث کو قبول کرنے میں جو توقف کیا تھا غالب گمان یہ ہے کہ اس توقف کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے اور غالباً کسی اور کو اس کا علم نہیں ہوا ہے مثلاً یہ کہ (۱) یا وہ تحقیق کرنا چاہتے ہوں کہ میراث جدہ کا یہ حکم (جس کو مغیرہ بن شعبہ روایت کرتے ہیں) اب بھی باقی ہے یا منسوخ ہو چکا (اگر کسی دوسرے صحابی نے بھی اس کو بیان کیا تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ مستقل حکم شرعی ہی اور اب بھی باقی ہے ورنہ تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کوئی جزئی واقعہ تھا ہو سکتا ہے منسوخ اور متروک ہو گیا ہو) (۲) یا وہ یہ تحقیق کرنا چاہتے ہوں کہ کسی دوسرے صحابی کو بھی اس کا علم ہے یا نہیں اگر دوسرے صحابہ کو بھی اس کا علم ہوگا تو یہ حکم شرعی اور زیادہ قوی اور محکم ہو جائے گا اور اگر دوسرے صحابہ کو اس کے خلاف علم ہوگا تو اس کو رد کیا جا سکے گا۔ (۳) یا اس لئے توقف کیا ہوگا کہ وہ اس حکم کی تقویت کے لئے مزید شہادتیں چاہتے ہوں گے جیسے مقدمات میں حاکم

---

[۱] حالانکہ قرآن کریم نے تمام اصحاب فروض (حصہ والوں) کا تفصیل سے ذکر فرمایا ہے ۱۲

دو شہادتوں کے بعد بھی اپنے فیصلہ کی صحت کا یقین و اطمینان حاصل کرنے کے لئے اور زیادہ شہادتیں طلب کیا کرتا ہے اس لئے نہیں کہ دو شہادتیں فیصلہ کے لئے کافی نہیں ہیں (۴) یا حضرت ابوبکر نے اس لئے توقف کیا ہو گا کہ لوگ بے پروائی کے ساتھ کثرت سے حدیثیں بیان کرنے کی جرأت نہ کریں بہرصورت ان احتمالات میں سے کسی نہ کسی احتمال پر ان کے اس توقف کو محمول کرنا ضروری ہے اس لئے کہ حضرت ابوبکر سے خبر واحد (ایک صحابی کی روایت) کو قبول کرنا اور جو لوگ (عام صحابہ) خبر واحد کے قبول کرنے کے قائل تھے اُن پر رد نہ کرنا قطعی طور پر ثابت ہے۔

حضرت علی کے واقعہ کا جواب

رہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا طرز عمل سو اگر یہ روایت صحیح ہے کہ وہ ہر راوی حدیث سے قسم لیا کرتے تھے۔ — حالانکہ مجھے تو یہ چیز عجیب سی معلوم ہوتی ہے — تو اس معاملہ میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے (یہ ان کی شخصی رائے ہے) اور اگر یہ روایت صحیح نہیں ہے تو پھر ان کا نظریہ بھی یقیناً وہی ہونا چاہیے جو اور تمام صحابہ کا تھا (کہ خبر واحد قابل قبول ہے) بلکہ محصول کے مصنف نے (محصول ج ۲ میں) تو حضرت علی کے بارے میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت علی نے "مذی" (کے حکم) کے بارے میں حضرت مقداد — جن کو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مذی کا حکم دریافت کرنے کے لئے بھیجا تھا — کی روایت قبول کر لی۔[1] اور اُن سے قسم نہیں لی (نہ صرف یہ بلکہ انہی کے اعتماد پر خود بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے) علاوہ ازیں مذکورہ بالا جو روایت اُن سے منقول ہے اس میں بھی انھوں نے حضرت ابوبکر سے قسم نہیں لی بلکہ یہ کہا۔ ابوبکر نے سچ کہا" (اس سے معلوم ہوا کہ یہ قسم لینا ان کا کوئی عام اصول نہ تھا بلکہ اگر تردد ہوتا تو ایسا کرتے تھے ورنہ نہیں) مختصر یہ ہے کہ حضرت ابوبکر، عمر اور علی (رضی اللہ عنہم) کے طرز عمل سے قطعی طور پر یہ ثابت ہے کہ وہ ایک راوی" کی روایت کو قبول کیا کرتے تھے باقی خصوصی حالات کے تحت جہاں دوسرے

---

(۱) المحصول ج ۲۔

راوی کے طلب کرنے یا قسم لینے کی ضرورت ہوتی وہاں دوسرا راوی بھی طلب کر لیتے یا قسم لے لیتے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ ان کا عام مسلک یا مستقل دستور العمل تھا۔

اس تحقیق و توجیہہ کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کی روشنی میں ان تینوں کبار صحابہ کا طرز عمل باقی تمام صحابہ کے ساتھ متفق اور مطابق ہو جاتا ہے کہ تمام صحابہ صرف ایک راوی کی روایت پر اکتفا کیا کرتے تھے خبر واحد کے حجت ہونے" کی بحث کے موقعہ پر ہم اس سلسلہ میں امام شافعی کی تحقیق نقل کریں گے۔

صحابہ کرام کے طلب حدیث کے لئے دور دراز شہروں کے سفر

حضرت عمر کے عہد میں روایت حدیث کا حال

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا زمانہ ختم ہونے (اور وفات پانے) کیوقت سنت صحابہ کے سینوں میں تو پورے طور پر محفوظ تھی لیکن اس کی نشر و اشاعت (اور روایت حدیث) کا سلسلہ کچھ بہت زیادہ نہ تھا (صرف ضرورت کے وقت صحابہ حدیثیں بیان کرتے تھے حمل و روایت حدیث بذات خود مطلوب نہ تھا) نہ ممالک اطراف میں تھا ــــ اس لئے کہ حضرت عمر نے (انتظامی امور میں مشاورت کی غرض سے) بیشتر صحابہ کو مدینہ چھوڑنے (اور دوسرے مفتوحہ شہروں میں آباد ہونے) سے منع کیا ہوا تھا بجز بعض افراد کے جن کے باہر بھیجنے میں دینی مصالح مضمر تھیں، جیسے عبداللہ بن مسعود کو تعلیم قرآن و حدیث کے لئے عراق ـ کوفہ ـ میں اور ابوالدرداء کو شام میں بھیجا تھا ــــ اور نہ خود مدینہ میں ہی (مستقل طور پر اشاعت و روایت حدیث کا سلسلہ) تھا اس لئے کہ حضرت عمر کی سیاست (دینی مصلحت) ــــ جیسا کہ آپ اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں ــــ قرآن (کی تعلیم) کو زیادہ سے زیادہ مرکز توجہ بنانے اور حدیث کو کم سے کم روایت کرنے (کے اصول) پر مبنی تھی، تاکہ بہت زیادہ حدیثیں روایت کرنے سے روکا جا سکے اور روایت حدیث میں وہم یا خطا کی روک تھام بھی ہو سکے۔

حضرت عمر کی شہادت کے بعد

جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو انھوں نے صحابہ کرام کو مفتوحہ ممالک میں آباد ہونے کی اجازت

دیدی (اور بیشتر صحابہ کرام بلاد اسلامیہ میں پھیل گئے یا لفاظ دیگر حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرکز اسلام مدینہ طیبہ میں یکجا محفوظ و مجتمع رہنے کی بجائے تمام اسلامی شہروں میں پھیل گئی) اور (اب) عام لوگوں نے خصوصاً کمسن صحابہ حسلہ بنوں کو جمع کرنے کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگے خاص کر اس لئے بھی کہ بڑی عمر کے صحابہ ۔ جو درحقیقت پورے ذخیرۂ حدیث کے حامل اور محافظ تھے ۔ روز بروز (دنیا سے اٹھتے اور) کم ہوتے جارہے تھے اس لئے (سب سے پہلے) کمسن صحابہ نے بڑی عمر والے صحابہ (یعنی حاملین حدیث) سے بڑے اہمام کے ساتھ حدیثیں حاصل کرنے اور جمع کرنے کی کوشش شروع کی چنانچہ وہ بڑی عمر کے صحابہ (یعنی حفاظ حدیث) سے پورے اہتمام کے ساتھ حدیثیں حاصل کرتے یہاں تک کہ وہ جمع حدیث کی غرض سے ایک دوسرے کے پاس دور دراز کے سفر کرنے میں بھی دریغ نہ کرتے (اس لئے کہ حاملین احادیث دور دراز شہروں میں جاکر آباد ہوگئے تھے)

چنانچہ امام بخاریؒ نے ادب المفرد میں نیز امام احمد، طبرانی اور بیہقی نے یہ الفاظ بیہقی کے ہیں) جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں :-

> مجھے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث جسے میں نے آپ سے نہیں سنا تھا (شام میں) ایک صحابی کے پاس ہے تو میں نے (سفر کے لئے) ایک اونٹ خریدا اور اس پر کجاوہ کسا اور ایک ماہ کا سفر کرکے شام پہنچا تو وہ صحابی عبداللہ بن انیس انصاری نکلے ۔ تو میں ان کے پاس پہنچا اور میں نے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ "مظالم" کے بارے میں ایک حدیث آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے اور میں نے وہ حدیث نہیں سنی ہے تو مجھے ڈر ہوا کہ کہیں اس حدیث کو سننے سے پہلے میں مرجاؤں یا آپ وفات پاجائیں (اس لئے میں مدینہ سے چلکر آپ کے پاس آیا ہوں) تو انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا ہے کہ: قیامت کے دن لوگ غیر مختون، خالی ہاتھ (جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے) اٹھائے جائیں گے ۔ ہم نے عرض کیا، حضور بُھْمٌ

سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: ان کے پاس کچھ نہ ہوگا — پھر ایک ندا (آواز) آئے گی جس کو دور والے بھی ایسے سنیں گے جیسے قریب والے: میں دیّان (بدلہ دلانے والا) ہوں، (لہٰذا) کوئی دوزخی اس وقت تک دوزخ میں داخل نہیں ہوگا جب تک میں اس سے کسی جنتی کا اگر کوئی حق ہو تو اس کا بدلہ نہ دلا دوں اور کوئی جنتی اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوگا جب تک میں اس سے اگر کسی دوزخی کا کوئی حق ہو تو اس کا بدلہ نہ دلا دوں یہاں تک کہ ایک طمانچہ بھی (اگر کسی نے کسی کو مارا ہے تو اس کا بھی بدلہ دلاؤں گا) ہم نے عرض کیا یہ کیسے (ممکن ہوگا)؟ —————

————— ہم تو خدا کے سامنے مادر زاد ننگے، غیر مختون اور خالی ہاتھ حاضر ہوں گے؟ تو آپ نے فرمایا:- نیکیوں اور بدیوں کے ساتھ تبادلہ ہوگا (یعنے اول حقدار کو حق مارنے والے کی نیکیاں دیدی جائیں گی اگر اس سے بھی بدلہ پورا نہ ہوا تو حقدار کی بدیاں اس پر ڈالدی جائیں گی)

(۲) بیہقی اور ابن عبد البر نے عطاءؒ بن ابی رباح سے روایت کیا ہے کہ ابو ایوب انصاری نے (ایک مرتبہ) مدینہ سے عقبہ بن عامر انصاری سے ایک ایسی حدیث حاصل کرنے کے لئے جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُننے والا عُقبہ بن عامر جہنیؓ کے علاوہ اور کوئی صحابی باقی نہیں رہا تھا مصر کا سفر کیا (اس لئے کہ عقبہ اس زمانہ میں مصر میں رہتے تھے) تو ابو ایوب انصاری (کو مصر میں عقبہ بن عامر کے مکان کا پتہ معلوم نہ تھا اس لئے) مسلمۃ بن مخلد امیر مصر کے مکان پر پہونچے (اور وہاں سے عقبہ کا پتہ معلوم کر کے ان کے مکان پر پہونچے) تو عقبہ بن عامر باہر آئے تو (دیکھا ابو ایوب انصاری ہیں فوراً) ان کو لپٹ گئے، اور کہا: اے ابو ایوب آپ (اتنا دور دراز سفر کر کے مصر) کیسے آئے؟ اُنھوں نے کہا: (مجھے معلوم ہوا ہے کہ) تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مومن کی پردہ پوشی (کے اجر و ثواب) کے بارے میں ایک حدیث سُنی ہے؟ عقبہ نے کہا جی ہاں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سُنا ہے آپ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے دُنیا میں مومن کی

کسی معصیت پر اس کی پردہ پوشی کی اللہ جل شانہٗ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے" اس کے بعد حضرت ابو ایوب انصاری اپنی سواری کی طرف لوٹے اور فوراً اس پر سوار ہو کر مدینہ روانہ ہو گئے چنانچہ امیر مصر مسلمہ کی جانب سے "شاہی ضیافت" بھی عریش مصر میں ان تک پہونچ پائی (گویا حدیث سننے کے بعد ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہرے اور واپس مدینہ روانہ ہو گئے تا کہ طلب حدیث کی نیت اور قصد کے ساتھ کسی دوسری غرض کی آمیزش نہ ہو)

یہ ہیں وہ محرکات جن کے تحت روایت و اشاعت حدیث کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہونا شروع ہو گیا اور صحابہ (خصوصاً کبار صحابہ) پہلے سے بہت زیادہ مسلمانوں کے مرکز توجہ و اہتمام بن گئے۔ (صغار صحابہ کے علاوہ) تابعین بھی حضرات صحابہ سے — جہاں بھی وہ ہوں — ملاقات کرنے اور ان کے سینوں میں جو علم (احادیث) محفوظ تھا اس کو اُن سے منتقل کرنے کے — اس سے پہلے کہ وہ رفیق اعلیٰ (رب العالمین) سے جا ملیں — بیحد حریص تھے۔ اسلامی شہروں میں سے کسی بھی شہر میں کسی ایک صحابی کی آمد (اور اس کی شہرت) سارے باشندگان شہر کو (پروانوں کی طرح اس شمع سنت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے گرد) جمع کر دینے کے لئے بہت کافی ہوتی تھی اور ان کے پہونچتے ہی (تشنہ کامان حدیث رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے) ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے اور (فرط شوق و تعجب سے) انگلیاں اٹھتیں کہ یہ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی۔

کثرت سے حدیثیں روایت کرنے والے صحابہ اور اس کی وجہ

درحقیقت صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث، دوسرے صحابہ کی بہ نسبت بہت زیادہ روایت کرنے میں یا تو اس لئے مشہور ہوئے کہ (۱) وہ (قدیم الاسلام ہونے کی وجہ سے) آپ کی صحبت میں بہت زمانہ تک رہے تھے جیسے حضرت عبد اللہ بن مسعود (۲) یا وہ شب و روز آپ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے جیسے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص) حضرت انس بن مالک (۳) یا انھیں آپ کے خانگی حالات اور نجی زندگی کا زیادہ وسیع علم تھا جیسے حضرت عائشہ صدیقہ (۴) یا ان کو طبعاً جمع احادیث سے بہت زیادہ شغف تھا جیسے عبد اللہ بن عمرو

عبداللہ بن عمرو بن العاص اور ابوہریرۃ، حالانکہ ان میں سے پہلے دو حضرات کمسن تھے اور تیسرے بہت بعد میں (۷ھ کے اندر) اسلام لائے تھے (مگر یہ تینوں جمع و حفظ حدیث کے دیوانے تھے)

لوگ ان احوال و ظروف میں صحابہ سے بلا کسی تردد و تذبذب کے احادیث اخذ کرتے اور خود صحابہ بھی ایک دوسرے سے حدیثیں لیتے نہ وہ ایک دوسرے کی تکذیب کرتے اور نہ ہی اس اخذ و استفادہ میں کوئی تنگی محسوس کرتے اس لئے کہ (ابھی تک) احادیث میں دسیسہ کاری کا یا جھوٹ بولنے کا وجود (مسلمانوں کے داخلی) فتنے کے رونما ہونے سے پہلے تک نام کو نہ تھا (بدقسمتی سے) یہ خانگی فتنہ مسلمانوں کی دینی زندگی کے لئے بھی ایسا ہی نقطہ تغیر و انقلاب بن گیا جیسے ان کی سیاسی زندگی کے لئے (انقلاب کی چنگاری بنا تھا)۔

فصل دوم

وضع حدیث اور اس سے متعلق چند بحثیں،

وضع حدیث (حدیثیں گھڑنے) کی ابتداء کب سے اور کیونکر ہوئی،

سن چالیس ہجری سنت کے وضع اور کذب سے پاک اور محفوظ ہونے کے، اور اس میں گوناگوں اضافوں اور سیاسی اغراض اور داخلی تفرقوں کے لئے سنت کو آلۂ کار بنانے کے، درمیان ایک حدفاصل ہے (یعنے ۴۰ھ تک سنت اور حدیث کذب اور وضع سے بالکل پاک اور محفوظ تھی ۴۰ھ کے بعد سے اُس کو سیاسی اغراض اور داخلی اختلافات کے لئے آلۂ کار بنا لیا گیا اور حدیث میں جھوٹ بولنے اور نو بنو حدیثیں گھڑنے کا سلسلہ شروع ہو گیا)

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان اختلافات نے حرب و پیکار کی شکل اختیار کر لی تھی جس کے نتیجہ میں بے انتہا خونریزی ہوئی اور بیشمار جانیں تلف ہوئیں۔

اور جبکہ مسلمان متعدد گروہوں اور فرقوں میں بٹ گئے تھے چنانچہ (۱) ایک فریق عام مسلمانوں کا تھا جو حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے باہمی اختلاف میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھا (اور ان کو حق پر سمجھتا تھا) (۲) دوسرا فریق خارجیوں کا تھا جو ابتدا میں (یعنے تحکیم اور ثالثی قبول کرنے سے پہلے) حضرت علیؓ کے سرفروش حامیوں میں سے تھے مگر واقعہ تحکیم کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کے جانی دشمن بن گئے تھے (اور دونوں کو کافر اور واجب القتل سمجھتے تھے) (۳) اور تیسرا فریق اہل بیت کا تھا جن میں کا ایک گروہ حضرت علیؓ کے قتل (اور شہید) ہونے اور حضرت معاویہؓ کے (متفقہ طور پر) خلیفہ بن جانے کے بعد (خلافت کا دعویدار بن گیا تھا اور) خلافت میں اپنے حق کا مطالبہ کر رہا تھا اور بنو اُمیہ کی حکومت کے خلاف بغاوت پر تلا ہوا تھا غرض اس طرح صرف یہ سیاسی واقعات و حوادث

مسلمانوں کے درمیان گروہ بندی اور فرقہ پرستی کا سبب بن چکے تھے۔

اس داخلی نزاع اور خانہ جنگی کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس تفرقہ اور گروہ بندی نے ایسی دینی شکل اختیار کر لی تھی جس کا اسلام میں مختلف مذہبی فرقے وجود میں آنے کے اندر بہت بڑا دخل ہے کیونکہ ہر فرقہ اپنے موقف کے حق ہونے کی تائید قرآن اور حدیث سے پیش کرتا تھا اور یہ بالکل فطری امر ہے کہ قرآن اور حدیث ہر گروہ کے ہر دعوے کی تائید تو نہیں کر سکتے لہٰذا بعض فرقوں نے تو قرآن عظیم کی آیات کی حقیقت کے خلاف تاویلیں شروع کر دیں اور سنت کی نصوص اور صریح حدیثوں کو وہ معنی پہنانے لگے جن کی وہ متحمل نہ تھیں اور بعض فرقوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے ایسی روایتیں گھڑنی شروع کر دیں جو ان کے دعوؤں اور اغراض و مقاصد کی تائید کریں یہ دیکھکر کہ قرآن عظیم کے اندر اس قسم کی دست درازی ان کے لئے دشوار تھی کیونکہ قرآن قطعی طور پر محفوظ تھا (سینوں میں بھی اور کتابی شکل میں بھی) مسلمان گوشہ گوشہ میں اسکی روایت (اور تلاوت) بڑی کثرت اور تواتر کے ساتھ کرتے چلے آرہے تھے (کسی کی مجال نہ تھی کہ ایک حرف کی بھی کمی زیادتی کا نام لے اور سنت یقیناً قرآن کی طرح محفوظ نہ تھی)

غرض یہاں سے حدیثیں گھڑی جانے کی اور صحیح حدیثوں کے ساتھ جعلی حدیثوں کے خلط ملط ہونے کی ابتداء ہوئی۔

سب سے پہلے فضائل کی حدیثیں گھڑی گئیں

سب سے پہلا موضوع جس میں گھڑنے والوں نے حدیثیں گھڑیں اشخاص افراد کے فضائل تھے چنانچہ ہر فرقہ نے اپنے اماموں اور اپنے فرقہ کے قائدوں کی فضیلت میں بڑی کثرت سے حدیثیں وضع کیں۔

اور کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے جس فرقہ نے اس (ناقابل معافی جرم) کا ارتکاب کیا وہ شیعوں کے مختلف گروہ تھے۔ جیسا کہ ابن ابی الحدید (شیعہ مجتہد) نے شرح نہج البلاغۃ میں اعتراف کیا ہے کہ :۔

یاد رکھو! فضائل کی روایتوں میں اصل جھوٹ شیعوں کی جانب سے آیا ہے (۱)

---

(۱) شرح نہج البلاغۃ ج ۲ ص ۱۳۴۔

یقیناً جاہل سُنیوں نے بھی ان کے مقابلہ پر حدیثیں وضع کیں اور جواب ترکی بترکی دیا۔

کس نسل میں وضع حدیث کی ابتداء ہوئی؟ صحابہ کا زمانہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ـــ جنہوں نے اللہ کے رسول پر اپنی جان و مال سب کچھ قربان کر دیا تھا اور اسلام کی سربلندی کی راہ میں گھر بار، عزیز و اقارب سب چھوڑ چکے تھے اور اللہ کی محبت، اور خوف وخشیت خداوندی ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا تھا ـــ ان کے متعلق تو کچھ بھی کیوں نہ ہو یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنے کے جرم کا ارتکاب کرسکتے ہیں جبکہ ان کے محبوب اور (کفر و شرک سے) نجات دلانے والے نبی علیہ الصلوٰۃ کی یہ حدیث ان کے درمیان شہرت پا چکی تھی (اور ہمہ وقت ان کے کانوں میں گونج رہی تھی):

> مجھ پر جھوٹ بولنا کسی اور پر جھوٹ بولنے کی مانند نہیں[1] ہے (کہ صرف گناہ کبیرہ ہے اللہ معاف کر دیگا بلکہ) جس نے عمداً مجھ پر جھوٹ بولا اسے تو قطعی طور پر اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالینا چاہیے۔

صحابہ کرام کی تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں بھی ان کی شان یہی تھی اور آپ کی وفات کے بعد بھی یہی رہی ہے اور یہ کہ وہ خوف وخشیت الٰہی اور ورع وتقویٰ کے اس اعلیٰ مقام پر پہونچے ہوئے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول پر جھوٹ بولنے کی وسوسہ بھی ان کے دلوں میں نہیں آسکتا تھا اور یہ کہ وہ شریعت اور اس کے احکام کی حفاظت اور دین کی طرف سے دفاع کرنے اور اس امانت کو جوں کا توں ـــ جیسے رسول اللہ

---

[1] چنانچہ قدماء محدثین کے نزدیک جس شخص نے ایک مرتبہ بھی جان کر حدیث میں جھوٹ بولا وہ اگر توبہ بھی کرلے تب بھی اس کی نہ صرف یہ ایک روایت بلکہ اگلی پچھلی کوئی بھی حدیث قبول نہیں کی جائے گی اور آخرت میں بھی کچھ نہ کچھ عذاب اس کو ضرور ہوگا۔ تاکہ حدیث کی تصریح کے مطابق آپ پر جھوٹ بولنے اور دوسروں پر جھوٹ بولنے میں فرق و امتیاز باقی رہے۔ مترجم

صلی اللہ علیہ وسلم سے لیا بالکل اسی طرح ۔ مسلمانوں تک پہونچانے کے انتہا درجہ حریص تھے۔ اس راہ میں وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار رہتے، ہر اس شخص سے جس کے اندر اللہ کے دین سے انحراف دیکھتے ۔ امیر ہو یا خلیفہ یا کوئی اور بڑی سے بڑی ہستی ۔ اُس سے دست و گریباں ہونے کے لئے آمادہ رہتے تھے اور اس سلسلہ میں نہ کسی کی ملامت کا انھیں ڈر تھا اور نہ موت کا، اور نہ کسی سخت سے سخت ایذا رسانی اور جور و ستم کی پروا تھی۔

ذرا دیکھئے یہ حضرت عمر فاروق ہیں، صحابہ کے سامنے برسر منبر خطبہ دے رہے ہیں اثناء خطبہ میں فرماتے ہیں:

عورتوں کے مہروں میں حد سے تجاوز مت کرو، اگر اللہ کے نزدیک بہت زیادہ مہر باندھنا کوئی عزت کی چیز ہوتی تو اس عزت کے تم میں سب سے زیادہ مستحق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے:

کہ اس پر ایک عورت کھڑی ہوتی ہے تمام صحابہ کو سنا کر کہتی ہے:

اے عمر! ذرا ٹھہرو، خدا تو ہمیں دے رہا ہے اور تم ہمکو محروم کر رہے ہو، کیا اللہ تعالیٰ نے (قرآن عظیم میں) نہیں فرمایا:

و آتیتم احدٰھن قنطاراً اور دے چکے ہو تم ان میں سے کسی عورت کو مال کثیر

تو عمر کہتے ہیں: (واقعی) عورت نے ٹھیک کہا اور مرد نے غلطی کی۔

(۲) یہی حضرت عمر ہیں جو حضرت ابوبکر سے اس وقت جھگڑتے ہیں جب وہ مرتدین اور مانعین زکوٰۃ سے جنگ کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں، حضرت عمر کی رائے میں ان مانعین زکوٰۃ سے (کفار کی طرح) قتال جائز نہ تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے استدلال کرتے تھے کہ:

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرلیں پس جب انھوں نے اس کا اقرار کرلیا تو بیشک انھوں نے اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو مجھ سے محفوظ کرلیا بجز اس (جان و مال) پر واجب حق کے (کہ اگر اس کو نہ ادا کریں تو اس کی سزا دوں) اور ان کے دلوں

کا حساب اللہ کے سپرد ہے (وہی دلوں کا حال جانتا ہے)۔

تو اس پر حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا:۔

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا: اِلّا بحقھا (یعنے اگر ان کی جان و مال پر کوئی حق واجب ہو اور وہ اس کو ادا کرنے سے انکار کریں تو ان سے جنگ کی جائے گی) اور مال پر جو حق واجب ہیں ان میں سے زکوٰۃ ہے (اور یہ زکوٰۃ دینے سے انکار کر رہے ہیں اور جنگ کرنے کے لئے آمادہ ہیں اس لئے اسی حدیث کے تحت ہمیں ان سے جنگ کرنی چاہیے)

ایک طرف حضرت ابوبکر کے رُودر رُو عمر کی یہ بیباکانہ حق گوئی ہے دوسری طرف ان کے دل میں حضرت ابوبکر کی اتنی قدر و منزلت ہے کہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں حضرت عمر ہی نے سب سے آگے بڑھ کر حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور (اس طرح) تمام صحابہ پر ان کی فضیلت اور فوقیت کا اعتراف بھی کیا تھا لیکن اس (اعتراف فضل و کمال اور اظہار اعتماد) کے باوجود ان کی محبت اور قدر شناسی اس سے مانع نہیں ہوئی کہ وہ اُن سے جھگڑا کریں ایک ایسے دینی امر میں جس کو وہ حق سمجھتے تھے اور حضرت ابوبکر اس کا خلاف کر رہے تھے۔

اور لیجئے، یہ حضرت علیؓ ہیں کہ حضرت عمر ایک حاملہ زانیہ عورت کو سنگسار کرنے کا حکم دیتے ہیں تو وہ فوراً ان کی مخالفت کرتے ہیں اور ان کے اس حکم پر گرفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں:۔

(اے عمر) بخدا اگر خدا نے تمہیں اس زانیہ عورت پر (زنا کے جرم کی وجہ سے) اختیار دیا ہے (کہ تم اسے سنگسار کردو) تو اس بچے پر تو اختیار نہیں دیا جو اس کے پیٹ میں ہے (کہ تم اسے بے قصور ہلاک کردو)

تو حضرت عمر یہ سُنکر اس حکم کو واپس لے لیتے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

لولا علیّ لھلک عمر — اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہوجاتا

اور لیجئے! یہ حضرت ابو سعید خدریؓ ہیں کہ مروان (جیسا جابر) والی مدینہ جب عید کی نماز کا خطبہ نماز سے پہلے دیتا ہے تو ابو سعید اس کے اس فعل کی علانیہ تردید کرتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ:۔

اس مروان نے سنت کے خلاف کیا ہے اور وہ عمل کیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ
وسلم کے عمل کے مخالف ہے۔

اور لیجئے، یہ حضرت ابن عمر ہیں کہ ــ امام ذہبی کے بیان کے مطابق ــ امت کا سب سے بڑا ظالم وسفاک انسان، حجاج بن یوسف ثقفی خطبہ دے رہا ہے اور حضرت ابن عمر کھڑے ہوتے ہیں اور حجاج کی طرف اشارہ کر کے لوگوں سے کہتے ہیں:۔

اس اللہ کے دشمن نے خدا کے حرم (مکہ) کو حلال بنا لیا ہے، بیت اللہ
کو ویران کر دیا ہے اللہ کے نیک بندوں کو قتل کر ڈالا ہے۔

امام ذہبی نے انہی حضرت ابن عمر کے متعلق روایت کیا ہے کہ:۔

(ایک مرتبہ) حجاج نے خطبہ کے اثنا میں کہا: ابن زبیر نے اللہ کے کلام کو
بدل دیا ہے" تو اس پر ابن عمر نے کہا: تو جھوٹ کہتا ہے حضرت ابن زبیر اللہ
کے کلام کو نہیں بدل سکتے تھے اور نہ تو ہی بدل سکتا ہے اس پر حجاج نے کہا:
"تم تو بڑھاپے میں سٹھیا گئے ہو" اس پر ابن عمر نے کہا: (کان کھول کر) سن
لے، اگر (ابن زبیر) کے متعلق تو نے پھر یہ کہا تو میں (تیرے جواب میں) پھر یہی کہونگا

صحابہ کرام کی اس قسم کی بیباکانہ حق گوئی کے واقعات سے اور صدہا اس جیسی مثالوں سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ یہ واقعات قطعی اور یقینی طور پر بتلاتے ہیں کہ صحابہ کرام حق کے معاملہ میں انتہائی جری اور بیباک تھے جس بات کو وہ حق جانتے تھے اس کے دفاع میں اپنی جان تک دینے سے دریغ نہیں کرتے تھے، اپنے بڑے سے بڑے دوست، ساتھی، رشتہ دار غرض ہر قریب سے قریب تر ہستی کی بات کے مقابلہ میں وہ حق کو ہی غالب اور سربلند رکھتے تھے اس لئے ان کے بارے میں یہ کہنا کیا؟ سوچنا بھی محال ہے کہ وہ خواہشات واغراض نفس کی پیروی میں یا دنیا کی حرص وطمع میں گرفتار ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بول سکتے ہیں اس لئے کہ جھوٹ ڈرپوک (یا لالچی) آدمی ہی بولا کرتا ہے (دلیر اور بے غرض آدمی کبھی جھوٹ نہیں بولتا)۔ اسی طرح صحابہ کرام کے حق میں یہ کہنا بھی محال ہے کہ وہ کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولتا سنیں اور خاموش رہیں۔

خود صحابہ کرام اس موضوع پر جو کچھ فرماتے ہیں وہ بھی سُن لیجئے

(۱) امام بیہقی حضرت براءؓ بن عازبؓ سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں :۔

ہم سب ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں نہیں سُن پاتے تھے، کیونکہ ہماری زمینیں بھی تھیں اور معاشی مشغلے بھی تھے (ان میں معروف رہنا ناگزیر تھا) لیکن لوگ (اس زمانہ میں) جھوٹ بالکل نہیں بولتے تھے اس لئے جو شخص بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں موجود ہوتا وہ غیر موجود لوگوں سے آپ کی حدیثیں بیان کر دیا کرتا تھا۔

(۲) اسی طرح حضرت قتادہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ :۔

حضرت انس نے ایک حدیث بیان کی تو ایک شخص نے کہا: کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے؟ انس نے کہا: جی ہاں یا ایسے شخص نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی ہے جو جھوٹ کبھی نہیں بولتا، خدا کی قسم ہم جھوٹ کبھی نہیں بولتے تھے اور نہ ہی ہم یہ جانتے تھے کہ جھوٹ کیا ہوتا ہے۔[1]

اس تفصیل کے بعد تو اس امر میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ نہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صحابہ کرام سے عمداً کوئی جھوٹ سرزد ہوا اور نہ آپ کی وفات کے بعد، اور یہ کہ وہ ایک دوسرے پر مکمل اعتماد کیا کرتے تھے کبھی ایک دوسرے کی تکذیب نہیں کرتے تھے ان کے مابین جو فقہی اختلافات تھے وہ دینی امور میں نظریاتی اختلافات سے آگے نہیں بڑھتے تھے ان میں سے ہر ایک متنفس حق کا طالب تھا اور راستی کا جویا۔

تابعین کا زمانہ

رہا تابعین کا زمانہ تو اس میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں کیا جاسکتا کہ کبار تابعین کے زمانہ میں، صغار تابعین کے زمانہ کی بہ نسبت جھوٹ بہت کم تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام نبوت ورسالت کا احترام، ورع وتقویٰ اور متدینّن کے عوامل بعد کے زمانہ کی بہ نسبت بہت زیادہ قوی تھے،

---

[1] مفتاح الجنۃ ص ۲۵۔

علاوہ ازیں سیاسی اختلاف بھی اپنے عہد طفولیت میں تھا (یعنے سیاسی اختلاف ابھی رونما ہوا ہی تھا) اس لئے وضع حدیث کے محرکات تابعین کے بعد کے دور کی بہ نسبت ابتدائی دور میں بہت کم تھے۔ اس کے ساتھ یہ اور اضافہ کیجئے کہ صحابہ کرام کا اور کبار تابعین — جو علم میں، دین و دیانت میں اور بیدار مغزی میں شہرۂ آفاق تھے — کا وجود جھوٹ بولنے والوں پر کاری ضرب لگانے، ان کی پوشیدہ اغراض اور سازشوں کو طشت از بام کرنے اور رسوا کرنے کے لئے بہت کافی تھا ورنہ کم از کم جھوٹ بولنے میں ان کی سرگرمیوں کو محدود تو کر ہی سکتا تھا (یعنے صحابہ اور کبار تابعین کے ڈر سے ان میں جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی)

وہ اسباب و عوامل جو وضع حدیث کے محرک بنے اور وہ ماحول اور خطے جن میں وضع حدیث نے نشو ونما پائی

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مسلمانوں میں وہ سیاسی اختلافات جن کی کرن حضرت عثمان کے آخری دور میں اور حضرت علی کی خلافت کے اوائل میں پھوٹ چکی تھی، وضع حدیث کا براہِ راست محرک اور سبب بنے ہیں۔ ہم ان لوگوں کا قول بھی نقل کر چکے ہیں جن کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے جس فرقہ نے حدیث میں جھوٹ بولنے کی جرأت کی وہ شیعہ تھے۔ اس لحاظ سے عراق سب سے پہلی سرزمین ہے جہاں وضع حدیث نے نشو ونما پائی۔ ائمہ حدیث نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے چنانچہ امام زہری فرماتے ہیں:-

> جو حدیث ہمارے پاس سے (مدینہ سے) ایک بالشت کی نکلتی ہے وہ عراق سے ایک ہاتھ کی ہو کر ہم تک لوٹتی ہے۔

امام مالک عراق کو (دار الضرب (ٹکسال) کہا کرتے تھے یعنے ایسی جگہ جہاں سے حدیثیں اسی طرح ڈھل ڈھل کر لوگوں کے پاس پہنچتی ہیں جیسے درہم و دینار ٹکسال سے نکلتے ہیں اور لوگوں کے درمیان لین دین اور خرید و فروخت میں رائج ہو جاتے ہیں۔ جب یہ بات پایۂ ثبوت

لہ ابن عساکر (قلمی)

کو پہونچ چکی کہ وضع حدیث کا براہِ راست سبب سیاسی اختلافات تھے تو اس کے بعد بطور نتیجہ اور بہت سے ایسے اسباب وجود میں آئے جن کی وجہ سے وضع حدیث کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ ہم ذیل میں اجمالاً ان تمام محرکات کا جائزہ لیتے ہیں جو وضع حدیث کا سبب بنے اور اس سلسلہ میں حتی الوسع اختصار سے کام لیں گے۔

وضع حدیث کا پہلا محرک سیاسی اختلافات

اس دور کے سیاسی حالات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام سیاسی گروہ چھوٹے ہوں یا بڑے سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنے کی دلدل میں ڈوبے ہوئے تھے ان فرقوں میں سب سے زیادہ جھوٹ رافضیوں نے بولا ہے۔

(۱) امام مالکؒ سے رافضیوں کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا:

ان سے تو بات تک نہ کرو اور نہ ان سے کوئی حدیث روایت کرو یہ تو ہمیشہ جھوٹ بولتے ہیں (اور اس کو دینی فرض سمجھتے ہیں) (۱)

(۲) شریک بن عبداللہ قاضی — جو شیعہ فرقہ کی حمایت میں مشہور تھے تاہم ان میں کچھ اعتدال تھا — فرماتے ہیں: جس (محدث) سے بھی تم ملو اس سے حدیث لے لو سوائے رافضیوں کے کیونکہ رافضی تو حدیثیں گھڑتے ہیں اور اس وضع حدیث کو اپنا دینی فرض سمجھتے ہیں (۲)

(۳) حماد بن سلمہ کہتے ہیں کہ: رافضیوں کے ایک شیخ (محدث) نے مجھ سے کہا ہے: جب ہم (کسی دینی اجتماع میں) اکٹھے ہوتے اور (باہمی مشورہ سے) کسی چیز کو اچھا سمجھتے تو اس کو حدیث بنا ڈالا کرتے تھے۔ (۳)

(۴) امام شافعی کا قول ہے: اہل اہواء (گمراہ فرقوں) میں سے میں نے رافضیوں سے زیادہ کسی فرقہ کو جھوٹی گواہی دیتے نہیں دیکھا (۴)

اہل سنت رافضیوں کے احادیث وضع کرنے کے ثبوت کے طور پر "غدیر خم" کی وصیت

---

(۱) منہاج السنۃ ج ۱ ص ۱۳ (۲) ایضاً (۳) ایضاً (۴) الباعث الحثیث ص ۱۰۹

والی حدیث پیش کرتے ہیں (جو شیعہ مکاتب فکر کے بنیادی ستون کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس پر سب متفق ہیں) اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع سے واپسی کے موقعہ پر راستہ میں ایک مقام پر جس کو "غدیر خم" کہتے ہیں تمام صحابہ کرام کو جمع کیا اور حضرت علی کا ہاتھ پکڑا اور سب کے سامنے انھیں کھڑا کیا اور فرمایا: یہ میرے وصی ہیں، میرے بھائی ہیں اور میرے بعد میرے خلیفہ ہیں تم ان کی ہر بات سننا اور اس کی اطاعت کرنا۔

اہل سنت کا کہنا ہے کہ بلا کسی شک و شبہ کے یہ حدیث جھوٹی ہے اس کو رافضیوں نے گھڑا ہے اس کے جھوٹ ہونے کا بیان آپ عنقریب پڑھیں گے۔

حسب ذیل حدیث بھی شیعوں کی ساختہ پرداختہ ہے:۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) جو شخص آدمؑ کے علم کو، نوحؑ کے تقویٰ کو، ابراہیمؑ کے حلم کو، موسیٰؑ کی ہیبت کو اور عیسیٰؑ کی عبادت کو بچشم خود دیکھنا چاہے اس کو چاہیے کہ وہ علیؓ کو دیکھ لے۔

ایک اور حدیث ہے:۔

(آپ نے فرمایا) میں علم کی ترازو ہوں علیؓ اس کے دونوں پلڑے ہیں، حسنؓ و حسینؓ اس ترازو کی ڈوریاں ہیں، فاطمہؓ اس ترازو (کے پکڑنے) کا تنکن ہیں اور شیعہ امام اس ترازو کے ستون ہیں (جن پر وہ ترازو قائم ہے) اس ترازو میں ہم سے محبت رکھنے والوں اور بغض رکھنے والوں کے اعمال (محبت و بغض) تولے جاتے ہیں۔

ایک اور حدیث ہے:۔

(آپ نے فرمایا) علیؓ کی محبت ایسی نیکی ہے جس کے ہوتے ہوئے کوئی بھی بدی نقصان نہیں پہونچا سکتی اور علی سے بغض ایسی بدی ہے جس کے ہوتے کوئی بھی نیکی نفع نہیں پہونچا سکتی۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حق میں حسب ذیل حدیثیں بھی شیعوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔

(١) جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معراج میں تشریف لے گئے تو حضرت جبرئیل جنت کا ایک امرود آپ کے پاس لائے آپ نے اس کو کھا لیا تو اسی کے بعد حضرت خدیجہ کے حمل ٹھہر گیا اور ان کے پیٹ سے حضرت فاطمہ پیدا ہوئیں چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب جنت کی خوشبو سونگھنے کو جی چاہتا تو آپ حضرت فاطمہ کو سونگھ لیتے۔

اس حدیث میں تو موضوع ہونے کی علامات بالکل ہی ظاہر ہیں کیونکہ (یہ مسلم ہے کہ) حضرت فاطمہ واقعہ معراج سے پہلے پیدا ہو چکی ہیں جیسا کہ یہ مسلم ہے کہ حضرت خدیجہ نماز فرض ہونے سے پہلے وفات پا چکی ہیں اور نماز بالاتفاق معراج کی رات کو فرض ہوئی ہے۔

جس طرح شیعہ حضرات نے حضرت علی اور اہل بیت کی فضیلت میں حدیثیں گھڑی ہیں اسی طرح عام صحابہ خصوصاً شیخین (ابوبکر و عمر) اور کبار صحابہ کی مذمت میں بھی کافی حدیثیں گھڑی ہیں، یہاں تک کہ خود شیعہ عالم ابن ابی الحدید لکھتا ہے:۔

باقی شیعہ نے صحابہ کے بارے میں جن انتہائی قابل نفرت اور شرمناک امور کا ذکر کیا ہے مثلاً

(١) قنفذ کو حضرت فاطمہ کے گھر بھیجنا اور اس کا آپ کو کوڑے مارنا جس سے آپ کے بازو میں بازوبند کی طرح کا دُمّل پڑ جانا

(٢) اور یہ کہ عمر کا حضرت فاطمہ کو دیوار اور دروازے کے درمیان بھینچ دینا جس کی شدت کی وجہ سے وہ ابا جان! ابا جان کہہ کر چلانے لگیں۔

(٣) اور یہ کہ عمر نے حضرت علی کی گردن میں رسی کا پھندا ڈالا جس سے حضرت علی کو کھینچ کر لایا جا رہا تھا اور حضرت فاطمہ ان کے پیچھے پیچھے چیختی جا رہی تھیں اور حسن و حسین زار و قطار رو رہے تھے"

اسی قماش کے اور بہت سے بہتانوں کا تذکرہ کرنے کے بعد کہتا ہے:۔

پس ان تمام الزامات کی ہمارے (ذمہ دار) علما کے نزدیک مطلق کوئی

اصل نہیں اور نہ اُن میں سے کوئی بھی ان کو مانتا ہے نہ ہی .... علماءِ حدیث نے ان کو روایت کیا ہے وہ تو ان کو جانتے تک نہیں (ان کو تو صرف جاہل شیعہ ہی نقل کرتے ہیں)

اسی طرح رافضیوں نے حضرت معاویہ کی مذمت میں حدیثیں گھڑی ہیں مثلاً:

"جب تم معاویہ کو میرے منبر پر دیکھو تو اسے جان سے مار ڈالنا"

اسی طرح حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص دونوں کی مذمت میں ایک حدیث ہے کہ،

"آپ نے بد دعا دی: اے اللہ! تو ان دونوں کو فتنہ میں سرنگوں ڈال دے اور جہنم کی آگ میں ان دونوں کو خوب زور سے دھکا دیدے۔"

الغرض رافضیوں نے ایسی حدیثیں گھڑنے میں جو اُن کے (فرقہ وارانہ) اغراض و مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ بیحد غلو سے کام لیا ہے (اور کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے) اور ایسی حدیثیں تعداد میں اتنی زیادہ ہیں کہ آدمی ان کو دیکھکر حیران و ششدر رہ جاتا ہے چنانچہ خلیل نے ارشاد میں لکھا ہے کہ:

"رافضیوں نے حضرت علی اور اہل بیت کے فضائل میں تقریباً تین لاکھ حدیثیں وضع کی ہیں۔"

خلیل کے اس بیان میں چاہے کتنا ہی مبالغہ کیوں نہ ہو پھر بھی اتنا تو ضرور ثابت ہے کہ ایسی حدیثیں تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر اس بیباکی اور دیدہ دلیری کو دیکھکر ایک مسلمان ہکا بکا رہ جائے اگر اس کو یہ نہ معلوم ہو کہ ان رافضیوں میں سے اکثر و بیشتر درحقیقت وہ ایرانی تھے جنہوں نے اسلام (سے انتقام لینے اور اس) کی بیخکنی کرنے کے لئے شیعیّت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا یا ان (ایرانی النسل) نومسلموں میں سے تھے جن کے قدیم آبائی مذہب (اشخاص پرستی) کے اثرات ان کے رگ و ریشہ میں جاگزیں تھے اور ابھی تک ان کے قلوب پوری طرح (شخصیت پرستی سے) پاک صاف نہیں ہوئے تھے چنانچہ وہ اسی بت پرستانہ ذہنیت کے ساتھ اسلام میں داخل ہوئے جو (اپنے مقتداؤں کے معاملہ میں) صاحب رسالت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایسا جھوٹ بولدینے میں کوئی حرج، نہیں سمجھتی جس سے ان مقتداؤں کی دلوں میں رچی بسی محبت کی تائید ہوتی ہو۔ جاہل یا (ناسمجھ)

بچے جب کسی سے محبت یا نفرت کرتے ہیں تو ان سے ایسی ہی (احمقانہ) حرکات سرزد ہوا کرتی ہیں اہل سنت (میں بھی اس قماش کے جاہلوں کی کمی نہ تھی! ان) کے جاہلوں نے بھی ــ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ــ ان بے پناہ جھوٹی اور من گھڑت حدیثوں سے مرعوب ہو کر جھوٹ کا جواب جھوٹ سے دیا اگرچہ ان کے کذب کا دائرہ بھی بہت محدود ہے اور ایسی حدیثوں کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ ان (اہل سنت کی) جھوٹی حدیثوں میں سے ایک حدیث یہ ہے:۔

جنت کے ہر درخت کے ہر پتہ پر لکھا ہوا ہے: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، ابوبکر الصدیق عمر الفاروق عثمان ذوالنورین،

حضرت معاویہ اور بنو امیہ کے طرفداروں نے بھی اس (روافض کے وضع حدیث) کا مقابلہ اسی طرح (جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر) کیا مثلاً انھوں نے ایک حدیث روایت کی ہے کہ:۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ) امین صرف تین ہستیاں ہیں:
میں، جبرئیل اور معاویہ

اسی طرح ایک اور حدیث ہے کہ:۔

(آپ نے فرمایا) اے معاویہ! تو مجھ سے (انتہائی قریب) ہے اور میں تجھ سے (انتہائی قریب) ہوں۔

ایک اور حدیث ہے کہ:۔

(آپ نے فرمایا) میں جنت میں بجز معاویہ کے اور کسی کو تلاش نہیں کروں گا چنانچہ (معاویہ) کافی دیر کے بعد میرے پاس آئیں گے تو میں اُن سے کہوں گا: اے معاویہ کہاں سے آرہے ہو؟ تو وہ کہیں گے: اپنے رب کے پاس سے وہ مجھ سے رازونیاز کی باتیں کر رہا تھا اور میں اس سے رازونیاز کی باتیں کر رہا تھا، پھر آپ فرمائیں گے: اے معاویہ! یہ (عزت افزائی) تمہاری اُس ہتکِ عزت کا صلہ ہے جو دُنیا میں کی گئی ہے۔

عباسیوں کے حامیتیوں نے بھی اسی طرح آل عباس کی حمایت میں حدیثیں گھڑیں چنانچہ انھوں نے (شیعوں کی) جھوٹی وصیت (کی حدیث) کے مقابلہ میں عباس کی وصیت (کی جھوٹی حدیث) بنائی اور

اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا کہ (آپ نے فرمایا ہے)

"میرے وصی اور وارث تو عباس ہیں"

اور غالباً ذیل کی جھوٹی حدیث بھی اسی فرقہ کی بنائی ہوئی جھوٹی حدیثوں میں سے ایک ہے کہ :۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس سے فرمایا! جب ۱۳۵ھ آئے گا تو وہ سال تمہارے لئے ہوگا (یعنے عباسیوں کی خلافت کا سال ہوگا) اور تمہاری اولاد میں سفاح، منصور اور مہدی (خلیفہ) پیدا ہوں گے ۔

کیا خوارج بھی حدیث میں جھوٹ بولتے تھے

علماء کا کہنا ہے کہ اسلامی فرقوں میں سے جس فرقے نے سب سے کم جھوٹ بولا ہے وہ خارجی فرقہ ہے جس نے حضرت علی کے تحکیم (ثالثی) کو قبول کرنے کے بعد ان کے خلاف بغاوت کی ہے (ورنہ تحکیم سے پہلے وہ ان کے زبردست طرفداروں میں سے تھے)

خارجیوں کے کم جھوٹ بولنے (یا بالکل جھوٹ نہ بولنے) کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبیرہ گناہ کرنے والے کو ــ جیسا کہ اُن کا مشہور و معروف عقیدہ ہے ــ (اسلام سے خارج اور) کافر سمجھتے تھے یا بقول بعض ــ جیسا کہ کبھی کا قول ہے ــ وہ مطلق گناہ کے ارتکاب کرنے والے کو (کبیرہ ہو یا صغیرہ) کافر (اور اسلام سے خارج) سمجھتے تھے [۱] اس لئے وہ (کسی بھی صورت میں) جھوٹ اور (اس کے علاوہ) فسق و فجور کو حلال سمجھ ہی نہیں سکتے تھے، اس کے برعکس وہ ورع و تقویٰ کے انتہائی بلند مقام پر پہونچے ہوئے تھے (اور اعلیٰ درجہ کے متقی اور پرہیزگار ہوتے تھے) مگر اس کے باوجود ان کے بعض مقتدی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنے سے نہ بچ سکے چنانچہ ان کے ایک شیخ کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ (خارجی عقائد سے تائب ہونے کے بعد) اُنھوں نے کہا :۔

بے شبہ یہ حدیثیں دین ہیں اس لئے خوب اچھی طرح چھان بین کر لیا کرو کہ

---

[۱] الفرق بین الفرق ص ۴۵ ۔

کس (راوی) سے دین (حدیث) لے رہے ہو (وہ کس عقیدہ اور مسلک کا آدمی ہے)

اس لئے کہ (خارجی مسلک کی پیروی کے زمانہ میں ہمارا طریق کار یہ تھا کہ) ہم جس

عقیدہ یا مسئلہ کو اپنی رائے سے اختیار کرنا چاہتے اس کو حدیث بنا دیا کرتے تھے[۱]

اسی بناپر امام الجرح والتعدیل، عبدالرحمٰن بن مہدی کہا کرتے تھے:

خارجیوں اور زندیقوں نے حسب ذیل حدیث گھڑی ہے:

جب تمہارے سامنے میری طرف منسوب کوئی حدیث آئے تو اس کو کتاب اللہ

سے ملا کر دیکھو اگر وہ اس کے موافق ہو تو (سمجھ لو) میں نے اس کو کہا ہے الخ

جدید و قدیم اہل قلم (اور مصنفین) کا نظریہ خوارج کے کذب کے بارے میں یہی ہے۔ لیکن مجھے اب تک کوئی ایسی حدیث نہیں مل سکی جسے کسی خارجی نے گھڑا ہو، اسی طرح میں نے "موضوعات" کی کتابوں میں بہت تلاش کیا مجھے کوئی خارجی ایسا نہیں ملا جسے حدیث میں جھوٹ بولنے یا حدیثیں گھڑنے والوں میں شمار کیا گیا ہو۔

باقی رہی مذکورہ بالا روایت جو خارجیوں کے کسی شیخ سے نقل کی گئی ہے تو مجھے تو اب تک پتہ نہیں چل سکا کہ یہ شیخ کون ہے؟ اس کے برعکس ایک رافضی شیخ کا بالکل ایسا ہی مقولہ پہلے گذر چکا ہے جس کو حماد بن سلمہ نے روایت کیا ہے۔ پھر کیوں نہ ایک خارجی شیخ کی طرف اس بیان کی نسبت کو غلط کہا جائے (لیجئے کسی نے خارجیوں کی عداوت کی بنا پر اس بیان کو رافضی کے بجائے خارجی کی طرف منسوب کر دیا ہے) خصوصاً جبکہ ہمیں (موضوعات کے ذخیرہ میں) خارجیوں کی وضع کی ہوئی ایک حدیث بھی نہیں ملتی۔

باقی رہا عبدالرحمٰن بن مہدی کا مذکورہ سابق قول: اذا اتاکم عنی حدیث الخ کے متعلق یہ کہنا کہ: یہ حدیث زندیقوں اور خارجیوں نے گھڑی ہے، تو مجھے تو عبدالرحمٰن بن مہدی کی طرف اس قول کی نسبت کے صحیح ہونے میں بھی کلام ہے (لیجئے اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول ہے بھی) بلکہ یہ قول تو بالکل ہی بلادلیل ہے اس میں کہیں اس کا ذکر نہیں کہ کس (زندیق یا

---

[۱] ابن الجوزی کتاب الموضوعات، سیوطی اللآلی المصنوعہ ج ۲ ص ۴۶۸

خارجی) نے اس حدیث کو وضع کیا ہے اور کب وضع کیا ہے؟ علاوہ بریں اس قول کی صحت کے مشکوک ہونے کی تقویت اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس بیان میں اس حدیث کے وضع کرنے کی نسبت خوارج کے ساتھ ہی زنادقہ کی طرف بھی کی گئی ہے تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خوارج اور زنادقہ (جو ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں) اس حدیث کے وضع کرنے پر متفق کیونکر ہو گئے؟ اور کیا ان دونوں (متضاد فرقوں) نے ایک ہی وقت میں اس حدیث کو گھڑا ہے؟ یا خارجیوں نے پہلے گھڑا اس کے بعد زندیقوں نے یا زندیقوں نے پہلے گھڑا اس کے بعد خارجیوں نے (کیا یہ دونوں آگ پانی کی طرح متضاد فرقے ایک دوسرے کی بات مان بھی سکتے ہیں)۔

علاوہ ازیں عبدالرحمٰن بن مہدی کے علاوہ دوسرے محدثین نے اس حدیث کے وضع کرنے کی نسبت صرف زنادقہ کی طرف کی ہے۔ چنانچہ عون المعبود (شرح ابوداؤد میں) ج ۴ ص ۳۲۹ پر لکھا ہے:۔

> باقی بعض محدثین نے جو یہ حدیث بیان کی ہے کہ: جب تمہارے سامنے کوئی حدیث آئے تو اسے کتاب اللہ سے ملا کر دیکھو اگر اس کے موافق ہو تو اس کو قبول کر لو تو درحقیقت یہ حدیث بالکل جھوٹی اور بے اصل ہے چنانچہ محدث زکریا ساجی نے یحیٰی بن معین کا قول نقل کیا ہے کہ: اس حدیث کو زندیقوں نے گھڑا ہے
>
> اور طاہر پٹنوی نے تذکرۃ الموضوعات کے ص ۲۸ پر محدث خطابی کا قول نقل کیا ہے کہ:
>
> اس حدیث کو زندیقوں نے وضع کیا ہے۔

میں نے بڑی جستجو کی کہ خوارج کی جانب وضع حدیث کی نسبت کے بارے میں کوئی علمی اور تحقیقی ثبوت مل جائے مگر مجھے تو علمی دلائل اس کے برعکس ہی ملے جن سے خوارج کی جانب اس نسبت کی نفی ہوتی ہے۔

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ خوارج کا اساسی عقیدہ ہے کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب یا مطلقاً گناہ کا ارتکاب کرنے والا ۔۔۔ صغیرہ ہو یا کبیرہ۔ (اسلام سے خارج اور) کافر ہے اور ظاہر ہے کہ جھوٹ

بولنا گناہ کبیرہ ہے چہ جائیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنا (یہ تو ایسا شدید کبیرہ ہے کہ توبہ کے بعد بھی اس کے معاف ہونے میں کلام ہے)

تبر د کامل میں ج ۲ ص ۱۰۶ پر لکھتا ہے:۔

خوارج کے تمام گروہ جھوٹ بولنے والے، اور علانیہ معصیت کا ارتکاب کرنے والے سے براءت اور بے تعلقی پر متفق ہیں (لہٰذا کسی بھی خارجی کے متعلق جھوٹ بولنے کا اور وہ بھی رسول اللہ پر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا)

علاوہ ازیں خوارج سب کے سب خالص عرب تھے اس لئے (فطری طور پر) ان کا ماحول ایسا ماحول ہو ہی نہیں سکتا جو دسیسہ کاریوں کو اور زندیقوں اور نسل پرستوں کی ریشہ دوانیوں کو برداشت کر سکے جیسا کہ رافضیوں میں ہوا ہے۔

مزید برآں بحیثیت مجموعی خوارج اعلیٰ درجہ کے عبادت گزار تھے، بڑے بہادر اور صاف گو تھے نہ کسی کی رو رعایت کرتے تھے اور نہ شیعوں کی طرح "تقیہ" کی پناہ لیتے تھے تو جس قوم کے یہ امتیازی اوصاف ہوں اس قوم سے قطعاً بعید ہے کہ وہ کسی پر بھی جھوٹ بولے اور اگر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنا جائز سمجھتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کمتر لوگوں پر، خلفاء پر، امراء پر اور زیاد و حجاج جیسے شقی ظالموں پر تو جھوٹ بولنا بدرجہ اولیٰ جائز سمجھتے، لیکن ہمارے سامنے جس قدر بھی تاریخی تصریحات ہیں وہ ہمیں بتلاتی ہیں کہ خوارج ہمیشہ خلفاء اور امراء کے ساتھ انتہائی صاف گوئی اور سچائی سے پیش آئے ہیں (اور کبھی جھوٹ اور فریب سے کام نہیں لیا تو وہ اس راست گوئی کے ہوتے رسول اللہ پر بھلا کیوں جھوٹ بولتے؟)

بہرحال میں مکرر کہتا ہوں کہ: (ہمارے انداز تحقیق کے اعتبار سے ہمارا فرض ہے کہ ہم کوئی ایسی محسوس دلیل تلاش کریں جس سے ثابت ہو کہ خوارج بھی ان فرقوں میں سے ہیں جنہوں نے حدیثیں وضع کی ہیں اور بھئی مجھے تو اب تک اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔[۱]

---

[۱] ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی صحیح فرماتے ہیں، درحقیقت حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن دو گروہ ہوئے ہیں (۱) ایک وضاعین حدیث ـــ حدیثیں گھڑنے والے ـ اس کے بانی اور مؤسسن روافض اور شیعہ ہیں ۔

(باقی صفحہ ۱۷۶ پر)

بھلا یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے جبکہ امام ابو داؤد جیسے جلیل القدر ناقدِ حدیث فرماتے ہیں:۔

"گمراہ فرقوں میں خوارج سے زیادہ کسی کی حدیث صحیح نہیں ہوتی"

اور امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:۔

گمراہ فرقوں میں خوارج سے زیادہ کوئی فرقہ راست باز اور انصاف پسند نہیں ہوا۔

نیز فرماتے ہیں:۔

خوارج ان لوگوں میں سے نہ تھے جو عمداً جھوٹ بولتے ہیں بلکہ وہ تو راست گوئی میں مشہور تھے ان کے بارے میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ ان کی حدیث سب سے زیادہ صحیح ہوتی ہے[۱]

وضع حدیث کا دوسرا محرک: زندقہ

زندقہ سے ہماری مراد یہاں اسلام سے ــــ بحیثیت دین کے اور بحیثیت سلطنت کے ــــ نفرت کرنا ہے۔

اسلام نے روئے زمین سے ایسے تمام شاہی تختوں، سلطنتوں اور حکومتوں کا صفایا کر دیا تھا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۵ سے آگے) (۲) دوسرے منکرین حدیث اس کے بانی اور موسس اور سب سے پہلے صحیح بلکہ مشہور و متواتر حدیثوں کا انکار کرنے والے خوارج ہوئے ہیں اس لئے کہ خوارج کا عقیدہ ہے کہ وہ صرف تحکیم (ثالثی) کو قبول کرنے والے صحابہ ــ حضرت علی سمیت ــ بلکہ تمام اگلے پچھلے صحابہ بھی کافر ہیں یا فاسق اور فاسق ان کے نزدیک اسلام سے خارج ہے لہذا ان کے نزدیک تمام صحابہ اسلام سے خارج اور واجب القتل تھے۔ اور کافر یا غیر مسلم کی نہ روایت قبول کی جا سکتی ہے نہ شہادت۔ اسی لئے خوارج نے ان تمام صحیح اور مشہور و متواتر حدیثوں کا انکار کر دیا جن سے کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرنے والے کا مسلمان اور ناجی ہونا ثابت ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ شفاعت کی تمام حدیثوں اور اس پر مبنی متفقہ عقیدہ شفاعت کے بھی منکر ہیں۔ ۱۲ مترجم [۱] منہاج السنۃ ج ۳ ص ۳۱۔

جو عوام کو عقائد میں گمراہ کرنے کی، اُن کی عزت کو خاک میں ملانے کی اپنی شخصی اغراض اور کمینی لوٹ کھسوٹ کے لئے ان کو غلام بنانے کی اور ایسی جنگوں کے تنور میں ان کو جھوک دینے کی۔ جو حکمرانوں کے دلوں میں فتوحات اور ملک گیری کی ہوس کو بھڑکا رہی تھیں۔ بنیادوں پر قائم تھیں۔

ان ممالک کے عوام نے جب اسلام کے زیر سایہ "فرد" کا احترام (شخصی عزت) عقیدہ کا احترام (مذہب کی آزادی) اور آزادیٔ رائے کا مشاہدہ کیا اور توہم پرستی، گمراہ کن فریب کاری شعبدہ بازی اور دجل و فریب کا جنازہ نکلتا ہوا دیکھا تو وہ اسلام کے آغوشِ رحمت کیطرف دوڑے اور جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔

درحقیقت مفتوحہ ملکوں میں اسلام کی سیاسی طاقت اور عسکری قوت کی ضرب، ان انسانیت کش شکست خوردہ حکومتوں پر اتنی کاری اور ایسی فیصلہ کن ثابت ہوئی کہ ان قائدین، اُمراء اور سپہ سالاروں کو اپنی کھوئی ہوئی سلطنت اور گئی ہوئی شوکت و عظمت کو دوبارہ حاصل کر سکنے کی کوئی توقع باقی نہ رہی اس لئے ان کے سامنے کھلے میدان میں اسلام سے انتقام لینے کی گنجائش نہ تھی سوائے اس کے کہ وہ (اپنی بزدلانہ سازشوں سے) عام مسلمانوں کے اور ان کے حکمرانوں اور سیاسی و عسکری رہنماؤں کے درمیان پھوٹ ڈالیں (اور ان کو داخلی فساد اور خانہ جنگی میں گرفتار کر کے ان کی طاقت و قوت کو آپس میں لڑا کر ختم کر دیں) اس دسیسہ کاری اور داخلی فساد کو پیدا کرنے کے لئے سنت اور حدیث میں افتراق انگیز اضافے کرنے کا میدان سب سے زیادہ وسیع تھا چنانچہ انھوں نے اس میدان میں خوب خوب جولانیاں دکھائیں اور بڑے کاری حملے کئے کبھی شیعیت کا لبادہ اوڑھ کر اور کبھی زہد و تصوف کا جامہ پہنکر اور کبھی حکمت و فلسفہ کا لباس زیب تن کر کے۔

ان تمام روپوں کو دھارنے سے ان بہروپیوں کا مقصد صرف ایک تھا یعنی اسلام کی اُس محکم اور عالیشان عمارت میں شگاف اور رخنے ڈالنا جس کو خاتم انبیاء حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم نے تعمیر فرمایا تھا۔ لیکن تقدیر الٰہی اس قصرِ شامخ اور بناءِ محکم ــــ اسلام ــــ کے ہمیشہ ہمیشہ قائم و دائم اور صحیح و سالم رکھنے کا فیصلہ کر چکی تھی اور یہ کہ یہ قصرِ محکم حوادث و فتن کے طوفانوں کا ہمیشہ مقابلہ کرتا رہے گا بلکہ اُس کی بنیادوں پر کدال چلانے والوں کی کدالوں کی نوکیں خود ان کے

سینوں کی طرف لوٹاتا رہے گا تا آنکہ وہ خود رسوا اور ذلیل ہو کر خاک میں مل جائیں

دین میں رخنہ اندازی کرنے، ارباب عقل وخرد اور تہذیب یافتہ لوگوں کی نظروں میں اس کی عظمت واحترام کو گرانے، اور عوام کے عقائد کو پستی کے اُس گڑھے تک پہچانے کے لئے جس کے بعد ملاحدہ اور بے دین لوگ ان کا مذاق اُڑا سکیں، جو جھوٹی حدیثیں ان زندیقوں نے بنائی ہیں ان کی کچھ مثالیں ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:۔

(۱) عرفہ کی شام کو اللہ تعالیٰ ایک بھورے رنگ کے اونٹ پر سوار ہو کر اُترتے ہیں اور سوار حاجیوں سے مصافحہ کرتے ہیں اور پیدل چلنے والوں سے معانقہ کرتے ہیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اپنے دونوں بازوؤں اور سینہ کے بالوں سے پیدا کیا ہے۔

(۳) میں نے اپنے رب کو اس حالت میں دیکھا کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی حجاب نہ تھا چنانچہ اس کی ہر ہر چیز دیکھ لی یہاں تک کہ وہ تاج بھی دیکھ لیا جس میں موتی جڑے ہوئے تھے۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی آنکھیں دکھنے آگئیں تو فرشتوں نے ان کی عیادت کی۔

(۵) جب اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو پیدا کرنا چاہا تو ایک گھوڑا پیدا کیا اور اس کو خوب دوڑایا جس سے اس کو پسینہ آنے لگا، اس پسینہ سے خدا نے اپنے آپ کو پیدا کیا۔

(۶) اللہ تعالیٰ نے جب حروف کو پیدا کیا تو ب نے تو سجدہ کر لیا مگر ا کھڑا رہا۔

(۷) خوبصورت چہرہ کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔

(۸) بینگن میں ہر مرض کی شفا ہے۔

غرض ان زندیقوں نے اسی طرح عقائد، اخلاق، طب اور حلال وحرام سے متعلق ہزاروں حدیثیں گھڑ کر صحیح احادیث میں خلط ملط کر دیں چنانچہ عباسی خلیفہ مہدی کے سامنے ایک زندیق نے اقرار کیا کہ "میں نے سو حدیثیں ایسی بنائی ہیں جو لوگوں کے ہاتھوں میں گھوم رہی ہیں" (پڑھی پڑھائی جا رہی ہیں) عبدالکریم بن ابی العوجاء کو جب قتل کرنے کے لئے لایا گیا تو اس نے اعتراف کیا کہ "میں نے چار ہزار حدیثیں بنائی ہیں جن میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام کیا ہے"۔

بنو عباس کے بعض خلفاء نے ان (عجمی النسل) زنادقہ کی اس تحریک کے پس منظر

میں جب اسلام کے سیاسی وجود کو خطرہ میں محسوس کیا تو وہ ان زندیقوں کے پیچھے پڑ گئے کچھ کو قتل کر ڈالا باقی کو منتشر کر دیا۔ انھوں نے ان زنادقہ کی بیخکنی کے لئے ایک خاص (جاسوسی کا) محکمہ قائم کیا تھا جس کے ذریعہ ان کے سازشی مرکزوں کی اور ان کے بڑے بڑے ادبا، شعراء اور علماء کی چھان بین (انکوائری) ہوتی تھی۔

ان حدیثیں بنانے والے زنادقہ میں سب سے زیادہ مشہور مندرجہ ذیل افراد تھے۔

(۱) عبدالکریم بن ابی العوجاء اس کو محمد بن سلیمان بن علی امیر بصرہ نے قتل کیا تھا۔

(۲) بیان بن سمعان المہدی اس کو خالد بن عبداللہ القسریؒ (والی عراق) نے قتل کیا تھا۔

(۳) محمد بن سعید المصلوب اس کو جعفر بن المنصور نے قتل کیا تھا۔

وضع حدیث کا تیسرا محرک: قوم، قبیلہ، ملک، زبان اور مقتداؤں کی عصبیّت

اسی نسل پرستی کے داعیہ کے تحت شعوبیوں (قوم پرستوں) نے یہ حدیث بنا رکھی ہے:۔

(۱) خدا جب ناراض ہوتا ہے تو عربی میں وحی نازل کرتا ہے اور جب خوش ہوتا ہے تو فارسی میں وحی بھیجتا ہے" تو جاہل عربوں نے بھی اس کے جواب میں حدیث بنا ڈالی ہو۔

(۲) خدا جب ناراض ہوتا ہے تو فارسی میں وحی بھیجتا ہے اور جب خوش ہوتا ہے تو عربی میں یا جیسے امام ابو حنیفہؒ کے جاہل حمایتیوں نے یہ حدیث بنا رکھی ہے:۔

(۳) عنقریب میری اُمت میں ایک شخص پیدا ہوگا جس کا نام ابو حنیفہ نعمان ہوگا وہ میری اُمت کا چراغ ہوگا" یا جیسے امام شافعیؒ کے خلاف متعصب جاہلوں نے یہ حدیث بنا ڈالی:۔

(۴) میری اُمت میں ایک شخص پیدا ہوگا جس کا نام محمد بن ادریس ہوگا وہ میری اُمت کو ابلیس سے زیادہ نقصان پہونچائے گا" خاص خاص قبیلوں، ملکوں اور زمانوں کے فضائل میں بھی اسی قسم کی بہت سی حدیثیں بنائی گئی ہیں۔

مگر بحمداللہ علماءِ حدیث نے قرار واقعی چھان بین اور تلاش و جستجو کر کے ایسی تمام گھڑی ہوئی حدیثوں کو صحیح احادیث سے الگ کر کے رکھ دیا ہے (کتب موضاعات اس کی شاہد ہیں)

وضع حدیث کا چوتھا محرک: قصے اور وعظ

پندوموعظت جیسی اہم دینی خدمت کی مسند پر (حکمرانوں کی غفلت شعاری اور لاپروائی سے) ایسے داستان گو قسم کے لوگ قابض ہو گئے جن کے دلوں میں خوف خدا کا نام تک نہ تھا انہیں اس کے سوا اور کوئی فکر نہیں ہوتی تھی کہ ان کی مجلس وعظ میں سامعین زار وقطار رونے لگیں یا وجد میں آکر سر دھننے لگیں اور چاروں طرف سے آفرین و ماشاء اللہ کی صدائیں بلند ہوں اس لئے وہ شب و روز نو بنو جھوٹے قصے اور تازہ بتازہ افسانے گھڑنے اور ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے میں لگے رہتے تھے۔

چنانچہ حدیث میں فساد اور رخنہ اندازی کے داخل ہونے کی وجوہ پر بحث کرتے ہوئے ابن قتیبہ لکھتے ہیں:۔

> دوسرا راستہ:۔ قصہ گو واعظ ہیں اس لئے کہ یہ لوگ ایک طرف (اپنے وعظ میں کشش پیدا کرنے کی غرض سے) لوگوں کی توجہ اپنی طرف مائل کرنے میں لگے رہتے ہیں اور اپنی جھوٹی اور اَن سُنی حدیثوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے زوردار بناتے ہیں اور دوسری طرف عوام کا حال تو یہ ہے کہ جب تک واعظ عجیب وغریب اور حیران کُن باتیں بیان کرتا رہتا ہے یا دلوں میں سوز و گداز پیدا کرنے اور رُلانے والی باتیں سُناتا رہتا ہے تو وہ بھی اس کے وعظ میں بیٹھے رہتے ہیں مثلاً جنت کے ذکر میں کہتے ہیں:۔
>
> (۱) جنت میں مشک اور زعفران کی حوریں ہوں گی ان کے کولھے میل بھر چوڑے اور میل بھر لمبے ہوں گے۔
>
> (۲) خدا اپنے ولیوں کو چمکدار اور صاف و شفاف موتیوں کے ایسے محل میں رکھے گا جس میں سترّ ہزار محل ہوں گے ہر محل میں ستر ہزار گنبد نما کمرے ہوں گے غرض اسی طرح ستر ہزار کی رٹ لگاتا رہتا ہے اس سے ورے بات نہیں کرتا۔[۱]

---

[۱] تاویل مختلف الحدیث ابن قتیبہ ص ۳۵۰

اسی واعظانہ قسم کی موضوع احادیث کی ایک مثال یہ حدیث ہے :۔

جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کلمہ توحید کے ہر کلمہ سے ایک پرندہ پیدا کرتا ہے جس کی چونچ موتی کی ہوتی اور پر مونگے کے۔

ان قصہ گو واعظوں کی ایک عجیب خصلت یہ ہے کہ یہ جھوٹ بولنے میں بڑے ہی جری ہوتے ہیں اور بڑی بیحیائی اور ڈھٹائی سے کام لیتے ہیں۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ امام احمد بن حنبل اور امام یحییٰ بن معین نے رصافہ کی مسجد میں نماز پڑھی ایک قصہ گو واعظ ان کے سامنے ہی کھڑا ہوا اور کہنے لگا : "احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے ہم سے یہ حدیث بروایت عبدالرزاق عن قتادہ عن انس بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اور مذکورہ بالا حدیث بیان کی اور مسلسل بیس ورق کے قریب بیان کرتا رہا تو یہ سنکر احمد بن حنبل (سوالیہ انداز میں) یحییٰ بن معین کی طرف دیکھنے لگے اور یحییٰ بن معین احمد بن حنبل کی طرف، اور ہر ایک نے دوسرے سے دریافت کیا کہ کیا تم نے یہ حدیث روایت کی ہے ؟ تو ہر ایک نے دوسرے کو جواب دیا : خدا کی قسم میں نے تو یہ حدیث بس ابھی سنی ہے (اس سے پہلے کبھی سنی بھی نہیں) جب واعظ حدیث بیان کر چکا تو یحییٰ بن معین نے اس کو اشارہ سے بلایا وہ یہ سمجھکر ان کے پاس آیا کہ کچھ نذرانہ لے گا تو احمد بن معین نے اس سے پوچھا کہ : یہ حدیث تم سے کس نے بیان کی تھی ؟ اس نے کہا یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل سے یحییٰ نے کہا : میں یحییٰ بن معین ہوں اور یہ احمد بن حنبل ہیں ہم نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں اس قسم کی باتیں سنی بھی نہیں (بیان تو کیا کرتا) اگر ان باتوں کا بیان کرنا ضروری ہی تھا تو ہمارے علاوہ اور کسی کا نام لیتے" اس واعظ نے نہایت گستاخانہ انداز میں جواب دیا : میں سنا کرتا تھا کہ یحییٰ بن معین بڑے بیوقوف ہیں آج اس کی تحقیق بھی ہو گئی" یحییٰ نے پوچھا : وہ کیسے ؟ اس نے کہا : کیا تم دونوں کے علاوہ اور کوئی یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل نام کا محدث ہے ہی نہیں میں نے تو سترہ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نام کے محدثوں سے حدیث سنی

اور لکھی ہے۔"

افسوسناک امر یہ ہے کہ یہ قصہ گو واعظ باوجود اپنی جہالت اور اللہ ورسول پر جھوٹ بولنے کی جسارت کے عوام میں انتہائی محبوب ہوتے تھے وہ ہمیشہ اُن کے گرویدہ اور گوش برآواز رہتے تھے اور علماء ان کی چیرہ دستیوں کی وجہ سے بڑی مصیبت میں گرفتار تھے چنانچہ سیوطی نے اپنی کتاب تحذیر الخواص من اکاذیب القصاص میں لکھا ہے۔

ایک عبرتناک واقعہ تحذیر الخواص من اکاذیب القصاص میں لکھا ہے کہ اسی قماش کا ایک قصہ گو واعظ بغداد میں مجلس وعظ میں بیٹھا اُس نے قرآن کریم کی آیت کریمہ عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محموداً کی تفسیر میں ایک روایت بیان کی کہ:

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عرش پر اللہ کے ساتھ بیٹھتے ہیں۔" یہ بات ابن جریر طبری کو بھی پہونچی تو ان کو اس (جھوٹ) پر بڑا غصہ آیا اور بڑی سختی سے اس کی تردید کی اور اپنے دروازہ پر لکھکر لگادیا:۔

سبحان من لیس لہ انیس ولاله — پاک ہے وہ ذات جس کا نہ کوئی ہمدم ہے

علی عرشہ جلیس — اور نہ عرش پر اس کا کوئی ہمنشیں ہے

تو اس پر بغداد کے عوام نے اُن پر یورش کردی اور مکان کے دروازے پر اتنے پتھر برسائے کہ دروازہ پتھروں سے اٹ گیا بلکہ پتھروں کا ڈھیر دروازے سے بھی اونچا نکل گیا[۱]

وضع حدیث کا آٹھواں محرک، فقہی اور کلامی اختلافات

فقہی اور کلامی مسلکوں کے جاہل اور بدکردار پیروؤں نے بھی اپنے اپنے مسلک کی تائید وتقویت کے لئے جھوٹی حدیثوں کا سہارا لیا ہے چنانچہ اس قسم کی حدیثوں میں سے چند حدیثیں یہ ہیں:۔

(۱) جو شخص نماز میں رفع یدین کرے گا اس کی نماز نہیں ہوگی۔

---

[۱] الاسلام والحضارۃ ج ۲ ص ۵۵۹

(۲) جنبی (جس پر غسل فرض ہو) اس پر تین مرتبہ کلی کرنا اور تین مرتبہ ناک میں پانی دینا فرض ہے
(۳) جبرئیل نے کعبہ کے پاس میری امامت کی اور بلند آواز سے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھی
(۴) جس نے یہ کہا کہ "قرآن مخلوق ہے" وہ کافر ہو گیا۔
(۵) عنقریب میری امت میں ایسے لوگ ہوں گے جو یہ کہیں گے کہ "قرآن مخلوق" ہے تو جس شخص نے یہ کہا اس نے خدائے بزرگ و برتر کے ساتھ کفر کیا (کافر ہو گیا) اور اس کی بیوی کو اسی وقت طلاق ہو گئی۔

وضع حدیث کا نواں محرک: دین سے جہالت اور حدیث سے شغف

اس محرک کے تحت حدیثیں گھڑنا بہت سے زاہدوں، عابدوں اور صلحاء کا وطیرہ رہا ہے یہ حضرات ترغیب و ترہیب کے سلسلہ میں حدیثیں وضع کرنے کو ثواب کا کام سمجھتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ اس طریقہ سے ہم دین کی خدمت کر رہے ہیں اور اللہ کا تقرب حاصل کر رہے ہیں ان موضوع احادیث کے ذریعہ وہ لوگوں کے دلوں میں عبادات و طاعات الٰہیہ کی رغبت و محبت پیدا کیا کرتے تھے۔

جب علماء دین ان کو اس سے منع کرتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ان کو یاد دلاتے کہ:

من کذب علی متعمدا فلیتبوء	جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے
مقعدہ من النار	اسے اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لینا چاہیئے۔

تو وہ کہتے ہم تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یعنے آپ کے دین کی تائید و حمایت میں جھوٹ بولتے ہیں (یہ سزا تو اس کی ہے جو آپ پر یعنے آپ کے خلاف جھوٹ بولے)

درحقیقت یہ دین سے جہالت، ہوائے نفس کے تسلط اور انجام سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ اس قسم کے عباد و زہاد نے جو حدیثیں وضع کی ہیں ان کی بہترین مثال وہ حدیثیں ہیں جو قرآن عظیم کی ہر ہر سورت کے فضائل سے متعلق بنائی گئی ہیں چنانچہ نوح بن مریم نے ان تمام حدیثوں

کے گھڑنے کا اعتراف کیا ہے اور عذر یہ بیان کیا:۔

میں نے دیکھا کہ مسلمان قرآن عظیم پڑھنے اور تلاوت کرنے سے تو لاپروائی برتتے ہیں اور ابو حنیفہ کی فقہ اور ابن اسحاق کے مغازی پڑھنے میں منہمک ہیں۔

اسی قسم کے حدیثیں وضع کرنے والوں میں ایک شخص غلام خلیل ہوا ہے یہ شخص بڑا عابد و زاہد تھا دنیا اور اس کی لذتوں سے بالکل کنارہ کش تھا عبادت الٰہی اور تقویٰ و پرہیز گاری کے سوا اس کا کوئی کام نہ تھا اسی لئے عوام الناس میں بڑا محبوب تھا اس کی ہر دلعزیزی کی انتہا یہ ہے کہ جس روز اس کا انتقال ہوا تو بغداد والوں نے اس کے سوگ میں تمام کاروبار اور بازار بند کر دیئے تھے اس عبادت گذاری اور پرہیز گاری کے باوجود اذکار و اوراد کے فضائل میں نو بنو حدیثیں گھڑنے کا سبق شیطان نے اس کو خوب پڑھایا تھا چنانچہ جب اس سے پوچھا گیا کہ یہ دلوں میں سوز و گداز اور رقت پیدا کرنے والی حدیثیں جو تم بیان کرتے ہو کہاں سے آئیں (کس نے تم سے روایت کی ہیں) تو اس نے جواب دیا: عوام کے دلوں میں رقت اور سوز و گداز پیدا کرنے کے لئے یہ حدیثیں خود ہم نے بنائی ہیں"۔

وضع حدیث کا ساتواں محرک: اُمرا اور پادشاہوں کا تقرب حاصل کرنے کے لئے ان کے حسب منشا حدیثیں بنانا

اسی قسم کی احادیث کی بہترین مثال وہ حدیث ہے جو غیاث بن ابراہیم نے عباسی خلیفہ مہدی کی خوشامد میں بنائی تھی:۔

غیاث بن ابراہیم جب عباسی خلیفہ مہدی کی خدمت میں حاضر ہوا تو خلیفہ کبوتر بازی میں منہمک تھا تو غیاث نے (خلیفہ کی اس دلچسپی کو دیکھکر) وہ مشہور و معروف حدیث بیان کی جس کے الفاظ یہ ہیں:

لا سبق الا فی نصل او حافر

نیزہ بازی یا گھوڑ دوڑ کے سوا کسی اور چیز میں مسابقت یعنے شرط لگانا جائز نہیں۔

اور اس حدیث میں او جناح (یا کبوتر بازی میں) کے الفاظ مہدی کو خوش کرنے کے لئے بڑھا دیئے۔ تو مہدی نے اس کو دس ہزار درہم عطیہ (انعام) دیئے پھر اس کے واپس ہونے کے بعد کہا:۔

اشهد ان قفاك قفا كذاب على رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم — میں گواہی دیتا ہوں کہ تیری .... (کھوپڑی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنے والے کی کھوپڑی ہے

اس کے بعد مہدی نے تمام کبوتروں کے ذبح کرنے کا حکم دے دیا۔

وضع حدیث کے مزید محرکات

حدیثیں گھڑنے کے ان اسباب ومحرکات کے علاوہ اور بھی بہت سے اسباب محرکات ہوئے ہیں مثلاً

(۱) بعض (نام نہاد) محدثین کو یہ شوق ہوتا تھا کہ وہ متن یا سند کے اعتبار سے نادر حدیثیں روایت کریں۔

(۲) یا اپنے فتووں کی (ایسی خود ساختہ حدیثوں کے ذریعہ) حمایت وتقویت کریں۔

(۳) یا اپنے کسی حریف فرد یا فرقہ سے (خود ساختہ حدیثوں کے ذریعہ) انتقام لیں۔

(۴) یا (موضوع حدیثوں کے ذریعہ) کسی خاص قسم کے کھانے، خوشبو یا لباس کو لوگوں میں مقبول بنائیں۔

علماء حدیث نے بھی — شکر اللہ مساعیھم — انتہائی تحقیق وتنقید اور تفصیل کے ساتھ اسباب وضع حدیث بیان کئے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہر قسم کی موضوع احادیث کی نشان دہی کی ہے (مستقل کتابیں موضوعات پر لکھی ہیں)

وضاعین حدیث کی اقسام اجمالاً

وضع حدیث کے ان اسباب ومحرکات کے نتیجہ میں جو ہم نے بیان کئے مختلف قسم کے بہت سے وضاعین حدیث پیدا ہوئے ہیں جن کی مشہور قسمیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) زنادقہ (۲) گمراہ فرقوں کے پیرو (۳) شعوبیہ (قوم پرست اور نسل پرست) (۴) کسی خاص قوم یا ملک یا امام کے متعصب حمایتی (۵) فقہی مسلکوں کے جاہل اور دین سے

بے بہرہ متعصب حمایتی (۶) قصہ گو واعظ (۷) جاہل عابد دیندار،
(۸) بادشاہوں کے خوشامدی مصاحب اور ان کے تقرب پر جان دینے والے درباری،
(۹) وہ (نام نہاد) محدث جو علوئے اسناد کو سرمایہ فخر سمجھتے ہیں اور (شہرت کے لئے) غریب نادر حدیثیں روایت کرنے کے شوقین ہوئے ہیں۔

ایک افسوسناک حقیقت کا اظہار

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک نہایت اہم بات کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں جو میرے ذہن میں ہمیشہ ہی کھٹکتی رہی ہے اور اس فصل کے لکھنے کے دوران تو اس کو اور بھی زیادہ تقویت ملی ہے وہ یہ کہ خلفاء اور امراء اسلام کی وضاعین حدیث کے معاملہ میں تساہل اور نرمی نے بہت ہی برا اثر ڈالا ہے جس سے دین کو شدید نقصان پہونچا ہے اگر اس معاملہ میں یہ خلفاء وسلاطین اس واقعی اور حقیقی شدت کا موقف اختیار کرتے اور وضاعین کے سرغنہ مجرموں کا ہاتھ کے ہاتھ قلع قمع کر دیتے جس کا ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تو وضع حدیث کا دائرہ اتنا وسیع نہ ہوتا اور یہ وبا اتنی نہ پھیلتی۔ بلکہ ہمیں تو یہ دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ مہدی جیسے خلیفہ نے غیاث بن ابراہیم کے جھوٹ بولنے کے اعتراف کرنے اور یہ باور کر لینے کے باوجود کہ اس نے محض ازراہ تملق حدیث میں لفظ بڑھایا ہے اس کو عبرتناک سزا دینے کے بجائے دس ہزار درہم انعام دیئے اور یہ جو روایت میں مذکور ہے کہ "اس نے کبوتروں کو ذبح کرنے کا حکم دیدیا اس لئے کہ وہ کبوتر ہی اس دروغ گوئی کا سبب بنے تھے" یہ تو بجائے خود انتہائی تعجب خیز اور عقل میں آنے والی بات ہے (یقیناً یہ بھی یار لوگوں کا اضافہ ہے)

اس لئے کہ مہدی کی دینی غیرت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ اس علانیہ جھوٹے اور بدکار انسان کو عبرتناک سزا دیتا اور (بے قصور) کبوتروں کو ذبح نہ کراتا چہ جائیکہ وہ کبوتروں کو ذبح کرے اور جو مجرم موت کی سزا کا مستحق ہے اس کو آزاد اور بے لگام پھرنے دے کہ وہ انعام کی رقم دس ہزار درہم سے جو درحقیقت مسلمانوں (یعنے بیت المال) کا مال ہے گلچھرے اڑائے۔

یہی ایک واقعہ نہیں بلکہ ایک اور وضاع حدیث کے ساتھ بھی مہدی کی اسی قسم کی مجرمانہ نرمی اور تساہل کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ شخص مقاتل بن سلیمان بلخی تھا اس نے مہدی سے کہا: اگر آپ چاہیں تو میں حضرت عباس اور ان کی اولاد کے فضائل میں حدیثیں بنادوں" تو اس پر مہدی

نے اس کو صرف یہ جواب دیا: "مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے" اور اس کے علاوہ اُس خبیث کو کچھ نہ کہا (حالانکہ وہ گردن زدنی تھا اسی وقت سر قلم نہ کراتا تو کم از کم عبرتناک سزا تو دیتا)

بلکہ ہمیں تو روایات یہاں تک ملتی ہیں کہ ابو البختری کذاب کی ایک جھوٹی حدیث ہارون الرشید کے سامنے ذکر کی گئی کہ:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (العیاذ باللہ) کبوتر اڑایا کرتے تھے۔" اس پہ ہارون الرشید ابوالبختری کا جھوٹ محسوس کر لینے کے باوجود۔ ابوالبختری کو اس صریح جھوٹ پر اس کے سوا اور کوئی سزا نہیں دیتا کہ صرف اتنا کہتا ہے: دور ہو، میرے سامنے سے اگر تو قریش میں سے نہ ہوتا تو میں تجھے ابھی معزول کر دیتا" واضح رہے کہ یہ ملعون کذاب ابوالبختری ہارون رشید کا قاضی تھا۔

یقیناً ان خلفاء کے اس موقف (اور مجرمانہ تساہل وچشم پوشی) پہ اللہ تعالیٰ اُن سے ضرور مواخذہ کریں گے بشرطیکہ یہ روایات وواقعات جو ان کی طرف منسوب کئے گئے ہیں صحیح ہوں۔

اگرچہ ہم ان زنادقہ کی بیخکنی کرنے پر اُن خلفا کے فضل واحسان کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے دین اسلام میں رخنہ اندازیاں کرنے والوں کی قرار واقعی سرکوبی اور بیخکنی کی .. لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ درحقیقت ان زنادقہ کو قتل کرنے کا محرک اور داعیہ (دین کی حفاظت نہ تھا بلکہ) صرف یہ تھا کہ وہ ان کی حکومتوں کے باغی تھے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہی خلفا نے ان جھوٹے اور حدیثیں گھڑنے والے لوگوں کے ساتھ جو ان کی اغراض وخواہشات کی تائید کرتے تھے اور خوشنودی کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہ جھوٹ بولتے تھے ان کے ساتھ اس کا عشر عشیر بھی نہیں کیا جو اُنھوں نے اپنے حکم سے سرتابی کرنے والے باغیوں کے ساتھ کیا تھا۔

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ قصہ گو واعظوں کے جھوٹے قصوں کی کہانیوں سے مسجدیں گونجتی تھیں اور یہ امراء و خلفا بیٹھے سُنتے تھے اور دروغ گو عباد و زہاد جھوٹی حدیثیں علانیہ بیان کرتے تھے اور بغلیں بجاتے آزاد پھرتے تھے نہ کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا تھا نہ ان کے منہ میں لگام دینے والا۔

اگر اللہ جل شانہٗ اپنے دین کی حفاظت کے لئے ہر ملک اور ہر زمانہ میں ایسے پختہ کار علماء

اور ائمہ وحفاظ حدیث پیدا نہ فرماتے جنہوں نے اللہ کے دین میں تحریفیں کرنے والوں کی تحریفوں کو ان کے منہ پر مارنے میں ...... اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو خفیہ رخنہ اندازی اور کذب وافترا سے پاک وصاف کرنے میں اپنی عمریں صرف کر دیں تو یہ مسخ وتشویہ کی وبا بالکل ہی عام ہو جاتی اور اللہ کے دین میں جو حق وصداقت کی روشن علامات جلوہ ریز ہیں وہ بالکل ہی بکھر کر رہ جاتیں اور ہم ان تک ناقابل برداشت مشقتیں اٹھانے کے باوجود بھی نہ پہونچ پاتے۔ اگر وضع حدیث اور وضاعین حدیث کی بیخکنی اور سرکوبی کے لئے ہمارے اسلاف کی یہ حوصلہ شکن کوششیں اور کاوشیں نہ ہوتیں اور وہ جھوٹ اور جھوٹوں کی افترا پردازیوں سے قیامت تک کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی حفاظت وصیانت کے لئے یہ موثر اقدامات نہ کرتے تو خالص حق اور صحیح احادیث تک رسائی ناممکن تھی۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

تیسری فصل

تحریک وضع حدیث کے مقابلہ اور بیخکنی کے سلسلہ میں علماء حدیث کی کوششوں اور کاوشوں کا بیان

صحابہ کرام کے عہد سے لیکر تدوین حدیث کی تکمیل کے دور تک، اس دو صدی کے عرصہ میں وضع حدیث کی بیخکنی اور وضاعین حدیث کی سرکوبی کے سلسلہ میں علماء و حاملین حدیث نے جو موقف اختیار کیا ہے، جو شخص بھی بنظر غائر اس کا مطالعہ کرے گا اور اُن مساعی اور کاوشوں کا جائزہ لیگا جو ائمہ حدیث نے صحیح اور بناوٹی حدیثوں کو الگ الگ کرنے اور جانچنے، پرکھنے میں انجام دی ہیں، وہ یہ فیصلہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ ناقدین حدیث جو کچھ کر گزرے اس سے زیادہ کا امکان ہی نہیں ہے اور نقد وجرح کے جو طریقے اُنھوں نے اختیار کئے وہ علمی تحقیق (سائنٹیفک ریسرچ) اور تنقید و تنقیح کے معیار پر سب سے زیادہ محکم اور قابل وثوق طریقے ہیں یہاں تک کہ ہم پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے علماء رحمہم اللہ کو، اس روئے زمین پر بسنے والی تمام قوموں میں، اخبار و روایات کے جانچنے پرکھنے کے دقیق علمی اصول و قواعد تجویز کرنے کے سلسلہ میں، اوّلیت کا درجہ حاصل ہے اور اُن کی ان کاوشوں اور کوششوں پر ہماری نسلیں بجا طور پر فخر کر سکتی ہیں اور دوسری قوموں کے سامنے سر افتخار بلند کر سکتی ہیں۔ سچ فرمایا اللہ جل شانہ نے :-

"یہ اللہ جل شانہ کا فضل ہے وہ جس کو چاہے (اور اہل سمجھے) عطا کردے اللہ تعالیٰ تو بڑی وسعت والے اور بڑے ہی علم والے ہیں۔"

ذیل میں وہ طریقے ملاحظہ فرمائیے جو ہمارے علما نے احادیث و آثار کی تنقید کے سلسلہ

میں اختیار کئے اور جن کے ذریعہ اُنھوں نے سنت اور ذخیرہ حدیث کو اس کے خلاف بچھائے ہوئے مکر و فریب کے جال سے بچایا ہے اور اس کا پاک و پاکیزہ دامن (وضع حدیث کے) جس کیچڑ سے آلودہ ہو گیا تھا اُس سے پاک و صاف کیا ہے

(۱) نقد احادیث کا پہلا طریق! اسناد حدیث

جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی احادیث کے بارے میں صحابہ ایک دوسرے پر (کلی اعتماد کیا کرتے تھے اور) مطلق شک و شبہ نہیں کرتے تھے اور نہ ہی تابعین اُس حدیث کو ماننے میں ذرہ برابر توقف اور تأمل کرتے تھے جس کو کوئی صحابی اُن کے سامنے بیان کرے یہاں تک کہ اُمت مسلمہ کے درمیان داخلی فتنہ و فساد کی آگ بھڑکی اور مردود و مطرود یہودی عبد اللہ بن سبا اپنی اُس مجرمانہ دعوت (تحریک) کو لیکر منظر عام پر آیا جس کو اُس غالی شیعیت کی بنیاد پر اس نے قائم کیا تھا جس کا مرکزی نقطہ حضرت علیؓ کی الوہیت (معبود ہونے) کا عقیدہ تھا۔

اس تحریک کے نتیجہ میں جوں جوں زمانہ گزرتا گیا سنت اور حدیث کے خلاف (کذب فی الحدیث اور وضع حدیث کی صورت میں) خفیہ سازش بڑھتی چلی گئی تو اُس وقت سے صحابہ و تابعین ہر کسی راوی سے حدیث قبول کرنے میں انتہائی احتیاط برتنے لگے اور اب اُنھوں نے ہر ایسی حدیث کو قبول کرنا چھوڑ دیا جس کی سند اور راویوں کو وہ بذات خود نہ جانتے پہچانتے ہوں اور ان کے ثقہ اور عادل ہونے کے بارے میں ان کو پورا اطمینان نہ ہو چنانچہ امام مسلمؒ صحیح مسلم کے مقدمہ میں ابن سیرینؒ کا قول نقل کرتے ہیں:۔

> ابتدا میں لوگ حدیث کی اسناد کے متعلق پوچھ گچھ نہیں کیا کرتے تھے لیکن جب سے (حدیث میں جھوٹ بولنے کا) فتنہ عام ہوا ہے تو کہنے لگے "پہلے اپنی حدیث کے راویوں کے نام بتلاؤ تا کہ اُن پر غور کریں چنانچہ اگر راوی اہل سنت میں سے ہوتے تو اُن کی حدیث قبول کر لیتے اور اگر گمراہ فرقوں میں سے ہوتے تو ان کی حدیث قبول نہ کی جاتی۔"

یہ اسناد کے ذریعہ یقین و اطمینان حاصل کرنے کا طریقہ اُن کمسن صحابہ کے زمانہ سے ہی شروع ہوگیا ہے جن کی وفات اِس فتنہ (وضع حدیث) کے پھیل جانے کے بعد ہوئی ہے چنانچہ امام مسلم مقدمہ صحیح مسلم میں ہی حضرت مجاہدؒ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ:۔

(ایک دن) بشیر عدوی حضرت ابن عباسؓ کے پاس آیا اور حدیثیں روایت کرنے لگا کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا اور یہ فرمایا" تو ابن عباسؓ نے نہ تو اس کی حدیثیں توجہ سے سنیں اور نہ اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا، ابن عباس کی اس بے توجہی اور بے اعتنائی کو دیکھکر اس نے کہا: اے ابن عباس کیا بات ہے میں دیکھتا ہوں کہ تم حدیث نہیں سُن رہے؟ تمہارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کر رہا ہوں اور تم سنتے تک نہیں؟ تو ابن عباس نے کہا: ہاں بھائی ایک زمانہ تھا کہ جب ہم کسی شخص کو یہ کہتے سُنتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے تو فوراً ہماری نگاہیں اس کی طرف اُٹھ جایا کرتی تھیں اور کان اس کی آواز پر لگ جاتے تھے لیکن جب لوگوں نے (بلاتحقیق) بُری بھلی ہر طرح کی حدیثیں بیان کرنی شروع کردیں تو ہم بھی محتاط ہوگئے اب ہم لوگوں کی صرف وہی حدیثیں کان لگا کر سُنتے ہیں جنکو ہم جانتے پہچانتے ہیں۔

اس دور کے بعد جب حدیثوں میں جھوٹ بولنے کی وَبا عام ہوگئی تو تابعین نے بھی اسناد کا مطالبہ کرنا شروع کردیا۔ چنانچہ ابو العالیہ کہتے ہیں کہ:۔

جب ہم صحابہ کرام کی کوئی حدیث کسی سے سُنتے تو اُس وقت تک ہم مطمئن نہ ہوتے جب تک خود اُن کے پاس سوار ہو کر نہ جاتے اور خود ان سے بلاواسطہ نہ سُن لیتے۔

امام زہریؒ فرماتے ہیں:۔

اسناد دین کا ایک رُکن ہے اگر اسناد کا سوال نہ ہو، تو جو چاہے اور جیسا چاہے کہدیا کرے (کہ حدیث میں یہ آیا ہے)

حافظ عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں:۔

ہمارے اور رُواۃ حدیث کے درمیان (رجال) اسناد ستون ہیں (جس حدیث کے ستون مضبوط ہوں گے ہم اسی کو قبول کریں گے)

(۲) نقد حدیث کا دوسرا طریقہ: حدیث کی صحت اور ثبوت کے متعلق سند کے علاوہ بھی وثوق اور اطمینان حاصل کرنا،

یہ وثوق و اطمینان صحابہ، تابعین اور اس فن کے ائمہ کی طرف رجوع کرکے حاصل کیا جاتا تھا درحقیقت اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت کے ساتھ یہ خاص عنایت فرمائی کہ بہت سے جلیل القدر اور فقہاء صحابہ کی عمریں دراز کر دیں تاکہ اُمت زیادہ سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے بارے میں ان کی طرف رجوع کر سکے اور اُن کے طرز عمل کا ـ جو اُسوۂ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا چربہ تھا ـ اتباع کر سکے۔ چنانچہ جب حدیثوں میں جھوٹ بولنا عام ہو گیا تو لوگوں نے اس فساد سے بچنے کے لئے اُن صحابہ کی پناہ لینی شروع کر دی اول تو جو حدیثیں خود اُن کے پاس ہوتیں (یعنی وہ خود اُن کے راوی ہوتے) وہ اُن سے دریافت کر لیتے اور جو احادیث دوسرے صحابہ کی اُنھوں نے اور لوگوں سے سنی ہوتیں تو اُن کے بارے میں ان کی رائے معلوم کرتے (کہ یہ حدیثیں صحیح ہیں یا نہیں) چنانچہ امام مسلم صحیح مسلم کے مقدمہ میں ابن ابی مُلیکہؒ[1] سے روایت کرتے ہیں کہ:۔

میں نے حضرت ابن عباسؓ کو لکھا کہ آپ میرے لئے ایک نوشتہ (مجموعہ احادیث) لکھکر بھیجدیں اور میرے متعلق اخفا سے کام لیں (یعنی کسی کو میری اس استدعا کا علم نہ ہو) تو اس پر ابن عباس نے فرمایا: بھئی خواہ بچہ ہے، میں اس کے لئے مزور کچھ امور (ضروری احادیث) خاص طور پر انتخاب کروں گا اور اس کے متعلق اخفا سے کام لوں گا، پھر اُنھوں نے حضرت علیؓ کے مکتوب فیصلے (مجموعہ احادیث)

---

[1] حضرت عبداللہ بن زبیر کے عہد میں یہ مکہ مکرمہ کے قاضی تھے اسی لئے یہ احتیاط کوشی ہے۔ از مترجم

منگوائے اور اس میں سے کچھ چیزیں لکھوائیں املا کے دوران بعض ایسی چیزیں (حدیثیں) آئیں جن پر ابن عباس بیساختہ کہتے ، خدا کی قسم علی نے یہ فیصلہ ہرگز نہیں کیا الّا یہ کہ وہ (خدانخواستہ) گمراہ ہی ہوگئے ہوں (اور ہمیں یقین ہے کہ وہ گمراہ کبھی نہیں ہوئے لہذا یہ جعلی اضافے ہیں)

اور صرف اسی غرض سے (کہ صحیح حدیث کی صحت کی طرف سے اطمینان (ہوجائے) تابعین نے تو بکثرت سفر بھی کئے ہیں — بلکہ بعض صحابہ نے بھی — تاکہ قابل اعتماد اور ثقہ راویوں سے براہ راست حدیثیں سُنیں ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک شہر سے دوسرے شہر کے سفر کئے ہیں چنانچہ صحابہ کے دو واقعے ہم بیان کرچکے ہیں کہ :-

(۱) صرف ایک حدیث کے لئے جابر بن عبداللہ نے شام کا اور ابو ایوب انصاری نے مصر کا سفر کیا ہے۔

(۲) سعید بن مسیبؒ کہتے ہیں کہ میں ایک ایک حدیث کی تلاش میں دنوں اور راتوں سفر کیا کرتا تھا۔

(۳) ایک مرتبہ شعبیؒ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان کی اور پھر اُس شخص سے کہا جس کے سامنے حدیث بیان کی :۔ لو میاں بغیر کسی زحمت و مشقت کے مفت میں اس حدیث کو لے لو اب سے پہلے تو آدمی کو ایک ایک حدیث کے لئے مدینہ تک کا سفر کرنا پڑتا تھا۔

(۴) بشر بن عبداللہ الحضرمیؒ کہتے ہیں : میں ایک ایک حدیث کے لئے ایک ایک شہر کا سفر کیا کرتا تھا۔

(۳) تنقید و تنقیح حدیث کا تیسرا طریقہ
ازروئے تاریخ راویوں کی جانچ پڑتال
اور ان کے سچ یا جھوٹ بولنے کی تحقیق :

یہ علم — علوم حدیث میں — عظیم الشان علم ہے (محدثین کی اصطلاح میں اس علم کا نام اسماء الرجال ہے) جس کے ذریعہ علماء حدیث نے ہر سچی اور جھوٹی حدیث میں اور ہر قوی اور ضعیف

راوی میں فرق و امتیاز کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے (بڑی ہی محنتیں اور مشقیں اٹھائی ہیں اور) بڑے شاندار کارنامے انجام دیئے ہیں انھوں نے راویوں کی قرار...... واقعی چھان بین کی ہے اور کھوج لگایا ہے ان کی پوری زندگی کی تاریخ (ولادت و وفات) کا سیرت و کردار کا اور ان کے ظاہری و خفیہ حالات کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے، راویوں کے عیوب بیان کرنے میں اور اس کے ذریعہ اللہ کے دین کی حفاظت کے معاملہ میں کسی کی ملامت کی مطلق پرواہ نہیں کی ہے نیز انھیں مطعون اور رسوا کرنے میں نہ ان کی پرہیزگاری و دینداری مانع ہوئی ہے اور نہ ہی انھوں نے (مذہبًا اس میں) کوئی تنگی محسوس کی ہے۔

چنانچہ یحیٰی بن سعید القطانؒ سے جب کہا گیا کہ:۔

> کیا تمہیں اس کا ڈر نہیں کہ جن راویوں کی حدیثیں تم نے (ان کو مجروح اور ناقابل اعتبار قرار دیکر) چھوڑدیں وہ قیامت کے دن خدا کے سامنے تمہارا گریبان پکڑیں گے (کہ انھوں نے ہماری عیب جوئی کر کے ہمیں مطعون اور رسوا کیا ہے)

یحیٰی بن سعید نے جواب دیا:۔

> مجھے ان راویوں کا گریبان پکڑنا گوارا ہے بمقابلہ اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا گریبان پکڑیں اور فرمائیں کہ تم نے میری حدیثوں کو (جان بوجھکر) جھوٹ سے کیوں نہیں بچایا۔

کس راوی کی حدیث قبول کی جائے کس کی نہیں اور کس راوی کی حدیث لکھی جائے اور کس کی نہیں اس سے متعلق ائمہ جرح و تعدیل نے کچھ قواعد بنائے ہیں اور نقد رواۃ حدیث کے سلسلہ میں ان پر عمل کیا ہے (ہم اجمالاً بطور نمونہ ان کو بیان کرتے ہیں)

ان راویوں کی اہم ترین قسمیں جنکی حدیثیں قبول نہیں کیجاتیں

(۱) جھوٹے راوی:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنے والے لوگ۔

اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولا اس کی کوئی بھی حدیث ہرگز قبول نہیں کی جائیگی (نہ اس جھوٹ بولنے سے پہلے کی نہ بعد کی) اسی طرح

اس پر بھی اتفاق ہے کہ یہ جھوٹ سارے کبیرہ گناہوں سے بڑھکر کبیرہ گناہ ہے۔

اختلاف صرف اُس کے کافر ہونے یا نہ ہونے میں ہے، چنانچہ علما کا ایک گروہ تو کہتا ہے کہ ایسا شخص کافر ہے، کچھ علماءِ حدیث کا کہنا ہے کہ ایسے شخص کو قتل کر دینا واجب ہے، ......

ایسے شخص کی توبہ کے قبول اور معتبر ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں بھی علما میں اختلاف ہے چنانچہ امام احمد بن حنبل اور امام بخاری کے شیخ ابو بکر حُمیدی کی رائے تو یہ ہے کہ ایسے شخص کی توبہ بھی قبول نہ ہوگی لیکن امام نووی کی رائے ہے کہ:۔

> اس کی توبہ تو یقیناً صحیح ہوگی باقی اس کی روایت کے قبول کرنے کا حکم اس کی گواہی کے مانند ہے (جو علما توبہ کے بعد جھوٹے آدمی کی گواہی قبول کرتے ہیں، وہ اس کی روایت کو بھی قبول کریں گے) اور اس شخص کا حال اس کافر کا سا ہے جو مرتد ہونے کے بعد مسلمان ہو جائے۔

لیکن امام ابو المظفر السمعانی کا کہنا تو یہ ہے کہ:۔

> جس شخص نے ایک حدیث میں بھی جھوٹ بولا اس کی اگلی پچھلی سب روایتوں کو رد کر دینا واجب ہے۔

(۲) عام گفتگو میں جھوٹ بولنے والے لوگ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ کبھی نہ بولا ہو۔

محدثین کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ جس شخص کا جھوٹ لوگوں میں مشہور ہو اگرچہ اس نے ایک مرتبہ بھی حدیث میں جھوٹ نہ بولا ہو یعنے جو لوگوں میں جھوٹا مشہور ہو اس کی حدیث قبول نہیں کی جائیگی۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

> چار قسم کے آدمیوں سے علم یعنے حدیث نہ لی جائے (۱) ایک وہ علانیہ احمق جس کی حماقت وسفاہت علانیہ ظاہر ہو چکی ہو (یعنے دُنیا اس کو احمق کہتی ہو) اگرچہ وہ سب سے زیادہ روایتیں بیان کرنے والا کیوں نہ ہو (۲) دوسرا وہ شخص جو عام گفتگو میں لوگوں سے جھوٹ بولتا ہو اگرچہ ہم اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنے کی تہمت نہ بھی لگائیں (یعنے اگرچہ حدیث میں

جھوٹ بولنے کا الزام اس پر نہ لگایا گیا ہو) (۳) تیسرا وہ باطل یا فاسد عقیدہ کا پیرو جو لوگوں کو اپنے عقیدے کی دعوت دیتا ہو (۴) چوتھا وہ صاحب فضل و کمال اور عبادت گذار شیخ (محدث) جس کو اتنا پتہ نہ ہو کہ وہ کیسی اور کس راوی کی حدیث بیان کر رہا ہے"۔

ہاں اگر ایسا جھوٹا شخص جھوٹ بولنے سے توبہ کر لے اور اس کے بعد وہ لوگوں میں ثقہ اور عادل مشہور ہو جائے تو جمہور محدثین اس کی توبہ کو بھی قبول کرتے ہیں اور حدیث کو بھی قبول کرتے ہیں لیکن ابو بکر صیرفی اس کے خلاف ہیں وہ کہتے ہیں:

جس راوی کی حدیث کو ہم اس کو جھوٹا پا کر ایک مرتبہ رد کر چکے پھر اگرچہ اس کی توبہ ثابت ہو جائے تب بھی ہم اس کی حدیث قبول نہیں کریں گے۔

(۳) گمراہ فرقوں سے تعلق رکھنے والے راوی

(۱) محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ جو شخص کسی ایسے باطل عقیدہ یا فرقہ کا پیرو ہو جس پر اس کی تکفیر کی گئی ہو (یعنے اہل حق نے اس عقیدہ کی بناء پر اس کو کافر قرار دیا ہو) اس کی حدیث قبول نہیں کی جائے گی۔

(۲) اسی طرح جو شخص (کسی بھی وجہ سے) جھوٹ بولنے کو حلال اور جائز سمجھتا ہو۔ اگرچہ اس کے عقائد کی بناء پر اس کو کافر نہ بھی کہا گیا ہو تب بھی اس کی حدیث قبول نہیں کی جائے گی۔

(۳) لیکن جو گمراہ فرقہ کا پیرو جھوٹ بولنے کو (کسی بھی صورت میں) حلال اور جائز نہ سمجھتا ہو تو اس کی حدیث قبول کی جائے گی یا نہیں؟ یا یہ فرق کیا جائے گا کہ اگر وہ لوگوں کو اپنے عقائد کو قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے تو اس کی حدیث نہیں قبول کی جائے گی اور اگر دعوت نہیں دیتا تو قبول کی جائے گی۔ اس میں محدثین کا اختلاف ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ کہتے ہیں:-

اس مسئلہ میں قدیم زمانہ میں بھی نزاع رہا ہے اور اب بھی نزاع ہے، اکثر محدثین کا مذہب تو یہ ہے کہ ایسے راوی کے بارے میں فرق کرنا چاہیئے اگر وہ اپنے مسلک کی دعوت دیتا ہو تو اس کی حدیث قبول نہ کی جائے اور اگر دعوت

نہیں دیتا ہو تو اس کی حدیث قبول کی جائے۔

ابن کثیر نے اس فرق کے بارے میں امام شافعی کی صریح عبارت ہی نقل کی ہے لیکن ابن حبان نے اس کے خلاف محدثین کا اتفاق نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں:۔

ہمارے تمام ائمہ کے نزدیک ایسے فاسد عقیدہ کے پیرو راوی کی حدیث سے (کسی مسئلہ پر بھی) استدلال کرنا جائز نہیں ہے (چاہے دعوت دیتا ہو یا نہ دیتا ہو) مجھے اس سلسلہ میں علماء کے اختلاف کا مطلق علم نہیں۔

ہماری رائے میں ابن حبان کا یہ محدثین کے اتفاق کا دعویٰ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ دیکھئے امام بخاری نے صحیح بخاری میں عمران بن حطان خارجی کی روایت ذکر کی ہے حالانکہ یہ شخص (حضرت علی کے قاتل) عبدالرحمٰن بن ملجم کا بڑا مداح تھا اور خارجی عقائد کا سب سے بڑا داعی (لیڈر) تھا۔

نیز امام شافعی نے بھی فرمایا ہے کہ:۔

میں تمام گمراہ فرقہ والوں کی گواہی قبول کرتا ہوں بجز رافضیوں کے فرقہ خطابیہ کے اس لئے کہ یہ لوگ اپنے ہم مسلک لوگوں کے حق میں جھوٹی گواہی دینے کو حلال اور جائز سمجھتے ہیں (۱)

لیکن عبدالقادر بغدادیؒ نے اپنی کتاب الفرق بین الفرق میں نقل کیا ہے کہ:۔

امام شافعی نے آخر عمر میں گمراہ فرقوں کی شہادت قبول کرنے کے بارے میں اپنی پہلی رائے سے رجوع کر لیا تھا اور استثنا میں (خطابیہ) کے ساتھ معتزلہ کا بھی اضافہ کر دیا تھا (کہ خطابیہ کی طرح معتزلہ کی گواہی بھی میں نہیں قبول کرتا) (۲)

نتیجہ بحث (علماء حق کے مختلف اقوال کے پیش نظر) میں تو اس نتیجہ[۱] پر پہونچا کہ:۔

---

(۱) اختصار علوم الحدیث ص ۱۰۰ (۲) الفرق بین الفرق ص ۱۰۳

[۱] خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ ذیل باطل یا گمراہ فرقوں کے پیرو راویوں کی حدیثیں مردود ہیں (باقی صفحہ ۱۹۸ پر)

محدثین کسی گمراہ فرقہ کے پیرو راوی کی صرف اس حدیث کو رد کرتے ہیں جو اس کے مسلک کی تائید کرتی ہو (داعیہ ہو یا نہ ہو) یا ایسے فرقہ سے تعلق رکھتا ہو جس کے متعلق معروف و مشہور ہو کہ وہ اپنے فاسد عقائد و اغراض کے لئے جھوٹ بولنے اور حدیثیں وضع کرنے کو جائز اور حلال سمجھتے ہیں اسی لئے محدثین نے روافض کی روایت کو تو بالکل ہی رد کر دیا ہے (۱) لیکن ایسے شیعہ فرقوں کی روایت کو قبول کیا ہے جو امانت و صداقت میں معروف تھے جیسا کہ محدثین نے ہر اس فاسد عقیدہ کے پیرو راوی یا گروہ کی حدیث کو قبول کیا ہے جو جھوٹ بولنے کو (کسی بھی صورت میں) حلال اور جائز نہ سمجھتا ہو جیسے کہ عمران بن حطّان۔

(۴) زندیق راوی وہ بے دین، بدکار اور دین سے کورے راوی جن کو اتنا بھی احساس نہ ہو کہ وہ کیا بیان کرتے ہیں (یعنی حدیث کی ان کی نظروں میں مطلق اہمیت نہ ہو) اور وہ تمام لوگ جن میں حفظ و ضبط، عدالت و ثقاہت اور عقل و فہم کی صفات پورے طور پر نہ پائی جائیں ان کی حدیث بھی قبول نہیں کی جائے گی۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۷ سے آگے) (۱) وہ فرقہ جس کی علماء حق نے تکفیر کی ہو۔

(۲) وہ فرقہ جو کسی بھی صورت میں جھوٹ بولنے کو جائز سمجھتا ہو

(۳) وہ فرقہ جس کے پیرو حدیثیں وضع کرنے میں مشہور ہوں

(۴) کسی بھی گمراہ فرقہ کا وہ راوی جو لوگوں کو اپنے مسلک کے اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہو۔

(۵) کسی بھی گمراہ فرقہ کے راوی کی وہ حدیثیں جن سے اس کے مسلک کی تائید ہوتی ہو۔

باقی جو گمراہ فرقہ کسی بھی صورت میں جھوٹ کو حلال نہ سمجھتا ہو اور راوی حدیث نہ اپنے مسلک کی دعوت دیتا ہو نہ اس کی روایت کردہ حدیث سے اس کے مسلک کی تائید ہوتی ہو اور ثقہ راویوں کے معیار پر پورا اترتا ہو اس کی روایت قبول کی جا سکتی ہے مترجم (۱) زید بن ہارون کا قول ہے: ہم ہر گمراہ فرقہ والے راوی کی روایت کو قبول کرتے ہیں سوائے اس کے جو اپنے مسلک کا داعی ہو ہاں رافضیوں کی روایت کسی بھی صورت میں نہیں لیتے اس لئے کہ وہ تو جھوٹ بولتے ہی ہیں منہاج السنۃ ج ۱ ص ۱۳

مقبول وہ راوی حدیث ہے جو ثقہ ہو اور جو حدیث وہ روایت کرے وہ اس کو خوب اچھی طرح یاد اور محفوظ ہو۔ (علم حدیث کی اصطلاح میں) ثقہ وہ مسلمان ہے جو ذی عقل ہو بالغ ہو موجبات فسق (منہیات و منکرات شرعیہ) سے اور منافی شرافت و مروت اخلاق و عادات سے مبرّا اور پاک دامن ہو اگر اپنی یادداشت سے بلفظہ حدیث بیان کرے تو الفاظ حدیث اسے خوب اچھی طرح یاد ہوں اور اگر حدیث کا مفہوم اور معنی بیان کرے (یعنے روایت بالمعنی کرے) تو حدیث کے مفہوم اور معنی کو کما حقہ سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

ان شرائط میں سے جو ہم نے بیان کیں اگر کوئی ایک شرط بھی راوی میں نہیں پائے جائیگی تو اس کی روایت رَدّ کر دی جائے گی"(۱)

(۵) وہ راوی جنکی روایت قبول کرنے میں توقف کیا جاتا ہے

ایسے راوی (جن میں مذکورہ بالا عیوب تو نہ ہوں تاہم) جن کی روایت کے قبول کرنے میں توقف کیا جاتا ہے (یعنے رد بھی نہیں کیا جاتا مگر قبول بھی نہیں کیا جاتا بلکہ تلاش اور جستجو کی جاتی ہے کہ اگر کوئی متابع (مؤید) مل جائے یا صحت کی جانب کو ترجیح دینے والا قرینہ ہاتھ آجائے تو قبول کرلی جائے)

ایسے راویوں کی متعدد قسمیں ہیں ان میں سے اہم قسمیں حسبِ ذیل ہیں :۔

(۱) جس راوی کی جرح و تعدیل میں ائمہ جرح و تعدیل کا اختلاف ہو۔

(۲) جو راوی روایت حدیث میں کثرت سے غلطیاں کرنے اور ثقہ ائمہ کی مرویات کی مخالفت کرنے کا عادی ہو (یعنے اکثر و بیشتر ثقہ ائمہ کی حدیثوں کے خلاف حدیثیں بیان کرتا ہو)

(۳) جو راوی کثرت سے بھولتا ہو (یعنے نسیان کا مریض ہو)

(۴) وہ راوی جو عمر کے آخری حصہ میں (بڑھاپے میں حافظہ کے خراب ہوجانے کی وجہ سے) روایتوں کو آپس میں خلط ملط کر دیتا ہو۔

---

(۱) اختصار علوم الحدیث ص ۹۸

(۵) وہ راوی جس کا حافظہ ہی سرے سے خراب ہو۔

(۶) وہ راوی جو (بغیر تبلائے) ثقہ اور غیر ثقہ ہر قسم کے راویوں سے حدیثیں روایت کرنے کا عادی ہو اور چھان بین بالکل نہ کرتا ہو۔

(۴) تنقید و تنقیح حدیث کا چوتھا طریقہ

حدیثوں کی مختلف اقسام پر تقسیم کرنے اور ان کے درمیان فرق و امتیاز کرنے کے قاعدے اور ضابطے۔

محدثین نے (حدیث کی حجیت اور احکام شرعیہ کا ماخذ ہونے کے اعتبار سے اہمیت کے پیش نظر) حدیث کی تین قسمیں تجویز کیں۔ (۱) اول صحیح (۲) دوم حسن (۳) سوم ضعیف۔

(۱) صحیح حدیث کی تعریف صحیح حدیث وہ ہے جس کی سند متصل ہو ثقہ اور پختہ حافظہ کے مالک راوی نیچے سے اوپر تک یعنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک دوسرے سے سُنتے اور روایت کرتے چلے آئے ہوں (اور روایت کا سلسلہ کہیں نہ ٹوٹا ہو) یا کسی صحابی یا تابعی پر ختم ہو (اصطلاح میں پہلی حدیث کو "مرفوع" کہتے ہیں اور دوسری کو "موقوف") نیز وہ حدیث نہ شاذ (غیر معروف) ہو نہ مردود (یعنے منکر) ہو نہ ہی اس حدیث (کی سند یا متن) میں کوئی اور علت (مانع صحت خفی عیب) موجود ہو (۱)

اس تعریف میں اتصال سند کی شرط اس لئے لگائی ہے کہ سند کا سلسلہ درمیان میں کہیں ٹوٹے نہیں چنانچہ اگر سند میں سے صحابی ساقط ہو (یعنے تابعی صحابی کا نام نہ لے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرف منسوب کردے) تو یہ حدیث "مرسل" کہلائے گی۔ ایسی حدیث جمہور محدثین کے نزدیک صحیح حدیث کے مرتبہ سے گر جاتی ہے باقی فقہا کے درمیان مرسل حدیث کی حجیت کے بارے میں اختلاف ہے (بعض فقہا حجت مانتے ہیں بعض نہیں)

(۱) حسن حدیث کی تعریف حدیث حسن کی تعریف کے بارے میں بڑا اختلاف ہے، شیخ ابن الصلاحؒ نے ذیل کے الفاظ میں اس اختلاف

---

(۱) اختصار علوم الحدیث ص ۶

کی وجہ بیان کی ہے:۔

جب کوئی حدیث بحث کرنیوالے محدث کے نقطۂ نظر سے ـــ نہ کہ فی نفسہ ـــ صحیح اور ضعیف کے درمیان درمیان ہوتی ہے (یعنے صفات صحیح اس میں موجود ہوتے ہیں مگر نہ اس درجہ کے کہ اس کے صحیح ہونے کا قطعی فیصلہ کیا جا سکے) تو اس کے بارے میں کوئی قطعی تعبیر اور متعین عنوان اختیار کرنا اکثر اہل فن کے لئے دشوار اور مشکل ہوتا ہے کیونکہ یہ (درمیان درمیان ہونا) ایک اضافی چیز ہوتی ہے جو ایک حافظ حدیث کے ذہن میں کھٹکتی تو ہے لیکن وہ اس کی تعبیر سے قاصر ہوتا ہے (اس لئے نہ صحیح کہتا ہے نہ غیر صحیح)

اس کے بعد شیخ ابن الصلاح ذیل کے الفاظ میں اس کی تعبیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں:۔

حدیث حسن کی دو قسمیں ہیں (۱) ایک وہ حدیث ہے جس کی سند کے راویوں میں کوئی مستور الحال راوی موجود ہو (یعنے اس کی سند میں کوئی ایسا راوی موجود ہو جس کی ائمہ جرح و تعدیل نے نہ توثیق کی ہو اور نہ اس پر جرح کی ہو) تاہم وہ مغفل بھی نہ ہو اور کثرت سے غلطیاں بھی نہ کرتا ہو، نہ ہی اس پر جھوٹ بولنے کا الزام عائد کیا گیا ہو مزید برآں اس حدیث کا متن بالکل انہی الفاظ میں یا اس کے قریب قریب دوسری صحیح سند سے بھی مروی ہو (۲) دوسری قسم وہ حدیث ہے جس کا (کوئی) راوی راست گوئی اور امانت و دیانت میں تو مشہور و معروف ہو لیکن حفظ و ضبط (یعنے حافظہ کی پختگی اور قوت یادداشت) میں صحیح حدیث کے راویوں کے درجہ تک نہ پہونچتا ہو مگر جس حدیث کو وہ تنہا روایت کرتا ہو، اس میں وہ محدثین کے نزدیک منکر (ناقابل قبول) نہ سمجھا جاتا ہو نہ ہی حدیث کا متن شاذ ہو (کہ اس کے سوا اور کسی راوی نے روایت نہ کیا ہو) نہ ہی اس میں کوئی اور مانع صحت خفی علت (پوشیدہ عیب) پایا جاتا ہو

یہ بحث تو ایک طرف، باقی پہلی اور دوسری صدی کے محدثین تک اس قسم کی احادیث کو حسن کے لفظ سے تعبیر کرنے کی اصطلاح قائم نہیں ہوئی تھی (ان کے عہد میں حدیث کی دو ہی قسمیں

تھیں صحیح یا ضعیف، حسن کو وہ صحیح میں شمار کرتے تھے) حسن کی اصطلاح تو اس کے بعد تیسری صدی میں امام احمدؒ اور امام بخاریؒ کے عہد میں منظر عام پر آئی ہے پھر اس کے بعد تو عام ہو گئی۔

(۳) ضعیف حدیث

عام محدثین کے نزدیک ضعیف، حدیث کی تیسری قسم ہے۔ ضعیف وہ حدیث ہے جس میں نہ صحیح حدیث کی صفات موجود ہوں اور نہ حدیث حسن کی۔

منشاء ضعف کے اعتبار سے حدیث ضعیف کے علیحدہ علیحدہ نام ہیں اس لئے کہ یہ ضعف یا متن میں ہو گا یا سند میں۔

چنانچہ سند کے اعتبار سے ضعیف حدیث کی قسموں میں سے ایک حدیث "مرسل" ہے۔

حدیث مرسل

مرسل وہ حدیث ہے جس میں صحابی کا نام مذکور نہ ہو (یعنے کوئی تابعی صحابی کا نام لئے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے حدیث بیان کرے)

مُرسَل حدیث کے حجت ہونے یا نہ ہونے میں فقہا کے درمیان تو اختلاف ہے (بعض فقہا حجت مانتے ہیں بعض نہیں) لیکن محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ مرسل حدیث پہ عمل نہ کیا جائے چنانچہ امام مسلمؒ صحیح مسلم کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> مرسل حدیث ہمارے اور اہل علم (محدثین) کے اصل قول (مسلک) کے پیش نظر حجت نہیں ہے۔

شیخ حافظ ابو عمرو بن الصلاح لکھتے ہیں:

> ہم نے مرسل حدیث کے ناقابل استدلال ہونے اور اس پر ضعیف ہونے کا حکم لگانے کے سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا ہے اسی پر حفاظ حدیث اور ناقدین روایات کی جماعت متفق ہے اور یہی وہ اپنی تصانیف میں مسلسل لکھتے چلے آئے ہیں

اس میں شک نہیں کہ ائمہ حدیث کا (مرسل حدیث کے متعلق) یہ فیصلہ اللہ کے دین میں انتہائی احتیاط اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت کی انتہائی حفاظت کے جذبہ پر مبنی ہے

اس لئے کہ (مرسل حدیث میں اس کے سوا اور کوئی نقص نہیں ہے کہ صحابی کا نام مذکور نہیں ہے اور) تمام صحابہ کی عدالت پر سب ہی محدثین کا اتفاق ہے (تو جو بھی صحابی راوی ہوگا وہ یقیناً عادل اور ثقہ ہوگا نام لینا نہ لینا برابر ہے) اس کے باوجود وہ مرسل حدیث کے ضعیف ہونے پر متفق ہیں حالانکہ مرسل حدیث میں صرف صحابی کا نام ہی تو مذکور نہیں ہے (اور صحابہ سب کے سب عادل و ثقہ ہیں تو صحابہ کے نام کا ذکر ہونے یا نہ ہونے سے حدیث کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑنا چاہیے)

رہا یہ احتمال کہ ہوسکتا ہے کہ صحابی نے کسی تابعی سے حدیث سنی ہو (اور ظاہر ہے کہ تابعی تو سب کے سب ثقہ اور عادل نہیں ہیں اور ممکن ہے وہ متروک تابعی ضعیف ہو) سو یہ احتمال انتہائی ضعیف (اور محض عقلی احتمال) ہے جس کا وقوع کبھی نہیں ہوا اور اگر ایسا ہوتا تو صحابی اس (ضعیف تابعی) کو ضرور بیان کرتا (کہ یہی اس صحابی کی دیانت کا تقاضہ ہے) (۱)

لہذا اگر ایک ثقہ تابعی صحابی کا نام ذکر نہیں کرتا۔ جبکہ تمام صحابہ عدول ہیں۔ تو اس سے حدیث (کی صحت) کو کیا نقصان پہونچتا ہے؟

لیکن ان تمام حقائق کے باوجود مرسل حدیث کو صحیح اور حجت نہ ماننا یہ ہمارے محدثین کی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں وہ فوق العادہ احتیاط کوشی ہے جس کی مثال اس امت کے محدثین کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔

---

(۱) ہاں یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ ہوسکتا ہے اس تابعی نے صحابی سے وہ حدیث نہ سنی ہو بلکہ اپنے جیسے تابعی سے سنی ہو اور وہ (صحابی کا نام لئے بغیر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتا ہو" سو یہ احتمال بھی انتہائی قلیل الوقوع اور نادر ہونے کے باوجود (حدیث کی صحت پر) اثر انداز نہیں ہوتا اسی لئے کہ کوئی بھی ثقہ تابعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے کوئی ایسی حدیث کبھی نہیں روایت کرتا جو اس نے کسی بھی صحابی سے نہ سنی ہو ۱۲

منقطع، معضل اور مرسل تبع تابعی ضعیف حدیث کی ایک قسم "منقطع" ہے۔ یہ وہ حدیث ہوتی ہے جس کے سلسلۂ اسناد میں صحابی کے علاوہ کوئی اور راوی مذکور نہ ہو یا اس کی سند میں کسی مبہم (نامعلوم) راوی کا ذکر ہو۔

اسی منقطع کی ایک قسم معضل ہے یہ وہ حدیث ہوتی ہے جس کی سُند میں سے دو یا دو سے زیادہ راوی پے درپے ساقط ہوں۔

اسی منقطع کی ایک قسم وہ حدیث ہے جسے کوئی تبع تابعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے روایت کرے (ظاہر ہے کہ اس سند میں سے کم از کم دو راوی ضرور ساقط ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ اس تبع تابعی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان دو سے زیادہ واسطے ہوں اس لئے کہ ایک تابعی کی روایت دوسرے تابعی سے بکثرت پائی جاتی ہے اس لئے یہ حدیث مرسل تبع تابعی کہلائے گی اور منقطع ہی کی ایک قسم شمار ہوگی)

حدیث شاذ ضعیف حدیث کی ایک قسم شاذ بھی ہے۔ امام شافعی شاذ کی تعریف حسب ذیل کرتے ہیں۔

> کوئی ثقہ راوی ایسی حدیث روایت کرے جو اُن تمام روایتوں کے خلاف ہو جن کو دوسرے راوی بیان کرتے ہوں تو ایسی حدیث کے قبول کرنے میں توقف کیا جائے گا۔

حفاظ حدیث نے شاذ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:۔

> شاذ وہ حدیث ہے جس کی ایک ہی سند ہو، وہ راوی (جس کی وجہ سے شذوذ پیدا ہوا ہے) ثقہ ہو خواہ غیر ثقہ۔ تو اگر وہ راوی جس کی وجہ سے شذوذ پیدا ہوا ہے ثقہ ہو تب تو اس حدیث کے قبول کرنے میں توقف کیا جائے گا اور اس سے (کسی مسئلہ پر) استدلال نہیں کیا جائے گا اور اگر وہ (منفرد) راوی ثقہ نہ ہو تو اس حدیث کو رد کر دیا جائے گا۔

لیکن امام شافعی کی تعریف اس دوسری تعریف سے بہتر ہے۔ کیونکہ دوسری تعریف کو اختیار کرنے کی صورت میں ایسی بہت سی حدیثوں کے قبول کرنے میں توقف کرنا پڑے گا جنکو صرف

ایک ثقہ راوی نے روایت کیا ہو۔

اور بھلا یہ توقف ممکن بھی کیسے ہو سکتا ہے جبکہ امام مسلم یہ کہہ رہے ہیں:۔

امام زہری کی نوے ۹۰ حدیثیں ایسی ہیں جن کو بجز زہری کے اور کوئی دوسرا راوی روایت نہیں کرتا (تو محدثین کی تعریف کے مطابق یہ سب شاذ ہوئیں اور ان کو قبول کرنے میں توقف کرنا چاہیئے حالانکہ یہ سب مقبول ہیں امام شافعی کی تعریف کے اعتبار سے بیشک شاذ نہ ہونگی اس لئے کہ یہ دوسرے راویوں کی روایات کے خلاف نہیں ہیں۔)

مُنکَر

ضعیف احادیث کی ایک قسم منکر بھی ہے۔ منکر وہ حدیث ہے جو ایسے راوی (کے تفرد) کی وجہ سے شاذ بنی ہو جو نہ ثقہ ہو اور نہ ہی پختہ حافظہ اور یادداشت کا مالک ہو، ایسی حدیث کو رد کر دیا جائے گا یعنے قبول نہیں کیا جائے گا۔

مضطرب

ضعیف حدیث کی ایک قسم مضطرب بھی ہے۔ مضطرب وہ حدیث ہے جس کی روایتیں سَنَد یا متن کے اعتبار سے اس قدر مختلف ہوں کہ کسی ایک کو دوسری پر ترجیح دینا ممکن نہ ہو اس لئے کہ وہ سب راویوں کے ثقہ ہونے کے اعتبار سے یکساں اور برابر ہوں

مضطرب حدیث عام طور پر ضعیف ہی سمجھی جاتی ہے الا یہ کہ یہ اختلاف صرف کسی راوی یا اس کے باپ کے نام میں یا اس کی نسبت میں ہو اور وہ راوی بہر صورت ثقہ ہو تو ایسی صورت میں اس حدیث پر صحیح ہونے کا حکم لگا دیا جائے گا۔[۱]

---

[۱] واضح ہو کہ ائمہ اصول حدیث کا اتنے اہتمام سے حدیث کی اتنی متنوع قسمیں تجویز کرنا اور ان میں فرق مراتب قائم کرنا ایک طرف اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ حضرات کھری اور نکھری ہوئی یعنے صحیح احادیث کو غیر صحیح احادیث سے الگ کرنے میں قطعاً کامیاب ہیں اور جن احادیث پر انھوں نے صحیح ہونے کا حکم لگایا ہے، وہ یقیناً صحیح اور بے شک وشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں ہیں جو ان میں ذرہ برابر شک وشبہ کرے وہ یقیناً اسلام اور مسلمانوں کا کھلا ہوا دشمن ہے۔

دوسری طرف ضعیف یعنے غیر صحیح حدیث کی وجہ ضُعف کے اعتبار سے اتنی قسمیں تجویز کرنا اور پھر

(باقی صفحہ ۲۰۶ پر)

موضوع اور اس کی علامتیں

علماء حدیث نے جس طرح صحیح، حسن، ضعیف حدیثوں کو پہچاننے کے لئے اصول وضوابط تجویز کئے ہیں اسی طرح انھوں نے موضوع احادیث کے پہچاننے کے ضابطے بھی تجویز کئے ہیں اور موضوع احادیث کی کچھ علامات بتلائی ہیں جن سے ان کے بناوٹی اور جعلی ہونے کا پتہ چل جاتا ہے۔

اس سے پہلے ہم حدیثیں گھڑنے والوں کی قسمیں اور وضع حدیث کے محرکات واسباب کا ذکر کر چکے ہیں اب ہم ان علامتوں کا ذکر کرتے ہیں جو موضوع حدیث کی نشاندہی کرتی ہیں اور ہم ان علامتوں کو دو قسموں پر تقسیم کرتے ہیں (۱) ایک سند میں وضع کی علامتیں (۲) دوسرے متن میں وضع کی علامتیں۔

(۱) حدیث کے موضوع ہونے کی علامتیں سند میں

یہ علامات بہت سی ہیں۔ ان میں سے زیادہ اہم حسب ذیل ہیں:۔

(۱) پہلی علامت یہ ہے کہ اس حدیث کی سند میں کوئی راوی نہ صرف جھوٹا ہو بلکہ جھوٹ بولنے میں مشہور ومعروف ہو اور اس کے علاوہ کوئی اور ثقہ راوی اس حدیث کو روایت نہ کرتا ہو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۵ ۔ ۔ ۔ ۔) وجہ ضعف کی نشاندہی کرنا اس تصریح کے ساتھ کہ ہماری تحقیق اور تلاش وجستجو کے اعتبار سے ۔ نہ کہ فی نفسہ ۔ اس کے متن یا سند میں فلاں نقص یا عیب ہے تاکہ آنے والے خدام حدیث فوق کل ذی علم علیم کے تحت مقررہ قواعد وضوابط اور اصول جرح وتعدیل کی روشنی میں اپنی علمی تحقیق اور تلاش وجستجو سے اس نقص یا عیب کا ازالہ کرکے حدیث کو ضائع ہونے سے بچا سکیں ۔ یہ صیانت وحفاظت حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبۂ صادق اور حب رسول کی قطعی دلیل ہے۔ اسی لئے وہ ضعیف حدیث کی متعدد اقسام میں حدیث پر صرف توقف کا یا کسی مسئلہ میں اس کے استدلال کے قابل نہ ہونے کا یا دوسری ان سے صحیح حدیثوں کے مقابلہ پر قابل قبول نہ ہونے کا حکم لگاتے ہیں اور وہ بھی اپنے علم کے اعتبار سے واللہ اعلم از مترجم۔

محدثین رحمہم اللہ نے اِن جھوٹے راویوں کا کھوج لگانے اور ان کے حالات زندگی معلوم کرنے کے بارے میں انتہائی اہتمام کیا ہے اور جن جن حدیثوں کی سند میں وہ موجود ہیں اُن کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس طرح الگ کر دیا ہے کہ ان کی گرفت سے نہ کوئی جھوٹا راوی بچ سکا ہے اور نہ کوئی جھوٹے راوی کی حدیث بچ سکی ہے۔

(۲) دوسری علامت یہ ہے کہ کسی حدیث کی سند میں کوئی ایسا راوی واقع ہوا ہو جس نے (کسی بھی وجہ سے یا مجبوری سے) خود اس کا اعتراف کیا ہو کہ اس نے کوئی ایک یا چند حدیثیں وضع کی ہیں مثلاً ابوعصمة نوح بن ابی مریم (کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں کہ اس) نے قرآن کریم کی سورتوں کے فضائل کی حدیثیں وضع کرنے کا اعتراف کیا تھا اسی طرح عبدالکریم بن ابی العوجاء نے اعتراف کیا تھا کہ اس نے چار ہزار[۵] ایسی حدیثیں بنائی ہیں جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا ہے (اور وہ لوگوں میں پھیل چکی ہیں)

(۳) تیسری علامت کسی حدیث کی سند میں کوئی ایسا راوی واقع ہو کہ جس شیخ سے وہ حدیث روایت کرتا ہے (از روئے تاریخ) اس سے اس کی ملاقات ثابت ہی نہ ہو یا وہ اس شیخ کی وفات کے بعد پیدا ہوا ہو یا اس مقام پر وہ کبھی گیا ہی نہ ہو جہاں حدیث سننے کا دعویٰ کرتا ہے۔ مثلاً:۔

(۱) مامون بن احمد ہروی نے دعویٰ کیا تھا کہ اس نے ہشام بن عمّار سے حدیث سنی ہے تو حافظ ابن حبانؒ نے اس سے دریافت کیا تم شام کس زمانہ میں گئے تھے؟ اس نے جواب دیا: ۲۵۰ھ میں؛ تو اس پر ابن حبان نے کہا: جس ہشام سے تم حدیث روایت کرتے ہو اس کا انتقال تو ۲۴۵ھ میں ہو چکا ہے۔ (تو کیا ہشام کی وفات کے پانچ سال بعد تم نے اس سے حدیث

۵؎ محدثین اور ائمہ جرح و تعدیل نے صرف ان لوگوں کے اقرار کی بنیاد پر ہی ان کی حدیثوں پر وضع حدیث کا حکم نہیں لگایا ہے بلکہ اس کے علاوہ اور دوسری علامات و قرائن کو بھی سامنے رکھا ہے ورنہ تو کچھ بھی مستبعد نہیں کہ اس قسم کے اقرار بھی ذخیرۂ احادیث کو مشکوک اور مشتبہ بنانے کی سازش کے تحت کئے گئے ہوں۔ مترجم

سُنی)

(۲) اسی طرح عبداللہ بن اسحاق کرمانی نے محمد بن یعقوب سے حدیث نقل کی تو اس سے کہا گیا: محمد بن ابی یعقوب کا انتقال تو تمہارے پیدا ہونے سے نو سال پہلے ہو چکا تھا (تو کیا تم نے پیدا ہونے سے پہلے ہی اس سے حدیث سُن لی تھی)

(۳) اسی طرح محمد بن حاتم الکشی نے عبداللہ بن حمید سے ایک حدیث روایت کی تو ابو عبداللہ الحاکم نے (لوگوں سے) کہا: لو اس شیخ نے عبد بن حمید کی موت سے تیرہ سال بعد (عالم برزخ میں جاکر) عبداللہ بن حمید سے حدیث سُن لی۔

(۴) اسی طرح امام مسلم نے صحیح مسلم کے مقدمہ میں نقل کیا ہے کہ:۔

معلّی بن عرفان نے بیان کیا ہے کہ: ابو وائل نے ہم سے حدیث بیان کی کہ عبداللہ ابن مسعود (جنگ) صفین میں ہمارے مقابلہ پر نکلے۔ تو اس پر ابو نعیم یعنے فضل بن دُکین نے — جو معلّی سے اس واقعہ کے راوی ہیں — کہا:۔ آپ کے خیال میں ابن مسعود مرنے کے بعد پھر زندہ ہو گئے تھے اس لئے کہ عبداللہ بن مسعود کی وفات تو ۳۲ھ یا ۳۳ھ میں ہو چکی تھی یعنے حضرت عثمان کی خلافت ختم ہونے سے بھی تین سال پہلے (اور صفین میں جنگ حضرت علی اور امیر معاویہ کے درمیان ۳۷ھ میں ہوئی ہے)

اس میں شک نہیں کہ ایسی صورتوں میں تاریخ پر — یعنے راویوں کی تاریخ پیدائش و وفات کے، ان کے سفر و حضر کی تاریخ پر، ان کے شیوخ (اساتذہ) کی تاریخ وغیرہ تاریخی حقائق پر — اعتماد کرکے کسی حدیث کے موضوع ہونے کا فیصلہ کرنا، سب سے محکم اور عمدہ طریقہ ہے۔

اسی لئے علوم حدیث میں علم طبقات رواۃ نے ایک مستقل اور اہم فن کی حیثیت اختیار کر لی ہے (جس کو علم اسماء الرجال کہا جاتا ہے) جس سے ناقد حدیث کسی صورت میں بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

حفص بن غیاث کا مقولہ ہے:۔

جب تم کسی شیخ کو متہم قرار دینا چاہو تو اس شیخ کے سال پیدائش و سال وفات کا حساب کر لو یعنے راوی کی عمر دیکھ لو اور اس شخص کی عمر دیکھ لو جس سے اس نے وہ حدیث (سنی اور) لکھی ہے۔

سفیان ثوری کا مقولہ ہے:

جب راویوں نے جھوٹ بولنا شروع کیا تو ہم نے بھی ان (کو رسوا کرنے) کے لیے تاریخ سے کام لینا شروع کر دیا۔

(۴) چوتھی علامت! بعض مرتبہ راوی حدیث کے نجی حالات زندگی اور ذاتی رجحانات (محرکات) کے ذریعہ بھی اس کی حدیث کے موضوع ہونے کا پتہ لگ جاتا ہے مثلاً حاکم نے سیف بن عمر تمیمی سے روایت کیا ہے کہ اس نے بتلایا کہ:

ایک دن ہم سعد بن ظریف کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اس کا لڑکا مکتب سے روتا ہوا آیا تو اس نے لڑکے سے پوچھا کیا ہوا کیوں روتا ہے؟ لڑکے نے جواب دیا: استاد نے مجھے مارا، تو یہ سنکر سعد بولا: اچھا! تو میں بھی ان (مکتب کے معلموں) کو رسوا کر کے چھوڑوں گا اور اپنے تلامذہ سے کہا مجھ سے عکرمہ نے ابن عباس کی یہ مرفوع حدیث بیان کی ہے: تمہارے بچوں کے معلم (استاد) تم میں سب سے زیادہ برے لوگ ہوں گے، یتیم بچوں پر ذرا رحم نہیں کریں گے، غریب مسکین بچوں کے حق میں بڑے ہی درشت مزاج (اور سخت گیر) ہوں گے۔

اسی طرح ایک اور حدیث ہے: ہریسہ کمر کو مضبوط کرتا ہے۔ اس حدیث کا راوی محمد بن حجاج نخعی ہریسہ بیچا کرتا تھا (دوکان چلانے کی غرض سے یہ حدیث گھڑ رکھی تھی)

(۱) موضوع حدیث کی علامتیں متن حدیث میں

متن حدیث کے اعتبار سے حدیث کے موضوع ہونے کی بہت سی علامتیں ہیں۔ ان میں سے زیادہ اہم یہ ہیں:-

پہلی علامت:- حدیث کے الفاظ کا اس درجہ رکیک اور گرا ہوا ہونا کہ ایک عربی

زبان کے انداز بیان کی باریکیوں کو جاننے اور پہچاننے والا بآسانی پتہ چلا لے کہ اس قسم کے رکیک اور گرے ہوئے الفاظ تو ایک عام فصیح و بلیغ عربی دان آدمی کی زبان سے بھی نہیں نکل سکتے چہ جائیکہ افصح العرب والعجم صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی ترجمان زبان مبارک سے۔
حافظ ابن حجرؒ کا کہنا ہے کہ الفاظ حدیث کی رکاکت (گراوٹ) کو موضوع ہونے کی علامت اس وقت قرار دیا جائے گا جب حدیث میں تصریح ہو کہ یہ الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔
حافظ ابن دقیق العیدؒ لکھتے ہیں:۔

> محدثین بسا اوقات ایسے امور کے اعتبار سے بھی جو مروی حدیث (کے الفاظ و معانی) سے متعلق ہوتے ہیں حدیث پر موضوع ہونے کا حکم لگا دیا کرتے ہیں۔

حافظ ابن دقیق کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ الفاظ حدیث کی کثرت مزاولت و ممارست (شب و روز حدیثیں پڑھتے پڑھاتے رہنے) کی وجہ سے محدثین کے قلوب میں ایک ایسی بصیرت، روحانی مناسبت اور قوی ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ (حدیث کے الفاظ سامنے آتے ہی) اس بصیرت اور ملکہ کے ذریعہ بآسانی پہچان لیتے ہیں کہ یہ الفاظ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہو سکتے ہیں یا نہیں (جیسے ایک تجربہ کار صراف سونے کو دیکھتے ہی بتلا دیتا ہے کہ یہ کھرا ہے یا کھوٹا)
بلقینی، ابن دقیق کے قول کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> اس (بصیرت اور ملکہ) کی شہادت ہمیں اس تجربہ سے ملتی ہے کہ اگر کوئی آدمی کسی شخص کی برسہا برس خدمت کرتا ہے اور اس کو (اس ہمہ وقتی خدمت اور مزاج شناسی کی بنا پر) اس بات کی پہچان ہو جائے کہ وہ مخدوم کن چیزوں کو پسند کرتا ہے اور کن سے نفرت کرتا ہے تو اگر اس خادم کے سامنے کوئی شخص — ایسی چیز کے بارے میں جس کے متعلق خادم جانتا ہے کہ اس کے مخدوم کو محبوب تھی — یہ دعویٰ کرے کہ فلاں چیز اس مخدوم کو ناپسند تھی تو وہ مزاج شناس خادم سنتے ہی کہہ دے گا کہ یہ قطعاً جھوٹ ہے (اسی طرح وہ سخن شناسانِ کلام نبوت جنہوں نے اپنی عمریں احادیث یاد کرنے یاد

رکھنے لکھنے لکھانے اور پڑھنے پڑھانے میں صرف کردی ہیں وہ موضوع حدیث
کے الفاظ سنتے ہی بتلا دیتے ہیں کہ یہ الفاظ افصح العرب والعجم صلی اللہ
علیہ وسلم کی زبانِ وحی ترجمان سے نکلے ہوئے ہرگز نہیں ہو سکتے)

(۲) متن حدیث سے متعلق دوسری علامت یعنی حدیث کا فساد یہ اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ
حدیث کا مضمون (۱) بدیہی عقلی امور کے خلاف ہو اور اس کی کوئی صحیح تاویل اور معقول مراد نہ بیان
کی جاسکے (تو ایسی حدیث کو موضوع کہا جائے گا) مثلاً یہ حدیث کہ:-

حضرت نوح کی کشتی نے (طوفان آنے کے وقت) بیت اللہ کے
سات چکر لگائے اور مقام ابراہیم پر دو رکعت دوگانہ طواف ادا کیں۔

(۲) یا اس کا مضمون اصول حکمت حقہ اور اخلاق کے تمام قواعد و اصول کے خلاف ہو مثلاً
یہ حدیث:-

ترکوں کا جور و ستم اور نہ عربوں کا عدل و انصاف

(۳) یا اس کا مضمون شہوانی جذبات اور بدکاری کے رجحانات کو برانگیختہ کرتا ہو مثلاً
یہ حدیث:-

حسین چہرہ کی طرف دیکھنا بینائی کو بڑھاتا ہے

(۴) یا اس کا مضمون محسوسات و مشاہدات کے خلاف ہو مثلاً یہ حدیث:-

پہلی صدی کے بعد کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جس کی خدا کو ضرورت ہو۔

(۵) یا اس کا مضمون مسلّم اور متفق علیہ طبی قواعد کے خلاف ہو مثلاً یہ حدیث:-

بینگن میں ہر بیماری کی شفا رکھی ہوئی ہے

(۶) یا اس کا مضمون از روئے عقل خدائے قدوس کی تنزیہ (پاکی اور بے عیبی) اور کمال ذات
وصفات کے منافی ہو مثلاً یہ حدیث:-

اللہ نے گھوڑے کو پیدا کیا پھر اس کو خوب دوڑایا جس سے وہ پسینہ پسینہ
ہوگیا تو اس پسینہ سے خدا نے اپنے آپ کو پیدا کیا۔

(۷) یا اس کا مضمون تاریخ کے قطعی اور یقینی مسلمات کے، یا کائنات اور انسان کی ہستی سے متعلق سنت اللہ اور قانون قدرت کے خلاف ہو۔

مثلاً عوج بن عنق کی حدیث :-

عوج بن عنق کا قد تین ہزار ہاتھ کا تھا

(۸) یا حضرت نوح علیہ السلام سے متعلق یہ حدیث :-

نوح نے جب عوج بن عنق کو ڈوبنے سے ڈرایا تو اُس نے نوح سے کہا: مجھے اپنے اس پیالے یعنے کشتی میں سوار کرلو اور یہ کہ طوفان عوج بن عنق کے ٹخنوں تک بھی نہیں پہونچا تھا اور یہ کہ وہ سمندر کی تہ میں ہاتھ ڈالتا اور مچھلی نکال لیتا اور سورج کے قریب لیجاکر اسے بھون لیتا تھا۔

اسی قبیل سے رتن نامی ہندی کی حدیث :

رتن نے چھ سو سال کی عمر پائی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ اس نے پایا تھا

(۹) یا کوئی حدیث ایسی حماقتوں اور خُرافات پر مشتمل ہو جن سے عقلمندوں کے دامن کو پاک سمجھا جاتا ہے۔

مثلاً یہ حدیث :-

سفید مرغا میرا محبوب ہے اور میرے دوست جبرئیل کا بھی محبوب ہے

یا مثلاً کبوتروں کے متعلق یہ حدیث :-

کبوتروں کو (گھروں میں پالکر) قینچیاں بنالو کیونکہ کبوتر تمہارے بچوں کو جنوں سے محفوظ رکھتے ہیں (یعنے کبوتر بچوں پر جنات کا اثر نہیں ہونے دیتے)

اسی طرح وہ تمام احادیث جن کو عقل انسانی بداہتًا رد کرتی ہے سب باطل مردود ہیں۔

ابن جوزی (نقّاد موضوعات) کا قول ہے :-

جس حدیث کو تم دیکھو کہ وہ عقل کے خلاف ہے، مسلمہ اصول کے منافی ہے اور نقول (صحیح احادیث) اس کے مخالف ہیں تو سمجھ لو کہ وہ گھڑی ہوئی ہے

امام رازی اپنی کتاب محصول میں لکھتے ہیں :۔

ہر وہ حدیث جس میں باطل کا شائبہ بھی ہو اور کسی تاویل کو قبول نہ کرے (یعنے اس کی کوئی صحیح اور معقول مراد نہ بیان کی جاسکے) وہ جھوٹی ہے یا اس کا وہ حصہ حذف کر دیا گیا ہے جو وہم کے شائبہ کو دور کرسکتا ہے (جب تک اس حصہ کا پتہ نہ چلے اور وہم کا شائبہ دور نہ ہو اس کو قبول نہیں کیا جائیگا)

(۳) متن حدیث سے متعلق موضوع ہونے کی تیسری علامت

جو حدیث قرآن کی صریح آیات کے خلاف ہو اور کسی بھی تاویل کو قبول نہ کرے (یعنے اس کی کوئی ایسی صحیح مراد نہ بیان کی جاسکے کہ اس کے بعد وہ قرآن کے خلاف نہ رہے) .... وہ یقیناً موضوع اور جھوٹی ہے مثلاً یہ حدیث :۔

زنا کی اولاد (حرامی بچہ) سات پشتوں تک جنت میں داخل نہ ہوگا (یعنی نہ صرف وہ خود بلکہ اس کی سات پشتیں بھی جنت میں نہ جاسکیں گی)

یہ حدیث یقیناً موضوع ہے اس لئے کہ یہ قرآن کریم کی آیت کریمہ کے قطعاً خلاف ہے ارشاد ہے :۔

ولا تزر وازرة وزر اخرى	کوئی بھی بار گناہ اٹھانے والا دوسرے کا بار گناہ نہ اٹھائے گا (یعنے کسی بھی شخص کو دوسرے شخص کے گناہ کی سزا نہیں دی جائے گی)

بلکہ درحقیقت یہ حدیث توریت سے ماخوذ ہے اس لئے کہ یہ توریت کے احکام (زنا) میں سے ہے (یعنے دین موسٰی علیہ السلام میں زنا کی یہی سزا تھی)

اسی طرح جو حدیث صریح سنت متواترہ یعنے صریح متواتر حدیث کے خلاف ہو (تو وہ بھی موضوع سمجھی جائے گی) مثلاً یہ حدیث :۔

جب تم سے میری طرف منسوب کر کے کوئی حدیث بیان کی جائے اور
وہ حق کے موافق ہو تو اس کو قبول کر لو خواہ میں نے کہا ہو یا نہ کہا ہو۔

یہ حدیث اس متواتر حدیث کے قطعاً منافی اور خلاف ہے:۔

جس شخص نے عمداً مجھ پر جھوٹ بولا اس کو اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لینا
چاہیئے۔

یا کوئی حدیث از روئے معنی ان اصول و قوانین عامہ کے خلاف ہو جو قرآن اور حدیث سے مسلمہ طور پر ماخوذ و مستنبط ہیں۔

مثلاً یہ حدیث:۔

جس کے بیٹا پیدا ہوا اور اس نے اس کا نام محمد رکھا یا تو وہ اور اس
کا بیٹا دونوں جنت میں جائیں گے۔

یا مثلاً یہ حدیث (قدسی):۔

میں نے اس پر قسم اٹھائی ہے کہ میں اس شخص کو دوزخ میں داخل نہیں
کروں گا جس کا نام محمد یا احمد ہوگا۔

یہ دونوں حدیثیں قرآن و حدیث سے ماخوذ قطعی اور معروف احکام کے خلاف ہیں کہ آخرت میں نجات کا مدار ایمان و اعمال صالحہ پر ہے نہ کہ ناموں اور لقبوں پر۔

یا کوئی حدیث اجماع امت کے خلاف ہو مثلاً یہ حدیث:۔

جو شخص رمضان کے آخری جمعہ میں کچھ فرض نمازیں بھی قضا کرلے تو یہ
نمازیں ہر اس نماز کی تلافی کر دیں گی جو اس کی عمر بھر میں فوت ہوئی ہو گی ستر سال تک

یہ حدیث اجماع امت کے خلاف ہے کیونکہ یہ اصول اجماعی طور پر مسلم ہے کہ کسی بھی فوت شدہ عبادت کے کوئی دوسری عبادت قائم مقام نہیں ہو سکتی۔

(۴) متن کے اعتبار سے موضوع ہونے کی چوتھی علامت

جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے معروف و مشہور تاریخی[1] حقائق و واقعات کے مخالف ہو یہ اس حدیث کے موضوع ہونے کی علامت

---

[1] کسی بھی ہستی کے اقوال و افعال (اوامر و نواہی) اور احوال و وقائع کی صحت کو (باقی صفحہ ۲۱۵ پر)

مثلاً یہ حدیث :-

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر والوں پر جزیہ لگایا تھا اور سعد بن معاذ کی شہادت سے اور معاویہ بن ابی سفیان کے تحریر پہ آپ نے خیبر والوں سے کٹھن کام لینے اور بیگار لینے کو معاف کر دیا تھا۔

حالانکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ فتح خیبر کے زمانہ میں تو نہ کوئی جزیہ کو جانتا تھا نہ ہی شرعاً نافذ ہوا تھا۔ جزیہ کی آیت تو جنگ تبوک کے بعد ہی نازل ہوئی ہے نیز یہ کہ سعد بن معاذ کی وفات تو اس سے پہلے غزوۂ خندق میں ہو چکی ہے (اور خیبر غزوۂ خندق کے بعد فتح ہوا ہے) اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ معاویہ فتح مکہ کے زمانہ میں مسلمان ہوئے ہیں (گویا فتح خیبر کے وقت نہ سعد بن معاذ زندہ ہیں کہ شہادت دیں نہ معاویہ ہی مسلمان ہوئے ہیں کہ حکمنامہ لکھیں اور نہ جزیہ کا حکم نافذ ہوا ہے) اس لئے یہ تاریخی حقائق و واقعات اس حدیث کی تکذیب کرتے ہیں اور اس پر گھڑی ہوئی حدیث ہونے کا حکم لگاتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۴) تاریخی معیار پر پرکھنے کے معنی مسلمہ طور پر یہ ہیں کہ اس زمانہ کے تاریخی حقائق و واقعات ان کی تردید و تکذیب نہ کرتے ہوں اگر ایسا ہوگا تو کہا جائے گا کہ تاریخ ان کی تردید کرتی ہے اس لئے جھوٹے اور بناوٹی ہیں

آپ دیکھتے ہیں کہ محدثین اور ائمہ جرح و تعدیل نے اس تاریخی معیار پر احادیث کو پرکھنے میں ذرہ برابر کوتاہی نہیں کی ہے۔

اس کے باوجود کسی استشراقی محقق کا احادیث کو از سر نو تاریخی معیار پر پرکھنے کی ضرورت کا اظہار کرنا محض استشراقی ذہن و فکر کی پیداوار ہے۔

اس لئے کہ صرف مستشرقین ہی کا انداز تحقیق ہے اسلام اور اسکی روایات کے متعلق کہ وہ زمانہ مابعد کے واقعات یا اپنے زمانہ کے ظروف و احوال کو سامنے رکھکر کوئی مفروضہ قائم کر لیتے ہیں اور اس کو تاریخی معیار قرار دے کر صدیوں پہلے کی مسلمہ اسلامی روایات — تعلیمات قرآن و احادیث — کو اس پر پرکھتے ہیں اور کہدیتے ہیں کہ تاریخی واقعات ان کی تردید کرتے ہیں اس لئے یہ جھوٹی یا غلط ہیں ان کو از سر نو تاریخی معیار پر

(باقی صفحہ ۲۱۶ پر)

اسی قسم کی ایک مثال حضرت انس کی یہ حدیث ہے انس کہتے ہیں:۔

میں (ایک مرتبہ) حمام میں داخل ہوا تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیٹھا ہوا دیکھا آپ صرف لنگی باندھے ہوئے تھے میں نے آپ سے بات کرنے کا قصد کیا تو آپ نے فرمایا: اے انس! میں نے بغیر لنگی باندھے حمام میں داخل ہونے کو اسی لئے منع کیا ہے (کہ لوگ حمام میں باتیں کرنے کے عادی ہیں۔

حالانکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ آپ حمام میں کبھی داخل نہیں ہوئے کیونکہ آپ کے زمانہ میں تو کوئی حجاز میں حمام کو جانتا بھی نہ تھا۔

(۵) متن کے اعتبار سے حدیث کے موضوع ہونے کی پانچویں علامت

جو حدیث کسی ایسے راوی کے مذہب کے موافق و مؤید ہو جو اعلیٰ درجہ کا متعصب ہے (تو یہ موافقت و تائید بھی ایسے غالی متعصب راوی کی حدیث کے موضوع ہونے کی معنوی علامت ہے) مثلاً کوئی رافضی فضائل اہل بیت میں کوئی حدیث روایت کرے یا کوئی مرجئی عقیدۂ ارجاء[1] کی تائید میں کوئی حدیث روایت کرے۔

جیسے حبّہ بن جُوَین کی یہ روایت:۔

میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے سُنا: میں نے اللہ کی عبادت اُس کے رسول کے ساتھ اس سے پانچ یا سات سال پہلے کی ہے کہ اس امت میں سے کوئی شخص بھی اس کی عبادت کرے۔

حافظ ابن حبان اس حدیث کے متعلق کہتے ہیں:۔

(حاشیہ صفحہ ۲۱۵ سے آگے) پرکھنے کی ضرورت ہے یہ کھلی ہوئی ہٹ دھرمی ہے اور اسلام دشمنی کا ثبوت!
مزید تفصیل آئندہ فصل سنت مستشرقین کی نظر میں کے تحت پڑھیے۔

[1] ارجاء کے معنی یہ ہیں کہ جہنم سے نجات کے لئے صرف زبان سے توحید و رسالت کی شہادت دینا کافی ہے یہ اسلام کے ایک گمراہ فرقہ کا عقیدہ تھا جنکو مرجئہ کہتے ہیں۔۱۲

رجۂ شیعیت میں انتہائی غالی تھا اور حدیث میں انتہائی واہیات تھا

(۶) متن کے اعتبار سے حدیث کے موضوع ہونے کی چھٹی علامت

حدیث کسی ایسی عام بات یا اہم واقعہ پر مشتمل ہو جس کے عام طور پر نقل کرنے کے محرکات بکثرت موجود ہوں (اس کے باوجود اس ایک راوی حدیث کے علاوہ اور کوئی بھی راوی اسکو روایت کرنے والا نہ ہو) مثلاً وہ واقعہ مجمع میں بیشمار لوگوں کے سامنے پیش آیا ہو پھر بھی لوگوں میں مشہور نہ ہو اور اس راوی کے علاوہ اور کوئی اس کو روایت نہ کرے۔

اسی بنا پر اہل سنت نے غدیر خم والی حدیث وصیّت کو موضوع اور جھوٹا بتلایا ہے علماء کا کہنا ہے کہ :-

> اس حدیث خم میں موضوع ہونے کی متعدد علامتیں ہیں ۔ ان میں سے اہم علامت یہ ہے کہ خود اس حدیث میں تمام صحابہ کے موجود ہونے کی تصریح موجود ہے پھر وہ سب کے سب صحابہ (جو غدیر خم میں موجود تھے) حضرت ابوبکر کے خلیفہ بنائے جانے کے وقت اس حدیث کے چھپانے پر کیونکر متفق ہو گئے یہ عادتاً بھی محال ہے اور واقعات کے بھی خلاف ہے، ایسی صورت میں

لہ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انتخاب خلیفہ کی نوبت ہی اس لئے آئی کہ آپ نے اپنے بعد کسی کو اپنا خلیفہ نامزد نہیں فرمایا تھا اور حدیث غدیر خم میں تو آپ نے صاف لفظوں میں حضرت علی کو اپنا خلیفہ نامزد فرما دیا ہے کوئی بھی صحابی مجمع عام میں اس حدیث کو بیان کر دیتا انتخاب کا قصہ ہی ختم ہو جاتا علاوہ ازیں اگر فرض کر لیجئے اہل بیت کے مخالفین نے اخفاء سے کام لیا تھا تو اہل بیت کو کیا ہو گیا تھا کہ انھوں نے اس حدیث وصیت کا نام تک نہیں لیا کم از کم حضرت عباس یا خود حضرت علی تو مخالفین کا منہ بند کر دیتے علاوہ ازیں انتخاب خلیفہ پر انصار و مہاجرین کا خطرناک ترین نزاع منا امیر و منکم امیر۔ جس میں خانہ جنگی ہوتے ہوتے رہ گئی اور تین دن اس نزاع کو ختم کرنے میں لگ گئے۔ یہ حدیث وصیت بآسانی اس نزاع کو ختم کر سکتی تھی اس کے باوجود کسی بھی صحابی کا اس حدیث کا نام تک نہ لینا قطعاً اس امر کی دلیل ہے کہ اس حدیث کا سرے سے وجود ہی نہ تھا اور یقیناً یہ حدیث رافضیوں کا اختراع بلکہ بہتان ہے ۱۲ مترجم

جمہور اہل اسلام میں سے صرف رافضیوں کا اس حدیث کو نقل کرنا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ یہ رافضیوں کا جھوٹ ہے۔

حافظ ابن تیمیہ اسی حدیث وصیت کے سلسلہ میں فرماتے ہیں :۔

اسی (عادتاً بعید اور محال ہونے کے) قبیل سے حضرت علی کی خلافت کے بارے میں نص (صریح حدیث) کا نقل کرنا بھی ہے ہمیں بہت سے طرق (دلائل) سے اس کا جھوٹ ہونا قطعی طور پر معلوم ہے اس لئے کہ یہ حدیث متواتر تو کیا ہوتی اس کو تو کوئی صحیح سند کے ساتھ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک) پہونچاتا بھی نہیں، یہ تک بھی (کسی سے) منقول نہیں کہ کسی نے اس حدیث کو خفیہ طریق پر ہی ذکر کیا ہو (جیسا کہ شیعہ کہتے ہیں) حالانکہ :۔

(۱) سقیفۂ بنی ساعدہ کے واقعہ (انتخاب خلیفہ) کے دن لوگ (انتخاب خلیفہ کے بارے میں) ایک دوسرے سے دست وگریباں تھے، آپس میں زبردست چہ میگوئیاں اور مشورے کر رہے تھے (اگر اس حدیث کا کوئی وجود ہوتا تو یہ نوبت ہی نہیں آسکتی تھی)

(۲) نہ ہی حضرت عمر کی وفات کے وقت (جب ان کے جانشین کا معاملہ درپیش تھا) کسی نے اس حدیث کا نام لیا جبکہ حضرت عمر نے (اپنے اجتہاد سے) چھ آدمیوں کے باہمی مشورہ سے خلافت کے مسئلہ کو طے کرنے کا حکم دیا (اگر کوئی صحابی بھی حضرت عمر کے سامنے اس نص صریح کو پیش کر دیتا تو وہ اپنے اجتہاد سے یہ حکم نہ دیتے)

(۳) پھر جب حضرت عثمان شہید کر دیئے گئے اور حضرت علی کی خلافت پر بیعت کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان شدید ترین اختلاف رونما ہوا (اس وقت بھی کسی موافق یا مخالف فریق نے اس حدیث وصیت کا نام نہیں لیا حالانکہ اسوقت تو تقیہ کا بھی وقت نہ تھا) ان کے ہاتھ پر ایک فریق بیعت کر چکا تھا)

لہذا قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ اگر (خلافت علی سے متعلق) کوئی صریح حدیث موجود ہوتی ــــ جیسا کہ رافضی دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت علی (کی خلافت) کے بارے میں صریح اور تمام اعذار کو ختم کر دینے والی قطعی نص (حدیث) موجود تھی اور یہ کہ لوگوں کو اس کا علم بھی تھا تو از روئے عقل اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایسے مواقع پر لوگوں کو اسے ضرور زبان پر لانا چاہیے تھا جیسا کہ ایسے مواقع پر ہوا کرتا ہے بلکہ عقل تو چاہتی ہے کہ اس جیسے نزاعی مواقع پر ــــ جن میں لوگوں کی تمام تر توجہ ایسی صریح دلیل پیش کرنے پر انتہا درجہ مرکوز ہوا کرتی ہے ــــ تو نہ صرف بہت سے بلکہ اکثر و بیشتر لوگوں کو اس قطعی نص کو پیش کرنا چاہیئے تھا (مگر کسی ایک متنفس نے بھی اس کا نام نہیں لیا) لہذا جس چیز کا لازم ہونا قطعی ہو اس کا نہ پایا جانا ملزوم کے نہ ہونے کی قطعی دلیل ہے (یعنے ایسے اہم مواقع پر لوگوں کا اس نص (صریح حدیث) کو ذکر نہ کرنا اس کے موجود نہ ہونے کی منطقی دلیل ہے سادہ لفظوں میں یوں کہئے:۔ ضرورت کے وقت کسی چیز کا نہ پایا جانا اس کے نہ ہونے کی دلیل ہے) (۱)

ابن حزم اسی حدیث وصیت کے متعلق لکھتے ہیں :۔

جس نص (صریح حدیث خلافت علی) کا دعویٰ کیا جاتا ہے اس کی روایت ہمیں کسی بھی تو راوی سے نہیں ملی بجز ایک مجہول (گمنام) شخص کے جو ایک مجہول شخص سے روایت کرتا ہے جس کی کنیت ابو الحمراء ہے (نام کا پتہ نہیں) ہمیں نہیں معلوم دنیا میں اس نام کا کوئی شخص ہے بھی یا نہیں؟

خود شیعی عالم ابن الحدید اپنی کتاب شرح نہج البلاغۃ ج ۱ ص ۱۳۵ پر لکھتا ہے:۔

یاد رکھو! یوں تو (وصیت) کے بارے میں آثار و احادیث بیشمار ہیں لیکن جو شخص بھی ان کو منظر غائر دیکھے گا اور انصاف سے کام لے گا وہ یقین کریگا

---

(۱) منہاج السنۃ ج ۴ ص ۱۱۸

کہ اس (وصیت) کے سلسلہ میں ایسی کوئی صریح اور قطعی نص (حدیث) موجود نہیں ہے جس میں نہ شکوک وشبہات کی گنجائش ہو اور نہ احتمالات کی گنجائش ہو جیسا کہ "امامیہ" کا دعویٰ ہے اس لئے کہ امامیہ کا تو دعویٰ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امیرالمومنین حضرت علی کو صاف صریح اور واضح طور پر اپنا خلیفہ نامزد کر دیا تھا، غدیرخم کی حدیث یا منزلت والی حدیث (یعنے انت منی بمنزلتہ ھارون من موسیٰ) یا اور اسی جیسی عام طریقوں (سندوں) سے وارد احادیث کی طرح نہیں، بلکہ آپ نے تو حضرت علی کی خلافت اور امارت مسلمین کے بارے میں قطعی طور پر تصریح فرما دی تھی اور مسلمانوں کو حکم دیدیا تھا کہ اسی نام سے ان کو سلام کریں (یعنے السلام علیک یا خلیفۃ رسول اللہ یا امیرالمومنین کہا کریں) چنانچہ مسلمان حضرت علی کو اسی نام سے مخاطب کر کے سلام کیا کرتے تھے اور نہ صرف ایک دو مقام پر آپ نے اس کی تصریح فرمائی تھی بلکہ بہت سے مقامات پر اس کی تصریح وتاکید فرمائی تھی کہ آپ کے بعد حضرت علی آپ کے خلیفہ ہوں گے اور ان کا حکم ماننے اور اطاعت کرنے کا حکم دیا تھا۔

امامیہ کی ان افتراپردازیوں پر ابن حدید کہتا ہے:۔

> اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ کوئی بھی انصاف پسند آدمی جب ان (اہم ترین) مواقع[1] اور واقعات کو پیش نظر رکھکر غور کرے گا جو آپ کی وفات کے بعد پیش آئے ہیں تو وہ قطعی طور پر جان لیگا کہ (خلافت علی سے متعلق کوئی ایسی نص صریح حدیث قطعاً نہ تھی (ورنہ ضرور سامنے آتی اور امامیہ قطعاً جھوٹ بکتے ہیں)

---

[1] ان مواقع سے وہی تینوں نازک ترین موقعے مراد ہیں جن کا ذکر حافظ ابن تیمیہؒ نے کیا ہے۔ ۱۲ مترجم۔

(۷) متن کے اعتبار سے موضوع ہونے کی ساتویں علامت[1]

کسی معمولی سے عمل پر بیحد وحساب ثواب (جس کا اصول شرعیہ سے کوئی ثبوت نہ ہو) اور کسی معمولی سی خطا پر سخت ترین وعید اور بے حد وحساب (جس کا اصول شرعیہ سے مطلق ثبوت نہ ہو) عذاب پر کسی حدیث کا مشتمل ہونا بھی حدیث کے موضع ہونے کی ایک علامت ہے۔

قصہ گو واعظ اس قسم کی حدیثیں لوگوں کے دلوں میں رقّت اور سوز وگداز یا حیرت وتعجب کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی غرض سے ایسی حدیثیں بکثرت بیان کیا کرتے ہیں مثلاً یہ حدیث :۔

> جو شخص چاشت کی اتنی اتنی رکعتیں پڑھے گا اس کو ستر نبیوں (کی عبادت) کا ثواب ملے گا۔

اسی طرح یہ حدیث :۔

> جس شخص نے لا الٰہ الا اللہ کہا اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک پرندہ پیدا کر دیتے ہیں جس کی ستر ہزار زبانیں ہوتی ہیں اور ہر زبان ستر ہزار بولیاں بولتی ہے اور (ان ستر ہزار ور ستر ہزار بولیوں میں) وہ اس شخص کے لئے مغفرت کی دُعا کرتا رہتا ہے۔

---

[1] واضح ہو کہ حدیث کے موضوع ہونے کی ان علامات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جس حدیث میں ان میں سے کوئی ایک علامت بھی موجود ہو اس حدیث پر ہرکس وناکس موضوع ہونے کا حکم لگا دے بلکہ یہ علامات وہ قرائن ہیں جن کی مدد سے احادیث کی بکثرت مزاولت اور نقد حدیث کا ملکہ رکھنے والے صاحب بصیرت ائمہ حدیث اپنے تجربہ اور بصیرت کے تحت کسی حدیث پر موضوع ہونے کا حکم لگاتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے ہرکس وناکس کسی مرض کی علامات کسی طب یا ایلوپیتھی کی کتاب میں پڑھ کر اور کسی مریض کے اندر ان میں سے کسی ایک علامت کو موجود پا کر یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس مریض کو فلاں بیماری ہے بلکہ باقاعدہ طب یا ایلوپیتھی کے فاضل اور کہنہ مشق طبیب یا ڈاکٹر ہی ان علامات سے مریض کے مرض کی تشخیص کر سکتے ہیں اور انہی کو اس کا حق پہونچتا ہے انہی کا فیصلہ حجت ہے۔ ۱۲، از مترجم

یہ ہیں وہ اساسی قواعد اور بنیادی ضابطے جو علمائے حدیث نے احادیث کو پرکھنے اور صحیح وغیر صحیح (موضوع) کی پہچان کے لئے تجویز کئے ہیں۔

نقد حدیث کے قواعد وضوابط کی جامعیت و اہمیت علمی

ان قواعد وضوابط میں آپ دیکھتے ہیں ان محدثین نے اپنی علمی اور تنقیدی مساعی میں صرف سند کے پرکھنے پر اعتماد اور اکتفا نہیں کیا ہے یا اپنی تمام تر توجہ متن کو چھوڑ کر صرف سند پر ہی مرکوز نہیں کردی ہے جیسا کہ بعض مستشرقین کا یا ان کے متبع استشراقی ذہن و فکر کے مالک مسلمان محققین کا خیال بلکہ دعویٰ ہے جس کی تفصیل آپ آئندہ ابواب میں پڑھیں گے بلکہ دیکھئے ان کی جرح وتنقید کا ہدف سند اور متن دونوں یکساں ہیں (یعنے دونوں کے اعتبار سے یکساں جرح وتنقید کرتے ہیں) اور وضع حدیث کی علامات کے سلسلہ میں آپ پڑھ ہی چکے ہیں، کہ محدثین نے چار سند سے متعلق علامات بیان کی ہیں اور سات متن سے متعلق علامات تجویز کی ہیں،

پھر ان حضرات نے صرف انہی علامات پر اکتفا اور اعتماد نہیں کیا ہے بلکہ اس فن کا تجربہ اور ملکہ رکھنے والے حذاق کے فنی ذوق کو احادیث کے پرکھنے، قبول کرنے یا رد کرنے میں بڑی اہمیت دی ہے اسی لئے حاذق اور ماہر محدثین نے بہت سی احادیث کو محض سُنکر ہی رد کر دیا ہے صرف اس لئے کہ ان کے فنی ملکہ نے ان کو گوارا اور قبول نہیں کیا (یعنے ان کا فنی ذوق ان کو حدیث ماننے کے لئے تیار نہیں ہوا)

اسی لئے وہ بسا اوقات (نقد حدیث کی سلسلہ میں) کہا کرتے ہیں:۔

(۱) اس حدیث پر تو ظلمت چھائی ہوئی ہے

(۲) یا اس حدیث کا متن تو بالکل تاریک ہے

(۳) یا دل اس کو حدیث ماننے سے قطعاً انکار کرتا ہے۔

(۴) یا یہ حدیث تو دل کو لگتی نہیں۔

(ان حضرات نے جو عمریں اس فن میں صرف کی ہیں اس کے پیش نظر) یہ کچھ تعجب خیز بات نہ ہونی چاہیئے (کسی بھی فن کی مزاولت اور کثرت تجربات سے اس قسم کا ملکہ اور بصیرت پیدا ہو ہی جاتی ہے) چنانچہ ربیع بن خثیم کا قول ہے:۔

بعض حدیثیں دن کی طرح روشن ہوتی ہیں جن کو تم ان کی روشنی سے ہی پہچان سکتے ہو (کہ یہ واقعی حدیثیں ہیں) اور بعض حدیثیں رات کی تاریکی کی طرح اندھیرا گھپ ہوتی ہیں ان کی تاریکی اور ظلمت سے ہی تم ان کو پہچان سکتے ہو (کہ یہ حدیث ہرگز نہیں ہو سکتی)

ابن الجوزی کہتے ہیں :-

منکر (گھڑی ہوئی) حدیث کو تو سنتے ہی عموماً ایک طالب حدیث کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل اس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔

اس بحث کی مزید تفصیل ہم انشاء اللہ مستشرقین اور ان کے متبعین کے شکوک و شبہات پر بحث کے ذیل میں بیان کریں گے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

فصل چہارم

ائمہ حدیث کی ان فوق العادہ مساعی جلیلہ کے نتائج و ثمرات کا بیان

ائمہ حدیث کی ان کامیاب کوششوں اور کاوشوں کے نتیجہ میں ــ جن کا ہم اختصار کے ساتھ گزشتہ اوراق میں ذکر کر چکے ہیں ــ سنت مقدسہ ــ جو احکام شرعیہ کا دوسرا ماخذ ہے ــ کے ستونوں کے محکم اور مضبوط ہو جانے کے باعث اسلامی شریعت کی عمارت محکم اور پائدار بنیادوں پر قائم ہو گئی اور سنت اپنے صحیح مقام پر آ گئی، اور مسلمان اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی احادیث کی طرف سے مطمئن ہو گئے۔

اس لئے کہ ذخیرۂ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہر ملاوٹ اور کھوٹ (موضوع اور بے اصل حدیثوں) کو دور کر دیا گیا تھا صحیح، حسن اور ضعیف کے درمیان امتیاز اور فرق مراتب واضح کر دیا گیا تھا اور اس طرح اللہ جل شانہٗ اپنے وعدہ کے مطابق اپنی شریعت کو مفسدوں کی فتنہ پردازیوں سے جھوٹے افتراء پردازوں کی رخنہ اندازیوں سے، زندیقوں اور شعوبیوں (نسل پرستوں) کی دست درازیوں سے (یعنے حدیث میں جھوٹ کی آمیزشوں اور گھڑی ہوئی حدیثوں سے) محفوظ کر دیا تھا۔

اس صبر آزما، حوصلہ شکن مگر مبارک و مقدس تحریک (نقد حدیث) کے جن عظیم الشان ثمرات و منافع سے مسلمان بہرہ یاب ہوئے ہیں ان میں سب سے زیادہ نمایاں اور اہم ثمرات و برکات اور فوائد و منافع ہم "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ تحریک نقد حدیث کا پہلا فائدہ، تدوین حدیث

ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جس اہتمام کے ساتھ قرآن کریم باضابطہ طور پر مدون ہوا تھا۔ اُس اہتمام کے ساتھ اور باضابطہ طور پر سنت کی تدوین نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ سُنت اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف صحابہ کرام کے سینوں میں محفوظ تھیں۔

اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ بھی —— جیسا کہ ہم کتاب وسنت وحدیث کی بحث میں بیان کر چکے ہیں —— فی الجملہ تدوین سنت اور کتابت حدیث سے خالی نہ تھا تاہم اس کو رسمی اور باضابطہ تدوین نہیں کہا جا سکتا۔

صحابہ کرام نے بھی اپنے بعد آنے والے تابعین کو مُنہ زبانی اور بالمشافہ (رُو در رُو) اس امانت یعنے ذخیرۂ سنت کو سپرد کیا چنانچہ صحابہ کرام کا دَور بھی اسی طرح گذر گیا اور سنت اس دور میں بھی بہت تھوڑی مقدار میں مدون ہو سکی (وہ بھی انفرادی طور پر اور خود اپنے یاد رکھنے یا ضرورت کے وقت مراجعت کرنے کی غرض سے)

اس تابعین کے دور میں بھی حاملین حدیث ایک دوسرے سے زبانی حدیثیں روایت کیا کرتے تھے (اگر روایت کرنے والے کو کہیں شک یا تردد ہوتا تو وہ اپنے مکتوب ذخیرہ حدیث کی مراجعت کر کے اطمینان کر لیتا)

یہ صحیح ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے باضابطہ طور پر تدوین حدیث کا ارادہ کیا تھا لیکن اس کے عواقب ونتائج پر —— جن کا تذکرہ آپ پڑھ چکے ہیں —— غور وفکر کے بعد اس ارادہ کو ترک کر دیا۔

چنانچہ امام بیہقی اپنی کتاب مدخل میں عروۃ بن الزبیر کی روایت سے نقل کرتے ہیں کہ:۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ارادہ کیا کہ حدیثوں کو یکجا طور پر لکھا جائے چنانچہ (حسب عادت) اُنھوں نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا، صحابہ نے بھی (ان

کے خیال کی تائید کی اور، ان کو یہی مشورہ دیا کہ احادیث کو باضابطہ طور پر لکھوا لیا جائے (تاکہ ضائع ہونے کا خطرہ نہ رہے) تاہم حضرت عمرؓ مطمئن نہ ہوئے اور) ایک مہینہ تک اس معاملہ میں اللہ جل شانہٗ سے استخارہ کرتے رہے آخر ایک دن صبح کو اللہ تعالیٰ نے ان کو فیصلہ کن نتیجہ پر پہونچا دیا تو اُنھوں نے صحابہ سے خطاب کرکے فرمایا: میں سنت کو لکھوانے کا ارادہ کر رہا تھا تو مجھے گزشتہ اُمتوں کا خیال آیا جنہوں نے (اسی طرح اپنے نبیوں کے) "نوشتے" لکھے اور اُنھیں پر ٹوٹ پڑے اور کتاب اللہ کو چھوڑ بیٹھے، خدا کی قسم میں اللہ کی کتاب (قرآن) کے ساتھ کسی کو بھی چیز کو ملتبس[1] (مشتبہ) نہ ہونے دوں گا[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ نے ترک کتابت حدیث کے سلسلہ میں جس فطری عذر کو بیان فرمایا ہے وہ فی الحقیقت اُن حالات کے پیش نظر بالکل ٹھیک تھا جن سے تمام مسلمان اس زمانہ میں گزر رہے تھے۔

اس لئے کہ صورت حال یہ تھی کہ قرآن عظیم (اپنی شان اعجاز کی وجہ سے) بالکل نر و تازہ تھا اور (اسلامی فتوحات کے نتیجہ میں) دنیا کی قومیں دھڑا دھڑ خدا کے دین میں داخل ہو رہی تھیں اس لئے ان (نومسلم) اقوام کے لئے پوری یکسوئی کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے پڑھانے، یاد کرنے کرانے اور اس کی تلاوت کرنے پر ہی اپنی پوری توجہ کو مرکوز کر دینا انتہائی ضروری تھا تاکہ قرآن ہی ان کے اسلامی عقائد کی اساس بنے اور قرآن ہی ان کے عقائد کو ہر طرح کی آمیزش اور تغیر و تبدل سے محفوظ رکھے۔

---

(۱) یہ ترک کتابت حدیث و سنت کی بعینہٖ وہی وجہ ہے جس کی بنا پر خود صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کتابت حدیث سے منع فرمایا تھا جس کی تفصیل آپ فصل کے حواشی میں پڑھ چکے ہیں اللہ جل شانہٗ نے حضرت عمرؓ کے دل میں بھی ایک مہینہ کے استخارہ کے بعد وہی بات ڈال دی جو صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیش نظر تھی ۱۲ مترجم

(۲) جامع بیان العلم ج ۱ ص ۶۴

(صحابہ کرام بھی حضرت عمر کی اس دور اندیشی اور دینی مصلحت کو سمجھ گئے) اور یہی صورت حال قائم رہی۔

یہاں تک کہ اسلام اور مسلمانوں میں داخلی فتنے اور اندرونی فسادات رونما ہونے لگے اور ان کے نتیجہ میں حدیث کے اندر جھوٹ بولنا (اور جھوٹی حدیثیں گھڑنا) عام ہوگیا تو اس نئے فتنے یعنے تحریک کذب فی الحدیث اور وضع حدیث کے مقابلہ اور مقاومت کے لئے جلیل القدر تابعین اور زمانہ مابعد کے ائمہ حدیث کے لئے اُٹھنا اور مقابلہ کرنا ضروری ہوگیا چنانچہ اُنھوں نے ہر پہلو سے حفاظت حدیث کے سلسلہ میں وہ کامیاب اور موثر کوششیں اور کاوشیں انجام دیں جن کا ذکر ہم گزشتہ اوراق میں کرچکے ہیں۔ ان مساعی جلیلہ کا پہلا ثمرہ اور فائدہ یہ ہوا کہ ان ائمہ نے (فتنہ وضع حدیث اور کذب فی الحدیث کی وجہ سے) احادیث کے ضائع اور ناقابل اعتماد ہوجانے کے خوف سے نیز حدیثوں کو ہر طرح کی آمیزش اور کمی زیادتی سے بچانے کی غرض سے سب سے پہلے تمام ذخیرہ سنت کو کتابی صورت میں مدوّن[1] اور محفوظ کردیا۔

جمع حدیث سے متعلق روایات قریب قریب اس پر متفق ہیں کہ تابعین میں سب سے پہلے جس شخص کو باضابطہ اور رسمی طور پر جمع و تدوین حدیث کا خیال پیدا ہوا وہ خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیز (متوفی ۱۰۱ھ) رحمہ اللہ تھے چنانچہ اُنھوں نے (۹۹ھ میں مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد) مدینہ طیبہ کے گورنر اور قاضی القضا قاضی ابوبکر بن حزم (وفات ۱۱۷) کے پاس حکم بھیجا کہ: "تلاش کرو جو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث تمہیں (کسی کے پاس)

---

[1] اور یہ علمی اور فنی کارنامہ اس لئے انجام پاگیا کہ تحریک "وضع حدیث" کے مقابلہ پر محدثین کی مذکورہ بالا کامیاب تحریک "نقد حدیث" کے نتیجہ میں ہر قسم کی حدیثیں چھٹ چھٹا کر سامنے آگئی تھیں مصنفین نے ان کو کتابوں میں مدون کردیا کسی نے صرف صحیح حدیثوں کو اپنی تصانیف میں جمع کیا کسی نے صحیح اور حسن دونوں قسم کی حدیثوں کو لے لیا اور کسی نے اپنی تصنیف میں ضعیف حدیثوں کو بھی۔ وجہ ضعف کی تصریح اور نشاندہی کے ساتھ ذکر کردیا چنانچہ حدیث کی متداول کتابیں صحاح اور سنن مدون ہوگئیں باقی موضوع احادیث کو — جو برائے نام حدیث کہلاتی ہیں — علیحدہ تصانیف میں جمع کردیا تاکہ ان کے بارے میں کسی کو حدیث ہونے کی غلط فہمی نہ رہے تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے مقالات حدیث شائع کردہ مکتبہ اسلامیہ کراچی ۔ ۱۲ مترجم

ملے اس کو لکھ لو (اور میرے پاس بھیجدو) کیونکہ (آئے دن حاملین حدیث یعنے صحابہ کرام کے دنیا سے اٹھنے کی وجہ سے) مجھے علم یعنے حدیث کے ضائع ہونے اور علماء حدیث کے دنیا سے اٹھ جانے کا اندیشہ ہے۔

عمر بن عبدالعزیز نے یہ بھی قصد کیا تھا (اور ابن حزم کو لکھا تھا) کہ عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاریہ (متوفیہ ۹۸ھ) اور قاسم بن محمد بن ابی بکر (متوفی سنہ ۱۲۰ھ) کے پاس جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایات تھیں وہ ان کو بھی لکھا کر بھیجیں[لہ] (اس لئے کہ یہ دونوں حضرت عائشہ کی آغوش تعلیم و تربیت کے پروردہ تھے اور ان کی حدیثوں کا سب سے بڑا ذخیرہ ان کے پاس تھا)

روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اس عظیم الشان کام یعنے جمع و تدوین حدیث کے لئے صرف مدینہ کے گورنر قاضی ابوبکر حزم کو ہی مامور نہیں کیا تھا بلکہ ممالک اسلامیہ کے تمام بڑے بڑے شہروں کے گورنروں اور وہاں کے بڑے بڑے علماء حدیث کو بھی یہ حکم بھیجا تھا اور حدیثیں جمع کرنے اور لکھنے پر مامور کیا تھا چنانچہ ابونعیم نے تاریخ اصفہان میں ایک روایت نقل کی ہے کہ:۔

خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیز نے پورے عالم اسلامی کے حکمرانوں اور حامیینِ

لہ اس روایت سے نیز مسند دارمی اور مؤطا امام محمد کی حسب ذیل روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مطلقاً تمام احادیث اور آثار کبار صحابہ دونوں کے جمع کرانے اور لکھانے کے احکامات بھیجے ہیں نہ کہ صرف مرفوع احادیث کے جیسا کہ بعض لوگوں کو امام بخاری کی عبارت سے وہم ہوا ہے۔ اس لئے کہ دارمی اور موطا کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:۔ ابوبکر بن حزم کو خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیز نے لکھا:۔ تلاش کرو جو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں یا سنتیں یا حضرت عمر وغیرہ کبار صحابہ کی احادیث و سنن تمہیں ملیں سب جمع کر لو اور لکھ لو اس لئے کہ مجھے احادیث اور علماء حدیث کے دنیا سے اٹھ جانے کا شدید اندیشہ ہے۔

اسی لئے تدوین حدیث کے دور اول کے مدونین و مصنفین نے بالتخصیص مرفوع و موقوف اور بلا امتیاز صحیح وغیر صحیح اور بغیر کسی خاص ترتیب و تبویب کے احادیث کو سینوں سے نقل کر کے سفینوں ۔ کتابوں ۔ میں جمع کر دیا منزجم

حدیث کو یہ حکم لکھا بھیجا تھا کہ :- تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو تلاش کرو اور جہاں کہیں بھی ملیں اُن کو جمع کر لو (اور لکھا کر میرے پاس بھیج دو)[1]

غرض اس طرح عمر بن عبدالعزیز نے اپنے جد امجد حضرت عمر بن الخطاب (وفات ۲۳ھ) کی جمع و کتابت حدیث کی اُس خواہش کو پورا کر دیا جو ایک مدت تک ان کے سینہ میں چٹکیاں لیتی رہی مگر اُنھوں نے (اپنے زمانہ کے حالات کے پیشِ نظر) قرآن کے ساتھ سنت کے خلط ہو جانے کے ڈر سے یا کتاب اللہ کے نظر انداز کر دیئے جانے کے خوف .... سے اُسے ترک کر دیا تھا۔

روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ابوبکر بن حزم نے تعمیل حکم کے طور پر کچھ احادیث حضرت عمر بن عبدالعزیز کے لئے لکھی بھی تھیں، چنانچہ قاسم اور عمرہ کی حدیثیں لکھا کر ان کے پاس دارالخلافہ میں بھیج بھی دی تھیں۔

لیکن (ظاہر ہے کہ یہ باضابطہ اور حکومتی سطح پر جمع و کتابت کی پہلی کوشش تھی اس لئے) مدینہ میں جو احادیث و آثار کا ذخیرہ موجود تھا وہ سب کا سب مدون نہیں ہوسکا (اسی طرح دوسرے بلادِ اسلامیہ کا بھی) اس عظیم کام کو سب سے پہلے جس شخص نے انجام دیا ہے وہ محمد بن مُسلم بن شہاب زہری (وفات ۱۲۴ھ) ہیں

امام محمد بن مُسلم بن شہاب الزہری بھی اس عظیم کارنامہ کو صرف اس لئے انجام دے پائے کہ جمع حدیث و سنت کے باب میں امام زہری کی ہستی اپنے عہد میں حاملینِ لواء سنت کے درمیان فضاءِ عالم میں لہراتے ہوئے سب سے زیادہ طویل و عریض جھنڈے کی سی تھی جو تمام فضاء عالم

---

(۱) تقیید العلم میں خطیب کی روایت میں اہل مدینہ کی تخصیص ہے

۵۲ مگر ابوبکر بن حزم کے ان "نوشتوں" کا یا قاسم و عمرہ کی احادیث کے مجموعہ کا یا دوسرے مراکز اسلامیہ کے وُلاۃ و قُضاۃ کے جمع کردہ مجموعوں کا مستقل وجود ان کی تصانیف کی حیثیت سے کہیں نہیں ملتا حتیٰ کہ ابوبکر بن حزم اور زہری کے جمع کردہ مجموعوں کا بھی۔ ان دورِ اوّل کے مدونین کے جمع کردہ مجموعوں کا وجود یقیناً اُن کے تلامذہ کے جمع کردہ مجموعہ ہائے احادیث میں ہے۔ ۱۲

(مترجم)

چھایا ہوا ہو (یعنی حاملین و جامعین حدیث رسول اللہ کے درمیان سب سے بڑا ذخیرہ حدیث ان کے پاس محفوظ تھا)

اسی لئے خود خلیفہ راشد عمر بن عبد العزیز اپنے رفقا و مصاحبین کو طلب حدیث کے لئے زہری کے پاس جانے کا حکم دیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے۔

زہری سے بڑھ کر سنت کا عالم اور حافظ روئے زمین پر کوئی موجود نہیں

عمر بن عبد العزیز کے اس خیال کی تائید امام مسلم (وفات ۲۶۱ھ) کے قول سے ہوتی ہے فرماتے ہیں:۔

نوّے حدیثیں ایسی ہیں جنکو روایت کرنے والا زہری کے سوا اور کوئی محدث نہیں رہا۔

نہ صرف امام مسلم بلکہ اور بہت سے ائمہ حدیث نے بھی اپنے اپنے زمانہ میں اعتراف کیا ہے۔

اگر زہری نہ ہوتے تو سنت کا بہت سا ذخیرہ ضائع ہو جاتا۔

یہ اعتراف اس کے باوجود کیا گیا ہے کہ زہری کے زمانہ میں حسن بصری (وفات ۱۱۰ھ) اور ان کے ہم پلہ محدثین موجود تھے (گویا زہری کے معاصر محدثین میں ہی زہری کی برتری اور فوقیت تسلیم کر لی گئی ہے)

تاریخ ارتقاء تدوینِ حدیث سے یہی ظاہر ہے کہ امام زہری نے (حضرت عمر بن عبد العزیز کے ایماء کے تحت) جس طرح جمع و تدوین حدیث کا کام (بطور نقش اوّل) انجام دیا اُس کی صورت اس منقح و مرتب تدوین حدیث کی سی نہ تھی جو (نقش ثانی کے طور پر) امام بخاری امام مسلم وغیرہ اکابر مدونین حدیث کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہونچا ہے۔

زہری نے تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا — اور اسی کے وہ مامور بھی تھے — کہ جو بھی حدیثیں اُنھوں نے صحابہ کرام سے سُنی تھیں ان کو بغیر کسی خاص ترتیب مضامین یا تعیین ابواب وغیرہ کے کیف ما اتفق جمع کر لیا اور لکھ لیا تھا بلکہ بکثرت صحابہ کے اقوال اور تابعین کے فتاویٰ بھی ان احادیث کے ساتھ جمع اور مخلوط تھے۔

ہر نئے کام کی ابتداء کا تقاضا بھی فطری طور پر یہی ہوا کرتا ہے۔

امام زہری کی اس سادگی اور بے تکلفی کا ثبوت ہمیں اس سے بھی ملتا ہے جو ان کے انداز روایت حدیث کے متعلق مروی ہے کہ وہ اپنے تلامذہ کو اپنی احادیث کے لکھے ہوئے اجزا نکال کر دیدیا کرتے تھے کہ وہ ان کی طرف منسوب کر کے ان احادیث کو روایت کریں۔

غرض اس طرح احادیث کو خاص خاص کتابوں اور نوشتوں کی شکل میں مدون کرنے کا سنگ بنیاد رکھنے کا سہرا امام زہری کے سر ہے اور تدوین حدیث میں اولیت کا فخر ان کو حاصل ہے اور یہ اس کے باوجود ہے کہ علماء تابعین کی بہت بڑی اکثریت لکھنے پر اعتماد کرنے کے بعد حافظہ کے کمزور پڑ جانے کے اندیشہ کی وجہ سے حدیثوں کے لکھنے کو برا سمجھتی تھی بلکہ خود امام زہری اپنی علمی شہرت کے ابتدائی دور میں حدیثیں لکھنے کو برا سمجھتے تھے اور خود بھی اس سے بچتے تھے تا اینکہ خلیفہ وقت امیرالمومنین عمر بن عبدالعزیز نے زہری کو مذکورہ بالا حکم کے تحت اس پر آمادہ کیا۔ اس موضوع پر مزید بحث امام زہری کے عنوان کے تحت آئندہ اوراق میں پڑھیے۔

پھر زہری کے بعد کے دور میں تو تدوین حدیث کا سلسلہ عام ہو گیا (اور تمام اسلامی ممالک میں محدثین نے حدیثیں جمع کرنا لکھنا اور تصنیف کرنا شروع کر دیں) چنانچہ مکہ مکرمہ میں سب سے پہلے ... ابن جریج (۱۵۰) اور ابن اسحٰق (۱۵۱) نے کتابی صورت میں حدیثیں جمع کیں اور مدینہ منورہ میں سعید بن ابی عروبہ (۱۵۶) ربیع بن صبیح (۱۶۰) اور امام مالک (۱۷۹) نے تدوین حدیث کی خدمت انجام دی اور بصرہ میں حماد بن سلمہ (۱۷۶) نے اور کوفہ میں سفیان ثوری (۱۶۱) نے اور شام میں ابو عمرو الاوزاعی (۱۵۶) نے اور واسط میں ہشیم (۱۸۸) نے اور خراسان میں عبداللہ بن المبارک[۱] نے اور یمن میں معمر (۱۵۳) نے اور رے میں جریر بن عبدالحمید (۱۸۸) نے اپنی اپنی احادیث کو کتابی شکل میں جمع اور محفوظ کر دیا۔

اسی طرح سفیان بن عیینہ (۱۹۸) لیث بن سعد (۱۷۵) اور شعبہ بن الحجاج (۱۶۰) نے بھی اپنی اپنی حدیثیں کتابی شکل میں جمع کر دیں۔ یہ تمام ائمہ حدیث ایک ہی زمانہ — دوسری صدی کے نصف آخر — میں ہوئے ہیں اس لئے ان میں سے کسی کے بارے میں بھی تحقیقی طور پر ...... نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں محدث نے سب سے پہلے تدوین حدیث کی خدمت

انجام دی ہے۔

تدوین حدیث میں ان ائمہ حدیث کا طریق کار — خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیز کی ہدایت کے بموجب — ایک ہی تھا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرفوع احادیث کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام کے اقوال — آثار — اور تابعین کے فتوے بھی اپنی مولفات میں جمع کرتے تھے اور ایک ہی کتاب میں مختلف ابواب کی احادیث کو ایک دوسرے کے ساتھ کیف ما اتفق ملا دیتے تھے۔

چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں :-

تدوین حدیث کے متعلق جو کچھ اب تک بیان کیا گیا اس کی صورت صرف یہ تھی کہ مختلف ابواب کی حدیثوں کو کیف ما اتفق ان حضرات نے ایک جگہ جمع کر دیا باقی ایک مسئلہ سے متعلق تمام حدیثوں کو اسی مسئلہ کے عنوان سے باب قائم کر کے اس کے تحت درج کرنا (یعنے بترتیب مسائل و ابواب جمع حدیث) تو اس کی ابتداء تو سب سے پہلے امام شعبی (وفات ۱۰۳ھ) نے کی ہے کیونکہ شعبی سے مروی ہے کہ انھوں نے "طلاق" سے متعلق تمام احادیث یکجا جمع کر کے حسب ذیل الفاظ میں ترجمۃ الباب قائم کیا :- یہ طلاق کا بہت بڑا باب ہے"[۱]

---

[۱] توجیہ النظر ص ۸

امام شعبی (ولادت ۲۱ھ وفات ۱۰۳ھ) قاضی کوفہ کے متعلق مذکورہ بالا روایت نہ صرف حافظ ابن حجر بلکہ اکثر تذکرہ نگار لکھتے چلے آتے ہیں اس سے دو نئے انکشافات سامنے آتے ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ تدوین حدیث سب سے پہلے ابواب فقہیہ پر ہوئی ہے اور یہی قرین قیاس بھی ہے اس لئے کہ فقہاء محدثین کو احکام فقہیہ کے ثبوت کی غرض سے ہر قدم پر حدیث کی ضرورت پیش آتی ہے اس لئے ان حضرات نے احادیث کے ضائع ہونے کے خطرہ کے تحت ... ... جمع نہیں کیا بلکہ احکام فقہیہ کے اثبات و استنباط کی ضرورت سے جمع کیا ہے اسی لئے امام شعبی نے ابواب فقہیہ پر (باقی صفحہ ۲۳۳ پر)

اس کے بعد تیسری صدی آتی ہے۔ تدوین حدیث کا یہ دور سب سے زیادہ روشن اور تابناک دور ہے اور ائمہ حدیث اور ان کی عظیم الشان اور زندۂ جاوید تصانیف کے لئے انتہائی سعادت کا دور ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۲) احادیث کی تدوین کی ہے مگر چونکہ امام شعبی بھی اپنے عہد کے کبار محدثین کی طرح کتابت حدیث کے مقابلہ پر حفظ حدیث کو ترجیح دیتے تھے اور یہی پہلی صدی کے نصف آخر کے محدثین کا معمول تھا اس لئے نہ امام شعبی نے مکتوب احادیث کو لائق توجہ سمجھا اور نہ اس کا اہتمام کیا کہ تمام ابواب فقہیہ پر بالاستیعاب احادیث جمع کر دیں۔ امام ابو حنیفہ (ولادت ۸۰ھ وفات ۱۵۰ھ) اپنے وقت کے مجتہد اعظم ہونے کے علاوہ امام شعبی کے بلا واسطہ شاگرد اور ان کی احادیث و فقہ کے سب سے بڑے محافظ ہیں انھوں نے امام شعبی کے اتباع میں اور فقہی ضرورت کے تقاضہ سے کتاب الآثار میں طہارت سے لیکر آخر تک تمام ابواب فقہیہ کے تحت احادیث و آثار صحابہ و تابعین کو پورے اہتمام کے ساتھ جمع کیا ہے اور امام مالک (۱۷۹ھ) نے کتاب الآثار کو سامنے رکھکر موطا لکھی ہے جس کو عام طور پر ناواقفیت کی وجہ سے ابواب فقہیہ پر سب سے پہلی حدیث کی کتاب کہا جاتا ہے۔

چنانچہ حافظ جلال الدین سیوطی شافعی اپنی کتاب تبییض الصحیفہ فی مناقب ابی حنیفہ میں لکھتے ہیں:

> مسند ابو حنیفہ کے بعض جامعین نے کہا ہے: ابو حنیفہ کے ان مناقب میں سے جن کے اندر وہ منفرد اور یکتا ہیں ایک یہ ہے کہ ابو حنیفہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم شریعت (احادیث و احکام شرعیہ) کو مدون کیا اور فقہی ابواب پر ترتیب دیا ہے پھر ان کے نقش قدم پر چلکر امام مالک نے موطا لکھی ہے بہر حال ابو حنیفہ سے پہلے کسی نے ابواب فقہیہ پر حدیث کی کتاب نہیں لکھی (تفصیل کے لئے دیکھئے مقالہ الکتب المدونۃ فی الحدیث)

(۲) دوسرے یہ کہ اگر چہ حکومتی سطح پر تدوین حدیث کی اولیت کا سہرا تو امام زہری (ولادت ۵۸ھ وفات ۱۲۴ھ) کے سر ہے لیکن بطور خود تدوین حدیث کی اولیت کا فخر امام شعبی اور ان کے بلا واسطہ شاگرد امام ابو حنیفہ کو حاصل ہے اس لئے کہ امام شعبی کا زمانہ امام زہری سے بہت پہلے ہے جیسا کہ (باقی صفحہ ۲۴۴ پر)

اس دور میں "مسانید" کی صورت میں حدیث کی تالیف شروع ہوئی ۔ مسانید کا طرز تالیف یہ ہوتا ہے کہ محدث و مصنف ایک صحابی کی تمام احادیث کو اگرچہ وہ اپنے مضامین و موضوعات کے اعتبار سے متنوع اور مختلف ہی کیوں نہ ہوں ایک ہی باب کے تحت جمع کر دیتا ہے (مثلاً

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۳) ان کی ولادت و وفات کے سنین سے ظاہر ہے نیز خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیز نے ۹۹ھ میں برسر اقتدار آنے کے بعد ہی تدوین احادیث کے احکامات نافذ کئے ہیں اور امام شعبی کی زندگی کا یہ بالکل آخری زمانہ ہے ۱۰۳ھ میں وفات پا گئے ہیں اس لئے ظاہر یہ ہے کہ شعبی کی ابواب فقہیہ پر تدوین حدیث کا زمانہ جس کا ذکر حافظ ابن حجر نے کیا ہے عمر بن عبدالعزیز کے حکم کے تحت زُہری کی تدوین سے بہت پہلے ہے

حقیقت یہ ہے کہ محدثین نے خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیز کے ایماء سے صرف حدیثوں کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے احادیث کو جمع کیا اور لکھا ہے، امام زہری اپنے زمانہ کے سرخیل محدثین میں سے ہیں اس لئے محدثین کا حلقہ امام زہری کو ہی احادیث کا سب سے پہلا مدون جانتا اور کہتا چلا آتا ہے ان حضرات کو تفقہ اور اجتہاد سے اور فقہاء محدثین وائمہ مجتہدین سے سروکار نہیں ہوتا اس لئے نہ وہ امام شعبی کا نام لیتے ہیں نہ امام ابوحنیفہ کا نہ پہلی صدی کے آخری ربع سے تدوین حدیث کے آغاز کا نام لیتے ہیں۔

اور چونکہ علم اسماء الرجال کے مصنفین اور حدیث و محدثین کے تذکرہ نگار عموماً محدثین ہی ہوئے ہیں اس لئے کتب رجال و تذکرہ فقہاء و محدثین کے تذکرہ سے نہ صرف خالی ہیں بلکہ ان حضرات نے تو کان ینظر فی الرای یا کان من اھل الرای کے الفاظ کو بھی جرح کے طور پر استعمال کیا ہے۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ ان حضرات کے بیان کے مطابق نہ صرف امام زہری بلکہ امام مالک کے علاوہ اول کسی بھی دور اول کے مدون حدیث کی کوئی بھی تصنیف اُن کے نام سے دستیاب نہیں صرف تاریخ تدوین حدیث لکھنے والے مصنفین ہی اُن کی طرف تدوین حدیث کی نسبت کرتے ہیں یہ نسبت یقیناً صحیح ہے طول عہد کی وجہ سے یہ مدون کتب مستقل کتابی شکل میں دستیاب نہیں ان کا وجود اس وقت ان کے تلامذہ کی مدون کتب میں ہی ہے، اس کے برعکس امام ابوحنیفہ کی کتاب الآثار مدون شکل میں دستیاب ہے نہ صرف دستیاب بلکہ مطبوع موجود ہے اور یہ کتابیں یقیناً موطا مالک سے پہلے تصنیف ہوئی ہیں مگر نہ ان کتب احادیث کا شمار کتب حدیث میں ہوتا ہے نہ ہی مدونین حدیث کے ادوار ثلاثہ میں ان محدثین کا نام آتا ہے صرف اس لئے کہ یہ اہل رائے تھے۔ حالانکہ متاخرین میں سے تو حافظ ابن حجر نے ان کتابوں کے رجال پر مستقل کتاب لکھی ہے (واللہ اعلم مترجم)

حضرت ابوبکر صدیق سے مروی تمام مختلف النوع مرفوع حدیثیں ایک باب میں اور حضرت ابوہریرہ سے مروی تمام احادیث ایک باب میں علیٰ ہذا القیاس)

سب سے پہلے جن محدثین نے اس طرز پر مسندیں تیار کیں وہ عبید اللہ بن موسیٰ العبسی کوفی (۲۱۳ھ) ہیں، مسدد بصری (۲۲۸ھ) ہیں اور نعیم بن حماد خزاعی (۲۲۸ھ) ہیں

اس کے بعد حفاظ حدیث انہی کبار محدثین کے نقش قدم پر چلتے اور مسندیں تالیف کرتے رہے چنانچہ امام احمد بن حنبل (۲۴۱) نے اپنی مشہور و معروف مسند تالیف کی جو چالیس ہزار احادیث پر حاوی اور سب سے بڑی مسند ہے۔

اسی طرح اسحٰق بن راہویہ (۲۳۸) اور عثمان بن ابی شیبہ (۲۳۹) وغیرہ ائمہ و حفاظ حدیث نے مسندیں تالیف کیں۔

ارباب مسانید کا طریقۂ تالیف — جو پہلے دور کی بہ نسبت فی الجملہ ترقی یافتہ ہے — یہ تھا کہ یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرفوع احادیث کو صحابہ کے اقوال (آثار) اور تابعین کے فتاویٰ سے الگ کر کے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو بترتیب صحابہ اپنی اپنی مسانید میں جمع کرتے اور لکھتے تھے، گویا اس دوسرے دور میں مرفوع احادیث کو موقوف احادیث و آثار سے الگ کر دیا گیا جس کو اصطلاح میں تجرید الاحادیث من الآثار کہتے ہیں۔ اب کسی حدیث کو مجموعۂ احادیث میں سے تلاش کرنا فی الجملہ آسان ہو گیا اس لحاظ سے کہ جس صحابی سے مطلوب حدیث مروی ہو اس کی مسانید میں تلاش کر لیا جائے مل جائے گی نیز ان مولفات کی فہرست بنانا بھی ممکن ہو گیا اس لئے تدوین حدیث کا یہ پہلا ترقی یافتہ قدم ہے)

لیکن ارباب مسانید کسی صحابی سے مروی احادیث کو یکجا جمع کرتے وقت صحیح اور غیر صحیح احادیث میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کرتے تھے بلکہ ہر طرح کی احادیث جو اس صحابی سے مروی ہوتیں اس کی مسانید میں یعنی اس کے نام کے تحت جمع کر دیتے تھے اس لئے ان مسانید سے استفادہ کرنے والے طالب حدیث کو کسی حدیث کی صحت کا حال معلوم کرنے میں بیحد مشقت اٹھانی پڑتی تھی اس لئے کہ ہر طالب حدیث کے لئے اس مخلوط مجموعہ احادیث میں سے صحیح احادیث کی تشخیص و تعیین کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا تھا بجز اس کے کہ یا وہ خود نقاد حدیث کے فن کا ماہر ہو

(اور صحیح و غیر صحیح حدیث میں فرق و امتیاز کرنے کی اہلیت رکھتا ہو جو کم ہی کسی کو نصیب ہوتی ہے) یا اگر وہ خود اس نقد حدیث کے فن سے واقف نہ ہو تو وہ اُن ائمہ فن سے دریافت کرے جو کسی حدیث کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کا فیصلہ کر سکتے ہیں اور ان کا فیصلہ حجت ہو ظاہر ہے کہ ہر ہر حدیث کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کا پتہ چلانے کے لئے اتنے پاپڑ بیلنے اور ائمہ نقد حدیث سے مراجعت کرنا بیحد دشوار ہے) چنانچہ عموماً ان ائمہ فن سے دریافت کرنے کا موقعہ میسر نہ آنے کی وجہ سے ان مسانید کی حدیثیں عام طلبہ حدیث کے لئے مجہول الحال (اور ناقابل استفادہ) رہ جاتی تھیں۔

یہی وہ صورت حال تھی جس نے امام المحدثین گوہر شب چراغِ سنت، امام محمد بن اسمٰعیل بخاری (۱۹۴-۲۵۶) کو (اپنے استاذ محترم حافظ اسحٰق بن راھویہ کے توجہ دلانے پر اور خواب میں صاحب سنت نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے بشارت ملنے پر) حدیث کی جمع و تدوین میں ایک نیا طریق کار اختیار کرنے پر آمادہ کیا (اور دین کی حفاظت کا ذمہ لینے والے رب العالمین نے ایسا موفق اور کامیاب بنایا کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ کے لقب سے سرفراز فرما کر رہتی دنیا تک کے لئے زندہ جاوید بنا دیا

اور وہ طریق کار (اور جمع و تدوین حدیث کا دوسرا ترقی یافتہ قدم) یہ ہے کہ امام بخاری نے اپنی تالیف میں صرف کھری اور نکھری ہوئی صحیح ترین احادیث کو لیا اور باقی رطب و یابس احادیث کو (جن کی صحت میں ذرا سا بھی شبہ ہوا) چھوڑ دیا (نیز صرف مرفوع احادیث کو لیا اور صحابہ و تابعین کے آثار و اقوال کو چھوڑ دیا اور اس طرح چھ لاکھ صحیح احادیث میں سے تقریباً ڈھائی ہزار حدیثوں کو اپنی کتاب میں درج کیا گویا تجرید الاحادیث من الآثار تو دوسرے دور تدوین میں ہو چکی تھی تجرید الصحیح من غیر الصحیح اس تیسرے دور تدوین میں ہو گئی) اور اس طرح امام بخاری نے اپنی کتاب تالیف فرمائی جس کا پورا نام یہ ہے۔

الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ

امام بخاری کے ہی ہمعصر اور تلمیذ رشید، امام مسلم بن الحجاج (۲۰۴-۲۶۱) نے

بھی اپنے شیخ اور استاذ کا اتباع[۵] کیا۔

ان دونوں اماموں کا بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ایک طالب حدیث کے لئے ایسا راستہ ہموار کر دیا کہ وہ بغیر کسی پوچھ گچھ اور چھان بین کے آنکھیں بند کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث تک پہونچ سکتا ہے۔

صحیحین — صحیح بخاری اور صحیح مسلم — کے منظر عام پر آجانے کے بعد بہت سے أئمہ نے تدوین حدیث میں ہر دو اماموں کا اتباع کیا چنانچہ اسی زمانہ (تیسری صدی کے نصف آخر) میں ان دونوں کتابوں کے بعد حدیث کی بہت سی کتابیں وجود میں آئیں جن میں سے اہم کُتب حدیث (جن کو صحیحین کے ساتھ ملا کر صحاح ستہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے) حسب ذیل ہیں:

(۱) سنن ابی داؤد (وفات ۲۷۵ھ) (۲) سنن نسائی (وفات ۳۰۳ھ)

(۳) جامع ترمذی (وفات ۲۷۹ھ) (۴) سنن ابن ماجہ (وفات ۲۷۳ھ)

ان چاروں ائمہ حدیث نے (اپنی اپنی شرائط کے مطابق) اپنی تصانیف میں سابق ائمہ کی بیشتر تصانیف کو جمع کر دیا ہے کیونکہ یہ مصنفین، محدثین کے معروف طریق کے مطابق ائمہ متقدمین (کے بواسطہ یا بلاواسطہ شاگرد اور اُن) کی احادیث کے راوی تھے۔

اس کے بعد چوتھی صدی شروع ہوئی۔ اس صدی کے محدثین نے تیسری صدی کے محدثین کے تصنیفی کاموں یعنی جمع و تدوین حدیث پر بجز معمولی استدراکات اور اضافوں کے اصل جمع و تدوینِ حدیث میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ (اس لئے کہ صحیح حسن اور ضعیف ہر قسم کی احادیث تیسری صدی کے مذکورہ بالا مصنفین اپنی دسترس کے بموجب صحاح ستہ

---

[۵] اور اصلاحی قدم یہ اٹھایا کہ پوری کتاب صحیح مسلم میں بجز مرفوع احادیث اور ان کی اسانید کے اور ایک لفظ بھی..... نہیں آنے دیا حتیٰ کہ اصل کتاب صحیح مسلم میں تراجم الابواب تک نہیں ہیں نیز ہر حدیث کے متن اور سند کے اعتبار سے امام مسلم کے نزدیک جتنے صحیح طریق تھے سب ایک جگہ جمع کر دیئے۔ اس اصلاحی قدم کا بے نظیر اور بیش بہا فائدہ وہی لوگ جان سکتے ہیں جنہوں نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو کسی ایسے استاد سے پڑھا ہو جو فی الواقع شیخ الحدیث کہلانے کا اہل ہو۱۲ مترجم

میں جمع کر چکے تھے)

چوتھی صدی کے مصنفین نے جمع و تدوین حدیث کے سلسلہ میں جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ انسے پہلے محدثین جو احادیث اپنی مصنفات میں جمع کر گئے تھے انہی کو (کسی خاص ترتیب وتہذیب کے ساتھ اپنی تصانیف میں جمع کر دیا اور انہی قدماء مصنفین کے نقد احادیث ورجال پر انھوں نے اعتماد کیا (اس لئے کہ رجال ورواۃ حدیث وہی تھے ان کے احوال واوصاف وہی تھے جن کی چھان بین متقدمین کر چکے تھے) اور ان کی جرح وتعدیل، توثیق و تضعیف کے بارے میں بھی ائمہ متقدمین فیصلے کر چکے تھے اب اس پر اضافہ کی کوئی صورت نہ تھی) اضافہ صرف اتنا کیا کہ ایک ایک حدیث کی کئی کئی سندیں اور متن کے اعتبار سے الفاظ وتعبیرات کے فرق واختلاف یا کمی بیشی کی صورتیں بیان کر دیں۔

اس چوتھی صدی کے مشہور ومعروف مصنفین اور ائمہ حدیث یہ ہیں۔

(۱) امام سلیمان بن احمد طبرانی (۳۶۰ھ)۔ طبرانی نے تین معجمیں تالیف کیں۔

(۱) معجم کبیر۔ اس میں (مسانید کے طرز پر) صحابہ کی احادیث ان کے ناموں کے تحت حروف تہجی کی ترتیب سے جمع کی ہیں اس مجموعہ میں پچیس ۲۵ ہزار پانچسو احادیث ہیں

(۲) معجم اوسط

(۳) معجم اصغر۔ ان دونوں مجموعوں میں اپنے مشائخ کی احادیث کو ان کے ناموں کے تحت حروف تہجی کے اعتبار سے جمع کیا ہے۔

(۲) چوتھی صدی کے دوسرے لائق ذکر محدث امام دارقطنی (۳۸۵ھ)۔ دارقطنی نے

لہ مثلاً ایک حدیث کی وہ سند اور متن بھی ذکر کیا جو بخاری میں تھا اور وہ بھی جو مسلم میں تھا اور وہ بھی جو صحاح ستہ اور کتب متداولہ کے علاوہ کتب حدیث میں تھا علی ہذا القیاس اس تکثیر طرق کا فائدہ یہ ہوا کہ ہر حدیث کی سندوں اور متنوں کے فرق اور تفاوت سامنے آ گئے اس سے حدیث کا مفہوم ومصداق سمجھنے اور حکم کی نوعیت معلوم کرتے ہیں نیز مختلف ومتعدد سندوں کے اعتبار سے حدیث کی صحت یا ضعف کا حکم لگانے میں بہت بڑی آسانی ہو گی)

اپنی مشہور و معروف کتاب سنن دارقطنی میں عبادات و احکام شرعیہ کی ترتیب کے اعتبار سے اپنی احادیث جمع فرمائی ہیں۔

ان کے علاوہ اس دور کے قابل ذکر مصنف (۱) ابن حبان بُستی (۳۵۴ھ) میں (۲) ابن خزیمہ (۳۱۱ھ) میں اور امام ابوجعفر طحاوی (۳۲۱ھ) ہیں۔ مدونین حدیث کی ان مساعی جلیلہ کے ذریعہ تین صدیوں[۱] میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث کی جمع و

---

[۱] مختصر تاریخ تدوین و کتابت حدیث و ادوار تدوین

(۱) رسول اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بعض شائقین جمع و حفظ حدیث نے یا کمزور حافظہ والے صحابہ نے آپ کی اجازت سے محض اپنی یادداشت کے لئے اور بوقت تردد مراجعت اور اطمینان کے لئے اپنی مرویات کو لکھا ہے اعتماد اور مدار روایت صرف حافظہ پر تھا۔

(۲) عہد صحابہ — نصف قرن اول — میں مذکورہ بالا مقصد کے تحت ہی اپنی اپنی مرویات کو لکھنے والوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے جو لوگ عہد نبوت میں حدیثیں نہیں لکھتے تھے انھوں نے بھی بغرض تثبت و احتیاط اپنی مرویات کو لکھ لیا تاکہ ضرورت کے وقت مراجعت کرسکیں چنانچہ روایت حدیث کرتے وقت کہیں تردد ہوتا تو اپنے مکتوب ذخیرہ کی مراجعت کرکے اطمینان کرلیتے۔

(۳) قرن اول کے نصف دوم میں علاوہ حفظ و تثبت کے، فقہاء محدثین نے فقہی احکام کے اثبات و استنباط کی غرض سے مسائل فقہیہ سے متعلق احادیث کو ابواب فقہیہ کی ترتیب سے لکھنا شروع کیا ہے مگر اعتماد اور مدار روایت صرف حافظہ پر تھا اپنے تلامذہ کے سامنے زبانی حدیثیں بیان کرتے اور وہ ان سے سُنکر زبانی ہی یاد بھی کرتے تھے محدثین کی اکثریت حافظہ کو نقصان پہونچ جانے کے خطرہ کی بنا پر لکھنے کو پسند نہیں کرتی تھی بلکہ عام طور پر لکھنے سے منع کرتے تھے۔

(۴) آغاز قرن دوم میں حاملین حدیث یعنے صحابہ کرام کے یکے بعد دیگرے دُنیا سے اُٹھ جانے کے بعد حدیثوں کے دُنیا سے اُٹھ جانے کے خطرہ کی بنا پر خلیفہ راشد عمر بن عبد العزیز نے ۱۰۰ھ میں عالم اسلامی کے تمام حکمرانوں کو اور حاملین حدیث کبار تابعین کو اپنے اپنے شہروں اور علاقوں کی احادیث کو فوری طور پر جمع کرنے اور لکھوا کر بھیجنے کے احکام نافذ کئے چنانچہ تمام ممالک اسلامیہ میں محدثین نے

(باقی صفحہ ۲۴۰ پر)

تدوین اور صحیح و غیر صحیح احادیث میں فرق و امتیاز کا عظیم کام بحمداللہ پایۂ تکمیل کو پہونچ گیا
بعد کی صدیوں کے محدثین و ائمہ حدیث نے صرف کتب صحاح پر استدراکات (اضافے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۹) سرکاری حکم کے تحت خواہی نخواہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث، کبار صحابہ کے تمام آثار اور کبار تابعین کے تمام اقوال جہاں بھی اور جس کے پاس بھی ملے سب جمع کر لیے اور تمام مرفوع و موقوف ہر قسم کی حدیثیں بغیر کسی خاص ترتیب کے سینوں اور زبانوں سے سفینوں اور بیاضوں میں منتقل کر لی گئیں اور لکھ لی گئیں۔

یہ حکومتی سطح پر جمع و تدوین حدیث کا پہلا دور ہے جس میں سرکاری کے حکم کے تحت محدثین کا مطمح نظر صرف حدیثوں کو جمع کر لینا اور لکھ لینا تھا اور بس، قرن دوم دوسری صدی میں عام طور پر محدثین نے اسی قسم کے غیر مرتب مجموعے تیار کئے صرف فقہاء محدثین اور ائمہ مجتہدین نے فقہی ابواب کی ترتیب پر احادیث کو جمع کیا جس میں سے صرف دو کتابیں آج دنیا میں مطبوع موجود ہیں امام ابو حنیفہ کی کتاب الآثار اور امام مالک کا موطا۔

ظاہر ہے کہ ان غیر مرتب مکتوب، احادیث کی نہ کوئی فہرست بن سکتی تھی نہ ہی ضرورت کے وقت کسی صحابی کی کسی خاص حدیث کو یا کسی خاص موضوع سے متعلق کسی خاص حدیث کو ان غیر مرتب کتب حدیث سے نکالا جا سکتا تھا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحابہ کے آثار اور تابعین کے اقوال سے جدا کی جا سکتی تھیں، علاوہ ازیں تدوین حدیث کے اس دور اول میں تدوین کا مقصد تمام احادیث کو لقبیہ کتابت لے آنا یعنے لکھ لینا تھا اس لئے اس دور تدوین میں رطب و یابس ہر قسم کی احادیث صحیح بھی اور غیر صحیح بھی سب لکھ لی گئی تھیں اس لئے بھی یہ مکتوب مجموعے ناقابل استفادہ تھے

لہذا سب سے پہلے احادیث کو آثار صحابہ اور اقوال تابعین سے الگ کرنے اور بوقت ضرورت کسی خاص حدیث کو نکالنے کی غرض سے احادیث کو بترتیب صحابہ از سر نو مدون کیا گیا یہ تدوین حدیث کا دوسرا دور اور ارتقاء تدوین حدیث کا پہلا دور ہے جو دور مسانید کہلاتا ہے جس کی تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں۔

ان مسانید کی فہرست تو بن سکی مگر جب تک کسی حدیث کے روایت کرنے والے صحابی کا نام

(باقی صفحہ ۲۴۹ پر)

کیے ہیں مثلاً ابو عبداللہ الحاکم نیشاپوری (وفات ۴۰۵ھ) کی مستدرک حاکم۔ ابو عبداللہ الحاکم نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث پر اضافے کیے ہیں حاکم کی تحقیق کے اعتبار سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۰) معلوم نہ ہو اس وقت تک ان مسانید میں سے اس کا نکالنا ممکن نہ تھا نیز کسی خاص موضوع یا مسئلہ سے متعلق تمام احادیث کو معلوم کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ اور کسی حدیث کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کا حال تو ان مسانید سے معلوم ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

اس لیے ائمہ حدیث نے صحابہ کے نام سے احادیث کو ترتیب دینے کے بجائے موضوعات اور مسائل کے اعتبار سے، ان تمام مسانید کی شکل میں مدون احادیث کو از سر نو مدون کیا نیز اپنی تصانیف میں صحیح حسن اور ضعیف کے فرق کو بھی ملحوظ رکھا کسی نے صرف صحیح حدیثوں کو لیا اور باقی کو چھوڑ دیا جیسے صحیح بخاری، صحیح مسلم، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان وغیرہ کسی نے صحیح کے ساتھ حسن کو بھی لیا صرف ضعیف کو چھوڑ دیا جیسے سنن نسائی، سنن دار قطنی، سنن دارمی وغیرہ اور کسی نے صحیح اور حسن کے ساتھ ساتھ قابل عمل ضعیف احادیث کو بھی وجہ ضعف کی تصریح اور نشاندہی کے بعد اپنی کتاب میں ذکر کر دیا جیسے سنن ابو داؤد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ وغیرہ

یہ تدوین حدیث کا تیسرا دور اور ارتقاء تدوین کا دوسرا دور ہے اس دور کی مدون کتابیں صحاح ستہ کے نام سے موسوم اور بکثرت دستیاب ہیں۔ اس دور میں تمام احادیث موضوعات اور مسائل کے اعتبار سے مدون ہو گئیں اور کسی حدیث کے صحیح، حسن یا ضعیف ہونے کا حال معلوم کرنا بھی آسان ہو گیا نہرستیں بھی مکمل طور پر بن گئیں اب ان کتابوں میں سے جس موضوع سے متعلق آپ حدیثیں نکالنا چاہیں بآسانی نکال سکتے ہیں۔

ان محدثین میں سے بعض حضرات نے اپنی کتاب میں تمام دینی موضوعات — عقائد، تفسیر، احکام، سیر، (غزوات)، آداب (اخلاق) فتن، اشراط (علامات قیامت) مناقب سے متعلق احادیث جمع کی ہیں ایسی کتابوں کو جامع کہتے ہیں جیسے جامع صحیح بخاری، جامع ترمذی وغیرہ اور بعض حضرات نے صرف احکام سے متعلق احادیث جمع کی ہیں ان کو سنن کہتے ہیں جیسے سنن ابو داؤد، سنن نسائی وغیرہ۔

ان مصنفین نے چونکہ اپنی اپنی تحقیق کے مطابق صحیح اور غیر صحیح کے علیحدہ علیحدہ معیار قائم کیے ہیں

(باقی صفحہ ۲۴۲ پر)

مستدرک کی تمام احادیث امام بخاری اور امام مسلم کی شرائط صحت حدیث کے مطابق ہیں اور صحیح ہیں اگرچہ شیخین نے اپنی کتابوں ــ صحیحین ــ میں ان کو کسی بھی وجہ سے درج نہیں کیا ہے۔

ائمہ حدیث نے مستدرک کی احادیث کے ایک حصہ کے متعلق تو تسلیم کیا ہے کہ واقعی شیخین کی شرائط کے مطابق ہیں اور صحیح ہیں اور ایک حصہ کے بارے میں حاکم کی رائے سے اختلاف کیا ہے وہ ان کو شیخین کے معیار پر صحیح نہیں مانتے۔

(۲) تحریک نقد حدیث کا دوسرا فائدہ علم مصطلح الحدیث

اس مقدس تحریک ــ نقد حدیث ــ کے علمی اور فنی نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ تحریک وضع حدیث کے مقابلہ اور مقاومت کے دوران حدیث کے علمی اصول اور فنی ضوابط مدون ہو گئے جو ائمہ حدیث نے حدیث اور غیر حدیث کے اور صحیح اور غیر صحیح کے درمیان فرق و امتیاز کرنے کی ضرورت کے تحت تجویز کئے اور انھوں نے تمام احادیث کو مذکورہ سابق تین قسموں پر تقسیم کر دیا اور ان اقسام ثلاثہ سے متعلق جملہ تفصیلات ــ حدود و تعریفات، شرائط و احکام ــ سب منضبط ہو گئے اور ہم ایک ایسے مستقل علم علم مصطلح الحدیث کے مالک بن گئے جس کے ذریعہ ہم کسی بھی علم و فن کی روایات کی صحت کو علمی اور فنی طریق پر پرکھ سکتے ہیں اور یہ ایسے صحیح معیاری اور تحقیقی اصول اور قواعد و ضوابط ہیں کہ آج تک دنیا فن تاریخ

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۲۴۱) اور اس کے مطابق صحیح احادیث کا انتخاب کیا ہے اس لئے کسی حدیث کے صحیح ہونے نہ ہونے کے بارے میں ان محدثین میں اختلاف ہو جانا ناگزیر ہے علاوہ ازیں ان ارباب صحاح نے خود اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ہم نے کتاب کے حد سے زیادہ طویل ہو جانے کے خوف سے بہت سی صحیح احادیث کو بھی چھوڑ دیا ہے۔

اس لئے تدوین حدیث کے چوتھے اور ارتقاء تدوین کے تیسرے دور میں ان مصنفین کے بعد آنے والے محدثین نے ان کی متروک اور چھوڑی ہوئی احادیث کا از سر نو جائزہ لیا اور انہی حضرات کے قائم کردہ معیار

(باقی صفحہ ۲۴۵ پر)

روایات وواقعات کو جانچنے پرکھنے کے جن علمی اور معیاری اصول سے آشنا ہوئی ہے اُن سب کی بہ نسبت یہ اصول زیادہ صحیح بھی ہیں معیاری بھی ہیں اور محکم وقابل وثوق بھی ہیں بلکہ ہمارے علماء حدیث رحمہم اللہ ہی دنیا میں وہ پہلے ناقدین محققین ہیں جنہوں نے سب سے پہلے تنقید روایات کے قواعد وضوابط کو ایسی محکم اور قابل وثوق علمی بنیادوں پر مدون کیا ہے کہ اس کے بعد مزید احتیاط وتثبت کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر علم وفن میں علماء سلف نے علماء حدیث کے نقش قدم پر چل کر اور انہی کے ڈالے ہوئے خطوط ـــ داغ بیل ـــ پر مختلف اسلامی علوم مثلاً تاریخ، فقہ، تفسیر، لغت اور ادب وغیرہ کے قواعد وضوابط بنائے ہیں چنانچہ قرون اولی کے مصنفین کی تصانیف میں ہر بحث اور ہر مسئلہ کو اس کے قائل تک متصل سند کے ساتھ پہونچایا اور نقل کیا جاتا ہے (مثلاً علم نحو میں کسی مسئلہ یا رائے کو سیبویہ سے نقل کریں گے تو ناقل سے لیکر سیبویہ تک پوری سند کے ساتھ، نہ یہ کہ سیبویہ نے یہ کہا ہے)

یہاں تک کہ خود علماء حدیث (محدثین) کی کتابوں کو ان کے تلامذہ متصل اور مسلسل سند کے ساتھ نسلاً بعد نسل نقل کرتے چلے آتے ہیں چنانچہ ہم بغیر کسی شک وشبہ کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ مثلاً امام بخاری رحمہ اللہ کی کتاب صحیح بخاری جو آج ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے (اور ہم پڑھتے پڑھاتے ہیں) وہ قطعاً ویقیناً امام بخاری رحمہ اللہ ہی کی تالیف ہے (حتی کہ ہم اس پر قسم اٹھا سکتے ہیں) کیونکہ اس کتاب کو نسلاً بعد نسل امام بخاری کے زمانہ سے (طباعت کتب حدیث کے عہد تک) اُن سے متصل سند کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔

یہ وہ امتیازی شان ہے جو روئے زمین کی کسی بھی قوم کے علماء کی تصنیف میں مطلق

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۲) (شرائط) پر متروک احادیث میں سے بہت سی احادیث کو صحیح حدیثوں میں اضافہ کیا یہ مستدرکات اور زوائد کا دور کہلاتا ہے تقریباً ہر صحیح احادیث کی کتاب پر مستدرکات لکھے گئے ہیں جس کا کچھ حال آپ کتاب میں پڑھ چکے ہیں ان کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور کتاب مستدرک حاکم ہے از مترجم ؎ بہ حاشیہ صفحہ ۲۴۴ پر دیکھئے

نہیں پائی جاتی حتٰی کہ ان کی مقدس آسمانی کتابیں — توریت و انجیل تک بھی روایت کی اس صورت (اور ثبوت و استناد کی اس قطعیت) سے محروم ہیں۔

دورِ حاضر کے ایک تاریخ کے محقق عالم نے تاریخی روایات وواقعات کے جانچنے اور پرکھنے کے اصول پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے اور اس کتاب میں اُنھوں نے تاریخی روایات وواقعات کے پرکھنے میں علم اصول حدیث کے اصول اور قواعد وضوابط پر اعتماد کیا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ تاریخی روایات کی صحت کا پتہ چلانے کے لئے صحیح ترین علمی اور تحقیقی جدید معیار اور طریقہ یہی ہے ۱؎ (یعنے عہد حاضر میں تحقیق وتنقید کے تمام جدید طریقوں سے زیادہ صحیح اور قابل اعتماد طریقہ یہی ہے جو محدثین نے روایت حدیث کے سلسلہ میں اختیار کیا ہے)

مباحث علم مصطلح الحدیث

علم مصطلح الحدیث :-

(۱) حدیث کی تین قسمیں قرار دیتا ہے صحیح، حسن، ضعیف پھر ان میں سے ہر ایک کی متعدد قسمیں تجویز کرتا ہے (جیسا کہ آپ اجمالاً پڑھ چکے ہیں)۔

(۲) راوی اور مروی (یعنے اصل روایت اور اس کے نقل کرنے والے) سے متعلق بہت سی شرطیں بیان کرتا ہے جن کا پایا جانا مطلوب یعنے ضروری ہوتا ہے۔

(۳) روایتوں میں جو علل (خفی عیوب)، شذوذ (تفرد) اور اضطراب (متن یا سند میں اختلاف) وغیرہ مانع صحت عیوب پیدا ہو جاتے ہیں ان کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

(۴) وہ وجوہات و اسباب علیحدہ بیان کرتا ہے جن کی بنا پر روایتوں کو رد کیا جاتا ہے اور وہ وجوہ و اسباب علیحدہ بیان کرتا ہے جن کی بنا پر روایتوں کو قبول کرنے (اور صحیح تسلیم کرنے) میں توقف کیا جاتا ہے تا آنکہ دوسری روایات یا قرائن سے ان کی تائید و تقویت کا

۱؎ اس کتاب کا نام بھی مصطلح التاریخ ہے اس کے مصنف آسد رستم جامعہ امریکہ بیروت میں تاریخ کے استاد (پروفیسر) رہ چکے ہیں۔

۲؎ چنانچہ موجودہ مطبوعہ نسخہ امام بخاریؒ کے مشہور ترین شاگرد حافظ محمد بن یوسف الفربری متوفی ۳۲۰ھ نے حرفاً حرفاً سنا ہے اور صدہا شاگردوں کے سامنے پوری کتاب کو امام بخاری سے روایت کیا ہے اسی طرح

(باقی صفحہ ۲۴۴ پر)

سامان نہ میسر آجائے۔

(۵) علم مصطلح الحدیث اس امر کی تفصیل بھی بیان کرتا ہے کہ راوی نے اپنے شیخ سے حدیث کس صورت میں سنی اور حاصل کی (یعنی حدیث استاد نے پڑھی تھی اور شاگرد نے سنی تھی یا اس کے برعکس شاگرد نے پڑھی تھی اور استاد نے سنی تھی نیز وہ اس وقت اکیلا تھا یا اور شرکاء درس بھی موجود تھے) پھر اس شاگرد نے حدیث کو زبانی یاد رکھا یا لکھا بھی تھا ہر دو صورتوں میں اپنے شاگردوں کے سامنے بیان کرنے تک کس طرح محفوظ رکھا۔

(۶) محدث (حدیث بیان کرنے والے) اور طالب حدیث کے آداب بھی اس علم میں بیان کئے جاتے ہیں (کہ محدث کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث بیان کرنے کے وقت اور شاگرد کو حدیث حاصل کرنے کے وقت کس عقیدت و احترام، طہارت و نظافت اور خلوص نیت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے)

ان کے علاوہ اور تمام متفرق مباحث و تفصیلات اور قواعد و ضوابط جو پہلی تین صدیوں کے علماء حدیث کے ذہنوں میں محفوظ اور معمول بہ تھے (یعنی گو یہ تمام مباحث اور قواعد و ضوابط فنی طریق پر مدون اور کتابی صورت میں مرتب تو نہ تھے مگر محدثین کے حلقوں میں رائج تھے اور پوری پابندی کے ساتھ اُن پر عمل کیا جاتا تھا) اس کے بعد دور تدوین علوم ہیں جیسے اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۴) حافظ فربری کے شاگردوں میں سے ابو محمد سرخسی متوفی ۳۸۱ھ نے حافظ فربری سے اپنے شاگردوں کے سامنے روایت کیا ہے علیٰ ہذا القیاس ہر صاحب نسخہ اپنے شیخ سے متصل سند کے ساتھ سنتا اور اپنے شاگردوں سے روایت کرتا چلا آتا ہے درمیان میں کہیں بھی یہ سلسلہ سند نہیں ٹوٹتا حتیٰ کہ اگر آج کوئی شخص بغیر کسی مستند شیخ سے صحیح بخاری کو پڑھے ہوئے محض اپنے ذاتی مطالعہ سے صحیح بخاری کو پڑھ لے تو اس کو صحیح بخاری کی کسی حدیث کو امام بخاری سے روایت کرنے کا حق نہیں جب تک کہ وہ کسی مستند (صاحب سند) شیخ سے پوری صحیح بخاری یا اس کا کچھ حصہ پڑھ کر اس شیخ کے واسطہ سے صحیح بخاری کی احادیث روایت کرنے کی اجازت نہ حاصل کرے۔ یہی حال باقی تمام کتب حدیث کا ہے۔ مشائخ برصغیر ہند و پاکستان کی اسانید کتب حدیث کے لئے مطالعہ کیجئے (باقی صفحہ ۲۴۶ پر)

تمام اسلامی علوم فنی طریق پر کتابی شکل میں رفتہ رفتہ مدون ہوئے ہیں اسی طرح اس فن کو بھی علماء حدیث نے ایک مستقل فن کی صورت میں مدون و مرتب کیا ہے۔ (اور اس پر کتابیں لکھی ہیں)۔[۵]

آغاز تصنیف و تالیف

اس علم مصطلح الحدیث کی بعض مباحث سے متعلق سب سے پہلے امام بخاری علیہ الرحمہ کے شیخ حافظ علی بن مدینی (متوفی ۲۳۴ھ) نے نقش اول کے طور پر ایک کتاب تالیف کی ہے جیسا کہ خود مصنفین کتب حدیث امام بخاری ۲۵۶ھ، امام مسلم ۲۶۱ھ اور امام ترمذی ۲۷۹ھ نے جستہ جستہ مباحث پر علیحدہ علیحدہ چھوٹے چھوٹے رسالے (کتابچے) لکھے ہیں۔ لیکن ان حضرات نے اس علم کے تمام مباحث کو یکجا کسی ایک کتاب میں جمع نہیں کیا، سب سے پہلے امام حدیث جنہوں نے اس علم پر ایک ایسی جامع علمی تصنیف لکھی جس میں اس علم کے تمام ابواب و مباحث کو جمع کر دیا گیا ہے وہ قاضی ابو محمود الرامہرمزی (۳۶۰) ہیں جن کی کتاب کا نام المحدث الفاصل بین الراوی والسامع ہے۔ لیکن رامہرمزی بھی کافی حد تک مباحث فن کو جمع کرنے کے باوجود اس فن کے تمام ابواب و مباحث کو بالاستیعاب اپنی کتاب میں بیان کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ ۱۲ ماہن مرزی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۵ سے آگے) الیانع الجنی لاسانید الشاہ عبد الغنی۔

درحقیقت یہ حفاظت اللہ تعالیٰ کے وعدے وانا لہ لحافظون کا ایفاء اور خاتم انبیا صلی اللہ علیہ وسلم کا زندہ معجزہ اور اسلام کے آخری دین الٰہی ہونے کا قطعی ثبوت ہے ۱۲ مترجم

[۵] یعنے چوتھی صدی میں علم مصطلح الحدیث کی تدوین اور اس پر تصنیف و تالیف کا آغاز ہونے سے یہ توہم ہرگز نہ ہونا چاہیئے کہ یہ علم قرون اولیٰ میں موجود نہ تھا بلکہ چوتھی صدی کی پیداوار ہے، اس لئے کہ نہ صرف علم مصطلح الحدیث بلکہ اور تمام اسلامی علوم کی تدوین اور اس پر تصنیف و تالیف بھی اسی صدی میں ہوئی ہے حالانکہ وہ سب علوم روز اول سے موجود اور معمول رہے ہیں۔ کسی بھی علم و فن کے کتابی صورت میں مدون نہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ علم اور اس کے قواعد و ضوابط، اصول و مباحث کا وجود دور تدوین سے پہلے نہ تھا ورنہ تو تمام قدیم ترین مسلّم علوم — تاریخ، ادب، شعر، صرف و نحو، معانی و بیان وغیرہ سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ ۱۲ مترجم

کے بعد ابو عبد اللہ الحاکم نیشاپوری (۴۰۵ھ) آتے ہیں اور اس علم مصطلح الحدیث پر معرفۃ علوم الحدیث نامی مشہور و معروف کتاب تصنیف کرتے ہیں یہ نقش ثانی ہے جو نقش اول یعنے رامہرمزی کی کتاب سے اگرچہ بہتر اور مباحث فن پر زیادہ حاوی ہے لیکن حاکم بھی فنی تہذیب و تنقیح اور ضبط و ترتیب کو ملحوظ رکھنے میں کامیاب نہیں ہوئے (یعنے مباحث منتشر اور پراگندہ ہیں) حاکم کے بعد ابو نعیم الاصفہانی (۴۳۰ھ) حاکم کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور حاکم کی کتاب پر مستخرج (اضافات و زیادات) لکھتے ہیں اس کے باوجود اس فن پر تصنیف و تالیف کا کام کرنے والے مصنفین کے لئے بہت کچھ چھوڑ جاتے ہیں (یعنے ایک باضابطہ اور مرتب و مہذب فن کی حیثیت سے . . . . . . بہت کچھ کام کرنا باقی رہ جاتا ہے) ان کے بعد خطیب بغدادی (۴۶۳ھ) نے اس میدان میں قدم رکھا اور روایت حدیث کے قواعد و ضوابط یعنے علم مصطلح الحدیث پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام الکفایہ رکھا اور آداب روایت حدیث پر ایک علیحدہ کتاب لکھی جس کا نام الجامع لآداب الشیخ والسامع رکھا، اسی طرح مصطلح الحدیث کے مختلف فنون میں سے ہر ہر فن پر علیحدہ علیحدہ[1] کتابیں تصنیف کیں۔ خطیب کے بعد قاضی عیاض (۵۴۴) اس میدان میں اُترے اُنھوں نے اپنی کتاب الالماع میں خطیب بغدادی کی مصنفہ علیحدہ علیحدہ کتابوں کو سامنے رکھکر انھیں یکجا جمع کرنے کی کوشش کی۔ قاضی عیاض کے بعد اس میدان کے مردِ میدان شیخ حافظ تقی الدین ابو عمرو عثمان بن الصلاح شہرزوری دمشقی (۶۴۲) آتے ہیں اور اپنی شہرۂ آفاق کتاب مقدمۃ ابن الصلاح، علم مصطلح الحدیث کے تمام فنون پر حاوی اور جامع کتاب تصنیف کرتے ہیں۔ لیکن ابن الصلاح نے یہ کتاب مدرسہ اشرفیہ دمشق میں اپنے تلامذہ کو سبقاً سبقاً املا کرائی ہے اس لئے اس کی ترتیب جیسا کہ چاہیئے محکم اور منقح نہ ہو سکی تاہم یہ کتاب متقدمین کی کتابوں میں علم مصطلح الحدیث کے جو مباحث پھیلے ہوئے اور . . . . . .

---

[1] یعنے خطیب بغدادی نے افادہ اور استفادہ کے نقطہ نظر سے اس بحر ناپیدا کنار کو کسی ایک ظرف میں سمونے کی کوشش کرنے کے بجائے یہ بہتر اور مفید تر سمجھا کہ ہر حصہ اور ہر شعبہ پر علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھدی جائیں آنیوالے مصنفین و مولفین انہی علیحدہ علیحدہ کتابوں کو بآسانی یکجا کرلیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ۱۲ مترجم

منتشر تھے ان سب پر حاوی ضرور ہے (ترتیب گو فنی نہیں ہے) اسی لئے ابن الصلاح کا یہ مقدمہ اس فن کے تمام شائقین کا مرکز اہتمام و توجہ بن گیا ہے نہ صرف یہ بلکہ اس فن کے ماہرین نظم و نثر میں مقدمہ ابن الصلاح کی شرحیں لکھنے پر ٹوٹ پڑے چنانچہ عراقی نے (الغرض تلخیص) اسے ایک ہزار اشعار میں نظم کیا جو الفیہ عراقی کے نام سے مشہور ہے حافظ سخاوی نے الفیہ عراقی (کا شعری اغلاق دور کرنے کی غرض سے اس) کی شرح لکھی نثر میں امام نووی (۶۷۶) کی کتاب تقریب بھی مقدمہ ابن الصلاح کی تلخیص ہے جس کی شرح حافظ جلال الدین سیوطی (وفات ۹۱۱ھ) نے التدریب کے نام سے لکھی ہے۔

ان مہمات کتب کے علاوہ اور بھی بہت سی مشہور و معروف کتابیں اس علم میں مقدمہ ابن الصلاح کے بعد لکھی گئی ہیں چنانچہ حافظ ابن کثیر دمشقی (نے بھی) اپنی کتاب اختصار علوم الحدیث میں مقدمہ ابن الصلاح کا اختصار کیا ہے (۱)

اس دور کے بعد تو اس علم پر مسلسل اور لگاتار کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ ان متاخرین کی کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور نظم میں حافظ عراقی کا الفیہ ہے اور نثر میں حافظ ابن حجر ( ) کی کتاب نخبۃ الفکر فی مصطلح الاثر ہے۔ سب سے آخر میں قاسمی دمشقی کی کتاب قواعد التحدیث لکھی گئی ہے۔

(۳) تحریک نقد حدیث کا تیسرا بیش قیمت فائدہ: علم جرح و تعدیل

(رُواتِ حدیث کی توثیق یا تضعیف کا علم)

حفاظت و صیانت حدیث کی ان مبارک مساعی کا تیسرا عظیم ثمرہ علم الجرح والتعدیل یا علم میزان الرجال کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس علم میں احادیث کے راویوں کے حالات زندگی سے، ان کی امانت و دیانت سے، ان کی ثقاہت و عدالت اور حفظ و ضبط سے یا اس کے

---

(۱) یہ کتاب استاذ احمد محمد شاکر کی تعلیقات (حواشی) کے ساتھ جس کا نام انھوں نے الباحث الحثیث رکھا ہے، نہایت عمدگی کے ساتھ مصر میں شائع ہو چکی ہے۔

برعکس ان کی دروغ گوئی وغلط بیانی سے ان کی لاپرواہی وتساہل پسندی سے یا سہو ونسیان وغیرہ سے بحث وتفتیش کی جاتی ہے[1]

یہ علم تحقیقی وتنقیدی علوم میں سب سے زیادہ عظیم الشان اور قابلِ وثوق واعتماد علم ہے جو اس مُبارک تحریک — حفاظت وتنقیح حدیث — کے نتیجہ کے طور پر وجود میں آیا ہے۔ اس علم کی نظیر بھی اقوام عالم کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔

اس علم کے وجود میں آنے اور تکمیل وارتقاء کے درجہ تک پہونچنے کا سبب اور داعیہ علماء حدیث کی ایک ایک راوئ حدیث کے حالات زندگی سے واقف ہونے کی حد سے بڑھی ہوئی جستجو اور حرص ہوئی ہے تاکہ وہ صحیح اور غیر صحیح احادیث میں تسلی بخش تمیز اور قابل اطمینان فرق کرسکیں۔ چنانچہ جو راوی ان کے ہمعصر ہوتے تھے ان کی تو وہ بذات خود (جہاں بھی وہ ہوتے وہاں جاکر) چھان بین اور تحقیق وتجسس کرتے تھے اور جو راوی اُن سے پہلے وفات پاچکے ہوتے تھے ان کے مطلوب حالاتِ زندگی ان کے واقف حال اور باخبر لوگوں سے دریافت کرتے تھے۔ ....

اور پھر ان راویان حدیث کے بارے میں (اپنی معلومات اور) اپنی رائے بے کم وکاست اور بے رورعایت، بغیر کسی اخلاقی رکاوٹ یا ارتکاب گناہ کے اندیشہ کے (اپنے تلامذہ کے سامنے اور اپنی تصنیفات وتالیفات میں) علانیہ ظاہر کردیتے تھے صرف اس لئے کہ یہ اللہ جل جلالہٗ کے دین کی حفاظت اور خاتم انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے دفاع کا خالص دینی معاملہ (اور مذہبی فریضہ) تھا۔

امام بخاری علیہ الرحمہ سے ایک مرتبہ کہا گیا کہ :۔

لوگ آپ کی "تاریخ" پر بڑی ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امام بخاری نے

---

[1] اس تفصیل کے جان لینے کے بعد اس علم کو "تاریخ رُوات حدیث" کہنا غلطی ہے "تاریخ" کو ان تفصیلات سے کیا واسطہ؟ یہ علم تو "تاریخ" سے بدرجہا اعلیٰ وارفع اور دشوار ومشکل علم ہے اسی طرح عہد حاضر کی سائنٹیفک ریسرچ کو اس سے کیا نسبت؟ جس پر مستشرقین اور استشراق زدہ محققین ناز کرتے ہیں اور ذخیرۂ احادیث کو اس کے معیار پر پرکھنا چاہتے ہیں۔ ۱۲ مترجم

اس کتاب میں لوگوں کی غیبتیں کی ہیں (اور غیبت بنص قرآن مردار جانور کے گوشت کی طرح حرام ہے)

امام بخاری نے جواب دیا:

ہم نے اپنی طرف سے ایک لفظ نہیں کہا ہم نے صرف وہی کہا ہے جو ہم سے ان کے متعلق بیان کیا گیا (اس کی ذمہ داری ہم پر بالکل عائد نہیں ہوتی اور کہا ہے صرف اللہ کے دین کی حفاظت کی غرض سے) چنانچہ خود نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک ضرر رساں شخص کے متعلق) فرمایا ہے[1]: بئس اخوالعشیرۃ — یہ اپنے قبیلہ کا بدترین آدمی ہے — (تاکہ مسلمان واقف ہو کر اس کی ضرر رسانی سے محفوظ رہیں)

جرح وتعدیل رواۃ حدیث کا آغاز اور ارتقاء

ویسے تو راویان حدیث کی توثیق و تضعیف سے بحث اور چھان بین کرنے کا سلسلہ صغار صحابہ مثلاً عبد اللہ بن عباس (۶۸ھ) عبادۃ بن الصامت (۳۴ھ) انس بن مالک (۹۳ھ) پھر کبار تابعین مثلاً سعید بن المسیب (۹۳ھ) شعبی (۱۰۴ھ) اور ابن سیرین جیسے حضرات کے زمانہ سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ لیکن (فساد زمانہ کے پیش نظر جوں جوں ضرورت بڑھتی گئی) یہ علم جرح وتعدیل رُواۃ مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ چنانچہ (ان صحابہ وتابعین کے زمانہ کے بعد) شعبہ (۱۶۰ھ) نے (خاص طور پر) رجال حدیث پر جرح وتنقید کی اس لئے کہ شعبہ روایت حدیث کے بارے میں بڑے تشدد پسند تھے وہ صرف ثقہ راوی سے ہی حدیث روایت کیا کرتے تھے، شعبہ کے ہم مسلک امام مالک (۱۷۹ھ) بھی تھے (وہ بھی حدیث کے ایک ایک راوی کی پوری طرح چھان بین کرتے اور صرف ثقہ راویوں کی حدیثیں بیان کیا کرتے تھے)

اس دوسری صدی کے مشہور اور سر فہرست علماء جرح وتعدیل سے

---

[1] تو جب عام لوگوں کو کسی بُرے شخص کی ضرر رسانی سے بچانے کے لئے اس کی بُرائی کو برملا بیان کیا جا سکتا ہے تو اللہ کے دین کو ضرر رساں لوگوں کی بُرائی یا کمزوری کو علانیہ بیان کر کے بچانا تو سب سے بڑا دینی فریضہ ہے۔ ۱۲ مترجم

اسماء گرامی یہ ہیں :-

(۱) معمر (۱۵۳ھ) (۲) ہشام دستوائی (۱۵۴ھ) (۳) امام اوزاعی (۱۵۶ھ) (۴) سفیان ثوری (۱۶۱ھ) (۵) حماد بن سلمہ (۱۶۷ھ) (۶) لیث بن سعد (۱۷۵ھ)

ان حضرات کے بعد علماء جرح وتعدیل کا دوسرا طبقہ منظر عام پر آیا - اس طبقہ کے مشاہیر کے اسماء گرامی یہ ہیں :-

(۱) عبداللہ بن مبارک (۱۸۱ھ) (۲) فزاری (۱۸۵ھ) (۳) سفیان بن عیینہ (۱۹۸ھ) (۴) وکیع بن الجراح (۱۹۷ھ)

اس دوسرے طبقہ کے مشہور ترین علماء جرح وتعدیل (جنکو اس علم میں امامت اور استناد کا درجہ حاصل ہے) حسب ذیل دو حضرات ہیں :-

(۱) یحیٰی بن سعید القطان (۱۸۹ھ) (۲) عبدالرحمٰن بن مہدی (۱۹۸ھ) یہ دونوں حضرات جمہور ائمہ حدیث کے نزدیک جرح وتعدیلِ رُواتِ حدیث کے باب میں انتہا درجہ با وثوق اور قابل اعتماد ہیں اور کسی راوی کے متعلق ان کا قول آخری سمجھا جاتا ہے - چنانچہ یہ دونوں حضرات جس راوی کی توثیق کر دیتے (اور ثقہ کہدیتے ہیں) اس کی روایت آنکھ میچ کو قبول کرلی جاتی ہے، اور جس راوی کو یہ مجروح (ضعیف) قرار دیتے ہیں اس کی روایت تمام محدثین کے حلقہ میں بے چون وچرا رد کردی جاتی ہے اور جس راوی کے بارے میں ان دونوں بزرگوں میں اختلاف ہوتا ہے (ایک ثقہ کہتا ہے دوسرا غیر ثقہ اور ضعیف کہتا ہے) اس کے بارے میں بیشک محدثین دوسرے ائمہ جرح وتعدیل یا کتب رجال کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جو پہلو اُن کو راجح نظر آتا ہے اس کو اختیار کرلیتے ہیں (۱)، (بالفاظ دیگر محدثین کے حلقہ میں قابل بحث وتحقیق صرف وہی راوی ہوتے ہیں جن کے بارے میں ان دونوں بزرگوں میں اختلاف رائے ہو یا جن کی توثیق یا تضعیف سے اُنھوں نے سکوت کیا ہو)

ان ائمہ جرح وتعدیل کے بعد انہی کے نقش قدم پر چلنے والا اسی مرتبہ اور اسی شان کے

---

(۱) توجیہ النظر ص ۱۱۴

مالک ائمہ کا ایک اور طبقہ (کہیئے تیسرا طبقہ) منظر عام پر آیا اور ان میں قابل ذکر علماء حسب ذیل ہیں:
(۱) یزید بن ہارون (۲۱۱ھ) (۲) ابو داؤد طیالسی (۲۰۶ھ) (۳) عبد الرزاق بن ہمام (۲۱۱ھ) (۴) ابو عاصم النبیل بن مخلد (۲۱۲ھ)

اس (تیسرے) طبقہ کے بعد علم جرح و تعدیل پر مستقل[1] کتابیں لکھی جانے لگیں چنانچہ سب سے پہلے جس امام نے اسماء الرجال پر کتاب لکھی اور ایک مستقل فن کے طور پر جرح و تعدیل رواۃ حدیث پر کلام کیا وہ (۱) یحیٰی بن معین (۲۳۳ھ) (۲) امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) (۳) محمد بن سعد کاتب الواقدی وصاحب الطبقات (۲۳۰ھ) (۴) علی بن المدینی (۲۳۴ھ) ہیں۔

پھر ان ائمہ مصنفین کے بعد امام بخاری (۲۵۶ھ)، امام مسلم (۲۶۱ھ)، ابو زرعہ رازی (۲۶۴ھ)، ابو حاتم رازی (۲۷۷ھ) ابو داؤد سجستانی (۲۷۵ھ) وغیرہ محدثین تصنیف کے میدان میں آئے اور انہی ائمہ متقدمین کے نقش قدم پر چلکر علم جرح و تعدیل و اسماء الرجال پر کتابیں لکھیں۔

پھر اس تیسری صدی کے بعد سے نویں صدی تک تو علماء جرح و تعدیل کی تصنیفات و تالیفات کا تانتا بندھا رہا ایک طبقہ کے بعد دوسرا طبقہ پیدا ہوتا اور احوال رجال حدیث پر مستقل کتابیں لکھتا اور بحث و تمحیص کرتا اور احادیث کے راویوں کے بارے میں تحقیق و تدقیق کا حق ادا کرتا رہا۔

ان ائمہ جرح و تعدیل کے اس اعتنا اور اہتمام کا ہی نتیجہ ہے کہ حدیث کی کتابوں میں سے کسی بھی کتاب کے کسی بھی راوی کا نام تمہارے سامنے آئے تو محال ہے کہ تم ان حضرات کی کتابوں میں اس راوی کی پوری تاریخ زندگی اور مطلوبہ اوصاف سے متعلق تفصیلات

---

[1] گویا تیسرے طبقہ تک تو راویان حدیث کی جرح و تعدیل سے متعلق ائمہ کے یہ فیصلے اور اقوال و آراء سینہ بسینہ منتقل ہوتے رہے محدثین اپنی تصنیفات میں جستہ جستہ ——— ان ائمہ کے اقوال نقل کر دیا کرتے تھے اس علم پر کوئی مستقل تصنیف وجود میں نہیں آئی تھی مگر اس تیسرے طبقہ کے بعد ایک مستقل علم اور باضابطہ فن کے طور پر صرف رجال اور ان کی جرح و تعدیل پر کتابیں لکھی جانے لگیں۔ ۱۲ مترجم

موجود نہ پاؤ

(پھر جب تمام رواۃ حدیث کے تراجم (حالات زندگی) مدوّن ہو گئے تو جیسا کہ قاعدہ ہے اس علم کی تصانیف میں بھی مصنفین نے استفادہ کی سہولت کی غرض سے تنوع اور تفنن کو اپنا مطمح نظر بنایا چنانچہ اسماء الرجال کی کتابوں میں سے بعض کتابوں میں ان کے مصنفین نے صرف ثقہ راویوں کے تراجم بیان کرنے کا التزام کیا مثلاً ابن حبان (۳۵۴ھ) بستی کی کتاب الثقات اور ابن قطلو بغا (۸۷۹ھ) کی کتاب الثقات چار جلدوں میں اور خلیل بن شاہین (۳۸۵ھ) کی کتاب الثقات۔ (اس تنقیح کا فائدہ یہ ہے کہ جن راویوں کے تراجم ان کتابوں میں آ گئے طالب علم کو ان کی فہرست میں ان کا نام دیکھتے ہی اجمالاً ان کے ثقہ ہونے کا علم ہو جاتا ہے)

اور بعض مصنفین نے صرف ضعفا کے تراجم یعنے ضعیف راویوں کے حالات پر کتابیں لکھیں۔ ان ضعفا پر کتابیں لکھنے والوں میں امام بخاری (۲۵۶ھ) امام نسائی (۳۰۳ھ) حافظ ابن حبان (۳۵۴ھ) دارقطنی (۳۸۵ھ) عقیلی (۳۲۲ھ) ابن الجوزی (۵۹۷ھ) اور ابن عدی (۳۶۵) مشہور آفاق مصنفین ہیں ابن عدی کی کتاب اس موضوع پر سب سے زیادہ جامع کتاب ہے چنانچہ جس راوی کے متعلق بھی علماء جرح وتعدیل نے کچھ کلام کیا ہے (اور ضعیف قرار دیا ہے) چاہے وہ صحیحین (صحیح بخاری وصحیح مسلم) ہی کا راوی کیوں نہ ہو اس کتاب میں ابن عدی نے اس کا مفصل ذکر کیا ہے اسی طرح ابن عدی نے ایسے ائمہ مجتہدین کا بھی ذکر کیا ہے جن کی امت نے تقلید کی ہے کیونکہ ان ائمہ کے بعض مخالفین نے ان کی زندگی میں ان پر بھی معاصرانہ چشمک کے زیر اثر اعتراضات کئے ہیں۔

اور ایسی کتابیں تو بے شمار ہیں جن میں ثقہ اور غیر ثقہ دونوں قسم کے راویوں کے تراجم (حالات زندگی) بیان کئے گئے ہیں اس قسم کی کتابوں میں امام بخاری کی تین تاریخیں (تاریخ کبیر تاریخ صغیر تاریخ اوسط) سب سے زیادہ مشہور ہیں

(۱) تاریخ کبیر حروف معجم (یعنے حروف تہجی) پر ترتیب دی گئی ہے اور تاریخ اوسط وتاریخ صغیر راویوں کے سنین وفات یعنے وفات کے سالوں کے حساب سے ترتیب دی گئی ہیں۔ اسی

طرح ابن حبان کی کتاب المجروح والتعدیل، ابن ابی حاتم رازی (۳۲۷) کی کتاب الجرح والتعدیل ابن سعد کی کتاب، کتاب الطبقات الکبریٰ بھی اسماء الرجال کی شہرۂ آفاق کتابیں ہیں۔ ان میں سب سے عمدہ اور اچھی کتاب حافظ ابن کثیر کی کتاب التکمیل فی معرفۃ الثقات والضعفاء والمجاھیل ہے۔ اس کتاب میں حافظ ابن کثیر نے حافظ مزّی کی کتاب التہذیب اور حافظ ذہبی کی کتاب میزان الاعتدال دونوں کے راویوں کو جمع کردیا ہے اسی کے ساتھ ساتھ کافی اضافے بھی کئے ہیں اور انداز بیان بھی بہت صاف اور واضح ہے۔ ابن کثیر کے بعد میں آنے والے ہر محدث اور فقیہہ کے لئے یہ سب سے زیادہ نفع بخش کتاب ہے (۱)

واضح رہے کہ جن ائمہ جرح و تعدیل نے اس فن پر کتابیں لکھنے کا اہتمام کیا ہے ان سب کا راویوں پر جرح وتنقید کرنے کا معیار ..... یکساں نہیں ہے چنانچہ ان میں سے بعض مصنفین کافی تشدد پسند اور سخت گیر ہوئے ہیں اور بعض انتہائی تسامح پسند اور درگزر کرنے والے ہوئے ہیں اور کچھ حضرات اعتدال پسند ہوئے ہیں نہ حد سے زیادہ سخت گیر اور نہ جان بوجھکر چشم پوشی کرنے والے۔

چنانچہ یحییٰ بن معین، یحییٰ بن سعید قطان، ابن حبان اور ابوحاتم رازی متشدّدین یعنے تشدد پسند ائمہ جرح وتعدیل میں شمار ہوتے ہیں اور نرمی سے کام لینے والے تسامح پسند مصنفین میں امام ابوعیسیٰ ترمذی، ابو عبداللہ الحاکم اور عبدالرحمٰن بن مہدی شمار ہوتے ہیں اور معتدلین میں امام احمد، امام بخاری اور امام مسلم شمار ہوتے ہیں۔

اسی وجہ سے بعض راویوں کے بارے میں ان ائمہ جرح وتعدیل کی آراء مختلف رہی ہیں،

---

(۱) توجیہہ النظر ص ۱۱۸

ملے ان کتابوں میں ضعیف راویوں کا صرف حال ہی نہیں بیان کیا بلکہ منشاء ضعف کی بھی تصریح کردی ہے تاکہ طالبعلم ان کی حدیث کے مرتبہ کو بھی سمجھ لے اور کتب رجال وجرح وتعدیل کی مراجعت کرکے اگر ممکن ہو تو وجوہ توثیق اور قرائن تقویت حدیث کے ذریعہ ضعف کا ازالہ بھی کر سکے۔

ایک ہی راوی کی بعض ائمہ توثیق کرتے ہیں اور بعض تضعیف کرتے ہیں اس کی وجہ صرف اُس نقطۂ نظر کا تفاوت اور اُس معیار کا اختلاف ہے جس کو ہر امام نے اپنی تنقید کے لئے تجویز کیا ہے بلکہ کہیں کہیں تو ایک ہی امام سے ایک ہی راوی کے متعلق مختلف اور متضاد آراء بھی ملتی ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایک زمانہ میں (حاصل شدہ معلومات کے تحت) وہ امام اس راوی کو ثقہ سمجھتا ہے اور توثیق کر دیتا ہے لیکن مرور ایام کے بعد اس راوی کے مزید حالات سامنے آنے کی وجہ سے اس کی رائے میں تبدیلی آجاتی ہے اور وہ اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور بغیر کسی پس و پیش کے اس کی تضعیف کرتا ہے (کہ یہی دیانت کا تقاضہ ہے) اور کبھی معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے (کہ جس راوی کو ضعیف قرار دیا تھا مزید تحقیق کے بعد منشاء ضعف کا ازالہ ہو جاتا ہے اور وہ اس کی توثیق پر مجبور ہو جاتا ہے اور اپنی بات کی پچ کرنے کے بجائے دیانتداری سے اس کو ثقہ قرار دیدیتا ہے)

راویوں کی جرح و تعدیل کے بارے میں ان ائمہ کے اختلاف کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب اجتہاد کے بارے میں فقہا کے منشاء نزاع اور نقطہ ہائے نظر کا اختلاف بھی ہے چنانچہ اہل حدیث (ظاہریہ) اور اہل رائے (فقہا) کے درمیان نزاع تو مشہور ہے ہی۔ اسی نزاع کی بنا پر نوبت یہاں تک پہونچی ہے کہ بعض اہل حدیث (محدثین) نے (جلیل القدر) ائمۂ اہل رائے یعنی ائمہ مجتہدین تک کو جرح و تنقید اور طعن و تشنیع کا نشانہ بنا ڈالا ہے اور ان کو ضعفا میں شمار کر دیا ہے صرف اس وجہ سے کہ ان ائمہ مجتہدین کا اجتہادی نقطۂ نظر اہل حدیث (ظاہریہ) کے نقطہ نظر سے ہم آہنگ نہ تھا۔

اس دعوے کا زبردست ثبوت اور قطعی دلیل یہ بہت کافی ہے کہ تاریخ اسلام میں تشریع فقہ اسلامی کے سب سے بڑے اور جلیل القدر امام، امام اعظم ابو حنیفہ کے حق میں بہت سے محدثین نے انتہائی حق ناشناسی اور حق تلفی کا ثبوت دیا ہے بلکہ بعض ائمہ جرح و تعدیل نے تو امام ابو حنیفہ کے بے مثل زہد و تقویٰ، خدا ترسی و پرہیزگاری اور علمی جلالت شان کے باوجود اُن کو ہدف طعن و تشنیع بنایا ہے۔ ابو بکر خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں امام ابو حنیفہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ہمارے اس بیان کا واضح اور قطعی ثبوت ہے حالانکہ اس کا سبب اور کچھ

نہ تھا کہ اکثر محدثین بلکہ ائمہ حدیث پر بھی امام ابوحنیفہ کا دقیق فقہی مسلک اور عمیق اجتہادی نقطۂ نظر مخفی رہا اور عام اہل حدیث (جن کو ظاہریہ کہا جاتا ہے) کے اس قابل نفرین تعصب نے انکو یہاں تک پہونچا دیا کہ وہ برملا امام ابوحنیفہؒ پر وہ تہمتیں لگانے لگے جن کی تاریخ قطعی طور پر تکذیب کرتی ہے۔

اور غالباً یہی ناقدین رُواۃ حدیث کے میلانات و رجحانات اور نقطہ ہائے نظر کا اختلاف' اور جرح و تنقید میں سخت گیری اور تساہل پسندی کے اعتبار سے تفاوت ہی وہ محرک ہے جس کی بنا پر بعد کے علماء یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئے کہ وہ مفصل اور واضح جرح و تنقید کو

سلہ یہ کچھ امام ابوحنیفہ ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ یحییٰ بن معین نے امام زہری پر امام اوزاعی پر امام شافعی پر شنیع ترین جرح کی ہے اسی طرح ابن ابی ذئب وغیرہ نے مالک بن انس پر کافی طعن و تشنیع کی ہے مگر یاد رکھئے کہ اس قسم کے بیباک یا متعصب جرح و تنقید اور طعن و تشنیع کرنے والے مصنفین چند ہی ہوئے ہیں اور وہ بھی "گاؤ سفید پیشانی" کی طرح علمی حلقے میں جانے پہچانے لوگ ہیں اور ایسے مصنفین کے جواب اور تردید میں خود ائمہ حدیث اور ائمہ جرح و تعدیل نے مستقل کتابیں لکھی ہیں اور ہر اس راوی حدیث اور امام و محدث کی براءت اور ثقاہت کو قطعی دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے جو ان سخت گیر، بیباک یا تعصب پیشہ مصنفین کی جرح و تنقید اور طعن و تشنیع کا نشانہ بنا ہے۔

درحقیقت علم اسماء الرجال اور علم جرح و تعدیل اس قدر مبسوط طریق پر مدون ہو چکا ہے اور اس قدر گوناگوں اور متنوع کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ کسی بھی راوی حدیث، محدث اور فقیہ کے اصلی اور واقعی حالات اس شخص پر مخفی رہ ہی نہیں سکتے جس کی نظر ان تصانیف پر محیط ہو۔ وہ لوگ جو اسماء الرجال کی کسی ایک کتاب یا جرح و تعدیل کے کسی ایک امام کے بیان کو سامنے رکھ کر کسی محدث، امام حدیث و فقہ یا راوئ حدیث پر جرح و تنقید اور طعن و تشنیع کرنے بیٹھ جاتے ہیں درحقیقت وہ حدیث کے دشمن ملحد ہیں جو رُواۃ حدیث، محدثین اور کتب حدیث پر مسلمانوں کے اعتماد کو ختم کر کے سرے سے احادیث سے پیچھا چھڑانا اور دین کو ختم کرنا چاہتے ہیں مسلمانوں کو ایسے لوگوں سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ مترجم

قبول کریں گے (یعنے علماء جرح وتعدیل کا کسی راوی کے متعلق صرف یہ کہدینا کہ وہ مثلاً ضعیف ہے یا متہم ہے یا مطعون ہے یا اس کی روایت قبول نہ کی جائے وغیرہ مبہم الفاظ کی بنا پر اس کو ضعیف یا مجروح نہیں سمجھا جائے گا جب تک وجہ ضعف یا وجہ طعن وضاحت اور تفصیل کے ساتھ نہ بیان کی جائے) اس لئے کہ اندیشہ ہے کہ مبادا کسی راوی پر جرح وتنقید اور طعن وتشنیع کا منشا ناقد کے انداز تحقیق کی غلطی یا مذہبی تعصب ہو جس کی اصل اور حقیقت کچھ بھی نہ ہو چنانچہ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :-

(کسی راوی کی تعدیل وتوثیق تو مجمل اور مبہم بھی قبول کی جا سکتی ہے) بخلاف جرح وتنقید کے کہ جب تک وجہ طعن یا وجہ ضعف کی وضاحت اور تعیین نہ کی جائے، اس وقت تک جرح وتنقید قبول نہیں کی جا سکتی کیونکہ کسی شخص کو فاسق (اور غیر ثقہ) قرار دینے کے اسباب ووجوہات میں اہل علم کے درمیان بڑا اختلاف ہے (کہ کن اعمال واخلاق اور حرکات کے ارتکاب کرنے سے انسان فاسق ہو جاتا ہے اور کن کی وجہ سے نہیں) اس لئے ہو سکتا ہے کہ ایک جرح کرنے والا ناقد کسی چیز کو فاسق ہو جانے کا سبب سمجھتا ہو اور اس کے ارتکاب کرنے والے راوی کو فاسق اور ضعیف قرار دیدے حالانکہ فی الواقع ایسا نہ ہو (یعنے شرعاً اس چیز کے اختیار کرنے کی وجہ سے انسان فاسق نہ ہوتا ہو) یا اس تنقید کرنے والے عالم کے نزدیک تو وہ چیز موجب فسق ہو لیکن دوسرے علماء جرح وتنقید کے نزدیک موجب فسق نہ ہو اور اس کا مرتکب راوی ضعیف نہ ہو اس لئے علماء جرح وتعدیل جرح وتنقید میں سبب جرح بیان کرنے کی شرط لگانے پر مجبور ہوتے ہیں (۱)

اس جرح وتعدیل رواۃ کے سلسلہ میں بعض جارحین کی زبان سے بعض بڑی دلچسپ باتیں

(۱) اختصار علوم الحدیث ص ۱۰۱،

بھی سننے میں آئی ہیں ان میں سے کچھ واقعات قارئین کی ضیافت طبع کے لئے یہاں بیان کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

(۱) ایک محدث سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے فلاں شخص کی حدیث روایت کرنی کیوں چھوڑ دی؟ انھوں نے جواب دیا: میں نے ایک مرتبہ اس شخص کو ایرانی گھوڑے پر سوار اور اس کو سرپٹ دوڑاتے دیکھا تھا (یہ حرکت میرے نزدیک چھچھورے پن کی دلیل اور شرافت و مروت کے منافی ہے) اس لئے میں نے اس کی حدیثیں روایت کرنی چھوڑ دیں۔

(۲) ایک بزرگوار سے صالح مُرّی کی احادیث کے متعلق دریافت کیا گیا (کہ آپ صالح کی حدیثیں کیوں نہیں روایت کرتے) فرمایا:-

صالح مرّی کی حدیثیں لے کر کیا کریں؟ حماد بن سلمہ کے سامنے ایک دن صالح مرّی کا نام آیا تو حماد بن سلمہ نے تھوک دیا تھا (یعنے حماد نے صالح سے نفرت کا اظہار کیا تھا)

ذرا دیکھئے کیسی معمولی معمولی باتوں پر بعض حضرات راویوں کو مجروح اور ان کی روایات کو متروک قرار دیدیتے تھے جن کا کسی شخص کی عدالت، ثقاہت اور حفظ وضبطِ حدیث سے اصلاً کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔

لیکن حق یہ ہے کہ یہ صرف تنگ نظر جاہلوں[1] یا دوسروں کے سہارے چلنے والے نام نہاد

---

[1] مصنف رحمہ اللہ تو اگرچہ اس قسم کے ناقدین کے ان اقوال کو مضحکہ خیز بتلا رہے ہیں لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ان اقوال سے ہی اخذ حدیث میں حضرات محدثین کی انتہائی ورع واحتیاط کا پتہ چلتا ہے کہ جن لوگوں نے اتنی معمولی معمولی باتوں کی بنا پر راویوں کی حدیثوں کو چھوڑ دیا تو واقعی وجوہ طعن اور موجبات جرح پائے جانے والے راویوں کی احادیث روایت کرنے کا تو ان کے متعلق تصور بھی نہیں کیا جا سکتا علاوہ ازیں ناقدین حدیث نے جن راویوں کو مجروح قرار دیکر ان کی روایات کو ترک کیا ہے ان کا یہ فیصلہ صرف اس ایک ہی وجہ طعن پر مبنی نہیں ہوتا جو وہ کسی موقعہ پر ذکر کر دیتے ہیں بلکہ مختلف اور متنوع وجوہ واسباب کی بنا پر وہ راوی اور اس کی روایات کے ناقابل اعتماد ہونے کا اطمینان کر لینے کے بعد ہی اس قسم کا فیصلہ کرتے ہیں اور راوی اور اسکی

(باقی صفحہ ۲۵۹ پر)

محدثین کا طرزِ عمل ہے ورنہ اس علم جرح وتعدیل کے اساطین اور عظیم المرتبت ائمہ جو اس فن جرح وتعدیل کے رگ وریشہ سے واقف اور اس فن کے داخلی اور خارجی دقائق وحقائق میں ماہر ہوئے ہیں وہ اس قسم کے سفیہانہ فیصلوں اور مضحکہ خیز تنقیدوں میں کبھی نہیں پڑتے۔

(۴) تحریک نقد حدیث کا چوتھا عظیم الشان ثمرہ: علوم حدیث

علم مصطلح الحدیث اور علم جرح وتعدیل کے علاوہ بھی بہت سے علوم ہیں جو سنت کے تحقیقی مطالعہ اور اخذ وروایتِ حدیث میں احتیاط وتثبت نیز سنت کے دفاع اور اس کے حقیقی اور اصلی ماخذوں کی بحث وتحقیق کے دوران بطور نتیجہ وجود میں آئے ہیں۔ چنانچہ ابو عبداللہ الحاکم نے اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں ان کی تعداد باون[۵۲] بتلائی ہے اور امام نووی نے اپنی کتاب التقریب میں علوم حدیث کی تعداد تریسٹھ[۶۳] تک پہونچا دی ہے۔ ذیل میں ہم ان میں سے اہم ترین علوم کا ذکر کرتے ہیں تاکہ سنت کی تنقید وتنقیح اور اس کے حفظ وضبط کی تحقیق کے سلسلہ میں علماء سنت کی دقتِ نظر کی قدر ومنزلت اور اس کی حفاظت وصیانت میں ان کے طریقہ ہائے کار کی اہمیت پر کما حقہ روشنی پڑ سکے۔

(۱) اہم ترین علوم حدیث میں پہلا علم

کسی محدث کی شخصی صداقت اور امانت ودیانت کا، حفظ وضبط حدیث میں اس کی پختگی اور احتیاط واہتمام کا، اس کی احادیث کے ماخذوں یعنی اساتذہ کے املا کرائے ہوئے نوشتوں کی صحت کا، شیوخ سے سماع حدیث کے وقت اس کی قابل اعتماد عمر کا، حدیث کی اعلیٰ سندوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۲۵۸)) روایات کو چھوڑتے ہیں علم اسماء الرجال اور علم جرح وتعدیل پر وسیع نظر رکھنے والے اہل علم اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ صرف ترکی گھوڑے کو بکٹٹ دوڑانا ہی اس راوی کے مجروح اور ضعیف ہونے کا سبب نہیں ہے بلکہ فی الواقع وہ راوی ثقہ نہیں ہے اسی طرح صالح مُری فی الواقع ضعیف راوی ہے صرف حماد بن سلمہ کا اس کا ذکر کرنے پر تھوکنا ہی سبب ضعف نہیں ہے۔ مترجم۔

وغیرہ کے حاصل کرنے کی غرض سے اس کے سفروں کا تفصیلی علم یا اس کے برعکس کسی محدث کی اپنی ذات کے حق میں یعنی صداقت و دیانت میں، اپنے علم یعنی حدیث کے حق میں، اپنے مشائخ کے حق میں لاپرواہی بے احتیاطی، سستی کاہلی تسامح پسندی وغیرہ کا تفصیلی علم۔

ابو عبداللہ الحاکم نے اس سلسلہ میں کہا ہے :۔

> ہمارے زمانہ میں ایک حدیث کے طالب علم کے لئے جس چیز کی شدید ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ اس محدث کے جس سے حدیث حاصل کرنا چاہتا ہے حالات کی خوب اچھی طرح چھان بین کرے کہ مثلاً (۱) وہ عقیدۂ توحید میں شریعت کے بیان کردہ تفصیلات ـــ ایمانیات ـــ پر پختہ اعتقاد رکھتا ہے یا نہیں ؟ (۲) انبیاء و رسل علیہم السلام پر جو وحی الٰہی نازل ہوئی اور جو شریعت وہ دنیا میں لائے اس کی اطاعت و پیروی کا وہ اپنے آپ کو پابند باور کرتا ہے یا نہیں ؟ (۳) پھر اس کے شخصی حالات زندگی کا جائزہ لے کہ وہ کسی باطل یا فاسد عقیدہ والے فرقہ کا پیرو تو نہیں ہے ؟ (۴) اگر ہے تو وہ اور لوگوں کو اپنے مسلک کی طرف دعوت تو نہیں دیتا ؟ کیونکہ کسی گمراہ فرقہ کی طرف دعوت دینے والے محدث کی نہ حدیث ہی لکھی (اور قبول کی) جاتی ہے اور نہ ہی وہ کسی عزت و احترام کا مستحق ہے۔ ایسے محدث کی حدیثوں کو ترک کر دینے (اور قبول نہ کرنے) پر مسلمانوں کے ائمہ کی ایک بڑی جماعت کا اجماع ہو چکا ہے۔ (۵) اس کے بعد اس محدث کی عمر (اور تاریخ ولادت) معلوم کرے اور دیکھے کہ جن شیوخ سے حدیث سننے کا دعویٰ کرتا ہے ان سے سماع ممکن بھی ہے یا نہیں یعنی اس کی عمر بھی اس دعوے کی تصدیق کرتی ہے یا نہیں، کیونکہ ہم نے ایسے بہت سے شیوخ حدیث کو دیکھا ہے جو ہم سے جن مشائخ کی حدیثیں روایت کرتے ہیں ان کی عمر ان مشائخ سے ملاقات کی متحمل نہیں (یعنی ان کی عمر اتنی کم ہے کہ ان مشائخ سے ان کا ملنا اور حدیث سننا ممکن ہی نہیں) (۶) اس کے بعد اس محدث کے ماخذوں یعنی مکتوب احادیث کے ذخیروں کا جائزہ لے کہ وہ

پرانے ہیں یا نئے کیونکہ ہمارے زمانہ میں محدثین کا ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جو مکتوب احادیث کی بیاضیں (لوگوں سے) خرید کر اُن سے حدیثیں روایت کرتے ہیں (اس طرح کہ گویا ان محدثین سے جن کی وہ بیاضیں ہیں خود ملے ہیں اور اُن سے یہ حدیثیں سُنی ہیں حالانکہ فی الواقع ایسا نہیں ہوتا) اور ایسے محدثین کا گروہ بھی موجود ہے جو زمانہ کے اعتبار سے پُرانے نوشتوں میں خود اپنے قلم سے اپنی سُنی ہوئی حدیثوں کو .... لکھ دیتے ہیں اور ان کو صاحب نسخہ محدث سے (اس طرح) روایت کرتے ہیں (جیسے اُس محدث نے ان کو ہی یہ حدیثیں لکھائی ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہوتا) تو ایسی صورت میں جو لوگ اس اس فن ـــ نقد حدیث ـــ سے ناواقف ہوتے ہیں وہ تو ایسے (دھوکہ باز) محدثوں (کے دھوکہ میں آجاتے ہیں اور ان) سے روایات لے لیتے ہیں (اور اُن پر اعتماد کر لیتے ہیں) اور وہ کسی حد تک (اپنی ناواقفیت کی بنا پر) معذور بھی ہیں باقی جو لوگ اس فن نقد حدیث کے ماہر ہوتے ہیں وہ جب ان جیسے محدثین سے ایسی روایتوں کو سُنتے ہیں تو وہ اپنے تجربہ کی روشنی میں ان کو پرکھنے کے بعد اُن پر خوب اچھی طرح جرح کرتے ہیں (اور اُن کے جھوٹ کو بے نقاب کرتے ہیں) اور ان کی حدیثوں کو برملا رَد کر دیتے ہیں تاکہ اس قماش کے محدث علانیہ اپنی اس حرکت سے توبہ کریں اور وہ توبہ منظر عام پر آجائے۔ باقی اس فن سے ناواقف لوگ بھی (ایسے محدثین کی حدیثوں کو قبول کرتے ہیں) معذور نہیں سمجھے جا سکتے کیونکہ جو شخص کسی چیز کو نہیں جانتا اس کا فرض ہے کہ وہ جاننے والوں سے دریافت کرے (لہٰذا ایسے ناواقف لوگوں کا بغیر اہل فن سے تحقیق کئے ایسے دھوکہ باز محدثوں کی حدیثوں کو قبول کر لینا ناجائز ہے قرآن کریم میں صریح حکم ہے فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون ـــ اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے دریافت کرو) ہمارے اسلاف رضی اللہ عنہم کا طرز عمل یہی تھا۔

(۲) اہم ترین علوم حدیث میں دوسرا علم: مسند احادیث کا علم

ابو عبداللہ الحاکم کا قول ہے :-

مسند (یعنے مرفوع متصل احادیث کا علم علوم حدیث میں بہت بڑا اور اہم علم ہے کیونکہ مسلمانوں کے ائمہ مجتہدین کا اس میں اختلاف ہے کہ غیر مسند (یعنے موقوف) حدیث بھی حجت ہے یا نہیں۔

حدیث مسند کی تعریف: مسند حدیث وہ ہوتی ہے جس کو کوئی محدث اپنے شیخ سے ایسے طریق پر روایت کرے کہ اُس شیخ سے اس محدث کے حدیث سننے کا ظاہری طور پر امکان ہو (یعنے اس محدث اور اس کے شیخ کے زمانے اور حالات زندگی کے اعتبار سے ملاقات اور سماع حدیث ممکن ہو) پھر اسی طرح ہر راوی حدیث اپنے شیخ سے روایت کرتا چلا جائے یہاں تک کہ اسناد (سلسلہ سند) کسی مشہور صحابی تک پہونچ جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حدیث کو روایت کرے (اصطلاح میں ایسی حدیث کو مرفوع متصل کہتے ہیں)

(۳) علوم حدیث میں تیسرا اہم علم: موقوف آثار (احادیث) کا علم

(موقوف حدیث جس کو اصطلاح میں اثر کہتے ہیں وہ حدیث ہوتی ہے جس کا سلسلہ سند رسول اللہ علیہ وسلم کے بجائے کسی صحابی پر ختم ہو جائے یعنے اس صحابی کا قول یا فعل ہو)

موقوف حدیث کی ایک مثال وہ حدیث ہے جو حاکم نے مغیرہ بن شعبہ سے روایت کی ہے کہ :-

مغیرہ بن شعبہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ (ضرورت کے وقت) آپ کا دروازہ ناخونوں سے کھٹکھٹایا کرتے تھے۔

اس پر حاکم کہتے ہیں: جو شخص اس فن (موقوف اور مرفوع کے امتیاز) سے واقف

نہ ہو اس کو یہ حدیث سُنکر خیال ہو گا کہ یہ حدیث مُسند (مرفوع) ہے کیونکہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر موجود ہے حالانکہ یہ حدیث مُسند نہیں ہے بلکہ صحابی مغیرہ بن شعبہ پر موقوف (ختم) ہے جو اپنے ہمعصر صحابہ کا عمل نقل کر رہے ہیں جن میں سے کوئی صحابی اس عمل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کرتا۔ (کہ آپ نے یہ فرمایا تھا کہ دروازہ ناخونوں سے کھٹکھٹایا کرو بلکہ صحابہ از خود بطور احترام ایسا کیا کرتے تھے کہ زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے سے آپ کو تشویش و تکلیف نہ ہو، اور آپ کا اس پر سکوت فرمانا پسندیدگی کی دلیل ہے لہٰذا حدیث موقوف ہونے کے باوجود احترام و آداب نبوت کے باب میں حجت ہے)

(۴) علوم حدیث میں چوتھا اہم علم

صحابہ کا علم ان کے باہمی فرقِ مراتب کے لحاظ سے

ابو عبد اللہ الحاکم نے کہا ہے کہ:۔

صحابہ کرام کے بارہ[۱۲] طبقے تھے ان میں سے پہلے طبقہ میں وہ صحابہ شمار ہوتے ہیں جو مکہ مکرمہ میں ہی اسلام لاچکے تھے اور سب سے آخری طبقہ میں وہ صحابہ شمار ہوتے ہیں جو آپ کے زمانہ حیات میں کم سن بچے اور نو عمر لڑکے تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف فتح مکہ یا حجۃ الوداع کے موقعہ پر دیکھا ہے۔ اسی لئے وہ صحابہ میں شمار ہوتے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ (اور ظاہر ہے کہ صحابہ جس قدر قدیم الاسلام اور زیادہ صحبت یافتہ ہوں گے اسی قدر ان کی حدیث دوسروں کے مقابلہ پر قابل ترجیح ہو گی اس لحاظ سے اس علم کی اہمیت واضح ہے)

(۵) علوم حدیث میں پانچواں اہم علم

مُرسل[۱۵] حدیثوں کا علم جن کے حجت ہونے (یا نہ ہونے) کے بارے میں (محدثین اور فقہاء کے درمیان) اختلاف ہے

علوم حدیث میں مُرسل احادیث (اور اصحاب مراسیل) کا تفصیلی علم بہت ہی مشکل اور دُشوار علم ہے۔ اس علم تک رسائی بہت کم محدثین کو نصیب ہوتی ہے بجز ان حاذق اور وسیع العلم محدثین کے جنہیں خاص طور پر اس علم میں تبحّر حاصل ہو (وہی جان سکتے ہیں کہ کس قسم کی اور کن تابعین کی مرسل حدیثیں حجت ہیں اور کن علماء کے نزدیک حجت ہیں اور کونسی اور کن تابعین کی مُرسل حدیثیں حجت نہیں ہیں اور کن ائمہ کے نزدیک حجت نہیں ہیں)

(۶) علوم حدیث میں چھٹا اہم علم: منقطع حدیثوں کا علم

منقطع حدیث، مرسل حدیث سے مختلف اور مغائر ہے (جیسا کہ آپ تفصیلی طور پر مصطلح الحدیث کے بیان میں پڑھ چکے ہیں) (یہ علم اتنا مشکل اور دقیق ہے کہ) بہت کم حفاظ حدیث ایسے ہیں جو دونوں کے درمیان تمیز کر پاتے ہیں۔ اس کے بعد حاکم نے ان کی تین قسمیں بیان کی ہیں اور ہر ایک قسم کی ایک ایک مثال بھی دی ہے:

---

[۱۵] مُرسل حدیث کی تعریف علم مصطلح الحدیث کے ذیل میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ جس مرفوع حدیث کی سند میں صحابی کا نام مذکور نہ ہو بلکہ تابعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے حدیث بیان کرے۔ بعض کبار تابعین مثلاً سعید بن مسیب وغیرہ کی مرسل حدیثیں نیز خاص قرائن سے تقویت یافتہ مُرسل حدیثیں اُن محدثین کے نزدیک بھی حجت ہوتی ہیں جو عام طور پر مرسل حدیث کے حجت ہونے کا انکار کرتے ہیں اس لحاظ سے ایک محدث کے لئے یہ جاننا از بس ضروری ہے کہ کن تابعین کی مُرسل حدیثیں حجت ہیں اور کن کی نہیں اور کس کے نزدیک حجت ہیں اور کس کے نزدیک نہیں اور وہ کونسے قرائن ہیں جن کی وجہ سے مُرسل حدیث سب کے نزدیک حجت ہو جاتی ہے۔ ۱۲ مترجم۔

اول :- (تابعی کے بعد) حدیث کی سند میں دو ایسے مجہول (غیر معروف) راوی واقع ہوں (خواہ یکے بعد دیگرے خواہ الگ الگ) جن سے علماء رجال واقف نہ ہوں

دوم :- حدیث کی اسناد کے درمیان کوئی ایسا راوی واقع ہو کہ اس کا نام تو معلوم نہ ہو، لیکن وہ حدیث دوسرے طریقہ (سند) سے معروف و معلوم ہو۔

سوم :- حدیث کی سند میں تابعی تک جو محل ارسال ہے سلسلہ اسناد پہونچنے سے پہلے کوئی ایسا راوی واقع ہو جس کا سماع (حدیث سننا) اُس شیخ سے ثابت نہ ہو جس سے وہ روایت کر رہا ہے۔

اس قسم کی حدیث کو مُرسل نہیں کہا جائے گا (اس لئے کہ صحابی اور تابعی سند میں مذکور ہیں) اس کو تو منقطع ہی کہا جائے گا (اس لئے کہ سند کا سلسلہ اُس راوی اور اُس کے شیخ کے درمیان ٹوٹتا ہے جس سے اس کا سماع ثابت نہیں)

(۷) علوم حدیث میں ساتواں اہم علم: مسلسل اسنادوں کا علم

حدیث مسلسل کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی سند میں ہر راوی کا اپنے شیخ سے سماع حدیث ایسا واضح اور یقینی ہو کہ اس میں شک وشبہ کی اصلاً گنجائش نہ ہو۔

حدیث مسلسل کی متعدد قسمیں ہیں (۱) کبھی یہ تسلسل کسی خاص اور معین لفظ کی پابندی کی وجہ سے ہوتا ہے جس کو اس حدیث کی سند کے تمام راوی اپنے شیخ سے حدیث روایت کرتے وقت اختیار کرتے چلے آئے ہوں مثلاً ہر راوی اپنے شیخ سے حدیث روایت کرتے وقت حدثنا (ہم سے حدیث بیان کی) کہے (ایسی حدیث کو مسلسل بالتحدیث کہتے ہیں) یا ہر راوی اشهد علی فلان انه قال (میں فلاں شخص (اپنے شیخ) پر شہادت دیتا ہوں کہ اس نے یہ کہا) کے الفاظ کہے (ایسی حدیث کو مسلسل بالشهادة کہتے ہیں (۲) یا یہ تسلسل کسی خاص اور معین فعل کے ساتھ ہوتا ہے جس کو ہر شیخ اپنے تلمیذ کے ساتھ حدیث روایت کرتے وقت اختیار کرتا ہے جیسے مسلسل بالمصافحہ (یعنے اوپر سے نیچے تک ہر شیخ حدیث روایت کرتے وقت اپنے شاگرد سے مصافحہ کرتا ہے اور پھر حدیث بیان کرتا ہے) علیٰ ہذا القیاس (ظاہر ہے کہ یہ پابندیاں حدیث کی صحت کو

خاص طور پر تقویت پہونچاتی ہیں اس لئے حدیث مسلسل غیر مسلسل حدیث کے مقابلہ پر قابل ترجیح ہوتی ہے اسی بنا پر ایسی احادیث کا علم علوم حدیث میں خاص اہمیت رکھتا ہے)

(۸) علوم حدیث میں آٹھواں اہم علم: معنعن حدیثوں کی پہچان اور انکا علم

ایسی حدیث جس کی سند میں کوئی ایک یا چند راوی عن یا قال وغیرہ ایسے الفاظ سے اپنے شیخ سے حدیث روایت کریں جن سے سماع کی تصریح نہیں ہوتی، اصطلاح میں ایسی حدیث کو معنعن کہتے ہیں بشرطیکہ وہ راوی تدلیس نہ ہو یعنی کسی بھی وجہ سے اور کسی بھی صورت میں اپنے شیخ (استاذ) کو چھپانے کا عادی نہ ہو غیر مدلس راوی کی معنعن حدیث باجماع ائمہ حدیث متصل ہوتی ہے اس لئے کہ عنعنہ کرنے والے راویوں کے متعلق ائمہ حدیث کا اجماع ہے کہ وہ ہر قسم کی تدلیس سے قطعی طور پر احتراز کیا کرتے تھے حاکم نے بطور مثال جابر بن عبداللہ کی ایک حدیث بصیغۂ عن پیش کی اور بتلایا کہ اس حدیث کو مصر کے راویوں نے روایت کیا ہے اس کے بعد مدینہ کے راویوں نے اور اس کے بعد مکہ کے راویوں نے اور ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے کہ ان (مصری، مدنی اور مکی) محدثین کے مذہب میں تدلیس قطعاً جائز نہ تھی اس لئے وہ اپنے شیخ سے سماع حدیث کی حدثنا وغیرہ الفاظ کے ذریعہ تصریح کریں یا نہ کریں ہمارے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور یہ حدیث یقیناً متصل ہے (اگرچہ راویوں نے عن کا لفظ استعمال کیا ہے)

لہ حدیث معنعن کو متصل تسلیم کرنے کے بارے میں امام بخاری وغیرہ کبار محدثین راوی کے مسلّم طور پر غیر مدلس ہونے کے علاوہ کم ازکم ایک مرتبہ اپنے شیخ سے ملنے اور حدیث سننے کی تصریح کو ضروری قرار دیتے ہیں لیکن جمہور محدثین کے نزدیک راوی اور اس کے شیخ کا معاصر ہونا اور لقاء وسماع کا امکان اُس کی حدیث کو متصل تسلیم کرنے کے لئے کافی ہے بہر صورت غیر معنعن حدیث (جس میں سماع کی تصریح ہو) معنعن کے مقابلہ میں یقیناً قوی ہوتی ہے اسی لئے عام طور پر محدثین معنعن حدیث میں راوی کے اپنے شیخ سے لقاء اور سماع کو ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں اس لئے ایک محدث کے لئے معنعن احادیث اور عنعنہ کرنے والے راویوں کا علم اور معرفت بے حد ضروری اور اہم ہے۔ ۱۲ مترجم

(۹) علوم حدیث میں نواں اہم علم: معضل روایات کا علم

معضل (جیسا کہ آپ مصطلح الحدیث کے ذیل میں پڑھ چکے ہیں) وہ روایت ہوتی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تک حدیث کی سند پہنچنے تک ایک سے زائد راوی ساقط ہوں (یعنے مذکور نہ ہوں) یہ معضل روایت مرسل روایت سے مختلف اور مغائر ہوتی ہے کیونکہ مرسل روایتیں صرف تابعین کی ہوتی ہیں (جو صحابی کا ذکر نہیں کرتے) تابعین کے علاوہ اگر کوئی اور راوی صحابی کا ذکر نہ کرے اور ایک سے زائد راوی متروک ہوں تو وہ روایت مرسل نہیں بلکہ معضل کہلاتی ہے (بہر صورت معضل روایت قوت اور صحت میں مرسل سے کم درجہ ہے اس لئے ایک محدث کے لئے معضل روایات کا علم بیحد ضروری ہے)

(۱۰) علوم حدیث میں دسواں اہم علم، مدرج روایات کا علم ہے

مدرج اس اضافہ کو کہتے ہیں جو صحابی (یا کوئی راوی) رسول اللہ صلی اللہ کی حدیث میں اپنی طرف سے (وضاحت کی غرض) کر دیتا ہے ایک محدث کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس کلام کو غیر کے کلام سے الگ اور جدا کرنے کے لئے مدرج کا علم ازبس ضروری ہے (اور اس کا پتہ بڑی مشکل سے چلتا ہے چنانچہ)

حاکم نے مدرج کی مثال میں وہ حدیث پیش کی ہے جو عبد اللہ بن مسعودؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ:۔

> آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن مسعود کا ہاتھ اپنے دست مبارک میں لیکر تشہد ان کو سکھلایا (جو قعدہ میں پڑھا جاتا ہے) اور فرمایا: کہو التحیات للہ والصلوات الخ اور پورا تشہد پڑھانے کے بعد فرمایا: جب تم نے یہ تشہد پڑھ لیا تو تمہاری نماز پوری ہوگئی۔ اب اگر تم اٹھنا (اور نماز ختم کرنا) چاہتے ہو تو اٹھ جاؤ اور اگر بیٹھنا (اور درود و دعا پڑھنا) چاہتے ہو تو بیٹھو حاکم کا کہنا ہے کہ: حدیث کا یہ حصہ: جب تم نے یہ کہہ لیا (یعنے تشہد پڑھ لیا) الخ

ابن مسعود کا اپنا قول ہے جو حدیث میں درج ہو گیا ہے اس کے ثبوت میں حاکم دوسری سند سے مروی اسی حدیث کو پیش کرتے ہیں جس میں راوی تصریح کرتا ہے کہ ابن مسعود نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تعلیم کردہ تشہد کو ذکر کرنے کے بعد خود کہا : جب تم یہ تشہد پڑھ چکے تو تم نے اپنی نماز کو پورا کرلیا اب اگر تم الخ (گویا ابن مسعود نے اپنے تلمیذ کو یہ بتلانے کے لئے کہ نماز کے ارکان بقدر تشہد بیٹھنے کے بعد پورے ہو جاتے ہیں یہ فقرا فرمایا تھا پہلے راوی نے اس کو اس طرح ذکر کردیا کہ وہ بھی حدیث کا جزء محسوس ہونے لگا بہر حال اس قسم کے ادراج (اضافہ) کا علم حدیث کے تمام طرق پر وسیع نظر کے بغیر نہیں ہو سکتا اس لئے ایک محدث کے لئے یہ علم بھی ازبس ضروری ہے)

(۱۱) علوم حدیث میں گیارہواں اہم علم : تابعین کا علم

علم حدیث کی یہ قسم ـ تابعین کا علم ـ بجائے خود بہت سے علوم پر مشتمل ہے کیونکہ ترتیب کے لحاظ سے تابعین کے بھی متعدد طبقات ہیں (اور ان میں فرق مراتب بجد ضروری ہے) جب بھی کوئی محدث تابعین کے طبقات اور فرق مراتب سے غفلت برتے گا (دھوکہ کھا جائے گا اور) صحابہ و تابعین کے درمیان فرق نہ کر پائے گا اسی طرح تابعین اور تبع تابعین کے درمیان فرق و امتیاز نہ کر سکے گا۔

اس کے بعد حاکم نے تابعین کے طبقات بیان کئے ہیں جو تعداد میں پندرہ ہیں۔ ان میں سے پہلے طبقہ میں وہ تابعین شمار ہوتے ہیں جو اُن دس صحابہ کرام سے ملے ہیں جن کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (جنت کی) شہادت (یعنے بشارت) دی ہے مثلاً سعید بن المسیب اور قیس بن ابی حازم اور آخری طبقہ میں وہ تابعین شمار ہوتے ہیں جو بصرہ کے (مقیم) صحابہ میں سے اُنس بن مالک سے اور کوفہ کے (مقیم) صحابہ میں سے ابن ابی اوفیٰ سے اور مدینہ کے (مقیم) صحابہ میں سے سائب بن یزید سے اور مصر کے (مقیم) صحابہ میں سے عبداللہ بن الحارث بن جزء سے اور شام کے (مقیم) صحابہ میں سے . . . . ابو اسامہ باہلی

سے ملے ہیں (یہ ان بلاد اسلامیہ میں سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابہ کرام ہیں رضوان اللہ علیہم اجمعین)

(۱۲) علوم حدیث میں گیارہواں اہم علم: صحابہ کرام کی اولاد کا علم

جو محدث علوم حدیث کی اس نوع ــ معرفت اولاد صحابہ ــ سے ناواقف ہوگا اس پر بہت سی روایات مشتبہ ہو جائیں گی اس لئے ایک محدّث کے لئے سب سے پہلے تو لازم ہے کہ وہ سید اولاد آدم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد (آل رسول) سے واقف ہو خاص کر ان میں سے ان سادات کرام سے تو ضرور ہی واقف ہو جن سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی احادیث کا روایت کرنا ثابت ہے اس کے بعد صحابہ کرام کی خصوصاً کبار صحابہ کی اولاد سے واقف ہو پھر تابعین، تبع تابعین وغیرہ ائمہ مسلمین کی اولاد سے واقف ہو اس لحاظ سے یہ بڑا وسیع علم ہے اور علوم حدیث کی قسموں میں سے ایک مستقل اور بذات خود مطلوب علم ہے (اس لئے کہ کسی بھی حامل حدیث کی روایات اور اس کے مکتوب ذخیروں کی سب سے بڑی محافظ اس کی اولاد ہی ہوتی ہے ضرورت کے وقت سب سے پہلے ان کی طرف ہی رجوع کیا جاتا ہے)

(۱۳) علوم حدیث میں گیارہواں اہم علم، علم جرح و تعدیل

درحقیقت یہ دو علم ہیں (ایک علم جرح و تنقید دوسرا علم تعدیل و توثیق) اور بجائے خود ہر ایک مستقل علم کی حیثیت رکھتا ہے ۔ یہی علم جرح و تعدیل درحقیقت علوم حدیث کا حاصل اور ثمرہ ہے اور یہی علم حدیث صحیح تک پہنچنے کا راستہ ہے

ابوعبداللہ الحاکم نے اس علم سے اسی طرح تفصیلی بحث کی ہے جیسے صحیح ترین اور ضعیف ترین سندوں سے مفصل بحث کی ہے۔

(۱۴) علوم حدیث میں چودھواں اہم علم: صحیح اور سقیم (ضعیف) حدیثوں کا علم

یہ فن، فن جرح و تعدیل کے علاوہ ہے (اس لئے کہ علم جرح و تعدیل تو مجروح

(ضعیف) اور غیر مجروح (ثقہ) راویوں کی نشاندہی کرتا ہے حالانکہ بہت سی ایسی اسنادیں ہوتی ہیں جن میں راوی مجروح کوئی بھی نہیں ہوتا لیکن پھر بھی ان کو صحیح احادیث (کی کتابوں) میں نہیں لایا جاتا (اور ضعیف سمجھا جاتا ہے) حاکم نے اس کی مثال میں وہ حدیث پیش کی ہے جس کو عبداللہ بن عمر بسند متصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: رات کی اور دن کی (نفل) نمازیں دو دو رکعت ہوتی ہیں اور وتر کی آخر شب میں ایک رکعت ہوتی ہے" حاکم کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں سارے ہی راوی ثقہ ہیں لیکن پھر بھی اس روایت میں "دن" کا لفظ یقیناً راوی کا وہم ہے (اس لئے کہ اس سند کے علاوہ دوسری جتنی سندوں سے عبداللہ بن عمر کی یہ حدیث مروی ہے ان سب میں صرف رات کا لفظ ہے دن کا لفظ اس سند کے علاوہ اور کسی سند سے ثابت نہیں)۔ اسی سلسلہ میں حاکم ایک اور مثال دیتے ہیں اور ایک حدیث پیش کرتے ہیں جو مالک عن ابن شہاب عن عروۃ عن عائشہ کی سند سے مروی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا اگر جی چاہا تو کھا لیا ورنہ چھوڑ دیا" حاکم کا کہنا ہے کہ اس حدیث کی سند میں اگرچہ سارے ہی راوی اپنی اپنی جگہ ائمہ ثقات ہیں تاہم مالک کی سند سے یہ روایت باطل ہے کیونکہ امام مالک کی اس سند سے تو ایک دوسری حدیث مروی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنے ہاتھ سے کسی عورت کو نہیں مارا نہ ہی آپ نے کبھی کسی سے (اپنی ذات کے لئے) انتقام لیا بجز اس کے کہ خدا کی قائم کردہ حرمتوں کو توڑا جائے (اس وقت بیشک آپ نے انتقام لیا ہے) سو ایسے امور میں تو اللہ بھی انتقام لے گا۔ حاکم کہتے ہیں: میں نے انتہائی کوشش کی کہ اس کا پتہ چل جائے کہ کس راوی کو وہم ہوا ہے لیکن مجھے اس کا پتہ نہ چل سکا تاہم غالب گمان یہ ہے کہ وہ راوی جس کو وہم ہوا ہے وہ ابن حبان بصری ہے حالانکہ (ائمہ جرح و تعدیل کے نزدیک) ابن حبان بصری صدوق (بالکل سچا) اور مقبول راوی ہے۔

ان مثالوں کے ذکر کرنے کے بعد حاکم کہتے ہیں: حدیث کے صحیح ہونے کا علم صرف اسکی روایت کے صحیح (اور راویوں کے ثقہ) ہونے سے ہی حاصل نہیں ہو جاتا بلکہ کسی حدیث کے صحیح ہونے

کا پتہ تو درحقیقت راویوں کی فہم و فراست، حفظ و ضبط اور کثرت سماع حدیث سے چلتا ہے
اسی لئے اس علم میں تو اس سے بڑھکر مدد اور کسی چیز سے نہیں ملتی کہ طالب حدیث علوم حدیث کے ماہر اہل
فہم اور وسیع النظر مشائخ کی صحبت میں رہے اور اس سلسلہ میں ان سے مذاکرے کرے تاآنکہ
ان مباحثوں اور مذاکروں کے ذریعہ حدیث کی پوشیدہ علت (اور مانع صحت عیب) کا پتہ
چلانے کا ملکہ پیدا ہو جائے ۔ لہذا جب بھی کوئی طالب حدیث اس قسم کی صحیح سند والی حدیث
کو امام بخاری، امام مسلم وغیرہ ارباب صحاح کی کتابوں میں موجود نہ پائے تو اس کو چاہیئے کہ وہ
ایسے ماہر فن اساتذہ و مشائخ سے اُس حدیث کی پوشیدہ علت کے بارے میں چھان بین
اور مذاکرے و مباحثے کرے تاکہ اس علت کا پتہ چل جائے ۔

(۱۵) علوم حدیث میں پندرھواں اہم علم

فقہ حدیث یعنے حدیث سے ماخوذ حکم شرعی کا علم ہے)

(آپ پڑھ چکے ہیں کہ حدیث احکام شرعیہ کا ماخذ دوم ہے لہذا) یہی علم فقہ حدیث
تو درحقیقت ان تمام علوم حدیث کا ثمر مطلوب ہے اور اسی پر تشریع احکام شرعیہ کا مدار
ہے (اسی لئے اس علم کا حاصل کرنا تو طالب حدیث کا اولین فریضہ ہے

اس اہمیت کو بیان کرنے کے بعد حاکم نے ان ائمہ حدیث کے نام شمار کرائے ہیں جو
اپنی روایت کردہ حدیث بیان کرنے کے بعد (وفقہ هذا الحدیث کے عنوان سے اس حدیث سے مستنبط حکم
شرعی کی نشاندہی بھی کرتے ہیں مثلاً ابن شہاب زہری، عبدالرحمن بن عمرو الاوزاعی، عبداللہ
بن مبارک سفیان بن عیینہ اور احمد بن حنبل وغیرہ فقہاء ائمہ حدیث ۔

(۱۶) علوم حدیث میں سے سولہواں اہم علم

منسوخ اور ناسخ حدیثوں کا علم ہے

ابوعبداللہ الحاکم نے علوم حدیث کی اس قسم کے ذیل میں بہت سی حدیثیں بطور مثال
ذکر کی ہیں جو ایک دوسرے کے لئے ناسخ و منسوخ ہیں (مثلاً) بحدیث جو ایک مسلمان کا اولین

مقصد حیات اور دنیا و آخرت دونوں میں سرخروئی کا موجب ہے ناسخ و منسوخ احادیث کے علم کے بغیر ممکن نہیں علاوہ ازیں بظاہر متعارض احادیث میں رفع تعارض کے لئے بھی ناسخ و منسوخ احادیث کا علم ازبس ضروری ہے لہذا ایک طالب حدیث کے لیئے اس علم کی اہمیت ظاہر ہے)

(۱۷) علوم حدیث میں سترھواں اہم علم مشہور احادیث کا علم ہے

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی مشہور (یعنے محدثین کے حلقہ میں مشہور) احادیث کا علم:

حاکم کہتے ہیں مشہور اور صحیح احادیث میں بڑا فرق ہے بہت سی حدیثیں محدثین کے حلقہ میں مشہور و معروف ہوتی ہیں لیکن (کسی بھی وجہ سے) صحیح احادیث کی کتابوں میں موجود نہیں ہوتیں۔ اس کے بعد حاکم نے ایسی مشہور احادیث کی بہت سی مثالیں ذکر کی ہیں۔

(۱۸) علوم حدیث میں اٹھارواں اہم علم

غریب احادیث (منفرد راویوں کی احادیث) کا علم ہے

غریب حدیث کی بھی بہت سی قسمیں ہیں:-

(۱) ان میں سے ایک قسم کتب صحاح کی غریب حدیثیں ہیں: یہ وہ حدیث ہوتی ہے جس کا کوئی ثقہ راوی منفرد (اکیلا) ہو (یعنے اس راوی کے سوا اور کوئی راوی اس شیخ سے اس حدیث کو روایت نہ کرتا ہو) چونکہ راوی ثقہ ہے اس لئے حدیث تو صحیح ہے مگر چونکہ منفرد ہے اس لئے غریب کہلاتی ہے)

(۲) غریب حدیث کی دوسری قسم غرائب الشیوخ ہے (یعنے مشائخ کبار ایک دوسرے سے ایک حدیث روایت کرتے ہیں مگر ہر ایک منفرد ہوتا ہے)

حاکم نے غرائب الشیوخ کی مثال میں حسب ذیل مرفوع حدیث پیش کی ہے:

لا یبیع حاضر لباد	کوئی شہری (مقامی آدمی) کسی دیہاتی (بیرونی آدمی) کا سامان فروخت نہ کرے۔

حاکم کہتے ہیں: یہ حدیث مالک بن انس عن نافع عن ابن عمر کی سند سے غریب ہے (یعنی امام مالک نافع سے روایت کرنے میں متفرد ہیں) حالانکہ امام مالک مسلم امام ہیں انکی حدیثیں جمع کی جاتی ہیں (یعنی محدثین کے حلقہ میں مقبول ہیں) پھر امام شافعی بھی (امام مالک سے روایت کرنے میں) متفرد ہیں حالانکہ شافعی بلند پایہ امام ہیں پھر ہمیں معلوم نہیں کہ امام شافعی سے بجز ربیع بن سلیمان کے کسی اور نے بھی روایت کیا ہو حالانکہ ربیع بن سلیمان بھی ثقہ اور قابل اعتماد راوی ہیں (گویا امام مالک بھی متفرد، شافعی بھی متفرد اور ربیع بن سلیمان بھی متفرد ہیں اس لئے حدیث صحیح ہونے کے باوجود غریب کہلائے گی)

(۱۹) علوم حدیث میں انیسواں اہم علم: احادیث افراد کا علم

حدیث فرد کی چند قسمیں ہیں جن میں سے۔

(۱) پہلی قسم: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی حدیث جس کو کسی صحابی سے کسی ایک خاص شہر کے محدثین ہی روایت کرتے ہوں مثلاً کسی حدیث کو شروع سند سے آخر تک صرف کوفی محدثین روایت کریں (یعنے سارے راوی کوفی ہوں) یا صرف مدنی محدثین روایت کریں۔ اسی طرح کسی اور شہر والے (تو ایسی حدیث من افراد کوفہ یا من افراد مدینہ، کہلاتی ہے)

(۲) ایسی حدیث بھی فرد کہلاتی ہے جس کو کسی جلیل القدر امام سے صرف ایک ہی (ثقہ) راوی روایت کرے (تو ایسی حدیث من افراد ذلک الامام کہلاتی ہے)

(۳) کسی شہر مثلاً مدینہ کے مشائخ کی کوئی ایسی حدیث بھی فرد کہلاتی ہے جس کو دوسرے شہر مثلاً مشائخ مکہ میں سے صرف ایک ہی شیخ روایت کرے (تو اس حدیث کو اس مکی شیخ کی افراد میں شمار کیا جاتا ہے۔)

(۲۰) علوم حدیث میں سے بیسواں اہم علم: مُدَلِّسین اور ان کی احادیث کا علم ہے

یعنے ایسے تدلیس کرنے والے محدثین کا علم جن سے (سنی ہوئی اور) لکھی ہوئی حدیثوں

میں یہ تمیز نہ کی جاسکے کہ ان کی کونسی حدیثیں اپنے مشائخ سے سنی ہوئی ہیں (یعنے ان میں سماع کی تصریح ہے) اور کونسی بغیر سنی (اس لئے کہ تدلیس کرنے والے محدث کی صرف وہی روایتیں صحیح اور قابل قبول ہوتی ہیں جن میں وہ اپنے شیخ سے سننے کی تصریح کریں تو جب کسی محدث سے سنی اور لکھی ہوئی حدیثوں میں یہ فرق اور امتیاز ختم ہوجائے گا تو ان کی ساری حدیثیں ناقابل اعتماد ہوجائیں گی اس لئے ایک محدث کے لئے اس علم کا حاصل کرنا ناگزیر ہے)

(۲۱) علوم حدیث میں اکیسواں اہم علم

علل حدیث (حدیث کے مخفی عیوب) کا علم ہے

علم علل حدیث، صحیح وسقیم احادیث اور جرح وتعدیل رواۃ حدیث کے علم سے بالکل الگ، جداگانہ اور مستقل علم ہے. حاکم کہتے ہیں: .... حدیث معلول تو ایسے وجوہ واسباب کی بنا پر قرار دی جاتی ہے جن میں جرح وتنقید کا مطلق دخل نہیں ہوتا.

کیونکہ مجروح راوی کی حدیث تو ہوتی ہی ہے ساقط وناکارہ (اس کے معلول ہونے نہ ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا) اور حدیث میں علت تو اکثر وبیشتر ثقہ راویوں کی احادیث میں سے ہی کسی حدیث میں کوئی ایسی پوشیدہ علت ہوتی ہے جس کا پتہ نہیں چلتا اس لئے وہ حدیث معلول قرار دیدی جاتی ہے (یعنے بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ ثقہ راویوں کی حدیثوں میں کوئی ایسی حدیث پائی جاتی ہے جس میں کوئی ایسا مخفی عیب ہوتا ہے جس کا عام محدثین کو پتہ نہیں چلتا اس لئے اسے معلول قرار دیدیا جاتا ہے)

اس کے بعد حاکم کہتے ہیں: ہمارے نزدیک کسی حدیث کو معلول قرار دینے کا دار ومدار تو صرف معلول قرار دینے والے محدث کے غیر معمولی حفظ وضبط، فہم وفراست اور احادیث واسانید کی وسیع معرفت اور حذاقت ومہارت پر ہے اور کسی بھی چیز (یعنے قاعدہ ضابطہ) کا اس میں مطلق دخل نہیں۔

اس کے بعد حاکم نے معلول حدیث کی دس قسمیں بیان کی ہیں اور ہر ایک کی ایک ایک

مثال دی ہے لیکن حدیث کے معلول ہونے کا کوئی قاعدہ[۱] اور ضابطہ نہیں بتایا بس ہر ایک قسم کی ایک مثال ذکر کی ہے اور اس کی علت بتلائی ہے۔

ان تمام علتوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علتیں مذکورہ ذیل امور ہوتے ہیں :۔

(۱) ایک حدیث (یا سند) کا دوسری حدیث (یا سند میں) داخل (اور خلط ملط) ہوجانا (۲) یا راوی کو وہم ہوجانا (۳) یا فی الواقع مرسل حدیث کو متصل بنا دینا یا اور اسی طرح کے تصرفات و انحرافات۔

(۲۲) علوم حدیث میں بائیسواں اہم علم

متعارض احادیث کا علم ہے

(متعارض احادیث کا علم اس لئے ضروری ہے کہ ائمہ مجتہدین کے مابین مختلف فیہ مسائل میں ہر امام اپنے مسلک کے ثبوت میں حدیث پیش کرتا ہے چنانچہ) ایک امام ایک حدیث صحیح سے استدلال کرتا ہے اور دوسرا امام دوسری صحیح حدیث سے (ایسی صورت میں اگر حدیث کا طالب علم متعارض احادیث سے اور تعارض کے رفع کرنے کے طریقوں سے واقف نہ ہو تو وہ بڑے خلجان میں پڑجائے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل میں یہ تضاد کیسا)

حاکم نے اس قسم کی متعارض حدیثوں کی مثالیں ذکر کی ہیں مثلاً صحیح احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع میں مفرد تھے (یعنے آپ نے صرف حج کا احرام باندھا تھا) بعض دوسری صحیح روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ متمتع تھے (یعنے اول صرف عمرہ کا احرام باندھا تھا اس کے بعد حج کا) اور کچھ صحیح احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ قارن تھے یعنے عمرہ اور حج دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھا تھا)

اسی اختلاف احادیث کی بنا پر امام احمد اور ابن خزیمہ نے حج میں "تمتع" کو ترجیح دی (اور افضل قرار دیا) امام شافعی نے "افراد" کو اور امام ابوحنیفہ نے "قران" کو ترجیح دی (اور افضل قرار دیا)

---

[۱] درحقیقت نہ حدیث کے معلول ہونے کا کوئی قاعدہ وضابطہ ہے نہ ہی علل حدیث محدود و منضبط ہیں۔ بلکہ

(باقی صفحہ ۲۷۶ پر)

(۲۳) علوم حدیث میں تیئیسواں اہم علم

غیر متعارض احادیث کا علم ہے

بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جن میں کسی بھی صورت میں اور کسی بھی اعتبار سے مطلق تعارض نہیں ہے ان کا علم بھی ایک محدث کے لئے ضروری ہے (تاکہ اگر کوئی دشمن حدیث متعارض احادیث کی آڑ میں پورے ذخیرہ احادیث کو مشکوک اور ناقابل اعتبار کہنے کی جرأت کرے تو اس کو مسکت اور رسوا کن جواب دے سکے)
حاکم نے ایسی حدیثوں کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔

(۲۴) علوم حدیث میں چوبیسواں اہم علم

احادیث میں ایسے فقہی الفاظ کی زیادتی کا علم، جسکو صرف کوئی ایک دو راوی ہی روایت کرتے ہیں

اس قسم کی زیادتیوں پر مشتمل احادیث بھی بہت کم اور شاذونادر ہیں اور ایسے ماہرین فن محدثین بھی بہت کمیاب ہیں جن کو اس قسم کی زیادتیاں محفوظ ہوں (اور ان کی نشاندہی کر سکیں)
حاکم نے اس قسم کی احادیث کی متعدد مثالیں ذکر کی ہیں جن میں سے ایک عبداللہ بن مسعود کی حدیث ذیل ہے:-

عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: سب سے افضل کونسا عمل ہے؟ آپ نے فرمایا: اول وقت میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۲۷۵) حاذق حفاظ حدیث کی طبائع میں شب و روز کی مزاولت و ممارست احادیث و اسانید سے ایک ایسا قوی ملکہ اور ذوق صحیح پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ معلول (عیب دار) حدیث کے سامنے آتے ہی اس کے معلول ہونے کا حکم لگا دیتے ہیں اور یہ حکم صحیح ہوتا ہے خواہ وہ اس کی علت کی نشاندہی کر سکیں یا نہ کر سکیں بالکل اسی طرح جیسے ایک کہنہ مشق اور آزمودہ کار صراف سونے کو کسوٹی پر رگڑتے ہی بتلا دیتا ہے کہ یہ کھرا ہے یا کھوٹا اگرچہ وہ اس کی وجہ نہ بتلا سکے۔ اور اس کا قول حجت ہوتا ہے۔ مترجم

نماز پڑھنا" میں نے پھر عرض کیا: اس کے بعد کونسا؟ آپ نے فرمایا: "اللہ کی راہ میں جہاد کرنا" میں نے پھر دریافت کیا: اس کے بعد کونسا؟ آپ نے ارشاد فرمایا ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا"

حاکم کہتے ہیں:- یہ حدیث بالکل صحیح اور محفوظ ہے ائمہ حدیث کی ایک بڑی جماعت نے اس حدیث کو مالک بن مغول کی سند سے روایت کیا ہے اسی طرح عثمان بن عمر کی سند سے بھی روایت کیا ہے مگر اس حدیث میں" اول وقت" کا لفظ بجز بندار بن بشار اور حسن بن مکرم کے اور کوئی راوی ذکر نہیں کرتا[1] اور بندار بن بشار اور حسن بن مکرم دونوں ثقہ ہیں اور فقیہ بھی (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں نے فقہی نقطۂ نظر سے " اول وقت" کا اضافہ کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک ہر نماز کو اول وقت میں پڑھنا افضل ہے)

(۲۵) علوم حدیث میں پچیسواں اہم علم، محدثین کے مذاہب کا علم ہے

حاکم نے اس سلسلہ میں ائمہ حدیث کی بہت سی صریح عبارتیں نقل کی ہیں جن میں وہ بعض راویوں کے مذاہب کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو ان راویوں کے مذہب[2] سے آگاہ اور ہوشیار کر دیں۔ (اور ان کی حدیثیں قبول کرنے میں اس کا خیال رکھیں)

(۲۶) علوم حدیث میں چھبیسواں اہم علم

متن حدیث (یعنے عبارت حدیث) میں کتابت کی غلطیوں کا علم ہے

حاکم کہتے ہیں: (ان کتابت کی غلطیوں کا علم نہ ہونے کی وجہ سے) بہت سے محدثین نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اس کے بعد حاکم نے اس کی بہت سی مثالیں ذکر کی ہیں۔ (تفصیل کے لئے حاکم کی کتاب علوم الحدیث کی مراجعت کیجئے)

(۲۷) علوم حدیث میں ستائیسواں اہم علم، سندوں میں کتابت کی غلطیوں کا علم ہے

حاکم نے سندوں میں کتابت کی غلطیوں کی بھی بہت سی مثالیں ذکر کی ہیں۔

---

[1] بلکہ تمام ادی الصلوٰۃ لمیقاتہا (وقت پر نماز پڑھنا) روایت کرتے ہیں ۱۲ مترجم

[2] اس قسم کی تصریح اور تنبیہ کی ضرورت انہی راویوں کے متعلق پیش آتی ہے (باقی صفحہ ۲۷۸ پر)

ابو عبداللہ الحاکم نے ان ستائیس علوم حدیث کو بیان کرنے کے بعد اور بھی علوم حدیث کی بہت سی اقسام بیان کی ہیں ان میں سے بیشتر انواع کا تعلق راویوں کے ناموں، نسبوں، عمروں، قبیلوں، ہمعصروں، کنیتوں اور بیٹیوں وغیرہ ایسے امور کی تحقیق و تجسس اور حفظ و ضبط سے ہے جن کی معرفت ایک محدث کی علوم حدیث کی طرف انتہائی توجہ و اہتمام اور کامل حفظ و ضبط اور پختگی کو ظاہر کرتی ہے۔

تحریک نقد و تنقیح احادیث کا پانچواں عظیم ثمرہ اور فائدہ

موضوع (گھڑی ہوئی) احادیث اور وضّاعین حدیث (حدیثیں گھڑنے والوں) سے متعلق تصانیف

جب حدیث میں جھوٹ بولنے کی وبا عام ہوگئی اور قدماء محدثین نے جھوٹ بولنے والے لوگوں کا ہمہ گیر تعاقب شروع کیا تو انھوں نے ابتداء میں طریق کار یہ اختیار کیا کہ اپنی مجالس درس میں وہ برملا ان کذابین کے ناموں کا اعلان کرتے کہ فلاں راوی جھوٹا ہے اس سے حدیث ہرگز نہ لینا، فلاں راوی زندیق (بیدین) ہے (اس کے پاس بھی نہ پھٹکنا) اور فلاں راوی قدری (منکر قضا و قدر) ہے (اس کی حدیث کی طرف التفات نہ کرنا) اسی طرح جو راوی جیسا ہوتا علانیہ اس کا اعلان کرتے (تاکہ وہ گاو سفید پیشانی کی طرح رسوا ہو جائیں)

اسی طرح محدثین کے حلقوں میں بہت سے کذابین کے نام مشہور ہو گئے تھے ان میں سے کچھ لوگوں کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ ابان بن جعفر نمیری:۔ اس ابان نے امام ابو حنیفہ کی طرف منسوب کر کے تین سو حدیثیں گھڑی

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۲۷۷)) جو کسی گمراہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں مگر داعیہ نہیں ہوتے یعنی اپنے مذہب کی تبلیغ اور پروپیگنڈا نہیں کرتے نہ ہی وہ حدیث ان کے مسلک کی مؤید ہوتی ہے اس لئے محدثین ان کی حدیثیں تو روایت کرتے ہیں مگر ساتھ ہی لوگوں کو ان کے مسلک سے آگاہ بھی کر دیتے ہیں تاکہ لوگ ہوشیار رہیں اور ان کی کوئی ایسی حدیث قبول نہ کریں جس سے ان کے مسلک کی تائید ہوتی ہو۔ ۱۲ مترجم

تھیں (اور امام صاحب سے ان کو روایت کیا کرتا تھا حالانکہ امام ابوحنیفہ نے ان میں سے ایک حدیث بھی روایت نہیں کی تھی نرا جھوٹ تھا)

۲- ابراہیم بن زید اُسلمی :- اس ابراہیم نے امام مالک کی طرف منسوب کر کے ایسی بہت سی حدیثیں اُن سے روایت کی تھیں جو بالکل بے اصل تھیں

۳- احمد بن عبداللہ جویباری :- اس احمد نے کرامیہ کے عقائد کی تائید میں ہزاروں جعلی حدیثیں بنا رکھی تھیں۔

۴- جابر بن یزید جعفی :- سفیان ثوری اس جابر جعفی کے بارے میں کہتے ہیں: میں نے جابر کو تیس ہزار ایسی حدیثیں بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ اگر مجھے اتنی اتنی (یعنے بےحساب) دولت بھی دی جائے تب بھی ان میں سے کسی ایک روایت کو بھی اپنی زبان سے نقل کرنے کو حلال نہیں سمجھتا۔

۵- محمد بن شجاع لیثی :- اس محمد بن شجاع نے تشبیہ کی (خدا کو مجسم ثابت کرنے والی) بہت سی حدیثیں گھڑ رکھی تھیں اور ان کو کبار محدثین کی طرف منسوب کر کے روایت کیا کرتا تھا (کہ ان سے سُنی ہیں)

۶- نوح بن ابی مریم :- اس نوح نے قرآن کریم کی ہر سورت کے فضائل میں حدیثیں بنا رکھی تھیں۔

(۷) حارث بن عبداللہ الاعور (۸) مقاتل بن سلیمان (۹) محمد بن سعید المصلوب (۱۰) الواقدی (۱۱) ابن ابی یحییٰ (۱۲) ابن وہب القاضی (۱۳) محمد بن السائب الکلبی (۱۴) ابوداؤد النخعی (۱۵) اسحٰق بن نجیح الملطی (۱۶) عباس بن ابراہیم النخعی (۱۷) مامون بن ابی احمد الہروی (۱۸) محمد بن عکاشۃ الکرمانی (۱۹) محمد بن القاسم الطائکانی (۲۰) محمد بن زیاد الیشکری (۲۱) محمد بن تمیم الداری۔

بھی اسی قسم کے جھوٹے اور حدیثیں گھڑنے والے لوگ ہوئے ہیں۔

ان کذابین وضاعین حدیث کو اس طرح رسوا کرنے کے بعد علماء حدیث نے موضوع احادیث کی چھان بین شروع کی اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر تمام موضوع اور جعلی حدیثوں کو مستقل کتابوں میں جمع کر دیا تاکہ آنے والی نسلیں بھی ان سے واقف ہو جائیں اور دھوکہ نہ کھائیں۔ ان موضوعات پر لکھی ہوئی مشہور کتابیں یہ ہیں۔

(۱) حافظ ابوالفرج ابن الجوزی (متوفی ۵۹۷ھ) کی کتاب الموضوعات اس کتاب میں ابن الجوزی نے اپنی تحقیق کے مطابق وہ سب حدیثیں جمع کر دی ہیں جو ان کے خیال میں موضوع ہیں چاہے وہ کتب صحاح کی حدیثیں ہی کیوں نہ ہوں چنانچہ ابن الجوزی نے صحیح مسلم میں ۲ دو حدیثیں، صحیح بخاری میں ایک حدیث، مسند احمد میں اڑتیس ۳۸ حدیثیں، سنن ابو داؤد میں نو حدیثیں، جامع ترمذی میں تیس ۳۰ حدیثیں، سنن نسائی میں دس ۱۰ حدیثیں، سنن ابن ماجہ میں تیس ۳۰ اور مستدرک حاکم میں ساٹھ ۶۰ حدیثیں موضوع بتلائی ہیں۔ ان کے علاوہ اور کتب حدیث میں بھی موضوع حدیثوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ علماء حدیث نے ابن الجوزی کی بتلائی ہوئی موضوع حدیثوں کا جائزہ لیا ہے اکثر و بیشتر احادیث کے بارے میں تو ابن الجوزی سے اتفاق کیا ہے کچھ احادیث کے بارے میں اختلاف بھی کیا ہے (اور ان کو موضوع نہیں تسلیم کیا ہے) خصوصاً صحیح بخاری، صحیح مسلم اور مسند احمد کی حدیثیں (کہ وہ ان کو موضوع تسلیم نہیں کرتے بہرحال ابن الجوزی کی کتاب موضوعات کے باب میں اصل اور مدار کی حیثیت رکھتی ہے)

(۲) ابوعمر بن بدر الموصلی (متوفی ۶۲۳ھ) کی کتاب المغنی عن الحفظ والکتاب ہے۔ موصلی نے اس کتاب میں صرف ایسے ابواب کی نشاندہی کر دینے پر اکتفا کیا ہے جن سے متعلق کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں مثلاً ایک باب قائم کیا: باب فی زیادۃ الایمان و نقصانہ وانہ قول وعمل —— ایمان کی زیادتی کمی کا باب اور یہ کہ ایمان قول اور عمل کا نام ہے —— اس کے بعد کہتے ہیں: اس باب میں کوئی صحیح حدیث نہیں ہے۔ موصلی کی کتاب پر بھی علماء حدیث نے تنقید کی ہے اور اختلافات کئے ہیں۔

(۳) علامہ رضی الدین ابوالفضل بن محمد بن حسین (متوفی ۶۵۰ھ) کی کتاب

الدرہ الملتقط فی تبیین الغلط۔ اس کتاب پر بھی علماء حدیث نے تنقید کی ہے اور اُن سے اختلافات کئے ہیں۔

(۴) ابن طاہر مقدسی کی کتاب تذکرۃ الموضوعات۔ اس کتاب میں ابن طاہر نے صرف وہ حدیثیں جمع کی ہیں جن کے راوی جھوٹے، مجروح (عیب دار) ضعیف اور متروک (ناقابل اعتماد) ہوئے ہیں۔

(۵)، (۶) حافظ جلال الدین سیوطی کی کتاب اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعہ اور اللآلی کا ذیل (تتمہ) اصل کتاب ... میں توسیوطی نے ابن الجوزی کی کتاب الموضوعات کی تلخیص کی ہے اور بعض احادیث کے بارے میں جنکو ابن الجوزی نے موضوع بتلایا ہے اختلاف بھی کیا ہے (اور ثابت کیا ہے کہ یہ موضوع نہیں ہیں) اور ذیل (تتمہ) میں سیوطی کے خیال کے مطابق جو موضوع حدیثیں ابن الجوزی سے رہ گئی ہیں ان کو جمع کیا ہے۔

(۷) محمد بن طاہر بن علی پٹنی (متوفی ۹۸۶ھ) کی کتاب تذکرۃ الموضوعات۔ کتاب کے آخر میں وضاعین حدیث اور ضعیف راویوں کے ناموں پر مشتمل ایک رسالہ جو حرف تہجی کی ترتیب پر مرتب ہے (بطور فہرست) اضافہ کیا ہے۔

(۸) شیخ (ملا) علی القاری الحنفی (متوفی ۱۰۱۴ھ) کی کتاب الموضوعات۔

(۹) امام شوکانی (متوفی ۱۲۵۰ھ) کی کتاب الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ

(۱۰) امام صنعانی (متوفی ۱۱۸۲ھ) کا (موضوعات پر) ایک رسالہ۔ اس رسالہ میں صنعانی وہ (بے اصل) احادیث جمع کی ہیں جو ان کے زمانہ میں قصہ گو اور واعظوں کی زبانوں پر جاری وساری تھیں کتاب کے آخر میں مشہور ضعیف اور متروک (ناقابل اعتماد) راویوں کے ناموں کی ایک فہرست بھی دی ہے۔

(۱۱) شیخ محمد بن ابی المحاسن القاؤقجی الحسنی المشیشی الازہری کی کتاب اللؤلؤ المرصوع فیما لا اصل لہ او باصلہ موضوع۔ یہ محمد بن ابی المحاسن طرابلس میں پیدا ہوئے لیکن وفات مصر میں ۱۳۰۵ھ کے اواخر میں ہوئی۔ قاؤقجی کی یہ کتاب اور صنعانی

رسالہ دونوں یکجا مصر میں چھپ چکے ہیں۔

(۶) تحریک نقد حدیث کا چھٹا ثمرہ

ان احادیث پر مشتمل کتابیں جو لوگوں کی زبانوں پر جاری وساری ہیں اور ان میں جو صحیح، ضعیف یا موضوع ہیں ان کا بیان

اس موضوع پر حسب ذیل کتابیں لکھی گئی ہیں۔

(۱) ابن دبیع الشیبانی الاثری (متوفی ۹۴۴ھ) کی کتاب تمییز الطیب من الخبیث فیما یدور علی السنة الناس من الحدیث

(۲) مرحوم شیخ محمد الحوت بیروتی کی کتاب حسن الاثر فیما فیہ ضعف واختلاف من حدیث وخبر واثر۔

سنت اور حدیث اس تیرہ سو سال میں جن ادوار ومراحل سے گذری اور ان میں دشمنان سنت کی جن دسیسہ کاریوں اور مسخ وتحریف کی سازشوں کا اُس کو سامنا کرنا پڑا ہے اور جو فساد اور خرابی ان ناپاک سازشوں کے نتیجہ میں سنت وحدیث کے اندر پیدا ہو گئی تھی علماء حدیث نے اس کو دور کرنے اور ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک وصاف کرنے کے سلسلہ میں جو حوصلہ شکن اور زبردست کوشش انجام دی ہیں یہ ان کا مختصر سا بیان ہے جو ہم نے قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہا ہے۔

حق یہ ہے کہ ان فوق العادہ مساعی جلیلہ کو دیکھکر ایک انصاف پسند محقق کے لئے سر تعظیم واحترام خم کرنا ناگزیر ہے اور وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔ کہ درحقیقت یہ کارنامہ عام انسانی قدرت کی سطح سے بہت بالاتر ہے اور علم وتحقیق کی دنیا میں اس کی مثال ملنا محال ہے

دوسرا باب

مختلف زمانوں میں سُنّت کے متعلق جو شکوک و شبہات پیدا کئے گئے ہیں ان کا بیان

اس باب میں سات فصلیں ہیں

فصل اوّل! سُنّت کے بارے میں شیعہ اور خوارج کا رویہ۔
فصل دوم! سُنّت کے بارے میں عہد قدیم کے منکرین حجیّت حدیث کا رویہ۔
فصل سوم! سُنّت کے بارے میں عہد حاضر کے منکرین حجیت حدیث کا رویہ۔
فصل چہارم! سُنّت ان لوگوں کی نظر میں جو خبر واحد کے حجت ہونے کا انکار کرتے ہیں۔
فصل پنجم! سنت معتزلہ اور متکلمین کی نظر میں۔
فصل ششم! سنت دور حاضر کے بعض مصنّفین کی نظر میں۔
فصل ہفتم! سنت کا تصور مستشرقین کی نظر میں۔

تمہید

سنت کو ان تمام شدید ترین معاندانہ معرکوں کا مقابلہ کرنے اور پھر ان تمام معرکوں سے مظفر و منصور ہو کر نکلنے کے اثنا میں قدرتی طور سے اس کے مقدس جسم پر خفیف سے زخموں کے نشانات کا پڑنا ناگزیر تھا۔

لیکن یہ زخم اس کی ہستی کو اس کی قوت حیات اور الٰہی طاقت کو مطلق متاثر نہیں کر سکے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ سنت مختلف زمانوں میں بعض گم کردۂ راہ مسلمان فرقوں کے معاندانہ حملوں کا اور ان تمام شکوک و شبہات کا نشانہ بنتی رہی ہے جو دشمنان سنت شریعت اسلامی کا ماخذ ہونے کی حیثیت سے سنت کے بارے میں پیدا کرتے رہے ہیں۔

ہم ذیل کی فصلوں میں انشاء اللہ تفصیل کے ساتھ ان تمام شکوک و شبہات کا جائزہ لیں گے۔

پہلی فصل

شیعہ اور خوارج کا رویہ سُنت کیساتھ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تمام صحابۂ کرام کو اس امر میں ذرہ برابر بھی شک و شبہ یا خلجان پیدا نہیں ہوتا تھا کہ آپ کا ہر قولی یا فعلی حکم واجب الاطاعت ہے اور یہ کہ آپ تمام بنی نوع انسان کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اور یہ کہ روئے زمین کے تمام انسانوں اور ان کے بعد آنے والی نسلوں تک آپ کا یہ پیغام پہنچانا اُن کا فرض ہے۔

ثابت شدہ تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں صحابہ ایک دوسرے کو شک وشبہ یا عداوت کی نظر سے مطلق نہیں دیکھتے تھے بلکہ وہ آپس میں بھائیوں جیسی محبت کرتے تھے وحدتِ عقیدہ اور اتحادِ مقصد نے ان کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر دیا تھا۔ ایک نبی ایک کتاب اور ایک ہی شریعت نے ان کے قلوب میں کُلی اتحاد وارتباط پیدا کر دیا تھا۔ ان کے درمیان جو اخوت راسخ اور جاگزیں تھی قرآن عظیم نے اس کو ذیل کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے:-

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم، تراھم رکعاً سجداً یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا، سیما ھم فی وجوھھم من اثر السجود۔	محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں انتہائی سخت ہیں، اور آپس میں ایک دوسرے پر انتہا درجہ مہربان ہیں تم ان کو (نمازمیں) رکوع اور سجدے کرتے ہوئے دیکھو گے کہ وہ اللہ کے فضل اور رضا کی جستجو میں مصروف ہوں گے۔ ان کا امتیازی نشان ان کے چہروں[1] پر سجدوں کے آثار وانوار ہیں

؎ ؎ ؎ ؎ ؎

وہ باہمی محبت، باہمی تعاون اور ایثار میں ضرب المثل تھے سوائے حق کی تحقیق کے کے اور کسی بھی چیز میں ان کے درمیان کبھی کوئی اختلاف نہ ہوتا اور اس اختلاف میں بھی جوں ہی اُن پر حق عیاں ہو جاتا، انتہائی سُرعت کے ساتھ اس کو قبول کر لیتے (اپنی بات کی پچ اور اپنی شخصیت کو منوانے کا جذبہ ان میں نام کو نہ تھا) پھر اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اپنے ان اختلافات کے اثنا میں بھی، باہمی رواداری اور اخلاق کا کامل ترین نمونہ ہوتے تھے اور ایک دوسرے کے احترام کا پاس رکھنے میں اپنی مثال آپ ہی تھے۔

---

[1] سیماء ہی میں پیشانی کے اس امتیازی نشان کو کہتے ہیں جس سے آدمی کو دیکھتے ہی پہچان لیا جائے مومنین کی پیشانیوں پر سجدوں کے انوار وآثار ان مادی آنکھوں سے تو نظر نہیں آتے مگر اہل باطن اس مادی زندگی میں بھی دل کی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں اور ان کو دیکھتے ہی خدا یاد آتا ہے باقی آخرت میں تو آیت کریمہ لوحھم یسعی بابین ایدیھم میں ان انوار اور ان کی رہنمائی کو سب ہی دیکھیں گے۔ مترجم

اسی طرح وہ نہ ایک دوسرے کو جھٹلاتے نہ ایک دوسرے پر تہمت لگاتے ان میں جو پہلے اسلام لایا ہوتا اس کی فضیلت اور برتری کو پہچانتے اور اس کا احترام کرتے، جس نے دعوت وتبلیغ اسلام کی راہ میں زیادہ مال خرچ کیا ہوتا اس کی تشکرانہ قدر کرتے، اللہ تعالیٰ نے ان میں سے جن کو خیر وبرکت یعنے مال ودولت عطا فرمائی تھی اُن پر حسد نہ کرتے۔ ان سب کی مشترک خیر وخوبی ـــ جو ان کے شرف کے لئے کافی ووافی ہے ـــ یہ تھی کہ وہ سب کے سب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، ایک مضبوط ومحکم شریعت کے داعی اور مبلغ ہیں، اللہ نے محض اپنے فضل وکرم سے ان سب کو گمراہی سے بچاکر ہدایت ازلی سے نوازا ہے اس لئے وہ نوع انسانی کے سب سے زیادہ خوش نصیب اور خوش حال لوگ ہیں۔

جب نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا تو سب سے پہلا اختلاف جو صحابہ کرام کے درمیان رونما ہوا وہ منصب خلافت کی اہلیت کے بارے میں اختلاف تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین اور خلیفہ کون ہو؟ باوجودیکہ یہ نقطۂ اختلاف دنیا کی قوموں اور جماعتوں کے درمیان سب سے زیادہ نازک اور خطرناک قسم کا اختلاف سمجھا جاتا ہے کہ سلطنت کی باگ ڈور اور اقتدار اعلیٰ کس کے ہاتھ میں ہو؟ پھر بھی بخدا ان ملکوتی صفات کے مالک صحابہ کرام کی اس موقعہ پر آپس کی گفتگو، ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ خیال اور اپنی رائے کی صحت کے بارے میں پوری قوت کے ساتھ دفاع اور آخر اس فیصلہ تک ان کا پہونچنا جس پر ان کا مکمل اتفاق ہوا، یہ تمام تفصیلات تاریخ اقوام وامم عالم کے عجائبات میں سے ہیں یعنی ان تمام اختلافی مراحل میں ضبط نفس، حسن تعبیر، باہمی تعلقات اور فرق مراتب کے احترام کے ساتھ ساتھ تلاش حق کا دامن مطلق نہ چھوڑنا۔ اس طرح کی مثالیں تو ہمیں دورِ حاضر کی ترقی یافتہ اور مہذب پارلیمنٹری مجالس میں بھی نہیں ملتیں۔ چہ جائیکہ وہ زمانہ جس میں دنیا کی قوموں کو شوریٰ کے اصول اور آداب جمہوریت کی ہوا بھی نہیں لگی تھی اور نہ ہی عوام کو اپنے حکمراں اور فرمانروا انتخاب کرنے کا کوئی حق حاصل تھا۔

سقیفۂ بنی ساعدہ کے واقعات وتفصیلات آپ صحیح اور معتبر تاریخی ماخذوں میں پڑھ سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات پاتے ہی کس جوش وخروش

کے ساتھ تمام انصار اپنے میں سے امیر المومنین اور خلیفۂ رسول اللہ انتخاب کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں اور کس طرح کبار مہاجرین ــــ جن کی قیادت ابوبکر، عمر اور ابوعبیدہ کر رہے تھے ــــ اس خبر کو سنتے ہی سقیفۂ بنی ساعدہ کی طرف لپکتے ہیں کہ اپنے انصار بھائیوں کے ساتھ ملکر اس مہم کو سر کریں پھر کس طرح صبر وضبط کے ساتھ وہ انصار کے دلائل کو ٹھنڈے دل سے پورے ادب واحترام کے ساتھ سنتے ہیں اس کے بعد کس خوبی کے ساتھ اپنے اور تمام مہاجرین کے نقطہ نظر کو موثر اور حقیقت پر مبنی انداز میں انصار کے سامنے پیش کرتے ہیں (اور انصار کو ان اہم خطرات سے آگاہ کرتے ہیں جو ان کے پیش نظر نہیں ہیں) چنانچہ وہ اول انصار کے عظیم کارنامے اور فضائل: اسلام اور مسلمانوں کو کسمپرسی کے عالم میں پناہ دینا اور مدد کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت اور دفاع کے لئے اپنے جان ومال قربان کر دینے کے لئے آمادہ ہونا، بے یار ودیار مہاجرین کو خوش آمدید کہنا اور اپنے گھروں میں ان کو پناہ دینا ان تمام کارناموں کا انتہائی فراخدلی اور صفائی کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں اور اس لحاظ سے اسلام میں جو فضیلت انصار کو حاصل ہے اس کے تشکرانہ اعتراف کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں، اس کے بعد بغیر کسی ادنیٰ خودستائی اور عظمت وفوقیت کے اظہار کے، مہاجرین کے فضائل ومناقب بیان کرتے ہیں بعد ازاں (انتخاب خلیفہ رسول کے سلسلہ میں جو خطرات، انصار کے پیش نظر نہ تھے ان کو واضح کرتے ہیں اور) فرماتے ہیں کہ آپ حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ (جزیرۃ العرب کے) تمام عرب قبائل متفقہ طور پر صرف قریش کے سامنے ہی جھک سکتے ہیں اور سر تسلیم خم کر سکتے ہیں (اس لئے خلیفۂ رسول قریشی ہونا ازبس ضروری ہے علاوہ ازیں) یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر انصار میں سے قبیلہ اوس کا کوئی شخص امیر ہوگا تو قبیلہ خزرج کے لوگ اس کی امارت کو تسلیم نہیں کریں گے اور اس کے مقابلہ پر یقیناً اٹھیں گے اور اگر قبیلۂ خزرج میں سے کوئی امیر منتخب ہوا تو قبیلہ اوس کے لوگ اس کو ہرگز برداشت نہ کریں گے اور اس کا مقابلہ ضرور کریں گے (اور اس طرح یہ انتخاب ایک نا ختم خانہ جنگی کا سبب بن جائے گا انصار نے اس خطرہ کو محسوس کیا چنانچہ) آپ دیکھیے کس خوبی کے ساتھ انصار اپنی اس تجویز کو کہ خلیفہ صرف

انصار میں سے ہونا چاہیئے واپس ایکر اس کے متبادل تجویز پیش کرتے ہیں کہ ایک امیر انصار میں سے ہو اور ایک مہاجرین میں سے ۔ مہاجرین نے کس دانشمندی کے ساتھ اس جذباتی تجویز کا جواب دیا کہ یہ دو عملی حکومت اسلام کی سب سے پہلی کمزوری ہوگی آخر حضرت ابوبکر صدیق نے انتہائی فراخدلی سے حاضرین کے سامنے اپنی تجویز پیش کی کہ ان حقائق کی روشنی میں مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ عمر یا ابوعبیدہ کے ہاتھ پر بیعت کرلیں ، ان دونوں ناموں کے سامنے آتے ہی حضرت عمر ایک دم اُٹھے اور حضرت ابوبکر سے کہا : آپ مجھ سے زیادہ فضل وکمال کے مالک ہیں" جس کا جواب حضرت ابوبکر نے انتہائی بے نفسی کے ساتھ یہ دیا کہ : ہاں ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو لیکن تم مجھ سے زیادہ قوی ہو (اور حکومت چلانے کے لئے قوت وطاقت کی ضرورت ہے نہ کہ فضل وکمال کی) اس پر حضرت عمر نے برجستہ جواب دیا : میری طاقت وقوت آپ کے فضل وکمال کی پشت پناہی کے لئے وقف ہے" اور یہ کہکر وہ بڑی تیزی سے آگے بڑھتے ہیں اور حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کرلیتے ہیں یہ دیکھکر تمام مہاجرین بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کرلیتے ہیں تو انصار سے بھی نہ رہا گیا اور وہ بھی یکایک حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے ہاتھ پر اس طرح بیعت کے لئے ٹوٹ پڑتے ہیں کہ انصار کے اُمیدوار خلافت قائد سعد بن عبادہ بھی اس ہجوم میں پامال ہو جانے سے بال بال بچتے ہیں انہی سعد بن عبادہ کو انصار نے اپنی طرف سے خلافت کا اُمیدوار نامزد کیا تھا ۔ غرض اس باہمی رواداری و بے نفسی کے ساتھ محض انہام وتفہیم کے ذریعہ ابوبکر کی بیعت سقیفہ بنی ساعدہ میں موجود مہاجرین وانصار کے اتفاق رائے سے پایۂ تکمیل کو پہونچ جاتی ہے اور حضرت علی اور خاندان بنو ہاشم کے چند افراد کے علاوہ باقی تمام مسلمان بھی حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کرلیتے ہیں چند روز کے توقف کے بعد . . . . . . حضرت علی اور خاندان بنو ہاشم کے تمام افراد بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کرلیتے ہیں ۔

اس طرح محض باہمی رواداری اور حق گوئی وحق جوئی کے ذریعہ حضرت ابوبکر کی خلافت

وبیعت کا کٹھن مسئلہ طے ہوجاتا ہے نہ کوئی خون کا قطرہ بہتا ہے نہ کوئی حزبی اور جماعتی تصادم آپس میں واقع ہوتا ہے، نہ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھال کر یا جھوٹی تہمتیں لگا کر ورغلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

صحابہ کرام کے حالات پڑھئے اس قسم کی بہت سی مثالیں آپ کو ملیں گی جن کے پڑھنے سے ان حضرات کے آداب واخلاق اور عالی نفسی ورواداری کی، ان کے معاشرہ کی قوت واستحکام کی اور باہمی تعاون واخوت کے روابط کی پختگی کی ایک واضح تصویر آپ کے سامنے آجائے گی۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے پورے عہد خلافت میں اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کے ابتدائی دور میں صحابہ کرام کے خلوص واتحاد اور باہمی روابط کے استحکام کی یہی صورت قائم رہی وہ باہمی تعاون کے وسیع ترین مفہوم میں امور خیر کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے تھے وہ بھلائی کے کاموں میں حیرت انگیز طریقہ پر ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی کرتے تھے اور شرعی امور میں ایک دوسرے کے ساتھ ذرا ذرا سی بات میں اختلاف اور حجت کرتے تھے اور حق جوئی وحق گوئی کے معاملہ میں ان کی باہمی دوستی، رواداری یا اقتدار اعلیٰ یا فضل وکمال، کھل کر حق بات کہنے سے ان کو ہرگز نہیں روکتا تھا۔ وہ صاف گو تھے ایسی صاف اور بے لاگ ولپیٹ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کھلی کھلی باتیں کرتے جیسے کہ عربوں کی فطری صاف گوئی معروف ہے جو نہ منافقت سے آشنا ہوتی ہے نہ چھل فریب سے۔ وہ مہذب ومتمدن شہریوں کی طرح ایک دوسرے کا ادب واحترام کرتے تھے جس میں نہ بدکلامی نام کو ہوتی ہے نہ درشت مزاجی۔ وہ ایسے بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے کام آتے اور آپس میں تعاون کرتے جس میں نہ خود نمائی اور برتری کے اظہار کا جذبہ ہوتا، نہ دوسروں پر اپنی بڑائی جتلانے کا۔ وہ فوجی سپاہیوں کی طرح اپنے امیر کی اطاعت کرتے جو سرکشی وسرتابی یا عدول حکمی وخلاف ورزی کو جانتے تک نہیں کہ کیا ہوتی ہے وہ سب کے سب ایک نئی ریاست نئی شریعت اور نئی اُمت کی بنیادیں رکھنے والے ایسے اعلیٰ درجہ کے معماران ملت تھے جو کامل ترین معماران ملت کی سی دِقت نظر، وسعت علم، سخت کوشی اور تعمیر وترقی کے ذرائع ووسائل پر کامل دسترس کے مالک ہوتے ہیں۔ تعمیر وترقی ملت کی اہلیت کے یہ تمام اوصاف وکمالات

ان میں بدرجہ اتم موجود تھے۔

یہاں تک کہ جب حضرت عثمان کے آخری دور خلافت میں داخلی فتنہ وفساد پھیل گیا، اور خدا دشمن یہودی اور ایرانی النسل عجمی، اسلام کا لبادہ اوڑھ کر مسلمانوں کے معاشرہ میں گھس پڑے اور بہ تقدیر الٰہی ان کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی بدولت خلیفہ سوم ۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ۔ اور خلیفہ چہارم ۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ۔ کا جو قتل مقدر ہو چکا تھا وہ وقوع میں آگیا اور اس کے بعد بلا شرکت غیرے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ہاتھ میں خلافت کی باگ ڈور آگئی تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان ملکوتی صفات کے مالک کبار صحابہ کرام کے خلاف ۔ جنہوں نے اس دین جدید اسلام کی بنیادوں کو اپنے بازوؤں سے استوار کیا تھا اور اپنے خون کے آخری قطروں سے سینچا تھا ۔ بے لگام زبانیں بدکلامیوں اور کمینہ قسم کی طعن وتشنیع پر اتر آتی ہیں اور حب علی کی آڑ لیکر اپنے دلوں کی بھڑاس نکالنے لگتے ہیں ۔ اور جس طرح حضرت علی کی حمایت اور شیعیت کا مظاہرہ کرنے والوں نے ان کبار صحابہ کے خلاف زبان درازیاں کیں اسی طرح خوارج نے بھی واقعہ تحکیم (ثالثی) کے بعد نہ صرف ان حضرات کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا بلکہ ان تمام صحابہ کو جو اس وقت موجود تھے علانیہ کافر قرار دیدیا صرف اس بنیاد پر کہ اُن کے زعم کے مطابق تحکیم (ثالثی) کو مان کر ان تمام صحابہ نے خدا کے حکم ۔ ان الحکم الا للہ ۔ کی خلاف ورزی اور نافرمانی کی ہے اور ۔ ان کے عقیدہ کے مطابق ۔ جو شخص خدا کے کسی ایک حکم کی بھی خلاف ورزی اور نافرمانی کرے وہ کافر ہے (لہذا یہ تمام صحابہ کافر اور واجب القتل ہیں)

اس کے برعکس جمہور مسلمین نے صحابہ کے ان مشاجرات اور اختلافات کے بارے میں انتہا درجہ معتدل اور درمیانہ موقف اختیار کیا تھا ان کا عقیدہ یہ تھا کہ پہلے تین خلیفہ ۔ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم ۔ یقینا حضرت علی سے زیادہ خلافت کے مستحق تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ کے مقابلہ پر یقیناً خلافت کے زیادہ مستحق ہیں۔

ان جمہور مسلمین کی سلامت روی اور اعتدال پسندی ہی کا نتیجہ تھا کہ باوجودیکہ اُنھوں نے حضرت علی کے مقابلہ میں خلفاء ثلاثہ کی تائید کی اور حضرت معاویہ کے مقابلہ میں حضرت علی کی حمایت

کی تاہم اس پورے المیہ میں انھوں نے اوّل سے آخر تک صحابہ کے ادب واحترام کا دامن ہاتھ سے ہرگز نہیں جانے دیا وہ ان حضرات میں سے جن کو غلطی پر سمجھتے تھے ان کی طرف سے معذرت کرتے تھے کہ انھوں نے جو کچھ کیا وہ ان کا اجتہاد ہے اور مجتہد جب تک حق کی تلاش میں رہتا ہے، اگر اس سے غلطی بھی ہو جائے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہوتا۔

علاوہ ازیں ان حضرات صحابہ نے اسلام میں عظیم کارنامے انجام دیئے ہیں، اسلام کا جھنڈا بلند کرنے اور بلند رکھنے کا شرف حاصل کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کی حمایت وحفاظت اور دفاع میں اپنی جانوں .... تک کی بازی لگادی ہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں تربیت یافتہ ہیں حق پرستی کے آداب انھوں نے آپ سے سیکھے ہیں پھر اس داخلی فتنہ اور خانہ جنگی کے رونما ہونے سے پہلے کی ان کی شاندار تاریخ ہے ان کے آداب اور طور طریقے ہیں، ان کے اعلیٰ اخلاق وفضائل اور عالی نفسی ہمارے سامنے ہے، یہ تمام حقائق ہمیں اس یقین کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ یہ حضرات سراپا خیر ہی خیر ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ اس نزاعی مسئلہ میں یہ سارے کے سارے حضرات مجتہد تھے اور حق ان کا قبلۂ مقصود تھا اس لئے جو حضرات ان میں سے صحیح فیصلہ پر پہونچنے میں کامیاب ہوئے ان کے لئے دوہرا اجر ہے اور جن سے تلاش حق میں غلطی ہوئی ان کے لئے اکہرا جیسا کہ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حکمراں کے اجتہاد کے بارے میں ایک مشہور حدیث[1] میں خبر دی ہے۔

اگر یہ داخلی اختلاف کبار صحابہ اور ان جمہور صحابہ وتابعین کے دائرہ میں ہی محدود رہتا جو کبار صحابہ کے نقش قدم پر چلتے رہے ہیں تو اس اختلاف میں بھی ان کی وہی شان باقی رہتی جو ان کا مزاج بن چکی تھی اور جس کے لئے وہ مشہور ومعروف ہیں یعنی علی الاعلان حق گوئی کے باوجود رواداری، حُسن سلوک اور صحابیت کا احترام، لیکن ان اختلافی معرکوں میں اسلام کے دشمن — یہودیوں — کی خفیہ سازشوں اور دسیسہ کاریوں نے نیز

---

[1] امام شافعیؒ نے کتاب الام ج ۷، ص ۲۵۲ پر اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ ۱۲

بہت سی نومسلم اقوام کے ناآشنا اسلام افراد کی مداخلت اور دراندازی نے ان صحابہ کرام کی تاریخ میں ان کی جانب بہت سی ایسی باتوں کو منسوب کر دیا جو ہمیں یقین ہے کہ انھوں نے ایک دوسرے کے متعلق ہرگز نہیں کہیں اور ان مقدس ہستیوں کے بارے میں ہرگز باور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کی ایسی پستی تک اتر سکتے ہیں۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس قسم کی جھوٹی روایات کو شیعہ حلقے بڑی دلچسپی کے ساتھ کان لگا کر سنتے ہیں بلکہ جس گروہ نے سب سے پہلے ان کبار صحابہ کے خلاف زبان درازی اور دریدہ دہنی اختیار کی اور ان کے بالمقابل حضرت علی کے حق میں اور ان کے فضائل کے بارے میں جھوٹی روایات سے اپنی مجلسیں گرم کیں وہ شیعہ ہی ہیں یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا شیعہ محققین نے بھی اعتراف کیا ہے جیسا کہ ہم اس سے پہلے شیعہ مکتب فکر کے ایک محقق ابن ابی الحدید کا بیان نقل کر چکے ہیں۔

کبار صحابہ کے متعلق خوارج کا نظریہ

بات کچھ بھی ہو، صحابہ کے درمیان اس داخلی نزاع اور اختلاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کبار صحابہ کے بارے میں شیعہ اور خوارج میں سے ہر ایک فرقہ نے جمہور مسلمین سے بالکل مختلف اور برعکس اپنا اپنا نظریہ قائم کر لیا۔

تمام خارجی فرقے باہمی اختلاف کے باوجود اس پر سب متفق ہیں کہ اس فتنہ (خانہ جنگی) سے پہلے کے تمام صحابہ ثقہ اور عدول ہیں لیکن اس فتنہ کے بعد تو انھوں نے حضرت علی کو حضرت عثمان کو اصحاب جنگ جمل کو دونوں حکموں (ثالثوں) کو اور ان تمام صحابہ و تابعین کو جو تحکیم (ثالثی) سے متفق تھے اور دونوں حکموں (ثالثوں) کو یا ان میں سے کسی ایک کو حق پر سمجھتے تھے سب کو کافر اور اسلام سے خارج قرار دیا ہے۔[1]

اسی بنیاد پر انھوں نے اس فتنہ کے بعد تمام احادیث کو رد کر دیا کیونکہ وہ سب

---

(1) الفرق بین الفرق ص ۴۵

تحکیم (ثالثی) سے متفق تھے اور خارجی عقیدہ کے مطابق ائمۂ جور (ظالم حکمرانوں) کی پیروی کر رہے تھے اس لئے کافر اور اسلام سے خارج تھے ان کی حدیثیں قبول نہیں کی جا سکتیں (باقی فتنے سے پہلے کے صحابہ اگرچہ ثقہ اور عدول تھے مگر اُن سے حدیثیں روایت کرنے والے چونکہ العیاذ باللہ یہی کافر صحابہ و تابعین ہیں اور کافر راوی کی روایت کردہ حدیث کے قبول کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اس طرح پورا کا پورا ذخیرہ سنت و حدیث خارجی مکتب فکر کے نزدیک مردود اور ناقابل اعتبار ہے (نعوذ باللہ منہ)

شیعوں کا نظریہ

شیعہ مکتب فکر کے تمام فرقے ــ یعنے وہ تمام شیعہ فرقے جو اسلام کے دائرہ میں داخل رہے ہے ــ متفقہ طور پر حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور ان تمام صحابہ پر ــ مہاجرین ہوں یا انصار ــ طعن و تشنیع کرتے ہیں ان کو مجروح قرار دیتے ہیں جنہوں نے ان اصحاب ثلاثہ کا ساتھ دیا

اسی طرح وہ حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ اور ان تمام صحابہ کو جو حضرت علیؓ سے ــ ان کے عقیدہ کے مطابق ــ خلافت چھیننے کی سازش میں ان کے ساتھ شریک تھے سب کو (خائن و فاسق اور) مطعون و مجروح قرار دیتے ہیں شیعہ ذہنیت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ وہ جمہور صحابہ کو مجروح کہیں (اور ان کی حدیثوں کو رد کریں) بجز ان چند صحابہ کے جو حضرت علیؓ کی حمایت اور ان کا ساتھ دینے کے لئے معروف ہیں۔ بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ یہ صرف پندرہ صحابی ہیں۔

اسی بنیاد پر شیعہ نے بجز شیعانِ علیؓ کے اور تمام صحابہ کی احادیث کو رد کر کے قبول احادیث کے بارے میں اپنا ایک الگ معیار اور مسلک قائم کر لیا کہ وہ صرف ان صحابہ کی روایتوں کو قبول کریں گے جو حضرت علیؓ کے طرفدار تھے یہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ وہ ائمہ اہلبیت کے واسطہ سے مروی ہوں اس لئے کہ ان ائمہ اہلبیت کے متعلق شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ معصوم تھے یا ان لوگوں کی سندوں سے مروی ہوں جو ان کے ہم مسلک یعنی شیعہ تھے۔

شیعہ مکتب فکر کا عام ضابطہ قبول حدیث کے باب میں یہ ہے کہ جس شخص نے بھی حضرت علیؓ سے موالات نہیں کی اور ان کا ساتھ نہیں دیا وہ خائن و فاسق ہے اس نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت میں خیانت کی اور ائمہ حق سے نزاع کیا اس لئے وہ ثقاہت کے درجہ سے گر گیا روایت حدیث میں اس پر بھروسہ اور اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

زیدیہ کا مسلک

شیعہ مکتب فکر کے صرف ایک فرقہ نے جمہور شیعہ کے اس نظریہ سے اختلاف کیا ہے۔ یہ فرقہ زیدیہ ہے جو حضرت ابوبکر و عمر کے مقابلہ پر حضرت علی کی تفضیل و ترجیح کا تو قائل ہے مگر اسی کے ساتھ زیدیہ کا یہ بھی عقیدہ کہ شیخین ۔ ابوبکر و عمر ۔ کی خلافت شرعاً درست تھی شیعہ میں یہی ایک فرقہ ہے جو شیخین کے فضائل کا برملا اعتراف کرتا ہے۔ اسی لحاظ سے شیعہ مکتب فکر کے تمام فرقوں میں فرقہ زیدیہ سب سے زیادہ اعتدال پسند ہے ان کی فقہ بھی اہل سنت کی فقہ سے بہت قریب ہے (ہمارے عرف میں انکو تفضیلی شیعہ کہتے ہیں)

جمہور مسلمین کا نظریہ

رہے عام مسلمان تو ان کا تو متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ تمام صحابہ ثقہ اور عدول ہیں خواہ وہ فتنہ کے پہلے ہوئے ہوں یا بعد میں اور خواہ وہ فتنہ میں شریک ہوئے ہوں خواہ ناطرفدار رہے ہوں اور ان تمام صحابہ سے جو بھی عادل اور ثقہ راوی احادیث روایت کرتے ہیں ان کو بے چون وچرا صحیح مانتے اور قبول کرتے ہیں بجز حضرت علی کی اُن روایات کے جو حضرت علی کے طرفداروں یعنی شیعانِ علی کے واسطے سے مروی ہوں۔ ایسی روایتوں میں وہ صرف اُن روایتوں کو صحیح تسلیم کرتے ہیں جو حضرت علی سے عبداللہ بن مسعود کے تلامذہ کی سند سے مروی ہیں کیونکہ یہ حضرات محدثین کی تحقیق کے مطابق سب ثقہ اور ہر طرح کی خیانت سے محفوظ ہیں، یہ حضرت علی کے رافضی اور شیعہ تبعین کی طرح ان پر جھوٹ بولنے کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔

اختلاف نظریات کا اثر سنت پر

صحابہ کے بارے میں اس نظریاتی اختلاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ سنت کا وہ ذخیرہ جو صحابہ کے عہد سے لیکر عہد جمع تدوین حدیث تک حاملین سنت نے یعنی صحابہ و تابعین و تبع تابعین نے بڑی کاوشوں کے بعد جمع کیا تھا اور محدثین و ائمہ نقد حدیث نے اسے نقد و تحقیق کے علمی معیار پر پرکھ کر صحیح احادیث کو کتب حدیث میں مدون کیا تھا شیعہ مکتب فکر کی جانب سے اس کی صحت پر طرح طرح کے

حملے کئے گئے اور جمہور محدثین کی صحیح احادیث پر کذب فی الحدیث اور وضع حدیث کے الزامات لگائے گئے خاص کر ان صحابہ کے فضائل سے متعلق احادیث جن کو جمہور شیعہ اپنا حریف گردانتے ہیں۔ ان شیعہ حضرات نے ائمۂ اہل سنت کی صرف ان احادیث کو صحیح تسلیم کیا جو ان احادیث کے موافق تھیں جن کو وہ اپنے ائمہ معصومین سے روایت کرتے ہیں۔ اس معاندانہ رویہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیعہ حضرات نے ائمہ اہل سنت کی ان تمام احادیث کو موضوع اور جھوٹا قرار دیدیا جو جمہور محدثین کے نزدیک اعلیٰ درجہ کی صحیح حدثیں ہیں۔

مثال کے طور پر اس صحیح حدیث کو لیجئے جس کی امام بخاری نے صحیح بخاری میں تخریج کی ہے کہ :-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مسجد نبوی کے اردگرد) صحابہ کے مکانات کے دریچوں کو جو مسجد نبوی کے صحن میں کھلتے تھے بند کرنے کا حکم دیدیا بجز ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دریچہ کے (کہ اسے کھلا رہنے دیا)

اس حدیث میں وہ تمام شرائط صحت موجود ہیں جو کسی حدیث کے صحیح ہونے کے لئے جمہور محدثین کے نزدیک ضروری ہیں نیز یہ حدیث صحیح علمی تنقید کے لحاظ سے بھی ہر طرح کے ضعف اور شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ لیکن شیعہ مکتب فکر کے نزدیک بالکل جھوٹی ہے، اور اس حدیث کے مقابلہ میں گھڑی گئی ہے جس کو وہ صحیح مانتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام دریچے بند کر دینے کا حکم دیدیا تھا بجز حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دریچے کے،

اس کے بالکل برعکس ایک اور مثال لیجئے جس میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہ "غدیر خم" والی وصیت کی حدیث ہے جو تقریباً تمام شیعہ مکاتب فکر کا بنیادی ستون بلکہ سنگ بنیاد ہے اسی حدیث کی بنیاد پر تمام شیعوں نے جمہور صحابہ کے بارے میں اپنا مخصوص نظریہ ــ تفسیق اور طعن و تشنیع ــ قائم کیا ہے اور اسی حدیث کو خلفاء ثلاثہ اور ان کے طرفدار تمام صحابہ سے متعلق اپنے نزاع و خصومت کی بنیاد بنایا ہے اور ان کے خلاف محاذ قائم کیا ہے۔ اہل سنت کے نزدیک یہ حدیث وصیت بالکل جھوٹی اور بے اصل ہے۔ علماء اہل سنت کے خیال میں غالی شیعوں

اور رافضیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی دیانت پر حملے کرنے اور تہمتیں تراشنے کا جواز پیدا کرنے کے لئے اس کو گھڑا ہے۔ ہم اس سے پہلے باب میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ ائمہ نقد حدیث نے کسی حدیث کی صحت کو جانچنے کے لئے جو محکم قواعد و اصول تجویز کئے ہیں وہ اس حدیث کے جھوٹ ہونے کا کس طرح قطعی فیصلہ کرتے ہیں۔

میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ کوئی بھی انصاف پسند اور غیر جانبدار محقق اس حدیث کے بارے میں جمہور محدثین کی تحقیق کی تائید کئے بغیر نہیں رہ سکتا اس لئے کہ عقلاً یہ بات قطعاً محال معلوم ہوتی ہے کہ تمام کے تمام صحابہ — حتیٰ کہ بنو ہاشم اور اہلبیت بھی — ایک عرصہ دراز تک اُس وصیت کے معاملہ کو چھپائے بیٹھے رہیں۔ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بزعم شیعہ تمام صحابہ کی موجودگی میں علی الاعلی فرمائی تھی۔

اسی طرح یہ بھی عقلاً محال معلوم ہوتا ہے کہ تمام کے تمام صحابہ آپس میں سازش کر کے حضرت علی کا حق مار لیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح حکم چھپا لیں دراں حالیکہ اللہ کے دین کو ہو بہو بغیر کسی کمی بیشی کے خلق خدا تک پہونچانے کے بارے میں ان کی حرص تو اس حد تک پہونچی ہوئی تھی کہ وہ اپنے امیر اور حکمرانوں تک کے سامنے بلا کسی عقوبت اور مواخذہ کے خوف کے برملا حق بات کہدیا کرتے تھے۔ ان کی حق گوئی کا یہ جذبہ — دین کے اہم امور میں ہی نہیں بلکہ — شب و روز کے معمولی مسائل و احکام میں بھی کار فرما تھا تو بھلا وہ وصیت جو آپ نے تمام صحابہ کو جمع کر کے علی الاعلان فرمائی ہو اور متعین فرما دیا ہو کہ آپ کے بعد خلیفہ فلاں شخص ہوگا، اس کو تو یہ صحابہ کیسے چھپا سکتے ہیں؟ اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کی عمداً مخالفت کسی بھی امر میں آپ کی نافرمانی اور فسق کا حکم رکھتی ہے اور اگر کوئی شخص اس مخالفت اور نافرمانی کو حلال اور جائز سمجھے تب تو یہ کفر ہے۔

کاش کوئی مجھے سمجھائے کہ جبکہ رسول کے تمام کے تمام صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنے لگ جائیں اور حضرت علی سے متعلق اپنے نبی کی وصیت کو چھپائے بیٹھے رہیں اور اس کے نتیجہ میں وہ سب کے سب خائن و فاسق یا کافر ہو جائیں تو وہ پورا دین اور شریعت جو انہی کے ذریعہ ہم تک پہونچی ہے۔ اس پر ہم کیونکر اطمینان کر سکتے ہیں (کہ اس

میں کوئی خیانت نہیں ہوئی)

اور کیا یہ بات خاتم انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے شایان شان ہو سکتی ہے کہ تئیس سال میں آپ کے تربیت کردہ آپ کے صحابی — شب و روز کے رفیق — خیانت کار، دھوکہ باز اور جھوٹے ہوں اور حق کو چھپانے اور آپ کے ایک قریبی عزیز مدامد — صحابی سے دشمنی کرنے اور اس کے خلاف محاذ بنانے پر متفق ہو جائیں؟

سنت کے بارے میں شیعہ اور خوارج کے رویہ میں فرق

جمہور صحابہ و تابعین کی احادیث کے معاملہ میں جو موقف شیعوں نے اختیار کیا نتیجہ کے اعتبار سے انہی سے ملتا جلتا موقف خوارج نے بھی اختیار کیا۔ اگرچہ خوارج شیعوں کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنے کی رذیلت میں نہیں گرے کیونکہ خارجی بڑے صاف گو، پرہیزگار اور دیہاتیوں کی طرح سادہ لوح ہوتے تھے تقیّہ کے مسلک کو اختیار کرنے سے بھی وہ بہت دور اور محفوظ تھے جس پر تمام شیعہ مکاتب فکر کا ایمان ہے لیکن اُنھوں نے بہت سے عقائد و شرعی احکام کے معاملہ میں — اپنے مخصوص معتقدات کی بنا پر — جمہور صحابہ و تابعین و تبع تابعین کی — احادیث — کی بڑی شدت سے مخالفت کی (اور ان کی تمام احادیث کو اُنھیں کافر یا خارج از اسلام کہہ کر رد کر دیا) مثلاً وہ ایک عورت اور اس کی خالہ یا پھوپی کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنے (اور بیوی بنانے) کو جائز قرار دیتے ہیں (حالانکہ بربنائے احادیث صحیحہ ائمہ اربعہ اور جمہور علمائے اسلام کے نزدیک قطعاً حرام ہے) یا وہ "رجم" (شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنے) کا انکار کرتے تھے جو احادیث (اور عہد نبوت کی تاریخ) سے قطعاً ثابت ہے۔

خوارج کے اس انکار کا سبب یہ ہرگز نہ تھا کہ وہ دین سے ناواقف تھے، اللہ جل جلالہٗ کے مقابلہ میں گستاخ و بیباک تھے اور خدا و رسول نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے وہ ان کو حلال بنا لیتے تھے جیسا کہ عہد حاضر کے اہل قلم مصنفین کا خیال ہے بلکہ اس انکار و مخالفت کا سبب یہ تھا کہ خوارج نے اپنے بنیادی عقیدہ کے مطابق ان تمام حدیثوں کو رد کر دیا تھا (جن سے یہ احکام ثابت تھے اور) جو خانہ جنگی کے فتنہ کے بعد ظہور میں آئی تھیں یا جن کے راوی (صحابہ یا تابعین

وغیرہ) اس فتنہ میں شریک تھے۔

اور ظاہر ہے کہ ردو قبول احادیث کا یہ معیار تو اسلام اور مسلمانوں کے لئے یقیناً ایک مصیبت عظمیٰ ہے کہ ہم ان تمام صحابہ کی عدالت (اور دیانت و امانت) کو صرف اس وجہ سے ساقط قرار دیدیں کہ وہ حضرت علی اور حضرت معاویہ کے نزاع میں شریک تھے یا ان کی حدیثوں کو رد کردیں اور ان کے کافر یا فاسق ہوجانے کا حکم لگادیں۔

خوارج اپنے اس عقیدہ کی بنا پر دین کے لئے خطرناک مضرت رساں اور نتائج بد کا موجب ہونے کے اعتبار سے شیعوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ معقولیت کا تقاضہ یہ ہے کہ جبکہ کسی روایت کے قبول کرنے کا مدار شرعاً و عقلاً راوی صحابی کی راست گوئی اور دیانت و امانت پر ہے اور یہ صفات ان حضرات میں مسلمہ طور پر بدرجہ اتم موجود تھیں، جھوٹ بولنا ان کی فطرت سے ان کے دین سے ان کی نبوی تربیت سے کوسوں دور تھا تو پھر ان کے سیاسی نظریات، اختلافات اور اجتہادی غلطیوں کا ان کی مرویات کو قبول کرنے میں قطعاً دخل نہ ہونا چاہیئے۔

کیا یہ بالکل ایسی ہی ہٹ دھرمی نہیں ہے جیسے کوئی شخص کسی ایسے قومی رہنما کو جس نے قومی معاملات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہوں اور اپنے قلم سے زبان سے اور جان و مال سے استعمار۔ سامراج۔ کے ڈٹ کر مقابلے کئے ہوں اس کو ملی قائدین اور قومی رہنماؤں کے زمرہ سے خارج قرار دیدے اس کی تمام قومی خدمات اور قربانیوں کا صاف صاف انکار کردیا جائے اور اس کے تمام بیانات کو جھوٹ کہہ کر رد کردیا جائے صرف اس لئے کہ اتفاق سے حریف پارٹیوں میں سے وہ ایسی پارٹی کا لیڈر رہتا جس کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور تھی اور اتفاق سے اس حزبِ اقتدار کو حق پر سمجھنے میں وہ غلطی کر بیٹھا یا اس نے کسی دوسرے قومی لیڈر کا مقابلہ کیا یا اس کے خلاف محاذ قائم کیا۔ جب تاریخ اور حق و انصاف کی رو سے کسی قومی لیڈر کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا جاسکتا تو شیعہ اور خوارج کو بھی ان صحابہ کرام کے بارے میں جو سیاسی موقف میں حضرت علی سے متفق نہ تھے یا خانہ جنگی کو ختم کرنے کی غرض سے انھوں نے تحکیم (ثالثی) کو قبول کرلیا، یہ فیصلہ کرنے کا قطعاً حق نہیں پہونچتا کہ وہ ان امناءِ دین کی عدالت و صداقت کو ساقط کردیں ان کی روایات کے باب میں ان کو مجروح اور ناقابل اعتماد قرار دے کر رد کردیں اور ایسے

اتہامات والزامات سے ان کے پاک وصاف دامن کو آلودہ اور داغدار بنائیں جو عوام کی سطح سے بھی گرے ہوئے ہیں۔ پھر مربی اُمت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ان صحابیوں کے ساتھ یہ معاملہ جن کے قدم پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اسلام کی خدمت وفداکاری میں انتہا درجہ استوار تھے۔ اگر ان فدائیان اسلام و پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اسلام کی حفاظت وصیانت میں یہ خدمات نہ ہوتیں تو ہم آج جہل ومحرومی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھٹکتے اور ہاتھ پاؤں مارتے پھرتے اور قطعاً راہ ہدایت پانے اور حق تک رسائی میں کامیاب نہ ہوتے۔

خلاصہ:- مختصر یہ ہے کہ سنت اور احادیث صحیحہ کو ان شیعہ اور خوارج کے ہاتھوں بڑی مشقتیں اٹھانی پڑی ہیں اور حاملین دین صحابہ وتابعین کے بارے میں ان دونوں فرقوں کے سرکشانہ اور بے لگام عقائد ونظریات، فقہی اور کلامی اختلافات پر بجید اثر انداز ہوئے ہیں اور سنت وحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تمام تر شکوک وشبہات پیدا کرنے کے ذمہ دار ان دونوں فرقوں کے عقائد ونظریات ہیں اور ان کا معاندانہ رویہ ہے۔

اس سلسلہ میں مزید بحث ہم مستشرقین اور ان کے متبعین کے شکوک وشبہات کے بیان کے ذیل میں کریں گے۔

دوسری فصل

متقدمین میں منکرینِ سُنّت

ابھی دوسری صدی ہجری آئی بھی نہ تھی کہ سنت کو ایک اور آزمائش سے گزرنا پڑا، کچھ فرقے تو ایسے پیدا ہو گئے جو اسلامی شریعت کا ماخذ ہونے کی حیثیت سے سُنّت کے حجت (اور دلیل شرعی) ہونے کا انکار کرتے تھے اور کچھ فرقے متواتر احادیث کے علاوہ باقی تمام احادیث — جو خبرِ واحد کے طور پر وارد ہیں — کے حجت ہونے کا انکار کرتے تھے اور بعض فرقے ہر اُس سنت اور حدیث کا انکار کرتے تھے جو قرآن عظیم کی نصوص کے بیان یا تاکید و تائید کے طور پر وارد نہ ہو، بلکہ ان سے — نصوص قرآن پر مستزاد — کوئی مستقل حکم نکلتا ہو۔

ہمارے علم میں ان سنت کے مخالف فرقوں کا جس محدث نے سب سے پہلے مقابلہ کیا وہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ امام شافعی نے اپنی معروف کتاب کتاب الاُمّ کی ساتویں جلد میں اس موضوع پر خاص طور سے ایک مستقل فصل قائم کی ہے اور اس میں امام شافعی نے منکرین سنت کے ایک بڑے عالم کے ساتھ اپنے مناظرہ کا ذکر کیا ہے اسی طرح امام شافعی نے اپنی دوسری کتاب الرسالہ میں خبرِ واحد[1] کے حجت شرعیہ ہونے پر ایک

---

[1] خبرِ واحد اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے راویوں کی تعداد صحابہ اور تابعین کے ادوار میں اتنی زیادہ نہ ہو جس سے اس کا یقین حاصل ہو سکے کہ ان راویوں نے اس حدیث کے روایت کرنے اور جھوٹ بولنے پر باہمی اتفاق کرنے سازش کی ہے۔ مترجم۔

طویل فصل قائم کی ہے۔ ذیل میں ہم کتاب الام سے مناظرہ کا اقتباس نقل کرتے ہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں:-

ایک مدعی نے جو اپنے گروہ منکرین حدیث وسنت کا بڑا عالم کہلاتا تھا مجھ سے کہا:-

آپ عربی النسل ہیں اور قرآن اُس قوم — عرب — کی زبان میں اترا ہے جس کے آپ ایک فرد ہیں اور آپ قرآن کے حرف بحرف محفوظ ہونے کو بھی سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ قرآن کا ایک حصہ وہ احکام الٰہیہ اور فرائض ہیں جو اللہ نے نازل فرمائے ہیں کہ اگر ان فرائض میں سے کسی ایک حرف کے متعلق بھی کوئی شک وشبہ کرنے والا اپنے شک وشبہ کا اظہار کرتا ہے تو آپ فوراً اس سے توبہ کراتے ہیں اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو فبہا ورنہ آپ اسے قتل کر ڈالنے کا حکم لگا دیتے ہیں۔

نیز قرآن مجید کے بارے میں اللہ تعالیٰ صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں:-

تبیانا لکل شئی — قرآن میں ہر چیز کا واضح بیان موجود ہے

تو ایسی صورت میں خود آپ یا کوئی بھی (قرآن کو ماننے اور جاننے والا) اس امر کا مجاز کیسے ہو گیا کہ جس چیز کو خدا نے (قرآن میں) فرض کیا ہے اس کے بارے میں کبھی کہہ دے: یہ فرض عام ہے، کبھی کہہ دے: یہ فرض خاص ہے، اور کہیں یہ کہہ دے: اس میں امر (حکم) فرض ہے (اور عبارت النص سے ثابت ہے) اور کہیں یہ کہے: اس میں امر (حکم) دلالت النص (سے ثابت) ہے۔ اور جہاں چاہا کہہ دیا: یہ امر اباحت کے لئے ہے۔

اکثر وبیشتر فرائضِ قرآن میں آپ کی اس تفریق (فرق کرنے) کا مدار ان ایک، دو یا تین حدیثوں پر ہوتا ہے جن کو آپ دوسرے لوگوں (راویوں) سے (سلسلہ بسلسلہ) روایت کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچا دیتے ہیں۔ حالانکہ میں آپ کو اور آپ کے ہم مسلک حدیث کو ماننے والوں (محدثین) کو دیکھتا ہوں کہ کسی بھی ایسے

راوی حدیث کو جس سے آپ یا آپ کے مشائخ خود ملے ہوں اور اس کا صدق (سچ بولنا) اور حفظ حدیث (حدیثوں کو یاد رکھنا) آپ کے نزدیک مسلم ہو، اس کے باوجود اس راوی حدیث کو آپ سہو و نسیان سے اور خطا سے مبرا (اور معصوم) نہیں مانتے یہی صورت حال آپ کے مشائخ کی بھی ہے (وہ بھی اپنے مشائخ کو سہو و نسیان اور خطا سے مبرا نہیں مانتے) بلکہ میں نے تو آپ حضرات کو اکثر رواۃ حدیث کے بارے میں یہ تک کہتے سُنا ہے کہ: فلاں راوی نے فلاں حدیث میں یہ غلطی کی اور فلاں راوی نے فلاں حدیث میں یہ غلطی کی۔

نیز میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ اگر کوئی دوسرا شخص، کسی ایسی حدیث کے متعلق جس سے آپ نے (کسی خاص مسئلہ میں) حلال ہونے یا حرام ہونے کا حکم لگایا ہے، کہہ دیتا ہے کہ: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا یہ تو آپ سے یا جس نے آپ سے حدیث بیان کی اس سے غلطی ہوئی ہے اور آپ نے یا آپ سے حدیث بیان کرنے والے نے جھوٹ بولا ہے" تو آپ اس شخص سے قطعاً توبہ کا مطالبہ نہیں کرتے بلکہ اس سے زائد کچھ نہیں کرتے کہ کہہ دیتے ہیں: تم نے بہت بُری بات کہی ہے (حدیث کے ادب و احترام کے خلاف ہے یعنی کسی خاص حدیث کے منکر کو آپ اس طرح کافر نہیں کہتے جیسے قرآن کے کسی ایک حرف میں شبہ کرنے والے کو کافر کہتے ہو اس فرق کے باوجود) قرآن کے کسی بھی ظاہر اور منصوص حکم میں، مذکورہ بالا قسم کے راویوں کی روایت کردہ احادیث کی بنا پر کسی بھی شخص کے لئے یہ فرق کرنا جائز ہے (کہ کسی حکم کو فرض کہے کسی کو مباح، کسی کو عام، کسی کو خاص، کسی کو عبارت النص اور کسی کو دلالت النص) اور تم ایسی حدیثوں سے اخبار آحاد سے کو کتاب اللہ کا درجہ دیتے ہو اور (کسی کام کا حکم) دیتے ہو اور (کسی کام سے) منع کرتے ہو"

ممکن ہے کہ کوئی چیز اس یقین (علم) کے قائم مقام ہو جائے اور قرآن میں نہ ہو۔

امام شافعی: جس شخص کو اُس زبان (عربی) کا علم ہو (اور عربیت کا صحیح ذوق ہو) جس میں اللہ کی کتاب اور اس کے احکام (نازل ہوئے) ہیں اُس کو، ان دونوں (کتاب اللہ اور احکام الٰہیہ) کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص وعام سچے صحابیوں کی احادیث کو جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کریں، قبول کرنے کی رہنمائی کرے گا اور وہ ضرور صحابۂ رسول اللہ کی حدیثوں کو قبول کرے گا یعنی ایک طرف قرآن رسول اللہ کی حدیثوں کو قبول کرنے کا حکم دیتا ہے دوسری طرف آپ کے تمام صحابہ کے سچے ہونے کی گواہی دیتا ہے ایسی صورت میں ہر قرآن کو جاننے اور ماننے والے پر بحکم قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو قبول کرنا فرض ہے اور جو شخص حدیثوں کا انکار کرتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ قرآن کا انکار کرتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

لہذا ہر قرآن کو ماننے والے کا فرض ہے کہ وہ آپ کی احادیث کو بھی مانے) اس کے بعد امام شافعی نے اپنے اس دعوے پر دلائل قائم کرنے شروع کئے چنانچہ اُنھوں نے کہا:

قال اللہ عزوجل: ھوالذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلو علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمہ	خدا وہ ہے جس نے ایک غیر کتابی قوم میں انہی میں کا ایک رسول بھیجا جو ان پر اللہ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور (تمام اعتقادی اور اخلاقی گندگیوں سے) ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس پر مناظر نے کہا: کتاب اللہ کو تم ہم جانتے ہیں یہ حکمت کیا (چیز) ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں: میں نے کہا یہ (حکمت) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت (حدیث) ہے

مناظر: یہ بھی تو احتمال ہے (کہ کتاب اور حکمت دو چیزیں نہ ہوں بلکہ مراد یہ ہو) کہ وہ رسول ان کو علی العموم پوری کتاب کی بھی تعلیم دیتا ہے اور بخاص کر حکمت یعنے کتاب کے احکام کی بھی (اس لحاظ سے حکمت کتاب سے کوئی علیحدہ چیز نہ ہوگی بلکہ کتاب ہی کا ایک حصہ یعنے احکام ہوگا اور عربیت کے لحاظ سے عطف جزء علی الکل ہو جائے گا)

امام شافعی: گویا آپ کے نزدیک (آیت کریمہ کی) مراد یہ ہوئی کہ وہ رسول ان کے سامنے اللہ عزوجل کی جانب سے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ فرض احکام کی (جن کا ذکر قرآن میں ہے) اور احکام کی طرح کیفیت (اور عملی صورت) بیان کرتا ہے، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ عزوجل نے اپنے فرض کردہ احکام تو محکم طور پر (خود قرآن میں) بیان کر دیئے اور ان پر کس طرح عمل کیا جائے، یہ بات اپنے نبی کی زبان سے بیان کر دی (لہذا رسول کے بیان کا نام حکمت ہوا اسی کو سنت رسول کہتے ہیں لہذا تمہارے قول کے موجب بھی حکمت کا مصداق سنت ہوئی)

مناظر: بیشک اس کا احتمال ہے (کہ رسول کے بیانِ کیفیتِ احکام کا نام حکمت ہو)

امام شافعی:- اگر تم یہ مسلک اختیار کرتے ہو تو یہ تو وہی پہلی بات ہوئی (کہ حکمت کا مصداق سنت ہے) جس کو تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے ذریعہ ہی جان سکتے ہو (لہذا تمہیں احادیث کو قبول کرنا پڑے گا)

مناظر: تو اگر میں کلام کے تکرار (یعنے تاکید) کا مسلک اختیار کر لوں (یعنی میں یہ کہوں کہ کتاب اور حکمت دونوں ایک ہی چیز ہیں جیسے اللہ کی کتاب کا نام کتاب ہے ایسے ہی اس کے احکام کا نام حکمت ہے لفظوں کے الگ الگ

ہونے کی وجہ سے بغرض تاکید حکمت کا کتاب پر عطف کر دیا ہے اس صورت میں حکمت کا رسول سے کوئی خاص تعلق نہ رہے گا کہ حدیثوں کے قبول کرنے نہ کرنے کا سوال پیدا ہو)

امام شافعی :- (اس کا خود تم ہی فیصلہ کرو کہ رسول کے فرائض بیان کرنے کے موقعہ پر) جب کتاب اور حکمت کا ذکر کیا جائے تو یہ بہتر ہے کہ کتاب اور حکمت دو چیزیں ہونی چاہئیں یا یہ بہتر ہے کہ دونوں سے مراد ایک ہی چیز ہو۔

مناظر: یہ بھی احتمال ہے کہ تمہارے بیان کے مطابق (کتاب وحکمت) کتاب و سنت ہوں تو دو چیزیں ہو جائیں گی اور یہ بھی احتمال ہے کہ کتاب وحکمت ایک ہی چیز ہوں (اور حکمت کا عطف کتاب پر صرف لفظی مغائرت کی بنا پر بطور تاکید ہو)

امام شافعی :- تو ان دونوں احتمالوں میں سے جو احتمال (از روئے عربیت) قوی ہوگا وہی قابل ترجیح ہوگا (اور عربیت کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ کسی کلام کو تاکید پر محمول کرنے کی بہ نسبت تاسیس[۱] - افادۂ جدید - پر محمول کرنا بہتر ہے)

امام شافعی فرماتے ہیں: اور قرآن میں (صرف یہی ایک آیت نہیں ہے بلکہ) اور بھی آیات موجود ہیں جو ہمارے بیان کی تائید کرتی ہیں اور تمہارے مسلک کی تردید۔

---

[۱] یعنی اگر یہ کہا جائے کہ کتاب وحکمت دونوں ایک ہی چیز ہیں اور لفظی فرق کی وجہ سے حکمت کا عطف کتاب پر بطور تاکید کر دیا ہے تو اس صورت میں اس آیت سے ثابت ہوگا کہ رسول صرف ایک چیز کی تعلیم دیتے ہیں چاہے اسے کتاب کہہ لو چاہے حکمت چاہے قرآن وغیرہ ایسی صورت میں حکمت کے لفظ کا ذکر کرنا نہ کرنا برابر ہوگا بلکہ بے معنی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ کتاب اور حکمت دو الگ چیزیں ہیں تو اس آیت سے ثابت ہوگا کہ رسول صرف کتاب کی ہی نہیں بلکہ حکمت کی بھی تعلیم دیتے ہیں جو ایک (باقی صفحہ ۳۰۷ پر)

مناظر: وہ آیات کہاں ہیں (ذرا پڑھئے)

امام شافعی:- اللہ بزرگ و برتر کا ارشاد ہے :-

واذکرن ما یتلی	اور یاد کرو جو کچھ بھی (قرآن کی) آیات
فی بیوتکن من آیات اللہ	اور حکمت (شریعت کے احکام)
والحکمت ان اللہ کان	تمہارے گھروں میں بیان کئے جاتے ہیں
لطیفاً خبیرا	ہیں، بیشک اللہ بڑا ہی مہربان باخبر ہے

دیکھو! اس آیتِ کریمہ میں اللہ جل مجدہٗ (ازواج مطہرات کو) خبر دے رہے ہیں۔ کہ ان کے گھروں میں دو چیزیں تلاوت کی جا رہی ہیں (اور ان دونوں چیزوں کو یاد رکھنے کا حکم فرما رہے ہیں)

ایک آیات قرآن اور ایک حکمت۔

مناظر: یہ قرآن تو بیشک تلاوت کیا جاتا ہے لیکن حکمت کیسے تلاوت کیجاتی ہے؟

امام شافعی:۔ (اس آیت میں) تلاوت کے معنی ہیں: قرآن و سنت کا نطق[1] کیا جا رہا ہے یعنے بیان کیا جا رہا ہے اور ظاہر ہے کہ ازواج مطہرات کے گھروں میں قرآن کی طرح سنت کا بھی نطق کیا جاتا تھا یعنی بیان کیا جاتا تھا۔

(حاشیہ صفحہ ۳۰۶) جداگانہ اور مستقل چیز ہے اس صورت میں حکمت کے لفظ کا ذکر کرنا نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہوگا اور ظاہر ہے کہ اللہ کا کلام ایسے بے معنی اور بھرتی کے الفاظ سے یقیناً پاک ہے لہذا دوسرا احتمال قطعاً صحیح ہے اور کتاب و حکمت دو مستقل چیزیں ہیں کتاب و سنت ۔ جن کی تعلیم دینا آپ کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔

[1] نطق کے لفظی معنی میں بولنا یعنے زبان سے کسی بات کو ادا کرنا اور قرآن کریم شہادت دے رہا ہے کہ آپ جو بات بھی زبان سے کہتے ہیں وہ اپنی خواہش سے نہیں کہتے بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو آپ کے پاس بھیجی جاتی ہے ارشاد ہے :-

وما ینطق عن الھوی ۔ آپ اپنی خواہش سے نہیں بولتے جو کچھ بولتے ہیں وہ

(باقی صفحہ ۳۰۸ پر)

مناظر: تو یہ آیت تو اس بارے ہیں کہ حکمت قرآن کے علاوہ کوئی چیز یعنے سنت ہے، پہلی آیت سے زیادہ واضح ہے۔

امام شافعی:۔ (علاوہ ازیں) اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے کو ہم پر فرض کیا ہے (اور پیروی آپ کے اقوال و افعال کے بغیر ہو نہیں سکتی اور اس کے علم کا ذریعہ صرف آپ کی احادیث ہیں لہذا اس فرض کی تعمیل قبول احادیث کو لازم قرار دیتی ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۳۰۷) ان ھو الا وحی یوحی وحی ہوتی ہے جو آپ کے پاس بھیجی جاتی ہے

لہذا جو بات بھی آپ کی زبان مبارک سے نکلے گی وہ وحی ہوگی خواہ اللہ کا کلام ہو یعنی الفاظ بھی اللہ کے ہوں خواہ الفاظ آپ کے ہوں اور معنی اللہ کے القا کئے ہوئے ہوں اس لحاظ سے آپ کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات وحی ہے خواہ قرآن ہو خواہ سنت فرق الفاظ کا ہوتا ہے اسی لئے قرآن کو وحی متلو کہا جاتا ہے اور سنت کو وحی غیر متلو یعنی قرآن کی نماز میں تلاوت کی جاتی ہے اور سنت کی نماز میں تلاوت نہیں کی جاتی باقی ہیں دونوں منجانب اللہ اس لئے اس آیت کریمہ میں تلاوت بمعنی نطق ہے اور منطوق کتاب و سنت دونوں ہیں علاوہ ازیں اس آیت کریمہ میں من آیات اللہ والحکمت بیان واقع ہوا ہے مایتلی فی بیوتکن کا جس کے یاد رکھنے کا ازواج مطہرات کو خاص طور پر حکم دیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ مرد درون خانہ کی باتوں سے واقف نہیں ہو سکتے اور ظاہر ہے کہ آپ کا شانۂ نبوت میں صرف قرآن کی آیات ہی نہیں ذکر فرماتے تھے۔ بلکہ اس کے علاوہ اور احکام شرعیہ بھی بیان فرماتے تھے اس لئے اس آیت کریمہ میں یقیناً آیات اللہ اور حکمت دو مستقل چیزیں ہونی چاہئیں تاکہ بیان مبین کے مطابق موافق ہو جائے اگر آیات اللہ اور حکمت سے مراد ایک ہی چیز ہوگی تو مبین عام ہو جائے گا اور بیان خاص، اور یہ کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ میں مناظر نے بے چون و چرا تسلیم کر لیا کہ واقعی حکمت کا مصداق آیات کے علاوہ ہونا چاہیے اور وہ سنت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

مناظر: یہ کہاں آیا ہے؟

امام شافعی: اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:۔

(۱) فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلمو تسلیما۔

پس ہرگز نہیں، قسم ہے تیرے پروردگار کی وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ ان تمام نزاعات میں جو ان کے درمیان پیدا ہوں تم کو حکم نہ مان لیں پھر جو تم فیصلہ کرو اس سے اپنے دلوں میں تنگی بھی محسوس نہ کریں اور کلی طور پر اپنے آپ کو (دل سے بھی زبان سے بھی) آپ کے سپرد کردیں۔

نیز ارشاد ہے:۔

(۲) من یطع الرسول فقد اطاع اللہ

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

نیز ارشاد ہے:۔

(۳) فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبھم فتنۃ او یصیبھم عذاب الیم۔

ان لوگوں کو جو آپ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں۔ ڈرتے رہنا چاہئے اس سے کہ ان پر (دنیا میں ہی) کوئی آفت آجائے یا (آخرت میں) دردناک عذاب میں گرفتار ہوں۔

مناظر: اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکمت کا مصداق سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی قرار دینا ہمارے حق میں بہتر ہے (اور یہی صحیح ہے) اس لئے کہ اگر وہ صحیح بھی ہو جو ہمارے فرقہ کے بعض بزرگوں نے کہا ہے کہ: بیشک اللہ جل وعلی نے ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فیصلہ کو تسلیم کرنے کا حکم دیا ہے مگر آپ کا فیصلہ وہی ہوتا ہے جو اللہ نے نازل فرمایا، تب بھی جو شخص آپ کے کسی بھی فیصلہ کو تسلیم نہ کرے۔ اس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ نہ تسلیم کرنے والا کہنے کی بہ نسبت اللہ کا فیصلہ نہ تسلیم کرنے والا کہنا زیادہ بہتر ہوگا (اس لئے کہ جبکہ آیت نمبر(۲) کے مطابق رسول کی اطاعت اللہ کی

اطاعت ہے تو رسول کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے اسی لئے آیت نمبر (۳) میں رسول کی نافرمانی کرنے والے کو شدید ترین تہدید کی گئی ہے)

امام شافعی (اس کے علاوہ) اللہ عزوجل نے امر رسول (رسول کے حکم) کا اتباع بھی ہم پر فرض کیا ہے (اور امر رسول کا علم بھی احادیث کے ذریعہ سے ہی ممکن ہے) ارشاد ہے:

ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتھوا — جو رسول تم کو حکم، دین اسکو اختیار کرو اور جس چیز سے تم کو منع کریں اس سے رُک جاؤ۔

مناظر:- قرآن (کی اس آیت) میں تو یہ بیان کیا ہے کہ ہم پر فرض ہے کہ ہم ہر اس چیز کو اختیار کریں جس کا آپ ہمیں حکم دیں اور ہر اس چیز سے باز رہیں جس سے آپ منع کریں۔

امام شافعی:- اور فرض ہم پر اور ہم سے پہلے لوگوں پر اور ہم سے بعد کے لوگوں پر یکساں ہے۔

مناظر: جی ہاں۔

امام شافعی:- پس اگر بات یہی ہے کہ ہم (سب) پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع فرض ہے تو کیا اس کا بھی ہمیں قطعی علم ہے کہ آپ ہم پر جب بھی کوئی چیز فرض کریں گے تو یہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ اس کا اختیار کرنا بھی فرض ہے؟

مناظر: جی ہاں

امام شافعی: تو اللہ نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر (احکامات) کی پیروی کرنے کا فرض، ہم پر، تم سے پہلے یا بعد کے کسی بھی شخص پر جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا، عائد کیا ہے۔

- - - - - - - - - - - کیا اس فرض کے ادا کرنے کی کوئی بھی سبیل آپ کی احادیث کو ماننے کے علاوہ ہوسکتی ہے؟ اس موقع پر امام شافعی نے اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی کہ قرآن کریم کی ایک آیت دوسری آیت کو کس طرح منسوخ کرتی ہے اور یہ کہ اس نسخ کے علم کا واحد ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہی ہوسکتا ہے اور وہ احادیث کو قبول کئے بغیر نہیں معلوم ہوسکتا۔

مناظر: بیشک آپ نے دلائل سے ثابت کردیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو قبول کرنا ہمارے لئے ناگزیر اور لابدی ہے اور اب میں بھی اس کا قائل ہو گیا کہ مسلمانوں پر حدیثوں کا اور ہر اس چیز کا ماننا فرض ہے جس کی اصل کتاب اللہ میں ہے (یعنی اجماع وقیاس)

اس کے بعد مناظر نے اپنے سابقہ عقیدہ (انکار حدیث) سے رجوع کرنے کا اور (اس مناظرہ کے بعد) جو حق (قبول حدیث) اس پر واضح ہوا اس کے قبول کرنے کا اعلان کردیا (یعنی یہ کہ میں اب منکر حدیث کے بجائے معتقد حدیث بن گیا ہوں)

اس کے بعد مناظر امام شافعی سے قرآن کریم کے ایسے الفاظ کے متعلق دریافت کرتا ہے جن کے معنی عام ہیں مگر کبھی ان سے خاص معنی مراد لے لئے جاتے ہیں اور کبھی عام اس کی کیا وجہ ہے؟

امام شافعیؒ اس کے جواب میں اس مسئلہ (تخصیص عام) کی وضاحت فرماتے ہیں:۔

> "عربی زبان میں بڑی وسعت ہے، لہٰذا اوقات عرب ایک عام لفظ بولتے ہیں اور (کسی قرینہ کی بنا پر) اس سے اسی عام کا کوئی خاص مصداق یا خاص فرد مراد لیتے ہیں (مگر) کسی عام سے خاص مراد لینا اسی وقت جائز ہوتا ہے جب اس تخصیص کی کوئی دلیل کتاب یا سنت میں موجود ہو"

اس کے بعد امام شافعی اس کی متعدد مثالیں قرآن کریم سے اس کے سامنے پیش کرتے ہیں جن میں الفاظ عام ہیں اور سنت کی بنا پر (بالاتفاق) ان میں تخصیص کی گئی ہے مثلاً (۱)، نماز (واقیموا الصلوٰۃ کے تحت) تمام مکلفین پر فرض ہے لیکن اس حکم سے حیض والی عورتوں کی تخصیص کی گئی ہے (کہ ایام حیض میں ان پر نماز فرض نہیں ہوتی اس حالت میں پڑھیں بھی تو نہ ہوگی) (۲) اسی طرح (واٰتوا الزکوٰۃ کے تحت) زکوٰۃ تمام قسم کے اموال پر عائد ہوتی ہے مگر ان اموال میں سے بعض اموال (غیر نامیہ) کی تخصیص کی گئی ہے (۳) اسی طرح (من بعد وصیۃ توصون کے تحت) وصیت ماں، باپ کے حق میں آیت میراث کی وجہ سے نہیں کی جاسکتی یعنی وصیت غیر ورثا کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے لا وصیۃ لوارث (۴) اسی طرح میراث میں ماں، باپ، اولاد وغیرہ کا حصہ علی العموم ذکر کیا گیا ہے مگر اس میں بھی (حدیث کی وجہ سے) تخصیص کی گئی ہے کہ کوئی کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا کوئی

غلام آزاد کا وارث نہیں ہوتا اور کوئی قاتل مقتول کا وارث نہیں ہوتا اور یہ تمام تخصیصین سنت ہی کی بنیاد پر کی گئی ہیں۔

(اس پر مناظر اعتراف کرتا ہے کہ فی الواقع یہ تمام تخصیصات مسلم ہیں اور ان کا علم سنت ہی سے ہوسکتا ہے) اس کے بعد مناظر کہتا ہے: میں ہمیشہ سے حدیث کی حجیت کا مخالف رہا ہوں آخر آج مجھ پر اس مسلک (انکار حجیت حدیث) کا غلط ہونا واضح ہوگیا۔ اس کے بعد کہتا ہے:
اس انکار حدیث میں بھی منکرین کے دو گروہ ہیں ان میں سے ایک گروہ بھی ایسی حدیث کو قبول نہیں کرتا جس کا بیان (یعنے ذکر) قرآن میں ہو"

امام شافعی (بطور امتحان) اُس سے دریافت کرتے ہیں: اس سے اس گروہ پر کیا خرابی لازم آتی ہے؟

مناظر:- یہ گروہ اپنے اس نظریہ کی بنا پر ایک بڑے خطرناک نتیجہ پر پہونچتا ہے وہ کہتا ہے جس شخص نے اتنا عمل کرلیا جس پر نماز یا زکوٰۃ کا اطلاق کیا جاسکے وہ اداء فرض — نماز اور زکوٰۃ — سے بری الذمہ ہوگیا۔ اس سلسلہ میں کسی قسم کی توقیت — تعیین وقت — یا تحدید — حدبندی — نہیں ہے اگرچہ ہر روز صرف دو رکعتیں پڑھ لے یا تمام ایام حیات یعنی پوری زندگی میں دو رکعت نماز پڑھ لے فرض ادا ہوگیا وہ کہتے ہیں فرض وہ ہے جو قرآن میں مذکور ہے قرآن کے علاوہ کسی بھی شخص پر کوئی چیز فرض نہیں۔

دوسرا فریق یہ کہتا ہے کہ "جو مسئلہ قرآن کریم میں موجود ہو اس کے متعلق حدیث قبول کی جائے گی" لہٰذا جو مسائل قرآن میں مذکور نہیں ہیں ان کے متعلق دوسرے فریق کا بھی قریب قریب وہی نظریہ ہے جو پہلے فریق کا ہے اور اس فریق پر بھی وہی اعتراضات وارد ہوتے ہیں جو پہلے فریق پر وارد ہوتے ہیں۔

مزید برآں اس دوسرے فریق پر یہ الزام بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ چلا تھا حدیث کو رد کرنے لازم آگیا اس پر حدیث کو قبول کرنا (اس لئے کہ وہ تمام حدیثیں جو نصوص قرآنیہ کے مطابق و موافق ہیں ان کو ماننے پر وہ مجبور ہے ورنہ قرآن کا انکار لازم آجائے گا لہٰذا اس کو بعض حدیثوں کے قبول کرنے کا اقرار کرنا پڑا حالانکہ دعویٰ ان کا یہ تھا کہ حدیث مطلقاً ناقابل قبول ہے)

علاوہ ازیں جو مسلک اُنھوں نے اختیار کیا اس کے نتیجہ میں اُن پر یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہ ناسخ ومنسوخ اور عام وخاص کی تشخیص وتعیین بھی نہیں کر سکتے (کہ اس کا علم حدیث کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا حالانکہ نسخ کی قرآن کریم میں تصریح[۱] موجود ہے اور تخصیص عام ناگزیر ہے)

مناظر:- ان دونوں مسلکوں کا غلط اور سراسر گمراہی ہونا اظہر من الشمس ہے میں تو اب ان دونوں مسلکوں میں سے کسی ایک کو بھی نہیں مانتا لیکن آپ کے پاس اس کی بھی کوئی دلیل ہے کہ ایک یقینی حرام چیز کو کسی غیر یقینی دلیل سے آپ مباح (حلال) کر سکتے ہیں یعنے جو چیز قطعی طور پر حرام ہو اس کو کسی ظنی دلیل کی بنا پر مباح اور حلال کیا جا سکتا ہے؟

امام شافعی: جی ہاں دلیل موجود ہے۔

مناظر: وہ کیا ہے ذرا بیان فرمایئے۔

امام شافعی: میرے قریب جو یہ شخص کھڑا ہے، اس کو قتل کرڈالنا اور اس کا مال چھین لینا حرام ہے یا نہیں؟

مناظر: جی ہاں قطعاً حرام ہے۔

امام شافعی: اگر دو ثقہ گواہ گواہی دیدیں کہ اس شخص نے فلاں شخص کو مار ڈالا اور اس کا مال چھین لیا ہے جو اس کے پاس موجود ہے تو آپ کیا کریں گے؟

مناظر: تو میں اس شخص کو قصاص میں (مقتول کے بدلے میں) قتل کرڈالوں گا اور اس کے قبضہ میں جو مال ہے وہ مقتول کے ورثا کو دلوا دوں گا۔

امام شافعی: کیا یہ ممکن نہیں کہ ان گواہوں نے جھوٹی یا غلط گواہی دی ہو۔

مناظر: جی ہاں ممکن ہے۔

امام شافعی: تو تم ایک شخص کی جان اور مال کو جو قطعی اور یقینی دلیل کی بنا پر حرام ہیں ایسے دو گواہوں کی بنا پر جن کی شہادت قطعی اور یقینی نہیں کیسے مباح کرتے ہو؟

---

[۱] قرآن کریم میں ارشاد ہے: واذا بدلنا آیۃ مکان آیۃ قالوا انما انت مفتر بل اکثرھم لا یعلمون قل نزلہ روح القدس من ربک بالحق لیثبت الذین آمنوا وھدی وبشری للمومنین۔

مناظر: اس لئے کہ مجھے شہادت قبول کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

امام شافعی: کیا کتاب اللہ میں تمہیں کوئی ایسی نص (صریح آیت) ملی ہے جس کی بناپر آپ قتل کی شہادت کو قبول کرتے ہیں۔

مناظر: (خاص شہادتِ قتل کے متعلق تو کوئی نص) نہیں لیکن (نصوص قرآنی سے) استنباط کی بناپر ہم اس شہادت کو مانتے ہیں کیونکہ قرآن کے احکام نصوص قرآن کے مفہوم سے ہی نکلتے ہیں (یعنی قرآن کریم میں اگرچہ شہادت کا حکم دین، طلاق وغیرہ کے بارے میں آیا ہے مگر یہ قبول شہادت کا حکم عام ہے تمام اموال و دماء وحقوق کے اندر جاری ہے اسی میں قصاصاً قتل اور ردّ مال مغصوب کا مسئلہ بھی داخل ہے)

امام شافعی:۔ اگر دو گواہوں کی شہادت کی بناپر جو محض ظاہری طور پر سچے ہیں آپ ان کی گواہی قبول کرنے کے مامور ہیں اور آپ محض ظاہری عدالت کی بناپر ان کی گواہی کو مان لیتے ہیں صرف اس لئے کہ غیب کا علم اللہ کے سوا اور کسی کو نہیں ہے تو ہم تو ایک راوی حدیث (کی حدیث قبول کرنے) کے بارے میں اُس سے بھی زیادہ شرطیں لگاتے ہیں جتنی گواہ کے بارے میں لگاتے ہیں

> ہم بعض لوگوں کی شہادت تو قبول کرتے ہیں مگر حدیث ان میں سے کسی کی بھی قبول نہیں کرتے، اسی طرح ہم راوی حدیث کے صدق یا غلطی کا اس کے شریکِ روایت حفاظ حدیث کے ذریعہ سے پتہ چلانے کا اہتمام کرتے ہیں اسی طرح کتاب وسنت کے ذریعہ سے بھی ہم صدق یا غلطی کا حال معلوم کرتے ہیں تو دیکھئے حدیث کے قبول کرنے کے بارے میں بہت سی ایسی صورتیں اور ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں جو شہادتوں میں اختیار نہیں کئے جاتے۔

آخر مناظر انتہائی انشراح وطمانیت کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو ماننا اور قبول کرنا درحقیقت اللہ کے حکم کو ماننا ہے۔

یہ منکرین حدیث کون لوگ ہیں اور مناظر کون تھا

مذکورہ بالا مناظرہ معمولی سے اختصار کے ساتھ نقل کرنے کے بعد ہم اس مسئلہ سے متعلق چند تنقیحات پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں

تنقیح اوّل:- امام شافعی نے یہ نہیں بتلایا کہ وہ کونسا فرقہ ہے جو تمام حدیثوں کا انکار کرتا ہے نہ ہی انھوں نے اس شخص کے بارے میں کچھ نشان دہی کی جس نے ان کے ساتھ مناظرہ کیا تھا۔ شیخ خضری رحمۃ اللہ کی رائے ہے کہ امام شافعی کی مراد اس منکرِ حدیث فرقہ سے معتزلہ کا گروہ ہے چنانچہ وہ اپنی کتاب تاریخ التشریع الاسلامی[1] میں لکھتے ہیں:

امام شافعی رحمہ اللہ نے اس گروہ کی شخصیت کا اظہار نہیں کیا جس کا حدیث کے بارے میں یہ مسلک اور نظریہ تھا اور نہ ہی تاریخ سے ہمیں اس کی کچھ وضاحت ملتی ہے ہاں امام شافعی نے اپنے اور ان اہل رائے کے ایک مناظرہ میں ــ جس کا ذکر ہم آئندہ کریں گے ــ جو خبر الخاصہ (خبر واحد) کو نہیں مانتے، اس امر کی تصریح کی ہے کہ یہ مذہب ــ یعنے تمام احادیث کا انکار ــ ان لوگوں کا ہے جو بصرہ کی طرف منسوب ہیں اور ہمیں تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ) بصرہ اس زمانہ میں علمی اور کلامی یعنی عقلی تحریک کا مرکز تھا، بصرہ سے معتزلہ کے مذاہب پھوٹے ہیں، بڑے بڑے ائمہ اعتزال اور مولفین و مصنفین بصرہ میں ہی ہوئے ہیں یہی لوگ محدثین اور ائمہ حدیث کے ساتھ بحثیں اور مناظرے کرنے میں پیش پیش رہے ہیں لہذا کچھ بعید نہیں کہ اس مذہب کے پیرو اور امام شافعی کا مناظر معتزلہ کے فرقے سے تعلق رکھتے ہوں یعنی معتزلی ہوں۔

اس خیال کی تائید ابو محمد عبد اللہ بن مسلم بن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ) کی کتاب تاویل مختلف الحدیث سے بھی ہوتی ہے ابن قتیبہ نے

---

[1] تاریخ التشریع الاسلامی ص ۱۹۷

اپنی اس کتاب میں سنت کے بارے میں مشائخ معتزلہ کا موقف بیان کیا ہے اور صحابہ خصوصاً فقہاء صحابہ کی شان میں معتزلہ کی زبان درازی اور دریدہ دہنی کے تذکرے کئے ہیں، خضری اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ امام شافعی (متوفی ۲۰۴ھ) کے زمانہ میں یا ان سے کچھ پہلے ان متکلمین معتزلہ کی طرف سے اہلسنت اور محدثین پر شدید قسم کے حملے اور یورشیں شروع ہو گئی تھیں اور اکثر و بیشتر یہ متکلمین بصرے ہی میں تھے۔ اس لئے یہ یقینی ہے کہ جس شخص نے امام شافعی کے ..... زمانہ میں [illegible] سے مناظرہ کیا تھا وہ معتزلی تھا (ملخصاً)

مصنف فرماتے ہیں: خضری کی یہ رائے جس کا انھوں نے اظہار کیا ہے غور و فکر کے بعد نہایت وزنی معلوم ہوتی ہے

انکار حدیث کیوں کیا گیا

تنقیح دوم: اس امر میں تو آپ کو ذرہ برابر بھی تردد نہ ہونا چاہیئے کہ سنت کے حجت ہونے سے اس انکار کی بنیاد صرف وہ شکوک و شبہات ہیں جو حدیث کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک پہونچنے کے طریق یعنے درمیانی راویوں کے بارے میں ان منکرین کے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں کیونکہ راویوں سے کبھی کبھی غلطیاں یا وہم سرزد ہوئے ہیں اسی طرح حدیثیں گھڑنے والوں اور حدیث میں جھوٹ بولنے والوں نے جھوٹی سچی حدیثیں خلط ملط کر دی ہیں ان اوہام و اغلاط زائدہ اور اختلاط کی بنا پر حدیثوں کو صحیح ماننے میں ان کو تردد تھا اور یہی بنیاد ہے ان منکرین کے اس قول کی کہ "ہمیں صرف قرآن پر اکتفا کرنا چاہیے حدیثیں اعتماد کے قابل نہیں ہیں" انکار کا یہ سبب ہرگز نہ تھا کہ احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور تقریرات پر مشتمل ہیں (اس لئے ہم ان کو نہیں مانتے) کیونکہ یہ تو کوئی مسلمان (جس کا اللہ رسول پر ایمان ہو) کہہ ہی نہیں سکتا چنانچہ مسلمانوں کے کسی بھی فرقہ سے یہ بات منقول نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی پیروی واجب نہیں ہے یا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال احکام شرعیہ کے ماخذ نہیں ہیں، علاوہ ازیں اس قسم کا انکار تو قرآن عظیم کی صریح آیات کے تمام صحابہ اور پوری امت کے اجماع کے انکار کے مترادف ہے ہاں یہ قول غالی شیعوں کے ایک گروہ کی طرف ضرور منسوب ہے جو سرے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی نبوت ہی کا منکر ہے، سو اس قسم کے لوگوں کے معتقدات سے ہم یہاں بحث ہی نہیں کرنا چاہتے یہاں تو بحث صرف اسلامی فرقوں کے معتقدات و مذاہب سے ہے نہ کہ دین سے منحرف (مرتد) بے دین (ملحد) اور ان کے معتقدات سے۔

اس سلسلہ میں علماء کے چند اقوال ملاحظہ فرمائیے ان سے ہماری اس رائے کی تائید و تقویت ہوتی ہے۔

کتاب الام ج ۷ ص ۲۵۰ پر امام شافعی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:۔

میں نے کسی بھی ایسے شخص کو، جسے مسلمان علم دین کی طرف منسوب کرتے (اور عالم دین کہتے) ہوں یا وہ خود کو علم دین کی طرف منسوب کرتا (اور خود کو عالم دین کہتا) ہو، اس امر کی مخالفت کرتے نہیں سنا کہ اللہ عز وجل نے مسلمانوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور آپ کے ہر حکم سامنے سر جھکانے کو فرض قرار دیا ہے اس لئے کہ آپ کے بعد آنے والے مسلمانوں کے لئے تو آپ کے قول و فعل کی پیروی کے سوا اور کچھ چارہ ہی نہیں اور یہ کہ ہر حال میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے علاوہ دین میں اور کسی چیز کا نام لینا ہی نہیں چاہئے اور ان دونوں کے علاوہ (قیاس اجماع وغیرہ) جو بھی کوئی چیز ہے ان دونوں کے تابع ہے (یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے خلاف نہ اجماع حجت ہے نہ قیاس) اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر اور ہمارے بعد آنے والوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو قبول کرنا فرض قرار دیا ہے، بجز ایک فرقہ کے جس کے آراء و معتقدات میں انشاء اللہ آگے چلکر بیان کروں گا (یہ وہی فرقہ ہے جس کے نظریات اور ان سے مناظرہ کا ذکر گذر چکا ہے)

بلاشبہ آپ اس مناظرہ کے ذیل میں اچھی طرح دیکھ چکے ہیں کہ اس فرقہ کے انکارِ حدیث کا مدار صرف حدیث کے ثبوت میں ظن اور تردد پر ہے کہ قرآن جس کی صحت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کے نزول کی نسبت اور اللہ کی طرف اس کا کلام ہونے کی نسبت بالکل قطعی اور یقینی ہے لہٰذا قرآن کے سامنے حدیث نہیں ٹھہر سکتی (یعنی قرآن

کی طرح حدیث قطعی اور یقینی نہیں ہے)

علامہ ابن حزم لکھتے ہیں :۔

جب ہم یہ بیان کر چکے کہ قرآن ہی اصل ہے جس کی طرف تمام شرائع و احکام میں رجوع کیا جائے گا تو اب ہم قرآن ہی میں غور کرتے ہیں تو ہم اس میں پڑھتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی ہمیں حکم دیں اس کا ماننا ہم پر واجب ہے" اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ جل شانہٗ اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت یہ بیان کرتے ہیں۔

وما ینطق عن	وہ (نبی) اپنی خواہش سے نہیں بولتے
الھوی ان ھو الا	وہ جو کچھ بولتے اور کہتے ہیں وہ تو صرف
وحی یوحیٰ	وحی ہوتی ہے جو ان کے پاس بھیجی جاتی ہے

تو اب ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اللہ عزوجل کی جانب سے جو وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتی تھی وہ دو قسم کی ہوتی تھی۔

(۱) ایک وحی متلو جس کے الفاظ اور ان کی ترتیب و تنسیق سب اللہ کی جانب سے ہے اور انسانی قدرت سے بالا تر یعنی معجزہ ہے۔ یہ قرآن عظیم ہے

(۲) دوسری وہ وحی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک روایت و نقل کے ذریعہ پہونچی ہے نہ اس کے الفاظ اور ان کی ترکیب و ترتیب انسانی قدرت سے باہر (یعنی معجزہ) ہے نہ وہ (نمازوں وغیرہ میں) تلاوت کی جاتی ہے لیکن (راویوں کی زبانوں سے سنکر اور کتب حدیث میں لکھکر) پڑھی ضرور جاتی ہے یہ وحی ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے یہ ہی وحی — حدیث — اللہ کی اس مراد و منشا کی وضاحت کرتی ہے جو وہ ہم سے چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لتبین للناس مانزل	تاکہ تم لوگوں پر اس چیز (دین) کی وضاحت
الیھم	کرو جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے

نیز قرآن مجید سے ہی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دوسری قسم کی وحی کی پیروی کو بھی ہم پر اسی طرح فرض فرمایا ہے جیسے پہلی قسم کی وحی کی اطاعت کو فرض کیا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول — اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو

لہذا یہ احادیث جن کا ہم نے ذکر کیا دین کے ان تین بنیادی ماخذوں میں سے ایک ماخذ ہیں جن کی اطاعت اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری آیت میں — جو ان تمام دین کے ماخذوں پر اول سے آخر تک حاوی ہے۔ ہم پر لازم قرار دی ہے وہ آیت یہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم — اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے ارباب امر کی۔

اطیعوا اللہ — اللہ کی اطاعت کرو — پس یہ تو (دین کی) اصل ہے یعنی قرآن کی اطاعت — واطیعوا الرسول — اور رسول کی اطاعت کرو یہ دین کا دوسرا ماخذ ہے جس کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔

واولی الامر منکم — اور اپنے ارباب امر کی — یہ دین کا تیسرا ماخذ ہے یعنے وہ اجماع جس کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو (یعنی وہ اجماع جس کے اتباع کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو)

اس کے چند سطر بعد لکھتے ہیں:-

جو مسلمان توحید — خدا کی وحدانیت کا اقرار کرتا ہے اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہر منازعت واختلاف کے وقت

قرآن عظیم اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرے اور ان دونوں ماخذوں میں جو فیصلہ پائے اس سے انکار نہ کرے۔ اگر کسی شخص نے حجت قائم (اور دلیل موجود) ہونے کے باوجود قرآن و حدیث کے فیصلہ سے گریز کیا تو وہ فاسق ہے لیکن جو شخص ان دونوں یعنی قرآن و حدیث کے فیصلہ سے انحراف کو حلال جانتا ہے یا دونوں میں سے کسی ایک کے فیصلہ کی اطاعت کو اختیار کرتا ہے دوسرے سے انحراف کو جائز سمجھتا ہے تو دونوں صورتوں میں شخص ہمارے نزدیک بیشک و شبہ کافر ہے

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:۔

جو شخص یہ کہے کہ ہم تو صرف اسی (حکم) کو مانیں گے جس کو قرآن میں پائیں گے وہ باجماع امت کافر ہے اور اس شخص پر لازم آئے گا کہ سورج کے ڈھلنے کے وقت سے لیکر رات کا اندھیرا چھانے تک ایک رکعت نماز پڑھے اور دوسری رکعت فجر کے وقت کیونکہ یہ وہ کسے سے کم (ادنیٰ یقینی) مقدار ہے جو (اقم الصلوٰۃ کے تحت) لفظ صلوٰۃ کا مصداق ہے اور (یہی یقینی ہے) اس لئے کہ زیادہ کی تو کوئی حد نہیں (جس کو قرآن سے متعین کیا جاسکے) ایسا شخص جس کا یہ عقیدہ ہو کافر ہے مشرک ہے اس کی جان و مال دونوں (مسلمانوں کے لئے) حلال ہیں (یعنی مسلمانوں کا فرض ہے کہ ایسے شخص کو ارتداد یا کفر کی بنا پر قتل کردیں اور اس کا مال بیت المال میں داخل کردیں)

حافظ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں:۔

غالی رافضیوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو سنت کے سرے سے حجت ہونے کا انکار کرتے ہیں اور صرف قرآن پر اکتفا کرتے ہیں اس لئے کہ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ نبوت دراصل حضرت علی کے لئے تھی جبرائیل امین سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس غلطی سے وحی لے آئے

(اور وہ نبی بن بیٹھے العیاذ باللہ)

تنقیح سوم: منکرین کی دلیل کا خلاصہ جو لوگ تمام احادیث کا انکار کرتے ہیں ان کی دلیل کا جس کو امام شافعی نے نقل کیا ہے خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ: قرآن عظیم میں ہر چیز کا بیان وتفصیل — خود قرآن کے بیان کے مطابق — موجود ہے اب (حدیث تین حال سے خالی نہیں) (۱) اگر حدیث میں ایسے احکام مذکور ہیں جو نئے ہیں قرآن میں ان کا ذکر نہیں ہے تو یہ ایک ظنی الثبوت یعنے حدیث کے ذریعہ قرآن کے ساتھ معارضہ ہوگا (کہ جو چیز قرآن میں نہیں اسکو تسلیم کیا جائے) جو قطعی الثبوت ہے اور ظنی دلیل قطعی دلیل کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتی (۲) اور اگر حدیث میں ایسے احکام مذکور ہیں جن سے قرآن کے احکام کی تائید وتاکید ہوتی ہے تو ایسی صورت میں اتباع اور پیروی قرآن کی ہوگی نہ کہ حدیث کی (۳) اور اگر قرآن کے کسی مجمل حکم کی حدیث وضاحت کرتی ہے تو درحقیقت یہ وضاحت ایک ایسی ظنی دلیل ہے جس کا منکر کافر نہیں ہوتا ایک ایسی قطعی دلیل کی توضیح وتشریح ہوگی جس کے ایک حرف کا منکر بھی کافر ہوجاتا ہے اور یہ کسی طرح جائز نہیں ہوسکتا (اس لئے کہ قطعی دلیل کے وہ مصداق جو ظنی دلیل کے تحت نہیں آتے وہ یقیناً قطعی دلیل کا مصداق ہونے کی وجہ سے قبول کئے جائیں گے اگرچہ ظنی دلیل کے خلاف ہوں لہذا حدیث قرآن کی وضاحت سے قاصر ہے)

اس تنقیح کی روشنی میں یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ یہ منکرین حدیث غالباً متواتر احادیث کو — جو قطعی الثبوت ہوتی ہیں — قبول کرتے ہوں گے پھر امام شافعی نے عمومیت کے ساتھ یہ کیسے فرمادیا کہ یہ منکرین حدیث تمام احادیث کا انکار کرتے ہیں؟

تحقیق وتجسس سے ایسا معلوم ہوتا کہ یہ لوگ متواتر احادیث کو بھی قطعی نہیں مانتے تھے بلکہ ان کے نزدیک وہ بھی ظنی ہیں کیونکہ یہ متواتر احادیث بھی ایسے "طرق" (یعنے سندوں) سے مروی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک سلسلۂ سند بجائے خود ظنی ہے لہذا متواتر احادیث کے راویوں کے متعلق بھی جھوٹ بولنے کا امکان موجود ہے اگرچہ ان سب سندوں کے راوی بہت بڑی جماعت ہی کیوں نہ ہو۔

اور اگر خضری کا یہ خیال صحیح ہے کہ امام شافعی کے ساتھ مناظرہ کرنے والا معتزلی تھا اور نظام

معتزلی کا جو مسلک بیان کیا گیا ہے ــ جس پر ہم عنقریب کلام کریں گے ــ کہ وہ متواتر احادیث کو بھی قطعی اور یقینی علم کے لئے مفید نہیں سمجھتا یہ بھی صحیح ہو تو ان دونوں باتوں سے ہماری رائے ــ کہ معتزلہ متواتر احادیث کے بھی منکر ہیں ــ کی کافی تقویت ہو جائے گی علاوہ ازیں امام شافعی کے مناظر کا یہ اعتراف کہ "جو شخص حدیثوں کو نہیں مانتا اس پر لازم ہے کہ وہ اتنی نماز کو جس پر صلوٰۃ کا لفظ صادق آجائے اداء فرض کے لئے کافی سمجھے" اس سے بھی ہماری اس رائے کی تائید ہوتی ہے اس لئے کہ مناظر کے مذکورہ بالا قول کے معنی یہی ہیں کہ ان منکرین پر پانچ نمازوں اور ان کی سترہ رکعتوں کا انکار کرنا بھی لازم ہے حالانکہ پانچ نمازیں اور ان کی سترہ رکعتیں متفق علیہ طور پر متواتر ہیں۔

باقی مذکورہ بالا مناظر کا (اپنے عقیدہ سے رجوع سے پہلے) یہ کہنا کہ جس چیز میں وہم کا امکان ہو میں اس کو ہرگز قبول نہیں کروں گا میں تو اسی چیز کو قبول کروں گا جس پر میں اللہ کو گواہ بنا سکوں اس سے بھی متواتر حدیث کا قبول کرنا ثابت نہیں ہوتا اس لئے کہ ان لوگوں کے نزدیک تو متواتر حدیث میں بھی وہم کا امکان ہے اس لئے یہ لوگ متواتر حدیث پر اللہ کی قسم نہیں کھا سکتے۔

تنقیح چہارم، امام شافعی کے جواب کا خلاصہ امام شافعی کے جواب کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) اللہ عزوجل نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کو ہم پر فرض کیا ہے یہ اتباع پوری اُمت پر فرض ہے اُن پر بھی جو آپ کے زمانہ میں تھے اور اُن پر بھی جو آپ کے بعد (قیامت تک) آنے والے ہیں اور جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ نہیں پایا اُن کے لئے آپ کا اتباع کرنے کی آپ کی احادیث کے اتباع کے علاوہ اور کوئی صورت ممکن نہیں اس لحاظ سے اللہ جل شانہٗ کا آپ کے اتباع کا حکم دینا آپ کی احادیث کو قبول کرنے کا حکم دینے کے مترادف ہے کیونکہ جس چیز کے بغیر فرض کی تعمیل نہ ہو سکے وہ بھی فرض ہوتی ہے۔

(۲) نفس قرآن کے احکام کا علم حاصل کرنے کے لئے بھی احادیث کو ماننا ضروری ہے کیونکہ قرآن کے ناسخ و منسوخ احکام کا علم ــ کہ کونسا حکم منسوخ ہے اور کونسا ناسخ ــ حدیث کی طرف رجوع کئے بغیر ممکن ہی نہیں۔

(۳) شریعت کے بہت سے احکام ایسے ہیں جن پر تمام اُمت کا اتفاق ہے حتیٰ کہ جو لوگ

تمام احادیث کا انکار کرتے ہیں وہ بھی ان احکام کو تسلیم کرتے ہیں۔ مثلاً اوقات نماز، تعداد رکعات یا اموال زکوٰۃ، مقادیر زکوٰۃ وغیرہ۔ ان احکام کو معلوم کرنے کی احادیث کو قبول کرنے کے علاوہ اور کوئی سبیل نہیں۔

(۴) خود شریعت ظنی دلیل کے ذریعہ قطعی دلیل میں تخصیص کرنے کی اجازت دیتی ہے مثلاً دو ثقہ گواہوں کی بنیاد پر قاتل کو قتل کرنے اور اس کا لوٹا ہوا مال چھین لینے کا حکم دیتی ہے باوجودیکہ جان و مال کی حرمت قطعی دلیل سے ثابت ہے مگر جان و مال دونوں کے معاملہ میں دو ثقہ گواہوں کی شہادت بلاکسی اختلاف کے قبول کی جاتی ہے حالانکہ یہ شہادت بلاشبہ ظنی ہے

(۵) احادیث خصوصاً اخبار آحاد میں اگرچہ غلطی، وہم یا جھوٹ کا امکان ہوتا ہے لیکن راوی کی عدالت کی چھان بین اور تحقیق کے، اور اس کی روایت کا اس کے ہمعصر محدثین کی روایات سے مقابلہ کرنے کے بعد جو ثبوت اور یقین حاصل ہوتا ہے اس کی وجہ سے روایت میں یہ احتمال گواہوں میں پیدا ہونے والے احتمال کی بہ نسبت بہت کم ہو جاتا ہے اور ثقہ گواہوں کی شہادت کو قبول کرنا نص قرآن ثابت ہے تو ثقہ راویوں کی احادیث کو قبول کرنا بدرجہ اولیٰ ثابت ہوگا)

خصوصاً جبکہ روایت کی تائید کتاب و سنت سے ہو جائے تو پھر احتمال قریب قریب معدوم ہو جاتا ہے۔

تنقیح پنجم: ایک شبہ کا ازالہ

امام شافعیؒ نے مناظر کے اس قول کا جواب کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ہر چیز کی تفصیل بیان کی ہے بظاہر نہیں دیا الّا یہ کہ قرآن عظیم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا جو حکم دیا ہے اس سے التزاماً یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ جو بھی احکام دیں (قرآن میں وہ صراحتاً مذکور ہوں یا نہ ہوں)۔ ان سب کا اقرار کرنا اور آپ کے تشریعی منصب کو تسلیم کرنا امت پر فرض ہے بعض علماء نے اس اشکال کے جو پانچ وجوہ بیان کئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے ان وجوہ کا ہم انشاء اللہ تیسرے باب میں ذکر کریں گے۔

تیسری فصل

عہد حاضر میں جو لوگ سُنّت کے حجّت ہونے کا انکار کرتے ہیں اُن کا رویہ سُنّت کے ساتھ

منکرین کے شبہات ہمارے زمانہ میں بعض ایسے لوگوں نے بھی سنت کے حجت شرعیہ ہونے کا انکار کیا ہے جن کو اس علم سے مس تک نہیں ہے۔ چنانچہ سید رشید رضا مرحوم نے اپنے رسالہ المنار کی دو اشاعتوں (ج ۹ ش ۷، و ۱۲) میں ڈاکٹر توفیق صدقی کے دو مقالے شائع کئے تھے ان مقالوں میں اس نظریہ — انکار سنت — کا اظہار حسب ذیل عنوان سے کیا گیا ہے: اسلام صرف قرآن کا نام ہے۔

ہم ذیل میں ان کے شبہات کا خلاصہ بیان کرتے ہیں اس کے بعد ہر ایک شبہہ کا جواب دیں گے۔

(۱) پہلا شبہ:۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

ما فرطنا فی الکتاب من شیئی	ہم نے اس کتاب — قرآن — میں کوئی بھی چیز نہیں چھوڑی۔

نیز ارشاد ہے:۔

وانزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شیئی	اور ہم نے تم پر کتاب قرآن اتارا (جس میں) ہر چیز کا واضح بیان ہے۔

یہ دونوں آیتیں بتلاتی ہیں کہ قرآن، دین سے متعلق ہر چیز پر اور دینی احکام میں سے

ہر حکم پر حاوی ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دین کی ہر بات کو ایسی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ اس کے بعد کسی بھی اور چیز۔ مثلاً سنت ۔ کی احتیاج باقی نہیں رہتی، ورنہ (اگر قرآن کے بعد کسی بھی اور چیز کی حاجت کو تسلیم کیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ کتاب ناقص ہے اس میں بہت سی چیزوں کی کمی ہے اور ہر چیز کی تفصیل اس کتاب میں نہیں ہے تو اس صورت میں خدا کی دی ہوئی اس خبر کا خلافِ واقع ہونا لازم آئے گا (اور یہ یقیناً محال ہے)

(۲) دوسرا شبہ :- اللہ تعالیٰ قرآن عظیم میں ارشاد فرماتے ہیں :

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون — ہم نے ہی اس ذکر۔ قرآن ۔ کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

یہ آیت بتلاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اگر سنت بھی قرآن کی طرح دین میں دلیل اور حجت ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کا بھی ذمہ لیتے۔

(۳) تیسرا شبہ :- اگر سنت (اور حدیث) بھی دین میں حجت ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی طرح اس کے لکھنے کا بھی ضرور حکم فرماتے اور آپ کے بعد صحابہ و تابعین بھی (قرآن کی طرح) سنت و حدیث کے جمع کرنے اور مدون کرنے کا اہتمام کرتے۔ اس لئے کہ جمع و تدوین کے ذریعہ ہی سنت کے ضائع ہونے سے، اس میں تغیر و تبدل یا بھول چوک واقع ہونے سے حفاظت ہو سکتی تھی جب سنت جمع و تدوین کے ذریعہ محفوظ ہو کر مسلمانوں کے پاس پہونچتی تو اس کی صحت قطعی اور یقینی ہوتی (اور اس سے استدلال کرنا صحیح ہوتا) اس لئے کہ جس کسی چیز کا ثبوت ظنی ہو اس سے استدلال کرنا صحیح نہیں خود اللہ پاک کا ارشاد ہے :-

ولا تقف ما لیس لک به علم — اس چیز کے پیچھے مت چلو جس کا تمہیں علم نہ ہو

کفار کے متعلق ارشاد ہے :

ان تتبعون الا الظن — تم تو صرف گمان کی پیروی کرتے ہو

سنت کا ثبوت قطعی اور یقینی اسی وقت ہو سکتا تھا جب وہ بھی اسی طرح لکھی جاتی جیسے قرآن کی کتابت ہوئی (اسی لئے قرآن کا ثبوت قطعی ہے) اس کے برعکس بعض روایات سے تو ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثیں لکھنے سے منع فرما دیا تھا اور جتنی حدیثیں

لکھی گئی تھیں ان کے بھی مٹا دینے کا حکم دیدیا تھا۔ چنانچہ صحابہ و تابعین کا اسی پر عمل رہا اور انھوں نے حدیثیں مطلق نہیں لکھیں)

ابو عبداللہ الحاکم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق نے اپنی لکھی ہوئی پانچسو۵۰۰ احادیث کے مجموعہ کو جلا دیا تھا اور یہ کہکر جلایا تھا کہ:-

مجھے ڈر ہوا کہ اگر میری موت آجائے اور اس مجموعہ میں کسی ایسے راوی کی حدیث موجود ہو، جس کو میں نے امین سمجھکر اس پر اعتماد کر لیا ہو اور وہ حدیث (دراصل) اُس طرح نہ ہو جس طرح اُس نے مجھ سے بیان کی ہے تو اس کے نقل کرنے (اور مسلمانوں تک پہونچانے) کا ذمہ دار میں ہوں گا (اور مسلمان میرا نام دیکھکر اس حدیث کو صحیح سمجھ لیں گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنے یا جھوٹی حدیث کو رواج دینے کا مجرم اور گنہگار میں بنوں گا)

اسی طرح حضرت زید بن ثابت نے بھی ذیل کے واقعہ میں ایسا ہی کیا ہے:

زید بن ثابت ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ کے پاس آئے حضرت معاویہؓ نے ان سے ایک حدیث دریافت کی وہ حدیث انھوں نے بیان کردی تو حضرت معاویہؓ نے ایک شخص کو اس حدیث کے لکھ لینے کا حکم دیا تو اس پر زید بن ثابت بولے "ہمیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثیں لکھنے سے منع فرمایا ہے"

چنانچہ زید بن ثابت نے اُس کو مٹا دیا۔

حضرت عمر فاروقؓ نے بھی ایک مرتبہ حدیثیں لکھوا لینے کا ارادہ کیا تھا لیکن انھوں نے بھی اس ارادہ کو ترک کردیا اور فرمایا: "میں حدیثیں لکھوا لینا چاہتا تھا لیکن مجھے یاد آیا کہ تم سے پہلی قوموں نے اسی طرح (اپنے نبیوں کے) نوشتے لکھ لئے تھے تو وہ انہی کے ہو کر رہ گئے اور کتاب اللہ کو چھوڑ بیٹھے اور میں تو خدا کی قسم اللہ کی کتاب (قرآن) کے ساتھ ہرگز ہرگز کسی دوسری چیز کو نہ ملانے دوں گا"

اسی طرح حضرت علیؓ نے بھی جن لوگوں نے ان کی حدیثیں لکھ لی تھیں ان کو مٹا دینے کے لئے فرمایا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی بھی جو حدیثیں لکھ لی گئی تھیں ان کو ابن مسعود نے

مٹا دیا تھا۔

تابعین میں سے بھی علقمہ، عبیدہ، قاسم بن محمد، شعبی، نخعی، منصور، مغیرہ اور اعمش (جیسے جلیل القدر تابعین) حدیثیں لکھنے کو برا سمجھتے تھے۔ حدیث کی کتابوں میں کراہت کتابت حدیث سے متعلق ان حضرات کے اقوال مشہور و معروف ہیں۔ ان حضرات نے صرف اسی (اظہار کراہت) پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بعض حضرات سے تو یہ بھی منقول ہے کہ وہ مطلقاً حدیثیں روایت کرنے سے منع کیا کرتے تھے یا کم سے کم حدیثیں روایت کرنے کو کہا کرتے تھے۔

اسی لئے حدیث کی تدوین تو صرف آن پچھلے اَدوار میں ہوئی ہے جبکہ وہ اغلاط، سہو و نسیان اور کذب و افترا کا نشانہ بن چکی تھیں اور تحریف و تصرف اور تغیر و تبدل حدیثوں میں عام ہو چکا تھا۔

لہٰذا یہ صورت حال لازمی طور پر سنت و حدیث کو مشکوک و مشتبہ بناتی ہے اور اخذ احکام شرعیہ کے بارے میں اُن پر اعتماد ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) چوتھا شبہ: خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض احادیث سے سنت کا حجت نہ ہونا ثابت ہوتا ہے مثلاً ایک حدیث میں آپ نے فرمایا ہے:

ان الحدیث سیفشو عنی فما اتاکم یوافق القرآن فھو عنی وما آتاکم عنی یخالف القرآن فلیس منی۔	عنقریب میری طرف منسوب کی ہوئی حدیثیں بکثرت پھیل جائیں گی تو جو حدیث تمہارے سامنے قرآن کریم کے موافق آئے وہ تو میری حدیث ہے اور جو حدیث قرآن کے خلاف ہو وہ میری حدیث نہیں۔

لہٰذا جب کسی حدیث سے کوئی نیا حکم شرعی ثابت ہوگا (جو قرآن میں مذکور نہ ہو) تو یقیناً وہ قرآن کے مخالف ہوگا اور اگر اس حدیث سے کوئی نیا حکم ثابت نہ ہوگا تو وہ حدیث محض قرآن (کے حکم) کی تاکید ہوگی اور حجت قرآن کا حکم ہی ہوگا۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

اذا حدثتم عنی حدیثا تعرفونہ ولا تنکرونہ قلتہ اولم اقلہ، فصدقوابہ	جب تم سے میری جانب سے کوئی ایسی حدیث بیان کی جائے جس کو تم جانتے پہچانتے ہو اور اس کو اجنبی محسوس کرو تو۔ خواہ اس کو میں نے کہا ہو یا نہ

فانی اقول مایعرف ولا ینکر

کہا ہو۔ تم اس کی تصدیق کر دو (کہ ہاں یہ حدیث ہے) کیونکہ میں وہی بات کہتا ہوں جو جانی پہچانی ہوتی ہے نہ کہ اجنبی اور غیر مانوس

÷ ÷ ÷ ÷

واذا حدثتم عنی حدیثا تنکرونہ۔ قلتہ اولم اقلہ فلا تصدقوا بہ فانی لا اقول ماینکر ولا یعرف

اور جب تم سے میری جانب سے کوئی ایسی حدیث بیان کی جائے جس کو تم اجنبی محسوس کرو، میں نے کہی ہو یا نہ کہی ہو، تو اس کی تصدیق ہرگز نہ کرنا (اور کہہ دینا کہ یہ حدیث نہیں ہے) کیونکہ میں کوئی ایسی بات نہیں کہتا جو نامانوس اور غیر معروف ہو۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو حدیث بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے بیان کی جائے اس کو مسلمانوں کے نزدیک معروف چیز یعنے کتاب اللہ کے حکم سے ملا کر دیکھنا ضروری ہے لہذا ثابت ہوا کہ حدیث بذات خود حجت نہیں ہے

اسی قسم کی ایک اور حدیث ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:۔

انی لا احل الا ما احل اللہ فی کتابہ ولا احرم الا ما حرم اللہ فی کتابہ

میں تو صرف اسی چیز کو حلال کرتا ہوں جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا ہے اور صرف اسی چیز کو حرام کرتا ہوں جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں حرام کیا ہے

دوسری روایت میں ہے:۔

لا یمسکن الناس علیّ بشئی فانی لا احل لھم الا ما احل اللہ ولا احرم الا ما حرم اللہ۔

لوگ کسی بھی چیز کے بارے میں مجھ پر تکیہ نہ کریں اس لئے کہ میں ان کے لئے صرف وہی چیز حلال کرتا ہوں جو اللہ نے حلال کی اور صرف وہی چیز حرام کرتا ہوں جو اللہ نے حرام کی۔

ڈاکٹر صدقی نے سنت اور حدیث کے حجّت ہونے کے خلاف جو شبہات پیش کئے ہیں، یہی ان کا خلاصہ ہے (میں سمجھتا ہوں کہ) ایک طالب علم وتحقیق کو ان شبہات کے لچر اور بے معنی ہونے کا یقین کرنے میں ذرا بھی شک و تردد نہیں ہو سکتا تاہم ذیل میں ہم ان شبہات کے جوابات

ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

(۱) پہلے شبہ کا جواب

قرآن عظیم دین کے تمام بنیادی اصول اور احکام شرعیہ کے قواعد عامہ پر حاوی اور جامع کتاب ہے، ان میں سے بعض اصول و قواعد تو خود قرآن نے صراحت کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں اور بعض کا بیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے چھوڑ دیا ہے اور جبکہ خدا نے اپنے رسول کو لوگوں کے سامنے دین کے احکام تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے لئے ہی بھیجا ہے اور اسی لئے اس نے لوگوں پر رسول کی اطاعت و پیروی کو فرض قرار دیا ہے تو ایسی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا احکام دین کو بیان کرنا یقیناً قرآن کے بیان کرنے کے مترادف ہے۔

اسی لئے شریعت کے وہ تمام احکام جو کتاب و سنت سے یا اُن دلائل سے جو کتاب و سنت ہی کے ساتھ ملحق اور انہی پر متفرع اور ماخوذ ہیں وہ سب کے سب کتاب اللہ کے احکام ہیں خواہ صراحتاً مذکور ہوں خواہ دلالتاً۔

لہٰذا سنت کے حجت شرعیہ ہونے میں اور اس امر میں کوئی منافات اور تضاد نہیں کہ قرآن میں ہر چیز کا بیان موجود ہے (اس لئے کہ قرآن ہی میں یہ حکم بھی موجود ہے کہ رسول جو بھی حکم تمہیں دیں، اسے قبول کرو اور یہ کہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے)

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:۔

> پس جس شخص کے سامنے دین سے متعلق کوئی بھی نیا مسئلہ پیش آئے اس کی رہنمائی کے لئے کتاب اللہ میں دلیل موجود ہے۔ اس لئے کہ اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں:۔

کتاب انزلناہ الیک لتخرج الناس من الظلمات الی النور باذن ربھم الی صراط العزیز الحمید	یہ کتاب ہے جسے ہم نے تم پر اُتارا ہے تاکہ تم لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے (جہل کی) تاریکیوں سے (نکال کر) (علم کی) روشنی کی طرف لیجاؤ، (سب پر) غالب لائق ستائش خدا کے راستہ کی جانب۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم و لعلھم یتفکرون	ہم نے تم پر یہ ذکر (قرآن) اُتارا ہے تاکہ جو (دین) لوگوں کے لئے اُتارا گیا ہے تم لوگوں کے سامنے اس کو وضاحت کے ساتھ بیان کردو (سمجھا دو) اور اس لئے تاکہ وہ اس پر (عمل کرنے کے لئے) غور و فکر کیا کریں۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:-

ونزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شیئ	اور ہم نے تم پر یہ کتاب اُتاری ہے جو ہر چیز کی وضاحت کرتی ہے۔

لفظ بیان (اور تبیان جو ان آیتوں میں آیا ہے) ایسے وسیع اور جامع مفہوم پر حاوی ہے جس کے تحت دین کے تمام اصول اور ان سے نکلے ہوئے تمام فروع آجاتے ہیں لہٰذا وہ تمام احکام جن کا اللہ نے اپنے ازلی حکم کے تحت اپنی مخلوق کو مکلف بنایا ہے، وہ اپنی اس کتاب (قرآن) میں حسب ذیل مختلف طریقوں پر بیان فرماتے ہیں:-

(۱) کچھ احکام تو خدا نے اپنی مخلوق کے لئے صراحت کے ساتھ بیان فرمائے ہیں مثلاً مجمل طور پر مفروضہ احکام کہ خدا نے مخلوق پر نماز، زکوٰۃ، روزے اور حج فرض فرمائے ہیں اور جو ظاہری و باطنی بےحیائی کے کام ہیں ان کو حرام فرمایا ہے، اسی طرح زنا، شراب، مردار کھانے (بہتا ہوا) خون اور خنزیر کا گوشت کھانے سے صراحت کے ساتھ منع فرمایا۔ اسی طرح وضو کی فرضیت کو کس طرح اور کس وقت کرنا چاہیئے صراحت کے ساتھ بیان فرما دی اور ان کے علاوہ تمام فرائض جن کی تصریح فرما دی ہے۔

(۲) اور کچھ احکام ایسے ہیں کہ ان کے فرض ہونے کو تو خدا نے اپنی کتاب (قرآن) میں محکم طور پر بیان فرما دیا ہے مگر ان کی کیفیت اور تفصیل کو اپنے نبی کی زبان سے بیان کرایا۔ مثلاً جیسے نمازوں (اور ان کی رکعتوں) کی تعداد زکوٰۃ کی مقدار اور اس کے ادا کرنے کا وقت اور ان کے علاوہ وہ تمام فرائض جو خدا نے اپنی کتاب میں نازل کئے ہیں (مگر ان کی کیفیت اور تفصیل

نہیں بتلائی)

(۳) کچھ احکام ایسے ہیں جن کی قرآن عظیم میں تصریح نہیں ہے بلکہ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری فرمایا ہے اور خدا نے اپنی کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو فرض قرار دیا ہے اور آپ کے ہر حکم کے سامنے سر جھکا دینے کا حکم دیا ہے تو (اس لحاظ سے) جس شخص نے اللہ کے رسول کے کسی حکم کو مانا درحقیقت اس نے اللہ کے فرض کردہ حکم کو مانا۔

(۴) اور کچھ احکام ایسے ہیں جن میں اجتہاد یعنی حکم شرعی کی تلاش وجستجو کو اپنی مخلوق پر فرض کر دیا اور ان اجتہادی احکام کی تلاش وجستجو میں اپنے بندوں کی اطاعت کو اسی طرح آزمایا جیسے اپنے فرض کردہ (منصوص) احکام میں ان کی فرمانبرداری کو آزمایا[۱] (یعنے جس طرح منصوص احکام کی تعمیل کرنا فرض ہے ایسے ہی غیر منصوص احکام میں اجتہاد کرنا فرض ہے)

اس کے بعد امام شافعی لکھتے ہیں :-

پس جو شخص اللہ کی کتاب میں اس کی جانب سے نازل شدہ (منصوص) احکام کو مانتا ہے وہ اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بیان شدہ (احکام) سنت کو بھی ضرور مانے گا اس لئے کہ خدا نے اپنی مخلوق پر اپنے رسول کی اطاعت (کہا ماننے) کو فرض کیا ہے اور یہ کہ حکم رسول کے سامنے سر جھکا دیں ۔ لہٰذا جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو قبول کیا درحقیقت اس نے اللہ کے حکم کو قبول کیا کیونکہ خدا نے اپنے رسول کی اطاعت (کہا ماننے) کو فرض قرار دیا ہے اس لئے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے احکام کو مجموعی طور پر ماننے کے ضمن میں ان

---

(۱) الرسالۃ ص ۲۰ - ۲۲ ..

یں سے ہر ایک کے حکم کو علیحدہ علیحدہ ماننا بھی داخل ہے اگرچہ کتاب وسنت کے جو احکام قبول کئے جاتے ہیں ان کی تفریعات جن کی بنا پر ان کو قبول کیا جاتا ہے جدا جدا ہوں (۱) (مثلاً کتاب کے منصوص احکام قطعی ہونے کی حیثیت سے اور سنت کے ظنی ہونے کی حیثیت سے یا کتاب کے حکم کو رکن اور فرض ہونے کی حیثیت سے قبول کیا جاتا ہے اور سنت کے حکم کو واجب یا مسنون ہونے کی حیثیت سے)

دوسرے شبہ کا جواب

اللہ تعالیٰ نے جو الذکر کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے وہ حفاظت صرف قرآن ہی تک محدود اور منحصر نہیں ہے، بلکہ اس "ذکر" سے مراد خدا کی شریعت اور اس کا وہ دین ہے جس کو لیکر اس کے رسول مبعوث ہوئے ہیں (یعنے اللہ کا جو دین لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے ہیں) عام اس سے کہ وہ قرآن ہو یا سنت ـــ اس کی تائید آیت کریمہ ذیل سے ہوتی ہے۔

فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون — پس تم اہل علم (دین) سے پوچھ لیا کرو اگر تم نہ جانتے ہو۔

یعنی (دین کے مسائل و احکام کا) علم نہ ہونے کی صورت میں تم ان لوگوں کی طرف رجوع کیا کرو جو اللہ کے دین اور اس کی شریعت کا علم رکھتے ہیں (دیکھئے اس آیت کریمہ میں بھی وہی الذکر کا لفظ آیا ہے جو حفاظت والی آیت میں آیا ہے لہذا یقیناً اس سے صرف قرآن نہیں بلکہ پورا دین مراد ہے) اور یہ حقیقت ہے کہ خدا نے جیسے اپنی کتاب ـــ قرآن ـــ کی حفاظت فرمائی ہے (کہ ابتدا سے لیکر اس وقت تک ہر دور میں بیشمار اور بے حساب مسلمان۔ بچے بوڑھے جوان، مرد و عورت قرآن کے حافظ و محافظ ہوتے ہیں) اسی طرح اس نے سنت کی بھی حفاظت فرمائی ہے کہ ہر زمانہ میں خدا نے حدیث کے ایسے بڑے بڑے حفاظ پیدا فرمائے جن کے سینوں میں اور سفینوں (کتابوں) میں (ہزاروں لاکھوں) حدیثیں محفوظ رہی ہیں جن کو خود یاد کرتے یاد رکھتے اور دوسروں تک پہونچاتے رہے

---

(۱) الرسالۃ ص ۳۳

ہیں یعنے ایک دوسرے سے روایت کرتے اور پڑھتے پڑھاتے رہے ہیں (نہ صرف یہ بلکہ) کھری کھوٹی، صحیح اور غیر صحیح حدیثوں کی چھان بین کرتے رہے ہیں اور اس علم حفظ حدیث ونقد حدیث میں اُنھوں نے اپنی عمریں صرف کر دی ہیں اور حفاظت حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مساعی کا حق کر دیا ہے جس کی تفصیل ہم پہلے باب کی تیسری فصل میں بیان کر چکے ہیں چنانچہ محدثین کی انہی مساعی کی بدولت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کتب حدیث میں محفوظ و مدون ہو گئی اور ایک حدیث بھی ضائع نہ ہونے پائی۔

اسی لئے علماء حدیث کا۔ جن میں سرِ فہرست امام شافعی کا نام ہے۔ دعویٰ ہے کہ:

> سُنّت کا تمام ذخیرہ عام محدثین کے پاس موجود ہے اگرچہ بعض محدثین کے ہاں زیادہ ہے اور بعض کے ہاں کم لیکن اگر تمام محدثین کی احادیث کو یکجا کر لیا جائے تو سنت کا پورا ذخیرہ یکجا ہو جاتا ہے ہاں جب ہر محدث کی جمع کردہ حدیثوں کو الگ الگ رکھا جائے تو ہر محدث (اور اس کی کتاب) سے کچھ حدیثیں رہ جاتی ہیں لیکن جو حدیثیں ایک محدث سے رہ جاتی ہیں وہ دوسرے کے ہاں موجود ہوتی ہیں (۱)

امام شافعی کا اخذ کردہ یہ نتیجہ یقیناً صحیح اور قطعی ہے اور ہمیں ذرہ برابر بھی اس میں شک نہیں کہ نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ اور احکام و معاملات و فرائض سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بھی ضائع نہیں ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال و افعال، اعمال و اخلاق سب کے سب محدثین کی جمع کردہ کتب حدیث و سیرت میں مدون موجود ہیں اگرچہ ان کی اسانید میں اختلاف اور مراتب صحت میں تفاوت ہو۔

علامہ ابن حزم لکھتے ہیں:۔

> تمام اہل لغت اور ارباب شریعت اس پر متفق ہیں کہ جو بھی وحی اللہ کی طرف سے نازل ہوئی (متلو ہو یا غیر متلو) وہی اللہ کی طرف سے نازل شدہ ذکر

---

(۱) جیسا کہ بعض مصنفین نے کیا ہے جس کا حال آپ پڑھ چکے ہیں (۲) الرسالہ ص ۴۲

ہے (جو آیت کریمہ انا نحن نزلنا الذکر میں مذکور ہے) لہٰذا پوری کی پوری وحی (کتاب ہو یا سنت) اللہ کی حفاظت میں یقینی طور پر محفوظ ہے اور (اس میں کبھی بھی کوئی ایسی تحریف نہیں کی جاسکتی جس کے باطل ہونے کی نشاندہی نہ کی جاسکے)۔

اس کے بعد ابن حزم ان لوگوں کی سختی کے ساتھ تردید کرتے ہیں جو اس آیت کریمہ میں الذکر کا مصداق صرف قرآن بتلاتے ہیں، کہتے ہیں:۔

یہ ایک ایسا جھوٹا دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں یعنے الذکر کو صرف قرآن کے ساتھ مخصوص ومنحصر کرنا دعویٰ بلا دلیل ہے لفظ الذکر کا مصداق ہر وہ چیز ہے جو اللہ نے اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل فرمائی ہے قرآن ہو یا سنت جو (بجائے خود) وحی ہے قرآن کی مراد اس سے واضح کی جاتی ہے اور اس لئے بھی (سنت الذکر کے تحت داخل ہے) کہ اللہ جل شانہٗ ارشاد فرماتے ہیں:۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیہم	اور ہم نے تمہارے اوپر اس ذکر کو اتارا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس چیز کی وضاحت کرو جو لوگوں کے لئے اتاری گئی ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اس آیت کریمہ سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی تشریح وتوضیح کرنے پر منجانب اللہ مامور ہیں اس لئے کہ قرآن میں کثرت سے احکام مجمل صورت میں بیان ہوئے ہیں (جب تک ان کی تفصیل نہ بتلائی جائے ان پر عمل کرنا ممکن نہیں) مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ جن کے متعلق نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بتلائے بغیر ہم نہیں جان سکتے کہ اللہ نے ہمیں کس چیز کا مکلف بنایا ہے۔ تو جب مجمل احکام کی وہ تفصیل جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی محفوظ نہ ہو، نہ ہی اس بیان رسول کی حفاظت کی کوئی ذمہ داری ہو تو ایسی صورت میں قرآن کی نصوص

(صریح آیات) سے انتفاع ناممکن ہو جائے گا اور اس طرح بہت سے
قرآن حکیم کے احکام جو اللہ نے ہم پر فرض کئے ہیں ضائع ہو جائیں گے اور
ایسی صورت میں ہم خدا کی صحیح مراد کسی بھی ذریعہ سے نہیں جان سکیں گے[1]

تیسرے شبہ کا جواب

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سنت و احادیث کے لکھنے کا حکم نہ فرمانا اور کتابت حدیث سے منع فرما دینا۔ جیسا کہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ سنت کے حجت شرعیہ نہ ہونے کی دلیل ہرگز نہیں بن سکتا بلکہ۔ جیسا کہ ہم کتابت حدیث پر بحث کے دوران بیان کر آئے ہیں کہ۔ صحابہ کرام کی جماعت میں لکھنا جاننے والوں کی قلت کے پیش نظر، اس وقت مصلحت کا تقاضہ یہی تھا کہ لکھنا جاننے والے صحابی قرآن مجید ہی کے لکھنے اور جمع کرنے پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور اس پر اپنی پوری ہمت صرف کر دیں اور یہ کہ اس وقت مسلمان اپنی تمام تر توجہ کتاب اللہ کی حفاظت پر مرکوز کر دیں کہ اس وقت (حفظ قرآن میں تساہل اور تغافل برتنے سے) قرآن کے ضائع ہو جانے کا یا کسی بھی دوسری چیز کی قرآن میں آمیزش کا شدید اندیشہ تھا (یعنے غیر قرآن کا قرآن کے ساتھ خلط ملط ہو جانے کا شدید خطرہ تھا) اور ہم اس بات کو بھی پوری تحقیق کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ (اسی خطرہ کے تحت) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کو قرآن کی طرح باضابطہ اور بالالتزام لکھنے سے منع فرمایا تھا۔ باقی رہا یہ کہ کوئی لکھنا جاننے والا اپنے یاد کرنے کے لئے حدیثیں لکھے سو اس کی مخالفت و ممانعت آپ نے نہیں فرمائی تھی بلکہ (کمزور حافظہ والے لوگوں نے نیز لکھنے پڑھنے کے شائقین نے تو) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ ہی میں، بلکہ آپ کی اجازت سے اپنے یاد کرنے کے لئے متعدد مجموعے لکھے ہیں۔

بہرحال سنت اور حدیث کے حجت شرعیہ ہونے کا دار و مدار لکھنے لکھانے پر ہرگز نہیں ہے کہ کہا جائے کہ: اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر سنت کی حجیت ہوتی تو آپ اس کے لکھنے کا ضرور حکم فرماتے اس لئے کہ سنت کے حجت ہونے کا ثبوت تو بہت سی چیزوں سے ہوتا ہے مثلاً تواتر سے،

---

(1) الاحکام ج ۱ ص ۱۲۱

قابل اعتماد اور ثقہ لوگوں کے بیان سے، تحریر سے، خود قرآن کی جمع و تدوین بھی عہد ابوبکر صدیقؓ میں صرف اس کے مختلف ٹکڑوں پر لکھا ہوا ہونے کی بنیاد پر نہیں ہوئی بلکہ صحابہ کرام نے لکھا ہوا ہونے پر اس وقت تک اعتماد نہیں کیا جب تک کہ قرآن کی ایک ایک آیت کے تواتر کے ساتھ صحابہ کو زبانی یاد ہونے کا اطمینان نہیں کر لیا اور کسی چیز کو زبانی یاد کرنے اور یاد رکھنے کا طریقہ اس کے صحیح اور محفوظ ہونے کی ضمانت کے بارے میں لکھ لینے اور قلمبند کر لینے کے طریقہ سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔

خصوصاً عرب جیسی قوم جو قوت حافظہ کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور و معروف اور حیرت انگیز یادداشت کے کرشموں کی مالک تھی ان کی قوت یادداشت کا یہ عالم تھا کہ ایک عرب طویل سے طویل قصیدہ صرف ایک مرتبہ سنکر یاد کر لیا کرتا تھا حضرت ابن عباس کے متعلق روایات سے ثابت ہے کہ انھوں نے عمر بن ربیعہ کا پورا کا پورا قصیدہ ایک نشست میں یاد کر لیا تھا[1]۔ ان میں سے بعض لوگوں کی قوت یادداشت کا یہ عالم تھا کہ ایک مجلس میں جتنی حدیثیں بیان کی جاتیں وہ سب کی سب ان کو اس طرح یاد ہو جاتیں کہ ان میں سے ایک حرف بھی نہیں چھوٹتا تھا۔ حافظ ابن عساکر نے امام زہریؒ سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ خلیفہ عبدالملک نے اہل مدینہ کے نام ایک خط لکھا جس میں اس نے فتنۂ ابن زبیر کے بارے میں اہل مدینہ کے موقف پر ملامت کی تھی یہ خط اتنا طویل تھا کہ دو طوماروں یعنے صحیفوں میں لکھا ہوا تھا تو امام زہری نے مسجد میں پڑھ کر سب کو سنا دیا اس کے بعد سعید بن المسیب نے اس خط کا مضمون معلوم کرنا چاہا کہ اس میں کیا کیا لکھا تھا تو انھوں نے اپنے شاگردوں سے دریافت کیا وہ تسلی بخش جواب نہ دے سکے تو زہری نے سعید سے پوچھا: اے ابو محمد آپ اس مکتوب میں جو کچھ لکھا ہے پورا کا پورا سننا چاہتے ہیں؟ سعید نے اثبات میں جواب دیا تو زہری نے ان کے سامنے سارا مکتوب اول سے آخر تک ایک حرف کی کمی بیشی کے بغیر پڑھ کر سنا دیا[2]۔

اس طرح کے قوت حافظہ کے بہت سے واقعات امام شافعی (وغیرہ محدثین) کے

---

(۱) جامع بیان العلم ج ۱ ص ۶۹ (۲) تاریخ ابن عساکر

متعلق بھی مشہور ہیں

لہذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث روایت کرنے یاد کرنے پڑھنے پڑھانے اور محفوظ رکھنے کے معاملہ میں بھی ان کے اعتماد کی بنیاد حافظہ اور قوت یادداشت پر ہی تھی اور ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حافظہ اور یادداشت پر اعتماد ایک حدیث کے طالب علم کے لئے حفظ حدیث میں نوشتہ پر اعتماد کرنے سے بدرجہا زیادہ بہتر اور مفید ہے

یہی وجہ ہے ان حضرات صحابہ و تابعین کے حدیثیں لکھنے کو ناپسند کرنے کی جن کے نام معترضین نے گنائے ہیں کہ کہیں حدیثیں لکھنا شروع کر دینے کے بعد یہ عجیب و غریب ملکۂ حفظ کمزور نہ پڑ جائے اور طلبۂ حدیث نوشتوں پر بھروسہ نہ کرنے لگیں۔

حافظ ابن عبدالبر حدیثیں لکھنے کے سلسلے میں بعض صحابہ اور تابعین کی رائے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

> اس باب — کراہت کتابت حدیث — کے تحت ہم نے جن حضرات کے اقوال نقل کئے ہیں ان کا مقصد درحقیقت (حفاظت حدیث کے بارے میں) عربوں کے فطری طریق کا یعنی حفظ حدیث کو ترجیح دینا اور اختیار کرنا ہے اس لئے کہ ان کی فطری قوت یادداشت بیحد قوی اور ان کی قومی خصوصیت تھی چنانچہ جن حضرات نے حدیثیں لکھنے کو ناپسند کیا ہے مثلاً، ابن عباس، شعبی، ابن شہاب زہری، ابراہیم نخعی اور قتادہ نیز وہ تمام حفاظ حدیث جو ان کے ہم مسلک ہیں اور انہی جیسی فطرت کے مالک ہیں (یہ سب کے سب نسلاً عرب تھے اور) ان حضرات کا حافظہ اور قوت یادداشت طبعی طور پر بیحد قوی تھی چنانچہ ان میں سے بعض حضرات تو صرف (ایک مرتبہ حدیث) سن لینے کو کافی سمجھتے تھے۔
>
> امام ابن شہاب زہری کا حسب ذیل بیان خاص طور پر اہم اور قابل توجہ ہے فرماتے ہیں: میں کسی وقت مدینہ طیبہ کے بازار بقیع سے گزرتا ہوں تو اپنے کان بند کر لیتا ہوں اس اندیشہ سے کہ (بازاری لوگوں کی زبان سے نکلا ہوا) کوئی ناپسندیدہ یا فحش کلمہ میرے کان میں نہ پڑ جائے (کہ پھر وہ مٹائے نہ مٹے گا)

خدا کی قسم! (آج تک) جو بات بھی میرے کانوں میں پڑی ہے میں اس کو کبھی نہیں بھولا۔ امام شعبی وغیرہ سے بھی اسی قسم کے اقوال مشہور ہیں۔ یہ تمام حضرات نسلاً عرب تھے اور اہل عصر کے متعلق نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: "ہم اَن پڑھ قوم ہیں نہ ہم لکھتے لکھاتے ہیں نہ حساب کتاب سے آشنا ہیں"۔ اور عربوں کی یہ خصوصیت تو دنیا میں مشہور ہی ہے کہ حافظہ اور یادداشت تو بس عربوں کا حصہ ہے (۱)

اس مدار حفظ حدیث پر ــ کہ صحابہ عموماً حدیثیں زبانی یاد کیا کرتے تھے ــ جب تقویٰ اور پرہیزگاری کے اس قوی ترین محرک کا اضافہ اور کر دیا جائے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان میں سے کسی نے اپنی کتاب میں کچھ ایسی حدیثیں جمع کر لی ہوں جن میں راوی کے وہم اور خطا کا امکان ہو! اور ایسی صورت میں کذب فی الحدیث کا خطرہ ہے جس کا نتیجہ جہنم کا عذاب شدید ہے) تو حدیث کے تحفظ کا معاملہ اور بھی محکم ہو جاتا ہے اسی خطرہ کے تحت حضرت ابوبکر صدیق کے متعلق بیان شدہ واقعہ کی ــ کہ انھوں نے اپنی لکھی ہوئی حدیثوں کا ایک مجموعہ جلا دیا تھا ــ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے (کہ اس کا باعث صرف ابوبکر کی انتہائی احتیاط اور شدت ورع تھا) اس توجیہہ کی ضرورت اس صورت میں ہے کہ یہ بیان شدہ واقعہ صحیح بھی ہو ورنہ حافظ ذہبی نے تو لکھا ہے کہ (حضرت ابوبکر کا) یہ واقعہ صحیح نہیں ہے اور یہی بات دل کو لگتی ہے۔

باقی بعض صحابہ کرام کا روایت حدیث سے احتراز کرنا ــ جیسا کہ معترض نے بیان کیا ہے سو اس کا سبب بھی دین کے معاملہ میں صحابہ کرام کی انتہائی پرہیزگاری اور احتیاط پسندی کا جذبہ ہے کہ کہیں ــ نادانستہ طور پر ہی سہی ــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے وہ کوئی ایسی حدیث نہ بیان کر بیٹھیں جس میں وہم یا خطا کا دخل ہو جیسا کہ حضرت زبیرؓ نے اس کی تصریح کی ہے باقی جن حضرات صحابہ کا حافظہ قوی تھا مثلاً ابن عباس، ابن مسعود، ابوہریرہ وغیرہ بغیر کسی طرح کی تنگی محسوس کیے ہمیشہ حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔ دیکھئے حضرت زید بن ثابتؓ ان لوگوں میں

جامع بیان العلم ج ا ص ۶۵

سے ہیں جو اس کو پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کی روایت کردہ حدیث کو لکھا جائے ــ جیسا کہ معترض نے ان کا واقعہ نقل کیا ہے ــ وہ خود غلط فہمی کو دور کرنے کی غرض سے کہتے ہیں: کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جو حدیث میں تم سے بیان کرتا ہوں وہ فی الواقع ویسی نہیں ہے جیسے میں نے بیان کی ہے "(۱) (یعنی میں حدیث لکھنے سے اس لئے منع نہیں کرتا کہ مجھے اس کی صحت میں کوئی شک یا تردد ہے بلکہ میں کتابت کی بہ نسبت حافظہ کو زیادہ قابل اعتماد سمجھتا ہوں)

بہرصورت جن بعض صحابہ نے حدیثیں لکھنے یا روایت کرنے سے احتراز کیا وہ درحقیقت دین کے معاملہ میں انتہائی احتیاط پسندی اور ارتکاب خطاء سے بچنے کے جذبہ پر مبنی تھا نہ اس وجہ سے کہ حدیث حجت نہیں)

علاوہ ازیں، بہرحال صحابہ وتابعین سے حدیثیں لکھنے کے واقعات معنوی طور پر تواتر کی حد تک پہونچ چکے ہیں جس کے بعد کسی بھی حق پسند شخص کو اس سے انکار کرنے یا اس میں شک وتردد کرنے کی گنجائش نہیں رہتی ۔ اس سلسلہ میں اگر مزید آثار وواقعات آپ جاننا چاہتے ہیں تو حافظ ابن عبدالبر مالکی کی کتاب جامع بیان العلم (ج ۱ ص ۷۰ تا ۷۷) کی مراجعت کیجئے اسی طرح خطیب بغدادی کی کتاب تدوین العلم میں بھی اس موضوع ــ کتابت وتدوین حدیث ــ پر کافی سے زائد سامان موجود ہے اس کی مراجعت کیجئے۔

باقی ڈاکٹر صدقی کا یہ کہنا کہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے کافی عرصہ بعد مدون ہوئی ہیں اس لئے ان پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا اور یہ کہ اس تاخیر تدوین حدیث کی وجہ سے حدیثوں میں ظن وتخمین کی گنجائش بہت زیادہ پیدا ہوگئی اور اللہ کے دین میں ظن وتخمین نہیں چلتا (یقین واطمینان کی ضرورت ہے) یہ بات تو اسی شخص کی زبان وقلم سے نکل سکتی ہے جو ائمہ وحفاظ حدیث کی ان تمام بےمثل کوششوں اور کاوشوں سے جو انھوں نے حدیث میں تحریف وتصرف، تغیر وتبدل اور کذب فی الحدیث کی بیخکنی کے سلسلہ میں کی ہیں نا آشنا ہو یا واقف ہونے کے باوجود نا واقف بنتا ہو)

---

(۱) جامع بیان العلم

اس لئے کہ جب یہ ثابت ہو چکا کہ عہد صحابہ سے لیکر پہلی صدی کے آخر تک — جبکہ خلیفۂ راشد عمر بن عبدالعزیزؒ کے حکم سے امام زہریؒ نے حدیثوں کو مدون کیا ہے — سنت و حدیث، پورے اہتمام کے ساتھ زبانی حفظ و ضبط کے ذریعہ اور خال خال کتابت کے ذریعہ بھی انتہائی محفوظ طریق پر نقل ہوتی رہی ہے اور یہ حدیثوں کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کا طریقہ برابر جاری رہا ہے درمیان میں کہیں بھی یہ سلسلہ نہیں ٹوٹا تو ایسی صورت میں حدیثوں کو شک و شبہ کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔

باقی احادیث میں خفیہ طریق پر جو جھوٹ ملا دیا گیا تھا تو حضرات محدثین و ائمہ نقد حدیث نے اس کی ایسی بیخکنی کر دی ہے اور کذب فی الحدیث و وضع فی الحدیث کی ایسی واضح نشاندہی کر دی ہے کہ اب اس بنیاد پر بھی شک و شبہ کی مطلق گنجائش باقی نہیں رہتی۔ یہاں تک کہ اب ایک مسلمان کے دل کو سنت اور احادیث کی صحت کے بارے میں اس حد تک اطمینان ہو جاتا ہے کہ قریب قریب یقین کا درجہ کو پہونچ جاتا ہے۔

اس کے باوجود ہم اس کے قائل نہیں کہ احادیث آحاد (غیر متواتر حدیثیں) — کہ تعداد کے لحاظ سے اکثر و بیشتر حدیثیں اخبار آحاد ہی ہیں — قطعی اور مفید یقین ہیں — حالانکہ بعض علماء حدیث اس کے قائل ہیں — بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ ایسی احادیث یعنی اخبار آحاد کے متعلق گمان غالب یہ ہے کہ یہ صحیح ہیں۔ ان کے مفید ظن ہونے کا بھی انکار کرنا محض مکابرہ اور ہٹ دھرمی ہے۔ ہمارے لئے تو حدیث کے حجت شرعیہ ہونے کے بارے میں یہ گمان غالب بہت کافی ہے۔

رہا یہ دعویٰ کہ دین کے احکام میں گمان نہیں چلتا۔ تو دین کے ان بنیادی اصول کے متعلق تو بالکل صحیح اور مسلم ہے جن کا انکار کرنے یا ان میں شک کرنے سے انسان کافر ہو جاتا ہے جیسے اللہ کی وحدانیت اللہ کے رسول کی صداقت قرآن کا اللہ رب العالمین کا کلام ہونے کی نسبت اور ان کے علاوہ اساسی عقائد اسی طرح اسلام کے ارکان نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ جن کا علم دین کے بدیہی اور قطعی امور میں سے ہے لیکن دین کے فروعی احکام کے بارے میں یہ دعویٰ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان فروعی احکام کو ظن غالب کے ذریعہ ثابت کرنے میں کوئی مانع نہیں (دین اور دنیا کے تمام کام ہی ظن غالب پر چلتے ہیں) بلکہ خود معترض بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ دین کے سارے ہی احکام قطعی دلائل سے ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ جو احکام براہ راست (یعنی بدون اجتہاد) قرآن سے ماخوذ ہیں اور وہ قطعی ہیں ان کی تعداد بہ نسبت ان احکام کے جو اجتہاد کے ذریعہ قرآن ہی سے اخذ کئے گئے ہیں، بہت کم ہے اس لئے کہ قرآن

کے بیان احکام میں عموم بھی ہے خصوص بھی، اطلاق بھی ہے تقیید بھی، اجمال بھی ہے تفصیل بھی، ان سب کی مراد و مصداق کو قطعی طور پر سمجھنا اور متعین کرنا ناممکن ہے۔ اور یہ تو علم اصول فقہ کا تسلیم شدہ اصول ہے۔ ہم تو اس کے ثبوت میں امام شافعی نے اپنے زمانہ کے حجیت سنت کے منکر کے سامنے شہادت پر عمل کی جو مثال پیش کی ہے، آپ کو یاد دلانا کافی سمجھتے ہیں دیکھیے شہادت کے ذریعہ کسی حکم کو ثابت کرنا یقیناً ایک ظنی دلیل سے اثبات حکم کی روشن مثال ہے کیونکہ شہادت میں گواہ کے جھوٹ بول دینے یا غلطی کر بیٹھنے کا احتمال بہرحال باقی رہتا ہے تو کیا اس کے بعد بھی اس دعوے کی کوئی گنجائش باقی رہ سکتی ہے کہ دین کے سارے احکام کے اثبات میں قطعی دلیل ضروری ہے اور ظن احکام شرعیہ کے اثبات میں مطلق کافی نہیں۔

(۴) چوتھے شبہ کا جواب

ڈاکٹر توفیق صدقی نے حجیّت سُنت کے خلاف جو احادیث پیش کی ہیں ان کا تفصیلی جواب دیجئے۔

(۱) پہلی حدیث جس میں بیان کیا گیا ہے کہ عنقریب میری طرف منسوب حدیثیں کثرت سے پھیل جائیں گی الخ

اس حدیث کے بارے میں امام بیہقی فرماتے ہیں:

> یہ حدیث منقطع (مُرسل) ہے اس لئے کہ اس حدیث کو خالد بن ابی کریمہ ابوجعفر کے واسطہ سے روایت کرتا ہے اور یہ خالد مجہول (نامعلوم شخص) ہے اور ابوجعفر صحابی نہیں ہے (۱)

امام شافعی اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں:

> اس حدیث کو کسی ایسے راوی نے روایت نہیں کیا جس کی حدیث کسی بھی چھوٹے یا بڑے معاملہ میں قبول کی جاتی ہو۔ یہ تو محض ایک نامعلوم راوی کی منقطع (مرسل) روایت ہے ہم تو اس جیسی روایت کسی معاملہ میں بھی قبول نہیں کرتے (۲)

---

(۱) مفتاح الجنۃ ص ۱۵ (۲) رسالہ ص ۲۲۵

علامہ ابن حزم اس حدیث کی ایک اور سند کے راوی حسین بن عبداللہ کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

حسین بن عبداللہ ساقط (ناقابل اعتبار) ہے اس پر زندقہ (لادینی) کا الزام ہے (۱)

امام بیہقی نے اسی کے ساتھ یہ بھی کہا ہے:۔

اسی قسم کی ایک اور حدیث بیان کی جاتی ہے کہ حدیث کو قرآن سے ملا کر دیکھو الخ یہ بھی باطل (اور بے اصل) ہے (عقلاً بھی) صحیح نہیں اس لئے کہ اس حدیث کا عکس ہی (کہ قرآن کہتا ہے کہ حدیث کو قرآن سے ملا کر دیکھو مطابق ہو تو قبول کرو ورنہ رد کر دو) اس کے باطل ہونے کی دلیل ہے کیونکہ قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں جس سے ثابت ہوتا ہو کہ حدیث کو قرآن سے ملا کر دیکھنا چاہئے (۲)

یہ تو اس حدیث کے متعلق علماء حدیث کے اقوال و آراء ہیں ہم اس حدیث کی تضعیف یا تصحیح میں ذرا توقف کر کے حسب ذیل تنقیح مناسب سمجھتے ہیں کہ اگر اس حدیث کو سنداً اور راویوں کے اعتبار سے رد کیا گیا ہے جیسا کہ علماء نقد حدیث فرماتے ہیں تب تو ہمارے لئے اس کے بارے میں بحث کی گنجائش نہیں اور جو ان حضرات کا فیصلہ ہے ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے مگر اتنی بات ضرور پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ ان حضرات میں سے کسی نے بھی اس کو موضوع نہیں کہا بلکہ بعض حضرات نے تو (محض راوی کے نامعلوم یا حدیث کے مرسل ہونے کی وجہ سے) صرف ضعیف کہا ہے جیسا کہ بیہقی اور امام شافعی کا بیان آپ پڑھ چکے ہیں۔ اور اگر اس حدیث کو متن کے اعتبار سے رد کیا جاتا ہے تو (رد کرنے سے پہلے اس پر غور کر لینا چاہئے کہ) یہ حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ روایت کی گئی ہے اکثر روایتوں میں الفاظ یہ ہیں: "پس جو حدیث قرآن کے موافق ہو اس کو قبول کر لو اور جو حدیث قرآن کے مخالف ہو یا موافق و مطابق نہ ہو اس کو رد کر دو" تو (ان الفاظ کے اعتبار سے تو یہ حدیث بالکل صحیح ہے) ان الفاظ کے اندر تو کوئی بھی ایسی بات نہیں جس کی بنا پر

---

(۱) الاحکام ج ۲ ص ۷۶ (۲) مفتاح الجنۃ ص ۶

اس کے ضعیف ہونے کا حکم لگایا جائے چہ جائیکہ اس کے بارے میں عبدالرحمٰن بن مہدی یہ کہیں کہ "یہ حدیث خارجیوں اور زندیقوں کی گھڑی ہوئی ہے" اس لئے کہ علماء حدیث کے درمیان یہ بات بالکل مُسلم اور متفق علیہ ہے کہ موضوع حدیث کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنت ثابتہ (صحیح حدیث) کے مخالف ہو اسی لئے (یہ طے شدہ ہے کہ) جب ہمارے سامنے کوئی بھی ایسی حدیث آئے گی جو کتاب اللہ کے مخالف ہو یا موافق و مطابق نہ ہو اور اس میں کسی صحیح تاویل کی بھی گنجائش نہ ہو تو باتفاق ائمہ حدیث اس حدیث پر موضوع ہونے کا حکم لگائیں گے اور کیا زیر بحث حدیث میں اس کے علاوہ کچھ اور کہا گیا ہے (پھر ان الفاظ کے ساتھ اس حدیث کو کس طرح ضعیف کہا جا سکتا ہے یہ تو بالکل صحیح حدیث ہے) ہاں اگر اس حدیث کے الفاظ یہ ہوں ـــ جیسا کہ بعض روایات میں یہ الفاظ آئے ہیں ـــ جو حدیث تم کتاب اللہ میں پاؤ اس کو قبول کرو اور جو کتاب اللہ میں نہ پاؤ اس کو رد کر دو" تو بیشک اس حدیث کو باطل کہنا پڑے گا اس لئے کہ باتفاق اہل علم بہت سی حدیثوں سے ایسے احکام ثابت ہوتے ہیں. جو کتاب اللہ میں مذکور نہیں ہیں (یعنے کتاب اللہ ان سے خاموش ہے) اور وہ حدیثیں صحیح ہیں، مقبول ہیں اور معمول بہا ہیں (اُمت نے اُن پر عمل کیا ہے)

حاصل یہ ہے کہ اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ صحیح حدیث کبھی کتاب اللہ کے خلاف نہیں ہو سکتی لہذا بعض احادیث میں جو قرآن کے خلاف احکام ملتے ہیں وہ بالاتفاق رد کر دینے کے قابل ہیں. علامہ ابن حزم لکھتے ہیں:۔

> کسی بھی صحیح حدیث میں کوئی ایسی چیز نہیں ہو سکتی جو قرآن کے خلاف ہو۔

محمد بن عبداللہ بن میسرہ کہتے ہیں:۔

> حدیث کی تین قسمیں ہیں (۱) ایک وہ حدیث جو قرآن کے موافق و مطابق ہو اس حدیث کو اختیار کرنا فرض ہے (۲) دوسری قسم وہ حدیث ہے جو قرآن کے احکام پر زائد ہو (یعنے کوئی مزید حکم اس سے ثابت ہوتا ہے) تو ایسی حدیث قرآن کے ساتھ ملحق ہے اور اس کو اختیار کرنا بھی فرض

ہے (۳) تیسری قسم وہ حدیث ہے جو قرآن کے مخالف ہے ایسی حدیث ساقط اور قابل رد ہے۔

علی بن احمد یعنے علامہ ابن حزم مزید فرماتے ہیں:۔

کسی ایسی صحیح حدیث کا وجود ہے ہی نہیں جو قرآن کے احکام کے اصلاً مخالف ہو، اس لئے کہ ہر شرعی حکم پر مشتمل حدیث یا قرآن کے کسی حکم کے ساتھ ملحق، اس پر متفرع اور قرآن کے مجمل حکم کی وضاحت کرتی ہوگی یا قرآن سے مستثنیٰ (جدا) مگر بحیثیت مجموعی قرآن کی مراد کی وضاحت کرتی ہوگی، تیسری صورت ہو ہی نہیں سکتی (۱)

علماء حدیث کی ان تصریحات کے بعد ہمارے خیال میں زیر بحث حدیث پسان الفاظ کے ساتھ کہ: "جو حدیث قرآن کے موافق نہ ہو یا مخالف ہو اس کو رد کر دو" متن کے اعتبار سے تو موضوع ہونے کا حکم ہرگز نہیں لگایا جا سکتا (کیونکہ متن بالکل صحیح اور اصول شریعت کے موافق ہے)

ہمارے اس خیال کی تائید امام شاطبیؒ کے بیان سے ہوتی ہے جو اس تحقیق اور اظہار خیال کے بعد نظر سے گزرا ہے امام شاطبیؒ اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

درحقیقت حدیث بھی اللہ تعالیٰ کی وحی ہی ہوتی ہے اس لئے وہ کتاب اللہ سے متناقض ہو ہی نہیں سکتی ہاں یہ ممکن ہے کہ حدیث میں کوئی ایسا حکم مذکور ہو جو نہ قرآن کے مخالف ہو نہ قرآن میں موجود ہو بلکہ قرآن اس سے خاموش ہو بجز اس صورت کے کہ اس امکانی صورت کے خلاف کوئی شرعی دلیل قائم ہو (یعنے وہ حکم اصول شریعت کے منافی ہو) تو ایسی صورت میں ہر حدیث کا کتاب اللہ کے موافق ہونا لابدی ہو گیا جیسا کہ زیر بحث حدیث میں مذکور ہے۔ لہذا معنی کے اعتبار سے یہ حدیث بالکل صحیح ہے

---

(۱) الاحکام ج ۲ ص ۸۰ - ۸۲

سند کے اعتبار سے صحیح ہو یا نہ ہو(۱)

شاطبیؒ کے اس بیان پر غور کیجئے بہت اہم ہے۔ بہرحال زیربحث حدیث اگر سند کے اعتبار سے صحیح بھی ثابت ہو جائے تب بھی معترض یعنے ڈاکٹر صدیقی کے لئے عدم حجیت حدیث کی دلیل ہرگز نہیں بن سکتی اس لئے کہ ہم تو خود اس کے قائل ہیں۔

(۲) باقی دوسری حدیث :۔ اذا حدثتم عنی حدیثا تعرفونہ ولا تنکرونہ قلتہ او لم اقلہ فصدقوا الخ سو یہ حدیث تو اپنی تمام سندوں کے اعتبار سے ضعیف بھی ہے اور منقطع بھی ابو محمد بن حزم اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں :۔ یہ حدیث مرسل ہے اس کا راوی اصبغ مجہول (نامعلوم شخص) ہے۔ علاوہ ازیں یہ حدیث تو خود اپنے جھوٹ اور باطل ہونے کی دلیل ہے اس لئے کہ اس حدیث میں ہے :۔

> میں نے کہا ہو یا نہ کہا ہو تم اس کے حدیث ہونے کی تصدیق کر دو"۔ محال ہے کہ یہ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مقدس سے نکل سکیں (یہ تو ایک معمولی ذی ہوش انسان بھی نہیں کہہ سکتا) اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ العیاذ باللہ آپ خود اپنے اوپر جھوٹ بولنے کی اجازت دے رہے ہیں حالانکہ آپ کا تواتر کی حد تک پہونچا ہوا ارشاد تو یہ ہے :۔
>
> من کذب علی متعمدا فلیتبوء مقعدہ من النار — جس نے جان بوجھکر مجھ پر جھوٹ بولا اسے ٹھکانا جہنم میں بنا لینا چاہیئے

اور یہ حدیث تمام اُمت کے نزدیک متواتر ہے۔

اس کے بعد ابن حزم لکھتے ہیں :۔

> اس حدیث کا ایک راوی عُبید اللہ بن سعید مشہور و معروف دروغ گو ہے۔ اور یہ تو درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خود جھوٹ کو منسوب کرنے کے مرادف ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: "میں نے نہ بھی کہا ہو

---

(۱) الموافقات ج ۴ ص ۲۱

تب بھی کہا ہے؟ تو جو بات آپ نے کہی نہیں اس کو آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں نے کہی ہے؟ اس کو تو ایک کذاب، ملحد، کافر اور احمق انسان ہی گوارا کر سکتا ہے (۱)

امام بیہقی اس حدیث کو مع السند بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں :-

حافظ ابن خزیمۃ نے کہا ہے کہ اس حدیث کے صحیح ہونے میں کلام ہے اس لئے کہ نہ ہمیں مشرق میں کوئی ایسا آدمی ملا نہ مغرب میں جو ابن ابی ذئب کی حدیث سے آشنا ہو بجز یحییٰ بن آدم کے اور نہ علماء حدیث میں کوئی ایسا محدث ملا جو حضرت ابو ہریرۃ کی روایت سے اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتا ہو۔

اس کے بعد خود بیہقی فرماتے ہیں :-

یحییٰ بن آدم کی اس حدیث میں سند اور متن دونوں کے اعتبار سے شدید اختلاف ہے جو یقیناً موجب اضطراب ہے بعض راوی ابو ہریرۃ کا ذکر کرتے ہیں اور بعض راوی ذکر نہیں کرتے بلکہ مرسل روایت کرتے ہیں (۲)

ہاں اس حدیث کی چند اور سندیں ہیں جو محدثین کے ہاں مقبول ہیں لیکن ان میں یہ الفاظ : قلتہ اولم اقلہ مطلق نہیں ہیں لیکن اس صورت میں ہمارے مخالف ڈاکٹر صدقی کا منشا پورا نہیں ہوتا اس لئے کہ اس حدیث سے تو صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ کسی حدیث کے سچے اور صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ شریعت کی بتلائی ہوئی پسندیدہ باتوں اور خوبیوں کے موافق و مطابق ہو اگر اس کے خلاف ہو تو یہ اس کے جھوٹ ہونے کی دلیل ہے ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ سچی حدیث کی پہچان یہ ہے کہ وہ معروف امور شرعیہ کے معیار پر پوری اترتی ہو لیکن اس حدیث سے یہ کیسے اور کہاں سے ثابت ہو گیا کہ حدیث حجت شرعیہ نہیں ہے۔

(۳) باقی تیسری حدیث :-

انی لا احل الا ما احل اللہ فی کتابہ ولا احرم الا ما حرم اللہ فی کتابہ

---

(۱) الاحکام ج ۲ ص ۲۰ (۲) مفتاح الجنۃ ص ۱۹

حافظ جلال الدین سیوطی اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں :-

اس حدیث کو امام شافعی اور بیہقی دونوں نے طاؤس کے طریق سے روایت کیا ہے ، امام شافعی کہتے ہیں : یہ حدیث تو منقطع (مرسل) ہے باقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا ہے (کہ تحلیل و تحریم اللہ کے حکم سے کی ہے) اسی کا آپ کو حکم دیا گیا تھا اور وحی الٰہی کی پیروی کرنا ہی آپ پر فرض کیا گیا تھا ہم اس کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے وحی الٰہی کی پیروی کی ہے تو (ایسی صورت میں آپ کی تحلیل و تحریم کو) اللہ کے فرض کر دینے کی وجہ سے ہی قبول کیا گیا ہے

امام بیہقی فرماتے ہیں :-

اگر اس حدیث میں فی کتابہ کے الفاظ صحیح روایت میں موجود ہیں تو اس کتاب سے وحی مراد ہوگی جو اللہ نے آپ کے پاس بھیجی تھی (نہ کہ قرآن) اور (آپ جانتے ہیں کہ) وحی کی دو قسمیں ہیں وحی متلو (قرآن) وحی غیر متلو (سنت)

آپ دیکھتے ہیں امام بیہقی کتاب کا مصداق قرآن کی بہ نسبت عام قرار دے رہے ہیں (جو قرآن وحدیث دونوں کو شامل ہے) یہ صرف امام بیہقی کی رائے نہیں ہے بلکہ کتاب کا لفظ مطلق وحی کے معنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں بھی آیا ہے۔ چنانچہ آپ نے ــــ (ایک زنا کے واقعہ میں) اس زانی کے باپ سے ــــ جس نے ایک آدمی کی بیوی سے زنا کیا تھا اور اس کے باپ نے اس آدمی سے کچھ بھیڑ بکریوں اور ایک خادم پر مصالحت کر لی تھی اس زانی کے باپ سے ــــ فرمایا :-

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں تم دونوں کے درمیان اللہ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا (وہ فیصلہ یہ ہے کہ) تیری بھیڑ بکریاں اور خادم تو تجھکو واپس کئے جاتے ہیں اور اس شخص کی بیوی نے اگر زنا کا اقرار کیا تو اس کو سنگسار کیا جائے گا۔

(دیکھئے اس حدیث میں آپ نے وحی سے کئے ہوئے اپنے فیصلہ کو کتاب سے تعبیر فرمایا ہے)
باقی زیر بحث حدیث میں اگر کتاب کے لفظ کو اس کے متبادر مصداق قرآن کے معنی میں استعمال کیا جائے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تحریم و تحلیل[1] فرماتے ہیں وہ بھی اللہ کی کتاب کے مطابق (جس میں نبی کی تحلیل و تحریم کی اطلاع دی گئی ہے) حلال ہے یا حرام ہے جس کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور مخالفت سے منع کیا گیا ہے

(۵) باقی حدیث :- لا یمسکن الناس علی بشئی الخ تو اس کے متعلق امام شافعی فرماتے ہیں :-

یہ حدیث طاؤس سے مروی ہے (اور طاؤس تابعی ہیں لہذا) یہ منقطع (یعنی مُرسل) ہے اور اگر صحیح بھی ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو میرے متعلق یہ نہ کہنا چاہیئے کہ : رسول اللہ اس چیز کو جو قرآن میں نہیں ہے کیسے حلال یا حرام کرتے ہیں ؟ کیونکہ رسول تو خود شارع (شریعت لانے والا) ہوتا ہے وہ اسی چیز کو حلال کرتا ہے جو اللہ کی شریعت میں حلال ہوتی ہے اور اسی چیز کو حرام کرتا ہے جو اللہ کی شریعت میں حرام ہوتی ہے (قرآن عظیم اس کی شہادت دیتا ہے)

اس مذکورہ بالا تنقیح و تجزیہ سے آپ پر یہ بات بخوبی واضح ہوگئی ہوگی کہ صاحب شبہ

---

[1] نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرائض منصبی کی آیت کریمہ ذیل میں خبر دی گئی ہے۔

یأمرھم بالمعروف وینھاھم عن المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث۔	وہ نبی ان کو ہر (شرعاً) بھلی بات کا حکم دیتا ہے اور ہر (شرعاً) بُری بات سے منع کرتا ہے اور پاکیزہ چیزوں (یا فعل و عمل) کو حلال کرتا ہے اور خبیث چیزوں (یا اعمال و افعال) کو حرام کرتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں طیبات اور خبائث عام ہیں اور مطلق یعنے قرآن میں مذکور ہوں یا نہ ہوں بشہادت قرآن عظیم نبی کی تحلیل اس چیز کے حلال اور طیب ہونے کی دلیل ہے اور تحریم اس چیز کے حرام اور خبیث ہونیکی دلیل ہے ۱۲ مترجم

(یعنی مخالف حجیت حدیث) نے جن احادیث کا سہارا لیا ہے ان میں سے بعض احادیث تو علماء حدیث کے نزدیک ثابت ہی نہیں ہیں اور جو احادیث ثابت ہیں وہ صاحب شبہ (معترض) کے دعوے کی دلیل نہیں بنتیں اور یہ ممکن بھی کیسے ہو سکتا ہے جبکہ صحیح احادیث سے اس مخالف اور ان کے ہمنوا لوگوں کی کھلی تردید ہوتی ہے۔

چنانچہ امام شافعی نے سفیان بن عیینہ عن سالم عن ابی النضر کی سند سے روایت کیا ہے کہ سالم نے عُبید اللہ بن ابی رافع کو اپنے باپ ابو رافع سے یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ:۔

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں کسی بھی ایسے (مغرور اور اور سرپھرے) شخص کو (اپنی اُمت میں) نہ پاؤں جو اپنے تخت پر تکیہ لگائے بیٹھا ہوا اور اس کے سامنے میری کوئی حدیث آئے جس میں میں نے کسی چیز کا حکم دیا ہو یا کسی چیز سے منع کیا ہو تو وہ یہ کہے: ہم نہیں جانتے، ہم تو جو اللہ کی کتاب میں پائیں گے اس کی پیروی کریں گے (یعنی میری اُمت میں میری حدیثوں کے ساتھ برتاؤ ہرگز نہ ہونا چاہیے)

اس حدیث کو ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور احمد نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح ابو عبداللہ الحاکم نے اپنی سند سے مقدام بن معدیکرب کی حسب ذیل حدیث روایت کی ہے:۔

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خیبر کے موقعہ پر (چند) چیزیں حرام فرمائیں منجملہ ان کے پالتو گدھے وغیرہ بھی تھے تو (اس پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک وقت آنے گا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی مسند پر تکیہ لگائے بیٹھا ہوگا اس کے سامنے میری حدیث بیان کی جائے گی تو وہ کہے گا: میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے اس میں جو چیز ہم حلال پائیں گے اس کو حلال کہیں گے اور جو چیز اس میں ہم حرام پائیں گے اس کو حرام کہیں گے۔

> اس پر امام شافعی نے فرمایا: (اس حدیث کے ذریعہ تو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں پر (قیل وقال کا) دائرہ تنگ (اور دروازہ بالکل بند)

کر دیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بھی بات کو رد کر سکیں اس لئے
کہ اللہ نے لوگوں پر امر رسول کی اطاعت فرض کر دی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ سنت کے دین میں حجت ہونے سے انکار اور یہ دعویٰ کہ اسلام تو صرف قرآن ہے، یہ وہ بات ہے جسے ایک ایسا مسلمان جو خدا کے دین اور شریعت کے احکام کو بھی حقیقت جانتا اور مانتا ہے، ہرگز نہیں کہہ سکتا، یہ بات واقعہ اور حقیقت کے بھی منافی ہے اس لئے کہ شریعت کے اکثر و بیشتر احکام تو سنت ہی سے ثابت ہیں، قرآن میں جو احکام مذکور ہیں وہ تو انتہائی مجمل ہیں اور اکثر قواعد کلیہ ہیں ورنہ سنت سے صرف نظر کر لینے کے بعد قرآن میں کہاں آیا ہے۔ کہ نمازیں پانچ ہیں؟ نیز ہر نماز کی رکعتوں کی تعداد، زکوٰۃ کی مقدارین، حج کے تفصیلی اور عملی احکام، اور ان کے علاوہ عبادات و معاملات کے تفصیلی احکام قرآن میں کہاں ہیں؟ امام بن حزم اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں :-

اس غلط اور باطل قول کے قائل سے ہم پوچھتے ہیں کہ کونسے قرآن میں یہ موجود ہے کہ ظہر کی چار رکعتیں ہیں اور مغرب کی تین اور رکوع کس طرح کیا جائے : در سجدہ کس طرح اور نماز میں قرأت قرآن کی کیفیت کیا ہے اور سلام کا طریقہ کیا ہے اور روزہ کن چیزوں سے ٹوٹتا ہے، سونے چاندی بھیڑ بکری، اونٹ گائے وغیرہ اموال پر زکوٰۃ کی تفصیلات، نصاب زکوٰۃ جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور کس مال میں سے کتنی زکوٰۃ لیجاتی ہے، حج کے اعمال و مناسک حج مثلاً وقوف عرفہ، عرفات میں نماز ظہر و عصر کی کیفیت، وقوف مزدلفہ، اور مزدلفہ میں نمازوں کی صورت، وقوف کا وقت، جمروں کی رمی، احرام کی کیفیت، احرام کے منافی کیا کیا چیزیں ہیں جن سے بچنا ضروری ہے، چور کا ہاتھ کاٹنے کی تفصیل، حرمت ثابت کرنے والی رضاعت (دودھ پلانے) کی تفصیل، کھانے کی چیزوں میں کون کونسی چیزیں حرام ہیں، ذبیحہ اور قربانی کی تفصیلات، حدود (شرعی سزائیں) کے احکام، طلاق واقع ہونے نہ ہونے کی تفصیلات، خرید و فروخت کے احکام صحیح اور فاسد یا باطل بیوع اور سود کے احکام اور سودی اموال کا بیان، عدالتی مقدمات، دعاوی، قسم، شہود، کے احکام، وقف، حین حیاتی ہبہ، صدقات اور نفقہ سے متعلق ہر قسم کے احکام۔ ان تمام لابدی مسائل و احکام کی عملی تفصیلات یقیناً قرآن میں موجود نہیں ہیں (اور ان کے بغیر احکام خداوندی

پر عمل ناممکن ہے) قرآن عظیم کے تو اکثر و بیشتر احکام ایسے مجمل ہیں کہ اگر ہم سنت سے صرف نظر کر لیں تو یقیناً ہم ان کو نہیں جان سکتے کہ ان پر کس طرح عمل کریں ان تمام احکام شرعیہ کے لئے لازمی طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول احادیث ہی کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے اجماع کا حال بھی یہی ہے (اس لئے کہ اس میں کتاب و سنت کے مخالف نہ ہونا شرط ہے) پھر اجماعی مسائل ہیں بھی بہت تھوڑے، لہٰذا اجماع کے بعد بھی حدیث کی طرف رجوع اور احتیاج ناگزیر ہے۔ (علاوہ ازیں) اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہم تو وہی مانیں گے جو قرآن میں ہے وہ باجماع امت کافر ہے نیز اس شخص پر لازم ہے کہ وہ آفتاب ڈھلنے سے لیکر رات کے اندھیرے تک نماز کی صرف ایک رکعت پڑھے اور دوسری رکعت فجر کے وقت کیونکہ یہی کم سے کم مقدار ہے جس پر لفظ صلوٰۃ کا اطلاق ہوتا ہے اور اس سے زیادہ کی کوئی حد قرآن میں مذکور نہیں لہٰذا اس قول کا قائل یقیناً کافر مشرک ہے۔ مسلمانوں کے لئے اس کی جان (قتل کر دینا) بھی حلال ہے اور مال بھی حلال ہے۔ یہ تو درحقیقت صرف مٹھی بھر غالی (کٹر) رافضیوں کا مذہب ہے جن کے کافر ہونے پر تمام اُمت کا اجماع ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں تو صرف ان احکام کو تسلیم کرتا ہوں جن پر تمام اُمت کا اجماع ہے اور بس، یعنی جو احکام قرآن کی نصوص سے ثابت ہیں لیکن ان کی مراد و مصداق کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے ان کو بھی نہیں مانتا تو یہ شخص بھی باجماع اُمت فاسق و کافر ہے۔

ان دونوں مقدموں سے یہ حقیقت ثابت ہو جاتی ہے کہ حدیث کو قبول کرنا اور دین میں حجت ماننا مسلمان رہنے کے لئے بھی) ضروری اور لابدی ہے (اور منکر حدیث کافر ہے) (۱)

---

(۱) الاحکام ج ۲ ص ۷۹ ــ ۸۰

چوتھی فصل

سُنّت کے ساتھ ان لوگوں کا رویہ جو "خبرِ واحد" کو حجت شرعیہ نہیں مانتے

تعریف علماء حدیث نے حدیث کی دو قسمیں کی ہیں۔

(۱) ایک متواتر حدیثیں یہ وہ احادیث ہیں جن کو عادل اور ثقہ راویوں کی ایک کثیر جماعت سلسلہ بسلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک، روایت کرتی رہی ہے (جن کے متعلق حدیث میں جھوٹ، بولنے پر آپس میں اتفاق کر لینے کا گمان عادتاً محال ہو)

(۲) دوسری احادیث آحاد، یہ وہ حدیثیں ہیں جن کو (ہر طبقہ میں) ایک، دو ثقہ راوی، ایک دو ثقہ راویوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سلسلہ بسلسلہ روایت کرتے رہے ہوں۔[1]

---

[1] صحابہ اور تابعین کے طبقہ کے بعد تو بیشتر احادیث کے راویوں کی تعداد اتنی بڑھ جاتی ہے کہ تواتر کی حد کو پہونچ جاتی ہے اسلئے مدار صرف صحابہ اور تابعین پر ہے یعنے جس حدیث کی روایت کرنے والے صحابہ اور تابعین کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ تواتر کی حد کو پہونچ جائے وہ حدیث متواتر ہے ورنہ خبر واحد ہے۔ مترجم

بعض علماء نے خبر واحد کی تعریف یہ کی ہے : ہر وہ حدیث جس کو ہر طبقہ میں اتنے راویوں نے روایت کیا ہو جن کی تعداد تواتر کی حد کو نہ پہونچتی ہو (یعنے ہر وہ حدیث جو متواتر نہ ہو وہ خبر واحد ہے یہ خبر واحد کی سلبی تعریف ہے اور پہلی تعریف ایجابی ہے)

حنفیہ نے (خبر متواتر اور خبر واحد کے درمیان) حدیث کی ایک تیسری قسم بھی بیان کی ہے جس کو "حدیث مشہور" کہتے ہیں۔ مشہور وہ حدیث ہوتی ہے جو ابتداء سند (یعنے صحابہ اور تابعین کے طبقہ) میں تو خبر واحد ہو (ایک دو صحابی اور تابعی اس کو روایت کرتے ہوں) لیکن قرن دوم وسوم (۱) (تبع تابعین کے طبقہ) میں اس کے راویوں کی تعداد تواتر کی حد کو پہونچ گئی ہو جیسے حدیث انما الاعمال بالنیات (کہ صحابہ میں صرف حضرت عمرؓ نے اور ان سے صرف علقمہ نے اور علقمہ سے صرف محمد بن ابراہیم تیمی نے اور ابراہیم تیمیؒ سے صرف یحییٰ بن سعید نے روایت کیا ہے یحییٰ کے بعد اس حدیث کے راویوں کی تعداد حد تواتر کو پہونچ گئی ہے)

علماء امت کا اس پر اتفاق ہے کہ حدیث متواتر علم اور عمل دونوں کے لئے مفید ہے (یعنے اس پر یقین کرنا بھی ضروری ہے اور عمل کرنا بھی واجب ہے) اور بغیر کسی اختلاف کے سب کے نزدیک حجت شرعیہ ہے بجز ان منکرین حدیث کے جو سرے سے حدیث کے حجت ہونے کے ہی منکر ہیں جن کے متعلق تفصیلی بحث ومناظرہ آپ پڑھ چکے اور بجز ان اقوال کے جو نظام اور اس کے ہمخیال لوگوں سے منقول ہیں (کہ وہ کسی حدیث کو حجت نہیں مانتے اگرچہ حدیث متواتر ہی کیوں نہ ہو) باقی خبر واحد کے بارے میں جمہور علماء امت کا اس پر اتفاق ہے کہ خبر واحد حجت شرعیہ ہے اس پر عمل کرنا واجب ہے اگرچہ وہ ظن غالب ہی کے لئے مفید ہو۔

امام رازیؒ نے تو اپنی کتاب محصول میں (یہاں تک) دعویٰ کیا ہے کہ صحابہ کرام کا بھی اس پر اجماع ہو چکا ہے (۲)

لہ یہ تقسیم صرف حنفیہ ہی نے نہیں بلکہ عام علماء حدیث نے بھی کی ہے اور نہ صرف مشہور یا مستفیض بلکہ "عزیز" بھی حدیث کی ایک قسم قرار دیتے ہیں۔ باقی ان سب اقسام کو خبر واحد کے تحت ہی داخل کرتے ہیں گویا بنیادی طور پر حدیث کی دو ہی۔

(۱) التحریر وشرحہ ج ۲ ص ۲۳۵ (۲) المحصول ج ۲

بعض علماء کا تو مسلک یہ ہے — جن میں امام احمد حنبل، حارث بن اسد محاسبی، حسین بن علی کرابیسی اور ابو سلیمان شامل ہیں اور امام مالک سے بھی ایک روایت ہے(۱) — کہ خبر واحد قطعی (یعنی یقینی حجت شرعیہ) ہے علم و عمل دونوں کے وجوب کے لئے مفید ہے (یعنے اس کے صحیح ہونے کا اعتقاد اور اس پر عمل دونوں ضروری ہیں)۔ ان علماء میں سے ہر فریق نے اپنے اپنے مسلک کے اثبات کے لئے دلائل پیش کئے ہیں جو اصول کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

(بہر صورت) قابل ذکر بات یہ ہے کہ خبر واحد کے حجت شرعیہ ہونے اور اس پر عمل واجب ہونے پر ان تمام علماء کا کلی اتفاق ہے ہاں رافضی فرقہ، قاسانی اور ابن داؤد سے خبر واحد کے حجت ہونے کا انکار بیشک منقول ہے(۲)۔ تحریر اور اس کی شرح میں اس قول کو رافضیوں اور ابن ابی داؤد کی طرف منسوب کیا ہے

علامہ ابن حزم کے بیان (الاحکام ج ۱ ص ۱۳۳ پر) سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ (عموماً) معتزلہ خبر واحد کے حجت نہ ہونے کے قائل ہوئے ہیں۔ امام شافعیؒ نے اپنی کتاب الرسالہ اور الام میں اس بات کو صاف نہیں کیا کہ خبر واحد کے حجت نہ ہونے کا کون قائل تھا۔ اگرچہ کتاب الام میں ان مخالفین کے ساتھ ان کے مناظرہ اور بحث سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بصرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے یہ لوگ معتزلہ بھی ہو سکتے ہیں اور رافضی بھی۔ کیونکہ بصرہ ہی اسلام میں علمی اور عقلی تحریکات کا مرکز تھا اس دور کے مشہور فرقے اور مختلف مکتب خیال کے پیرو وہاں جمع تھے۔ مسلم کے شارح نے (ج ۲ ص ۱۳ پر) اور مختصر کے شارح نے (ج ۲ ص ۵۹ پر) خبر واحد کی حجیت کا منکر رافضیوں اور اہل ظاہر کو بتلایا ہے۔

اہل ظاہر کی طرف اس قول — انکار حجیت خبر واحد — کی نسبت عجیب سی معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ ابن حزم — امام اہل ظاہر — کی کتابوں سے اور عام علماء اہل ظاہر کے بیانات سے تو، معلوم ہوتا ہے کہ اہل ظاہر اس مسئلہ میں جمہور علماء امت کے ساتھ ہیں۔

---

(۱) الاحکام للآمدی ج ۱ ص ۱۰۸

(۲) الاحکام ج ۱ ص ۱۰۲

خبر واحد کے حجت شرعیہ ہونے سے انکار کے دلائل

(۱) پہلی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ولا تقف مالیس لک بہ علم — تم اس چیز کے پیچھے مت چلو جس کا تمہیں علم نہیں

نیز ارشاد ہے:

ان الظن لا یغنی من الحق شیئا — گمان حق میں کا کچھ بھی فائدہ نہیں دیتا

اور خبر واحد کا طریقہ یعنے سلسلۂ روایت ظنی ہے اس لئے کہ ہر راوی کے متعلق بھول جانے یا غلطی کرنے کا احتمال بہرحال موجود ہے اور جس دلیل کی صورت حال یہ ہو (کہ اس میں وہم وخطا کا امکان ہو) وہ قطعی اور یقینی نہیں ہوسکتی نہ ہی وہ (کسی بھی مسئلہ میں) استدلال کے لئے مفید ہوسکتی ہے۔

(۲) دوسری دلیل اگر دین کے فروعی مسائل (احکام شرعیہ) میں خبر واحد پر عمل کرنا جائز ہے تو اصول دین اور عقائد میں بھی خبر واحد پر عمل جائز ہونا چاہئے، اور ہم اور آپ (دونوں فریق) اس پر متفق ہیں کہ اصول وعقائد میں خبر واحد کو قبول نہیں کیا جاتا تو فروعی مسائل اور احکام میں بھی ایسا ہی ہونا چاہئے (یعنی خبر واحد اگر حجت شرعیہ ہے تو اصول وفروع دونوں میں ہونی چاہیے اور اگر حجت نہیں ہے تو دونوں میں نہ ہونی چاہیے یہ تفریق کیوں اور کہاں سے آئی)

(۳) تیسری دلیل صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ جب ایک مرتبہ آپ نے (بھول کر) ظہر یا عصر کی نماز میں دو رکعت پر سلام پھیر دیا اور ذوالیدین نے آپ کو یہ کہکر کہ یا رسول اللہ نماز کچھ کم ہوگی یا آپ بھول گئے ہیں۔ آپ کو اس نسیان سے آگاہ کیا تو آپ نے ذوالیدین کی خبر کو قبول کرنے میں توقف فرمایا اور اس وقت تک ذوالیدین کی خبر کو قبول نہ فرمایا جب تک حضرت ابوبکر وعمر اور ان کے علاوہ صف اول کے مقتدیوں نے اس کی تصدیق نہ کردی اس کے بعد آپ نے نماز پوری فرمائی اور سجدہ سہو کیا۔ اگر خبر واحد حجت ہوتی اور اس پر عمل کرنا

واجب ہوتا تو آپ بلا توقف اور بغیر سوال کے ذوالیدین کے بیان پر اعتماد کر کے نماز پوری فرما لیتے

(۴) چوتھی دلیل متعدد صحابہ کرام سے بھی خبر واحد کو قبول نہ کرنا اور اس پر عمل نہ کرنا مروی ہے چنانچہ :

۱۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جدّہ (نانی) کی میراث کے مسئلہ میں مغیرہ بن شعبہؓ کی حدیث کو رد کر دیا اور اس وقت تک اس پر عمل نہیں کیا جب تک کہ محمد بن مسلمہؓ کی حدیث سے اس کی تائید نہ ہو گئی۔

۲۔ حضرت عمرؓ نے "استیذان" (مکان کے اندر آنے کی اجازت) کے مسئلہ میں ابو موسیٰ اشعری کی حدیث کو اس وقت تک قبول نہیں کیا جب تک کہ ابو سعید خدریؓ کی حدیث سے اس کی تائید نہ ہو گی۔

۳۔ حضرت ابوبکر و عمر نے حکم بن العاص کے (مدینہ) واپس آنے کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اذن (اجازت) سے متعلق حضرت عثمان کی حدیث کو قبول نہیں کیا۔

۴۔ حضرت علیؓ نے مفوّضہ (وہ عورت جس کو طلاق کا اختیار دیدیا گیا ہو) کے مسئلہ میں ابو سنان اشجعیؓ کی حدیث کو قبول نہیں کیا نیز حضرت علیؓ جب تک راوی حدیث سے حلف نہ اٹھوا لیتے اس وقت تک اس کی حدیث کو قبول نہ کرتے بجز حضرت ابوبکر صدیقؓ کے کہ ان کی حدیث کو بغیر قسم کے قبول کر لیتے تھے۔

۵۔ حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ عمرؓ کی اس حدیث کو نہیں مانا جس میں آیا ہے کہ میت کے گھر والوں کے رونے دھونے سے میت کو عذاب ہوتا ہے [1]

مذکورہ بالا دلائل کا جواب

ان دلائل کے علماء حدیث نے مختلف جوابات دیئے ہیں ہم ان کا خلاصہ ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

---

[1] الاحکام للآمدی ج ۱ ص ۹۴ نیز التقریر ج ۲ ص ۲۷۲ - ۲۷۳

(۱) پہلی دلیل ہم بیان کر چکے ہیں کہ دین کے بنیادی اصول (عقائد وغیرہ) اور قواعد عامہ کے بارے میں بیشک قطعی اور یقینی دلائل کا ہونا ضروری ہے لیکن فروعی مسائل اور جزئیات دین کے بارے میں تو "ظن غالب" پر عمل کرنا واجب ہے اس لئے کہ اس معاملہ میں ظن غالب پر عمل کرنے کے سوا کوئی دوسری راہ ہے ہی نہیں (یعنی ہر حکم شرعی اور جزئی مسئلہ میں قطعی اور یقینی دلیل میسر آنا ممکن نہیں) خود قرآن کی نصوص[۱] (اور صریح آیات) ہی کو لے لیجئے کہ اُن کے معانی اور مصادیق متعین کرنے میں کس قدر اختلاف آراء پایا جاتا ہے اور ائمہ مجتہدین اس سلسلہ میں ایک دوسرے سے مختلف مسلک اختیار کرتے ہیں مگر کوئی ایک مجتہد بھی اپنے اجتہاد کو قطعی اور یقینی نہیں کہتا۔ اس کے باوجود ہر مجتہد کے اجتہاد سے جو حکم شرعی ثابت ہو (اس مجتہد اور اسکے متبعین کے لئے) اس پر عمل کرنے کے واجب ہونے پر اُمت کا اجماع ہے اس لئے کہ ظن غالب پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں (ورنہ قرآن پر عمل کرنا ممکن نہ ہوگا)

علاوہ ازیں خبر واحد (خود اگرچہ ظنی ہے مگر اس) کا حجت شرعیہ ہونا دلیل ظنی سے ثابت نہیں بلکہ دلیل قطعی سے ثابت ہے اس لئے کہ صحابہ کرام سے لیکر ان کے بعد تک کے علماء (یعنی خیر القرون) کا اس پر اجماع ہے (اور صحابہ کا اجماع مسلمہ طور پر حجت قطعیہ ہے) اور اس اجماع

---

[۱] مثلاً مطلقہ حائضہ کی عدت کے متعلق قرآن کی نص ثلاثۃ قروء میں قرأ کے معنی امام شافعیؒ کے نزدیک طُہر کے ہیں اور وہ تین طہر کے زمانہ کو عدتِ طلاق قرار دیتے ہیں اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک لفظ قرأ کے معنی حیض کے ہیں اور ان کے نزدیک تین حیض کا زمانہ عدت طلاق ہے ظاہر ہے کہ ہر دو ائمہ مجتہدین نے اپنے اپنے اجتہاد سے طہر یا حیض کے معنی متعین کئے ہیں قطعی دلیل کسی کے پاس بھی نہیں ہے تو اگر ہر ہر حکم کے لئے قطعی اور یقینی دلیل کا ہونا ضروری قرار دیا جائے تو قرآن کریم کی اس آیت پر عمل کرنا ممکن نہ ہوگا اس نص پر عمل کرنے کی اس کے سوا کوئی سبیل نہیں کہ ظن غالب پر اکتفا کیا جائے امام شافعی اور ان کے متبعین مطلقہ حائضہ کی عدت تین طہر قرار دیں اور اس پر عمل کریں امام ابو حنیفہ اور ان کے متبعین تین حیض عدت قرار دیں اور اس پر عمل کریں چنانچہ ائمہ مجتہدین اور ان کے متبعین بلکہ تمام اُمت نے اس آیت پر اسی طرح عمل کیا ہے۔ مترجم

کی مخالفت پر اجماع کے دعوے سے اس اجماع کو کوئی ضرر نہیں پہونچتا اس لئے کہ (صحابہ کے اجماع کے مقابلہ میں)

یہ اجماع ایسی مخالفت ہے جس کی شریعت میں کچھ حقیقت نہیں۔ لہذا خبر واحد پر عمل کرنا ظنی دلیل پر مبنی نہیں ہے بلکہ ایسی یقینی دلیل پر مبنی ہے جو قطعیت (اور یقین) کے لئے مفید ہے یعنی اجماع (۱)

(۲) دوسری دلیل کا جواب

اس پر تو امت کا اجماع ہو چکا ہے کہ دین کے اصول اور عقائد کے ثبوت میں ظنی دلیل کو قطعاً قبول نہیں کیا جائے گا لیکن فروعی احکام کے بارے میں ایسا (کوئی اجماع) نہیں ہے۔ آمدی لکھتے ہیں:-

> مخالفین کی یہ دلیل (کہ اصول اور فروع دونوں کا حکم یکساں ہونا چاہیے) فتوی اور شہادت کے بارے میں خبر واحد کے مقبول ہونے سے ٹوٹ جاتی ہے (یعنی فتوے میں بھی خبر واحد سب کے نزدیک مقبول ہے، اور شہادت میں بھی، تو اگر فروع کا حکم بھی وہی ہوتا جو اصول کا ہے تو نہ فتوے میں خبر واحد قبول ہونی چاہیے تھی نہ شہادت میں) تو پھر اصول اور فروع کے درمیان — یہ فرق کیسے مسلم نہ ہوگا جبکہ وہ موجود ہے۔ اصل یہ ہے کہ رسول کی رسالت اور دین کے عقائد کے ثبوت کے لئے قطعی دلیل کا ہونا شرط ہے اس لئے اس میں ظنی دلیل معتبر نہیں ہے[لہ]، فروعی مسائل احکام کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ ان کے ثبوت میں قطعی دلیل کا ہونا

---

(۱) الاحکام للآمدی ج ص ۱۰۲، نیز الاحکام لابن حزم ج ۱ ص ۱۱۴

لہ اس لئے کہ عقائد پر تو ایمان لانا مطلوب ہوتا ہے اور ایمان لانے کے لئے مؤمن بہ (جس پر ایمان لایا جائے) کا یقین و اذعان کامل ہونا ضروری ہے لہذا عقائد میں دلیل کا قطعی اور یقینی ہونا شرط ہے اس کے برعکس مسائل و احکام پر عمل مطلوب ہوتا ہے اور عمل کے لئے ظن غالب کافی ہے اسی لئے ان کے ثبوت کے لئے دلیل کا قطعی ہونا شرط نہیں ہے اور یہی وجہ فرق ہے عقائد و اصول اور مسائل و احکام کے درمیان۔ مترجم

شرط نہیں ہے)(۲)

حق یہ ہے کہ یقین کے ضروری ہونے کے معاملہ میں فروعی احکام و مسائل کو اصول دین پر قیاس کرنا سینہ زوری ہے اور قطعاً محال ہے کیونکہ فروعی احکام و مسائل میں قطعی یقین حاصل کرنے کی کوئی صورت بیسر نہیں عقلاً، واصول کا معاملہ اس کے برعکس ہے (کہ ان پر ایمان لانا ہے اور ایمان قطعی یقین کے بغیر ممکن نہیں اگر ذرا بھی شک یا تردد کا شائبہ پیدا ہو جائے تو ایمان، ایمان نہ رہے گا) یہ (فرق) ایسا بدیہی ہے کہ اس سے اختلاف کرنا ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں۔

(۳) تیسری دلیل کا جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالیدین کی خبر میں توقف صرف اس لئے فرمایا تھا کہ آپ کو بجا طور پر ذوالیدین کے متعلق خطا یا نسیان کا گمان تھا اس لئے کہ صحابہ کرام کے اتنے بڑے مجمع میں سے سوائے ذوالیدین کے اور کوئی بھی آپ کو نہیں ٹوکتا سب خاموش ہیں (کہیں یہ خود ہی نہ بھول گئے ہوں، اس لئے ذوالیدین کے متعلق وہم کا گمان بالکل قرین قیاس تھا) اور یہ تو علماء اصول کا قاعدہ ہے کہ اگر خبر واحد میں وہم کی علامات پائی جائیں تو اس کے قبول کرنے میں توقف ضروری ہے۔

چنانچہ باقی صحابہ کے تصدیق کرنے کے بعد ذوالیدین کے متعلق غلطی یا وہم کا امکان نہ رہا تو آپ نے ذوالیدین کی اطلاع پر ہی عمل فرمایا (نماز پوری کی سجدہ سہو فرمایا) توقف کی وجہ صرف یہی احتمال خطا تھا نہ یہ کہ خبر واحد قابل عمل نہیں ہوتی اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے اس لئے کہ حضرت ابوبکر و عمر کی تائید کے بعد بھی ذوالیدین کی خبر، خبر واحد ہی رہتی ہے تواتر کی حد کو نہیں پہونچتی (لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل بہر صورت خبر واحد پر کیا ہے خواہ وہ خبر ذوالیدین کی خبر ہو یا ابوبکر و عمر کی) اور یہی محل نزاع ہے اگر مخالفین اس کو تسلیم کرلیں تو ہمارا مدعا ثابت ہے (کہ خبر واحد موجب عمل ہے)

(۴) چوتھی دلیل کا جواب صحابہ کرام کے متعلق تو جو امر محقق ہے جس میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں وہ تو یہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ خبر واحد پر عمل کیا ہے ان کا یہ تعامل تواتر کی حد تک پہونچا ہوا ہے۔ عنقریب ہم ایسے دلائل اور واقعات پیش کریں گے

---

(۱) الاحکام للآمدی ج ا ص ۹۸

جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے خبر واحد پر ہمیشہ عمل کیا ہے باقی کسی خاص واقعہ میں ان کا خبر واحد کے بارے میں توقف کرنا اس امر کی دلیل ہرگز نہیں ہے کہ وہ خبر واحد پر عمل نہیں کرتے تھے بلکہ انھوں نے توقف کسی نہ کسی شبہ کی بنا پر یا قبول حدیث کے باب میں انتہائی احتیاط کی بنا پر کیا ہے چنانچہ اس کی ایک واضح مثال وہی حدیث لے لیجئے جسے مخالفین دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں یعنی حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جدہ (نانی) کی میراث کے بارے میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی حدیث کو رد کر دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے مغیرہ بن شعبہ کی حدیث کو اس لئے رد نہیں کیا تھا کہ وہ اخبار احاد کو قبول نہیں کیا کرتے تھے بلکہ انھوں نے حدیث کو قبول کرنے میں توقف صرف اس لئے کیا تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ کوئی دوسری دلیل اور مل جائے جس سے مغیرہ کی حدیث کی تائید ہوتی ہو تاکہ ان کو اسلام کے اس "قانون" کے بارے میں مزید یقین و اطمینان حاصل ہو جائے کہ اسلامی قانون میراث میں (ماں کے نہ ہونے کی صورت میں) جدہ (نانی) کو چھٹا حصہ ملتا ہے اس لئے کہ قرآن مجید میں اس کی تصریح نہ تھی ایسی صورت میں اس پر عمل کرنے اور نافذ کرنے میں حضرت ابو بکر صدیق کے لئے اس قدر تحقیق و تثبت اور احتیاط ناگزیر تھی۔ جب محمد بن مسلمہ نے گواہی دی کہ میں نے بھی اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے تو حضرت ابو بکر کو مغیرہ کی حدیث پر عمل کرنے میں کوئی تردد یا تامل نہیں رہا۔

حضرت عمرؓ کے ابو موسیٰ اشعریؓ کی حدیث کو قبول کرنے میں توقف کی توجیہہ بھی یہی ہے۔

درحقیقت شیخین رضی اللہ عنہما کا قبول حدیث کے بارے میں یہ طرز عمل ایک عظیم اور موثر درس ہے دوسرے صحابہ کے لئے، ان کے بعد آنے والے محدثین کے لئے اور ان نو آموز لوگوں کے لئے جن کی ذہنی تربیت کما حقہ نہیں ہوئی تھی یا جو اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث (کو عام خبر دینے والوں کی خبروں کی طرح نہ سمجھیں بلکہ حدیث) کو قبول کرنے میں انتہائی چھان بین اور احتیاط از بس ضروری ہے (اس لئے کہ حدیث رسول اللہ تو درحقیقت دین ہے اور دین ہر کس و ناکس سے نہیں لیا جاتا) اسی لئے تو حضرت عمر نے ابو سعید خدریؓ کی شہادت کے بعد ابو موسیٰ اشعری سے کہا تھا:

یاد رکھو! تم (میرے اس طرز عمل سے) یہ نہ سمجھ لینا کہ میں تم کو روایت حدیث کے باب میں

متہم (ناقابل اعتماد) سمجھتا ہوں بلکہ میرے بھائی! یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث (کا معاملہ) ہے (اس میں امکان بھر احتیاط کی ضرورت ہے)

اس قسم کے اور واقعات میں بھی جو مخالفین کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں، ہمارا جواب یہی ہے اس قسم کے (تثبت اور احتیاط فی قبول الحدیث کے) واقعات خبر واحد کے حجت شرعیہ ہونے کے خلاف دلیل ہرگز نہیں بن سکتے ورنہ (اگر ان حضرات کے نزدیک خبر واحد حجت نہ ہوتی) تو ایک صحابی کی حدیث سے تائید ہو جانے کے بعد بھی اس پر عمل نہ کرنا چاہیے تھا اس لئے کہ اس تائید کے بعد بھی وہ خبر، خبر واحد ہی رہتی ہے اگرچہ ایک دو راوی اور بھی مل جائیں (تواتر کی حد کو پھر بھی نہیں پہونچتی)

آگے چل کر ہم تفصیل سے صحابہ کے اس طرز عمل پر روشنی ڈالیں گے کہ صحابہ تو (محض تثبت فی الحدیث کی خاطر) ایک دوسرے سے حدیثوں کے بارے میں پوچھ گچھ بھی کیا کرتے تھے، ایک دوسرے کی غلطیوں کی نشاندہی بھی کیا کرتے تھے (مگر اس تمام پوچھ گچھ اور رد وقدح سے) ان کا مقصد صرف اللہ کے دین کی حفاظت میں انتہائی جدوجہد اور تحقیق و تثبت سے کام لینا تھا (جس کے وہ مامور تھے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے باب میں ایسی چھان بین سے کام لینا تھا کہ امکانی حد تک غلطی یا وہم سے پاک ہو جائیں۔ آمدی لکھتے ہیں:

> جن حدیثوں کو صحابہ نے رد کیا یا ان کے قبول کرنے میں توقف کیا، اس کے موجب ایسے امور ہوئے ہیں جن کا تقاضہ یہی تھا (کہ ایسا کیا جائے) مثلاً اس حدیث کے معارض کوئی دوسری حدیث موجود تھی یا قبول حدیث کی کوئی شرط پوری نہیں ہو رہی تھی۔ نہ یہ کہ وہ سرے سے خبر واحد سے استدلال کرنے کے مخالف تھے، دراں حالیکہ صحابہ تو ایک دوسرے کی بیان کردہ حدیث کے قبول کرنے کے بارے میں بالکل متفق تھے۔ اسی لئے ہمارا تو اس پر اتفاق ہے کہ قرآن وحدیث کی تمام واضح نصوص حجت شرعیہ ہیں اگرچہ بعض خارجی امور کی بنا پر کسی حدیث کو چھوڑ دینا یا اس کے قبول کرنے میں توقف کرنا بھی جائز ہے (۱)

---

(۱) الاحکام ج ۱ ص ۷۹

بہر حال حجیت خبر واحد کے منکرین کے یہ شبہات اور ان کے جوابات ہیں جو علماء اصول نے اصول کی کتابوں میں بیان کئے ہیں۔

اب ہمارے ذمہ ان دلائل کا بیان کرنا باقی رہ جاتا ہے جن کی بناپر خبر واحد پر عمل کرنا واجب ہے اور کسی بھی مسلمان کے لئے روا نہیں ہے کہ وہ خبر واحد کی مخالفت کرے جبکہ وہ صحیح سند سے اس کے نزدیک ثابت ہو۔

علماء اصول نے خبر واحد کے حجت شرعیہ ہونے کے ثبوت میں بہت سی دلیلیں بیان کی ہیں جن میں سے بعض دلائل میں کلام کرنے کی گنجائش بھی ہے بعض کو مانا اور بعض کو رد بھی کیا جا سکتا ہے[1] لیکن ہم تو اس موقعہ پر مناسب سمجھتے ہیں کہ امام شافعیؒ کی کتاب "الرسالۃ" سے خبر واحد کی حجیت پر دلائل کے اقتباسات — اگرچہ وہ طویل ہیں — پیش کر دیں اس لئے کہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے کبار ائمہ میں سے امام شافعی ہی سب سے پہلے امام ہیں جنہوں نے اس موضوع پر مستقل اور مفصل بحث کی ہے اور اس مسئلہ پر سب سے بہتر دلائل پیش کئے ہیں ان کے بعد جن علما نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے وہ سب ان کے خوشہ چین اور رہین منت ہیں۔

لہٰذا میرا جی چاہتا ہے کہ (قارئین کتاب) امام شافعی کے اس صاف وشفاف اور شیریں چشمہ سے سیراب ہوں اور فصیح عربی اسلوب اور پرشوکت بلیغ بیان سے محظوظ ہوں۔

اخبار آحاد کے حجت شرعیہ ہونیکے دلائل

امام شافعی رحمہ اللہ اپنی کتاب الرسالہ میں صفحہ ۴۰۱ پر خبر واحد کے اثبات کے دلائل کے عنوان سے لکھتے ہیں:۔

اگر کوئی کہے: کہ خبر واحد کے حجت ہونے کا ثبوت کسی حدیث کی نص سے یا دلالت سے یا اجماع سے پیش کرو۔ تو میں اس کے جواب میں احادیث ذیل پیش کروں گا۔

(۱) عبد الملک بن عمیر عن عبد الرحمٰن بن عبد اللہ بن مسعود عن ابیہ کی سند سے سفیان نے حدیث بیان کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ اس

---

(۱) ملاحظہ ہو الاحکام للآمدی ج ۲ ص ۷۵ وما بعد، التقریر شرح التحریر ج ۲ ص ۲۷۲، نیز شرح اسنوی علی المنہاج ج ۲ ص ۲۹۴

بندے کو تروتازہ اور خوش وخرم رکھیں جس نے میری بات (حدیث) کو سنا پھر اسے یاد کیا اور (اپنی یادداشت میں) محفوظ رکھا اور (دوسروں تک) پہونچا دیا اس لئے کہ بہت سے فقہ (شرعی مسائل) کے حامل (یاد رکھنے والے) خود فقیہ نہیں ہوتے (مسائل شرعیہ میں بصیرت نہیں رکھتے) اور بہت سے فقہ (احکام شرعیہ) کے حامل جن کو (حدیث) پہونچاتے ہیں وہ اُن سے زیادہ فقیہ ہوتے ہیں۔ تین خصلتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں کسی مسلمان کے دل میں بخل نہ ہونا چاہیے (۱) محض اللہ کی رضا) کے لئے عمل کرنا (۲) مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کرنا (۳) اور مسلمانوں کی جماعت (جمہور مسلمین) کے ساتھ رہنا اس لئے کہ ان کی دعوت وتبلیغ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کو بھی شامل ہوتی ہے

توجب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بات (حدیث) کو سننے، یاد رکھنے اور (دوسروں تک) پہونچانے کی ہر ایسے شخص کو ترغیب دی ہے جو اس کو دہوہرا پہونچائے — اور یہ حکم ایک ہی ہے (یعنی سننا، یاد رکھنا اور پہونچانا ایک ہی حکم ہے) تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ آپ اسی بات کو پہونچانے کا حکم فرمائیں گے جو اس شخص کے لئے حجت شرعیہ ہو جس کو پہونچائی جائے (تاکہ وہ اس سے استدلال کرسکے) کیونکہ (بحیثیت صاحب شریعت نبی ہونے کے) آپ کی طرف سے تو یا احکام حلال پہونچائے جائیں گے (جن پر عمل کیا جائے) یا احکام حرام جن سے اجتناب کیا جائے یا احکام حدود (وقصاص) جن کو نافذ کیا جائے یا اموال سے متعلق احکام جو لئے جائیں اور دیئے جائیں یا دین ودنیا سے متعلق نصیحت کی باتیں۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ شرعی احکام کو ایسا آدمی بھی یاد کرلیتا ہے اور یاد رکھتا ہے جو خود فقیہ نہ ہو (فقہی بصیرت نہ رکھتا ہو) وہ ان احکام کا حافظ تو ہوگا لیکن (ان سے کون کونسے احکام نکلتے ہیں) اس کی سمجھ اس کی نہ ہوگی۔[۱] نیز اس حدیث میں ہر مسلمان کو جماعت مسلمین (جمہور) کے ساتھ رہنے کا بھی

---

[۱] یعنے عموماً ہر حافظ حدیث فقیہ نہیں ہوتا اور جس کو وہ حدیث پہونچاتا ہے ہوسکتا ہے وہ فقیہ ہو (باقی صفحہ ۳۶۴ پر)

حکم دیا ہے جو اس امر کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کا اجماع ۔ انشاء اللہ ۔ حجت ہے۔

(۲) نیز ہمارے شیخ سفیان نے سالم ابوالنضر انہ سمع عبید اللہ بن ابی رافع یخبر عن ابیہ کی سند سے یہ روایت بھی ہم سے بیان کی کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں تم میں سے کسی شخص کو ایسا نہ پاؤں (یعنی میری اُمت میں کوئی ایسا سرکش نہ ہونا چاہیے) کہ وہ تخت پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو، اس کے سامنے میرے امور دین میں سے کوئی ایسا امر آئے جس میں میں نے کسی کام کا حکم دیا ہو یا کسی کام سے منع کیا ہو اور وہ (اس کو سنکر) کہے: ہم نہیں جانتے، جو ہم کتاب اللہ میں پائینگے اس کی پیروی کریں گے[1]

(ہمارے شیخ) سفیان بن عیینہ نے بیان کیا کہ محمد بن المنکدر نے یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسل (صحابی کا ذکر کئے بغیر) بھی روایت کی ہے۔

یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے حجت شرعیہ ہونے کا نہایت پختہ ثبوت ہے نیز اس حدیث میں آپ نے مسلمانوں کو آگاہ فرمایا ہے کہ حدیث کا اتباع مسلمانوں پر لازم ہے اگرچہ کتاب اللہ میں وہ حکم صراحتاً مذکور بھی نہ ہو (یعنے قرآن اس سے خاموش ہو) یہ حکم اس حدیث کے علاوہ اور جگہ بھی بیان کیا گیا ہے۔

(۳) ہمارے شیخ امام مالک نے زید بن اسلم عن عطاء بن یسار کی سند سے روایت کیا کہ ایک شخص نے روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لے لیا۔ اس شخص کو اپنی اس

(بقیہ صفحہ ۳۶۳) اور اگر خود فقیہ ہو بھی تب بھی ممکن ہے کہ جس کو وہ حدیث پہونچا تا ہے وہ احکام شرعیہ کے استنباط میں اس سے زیادہ بصیرت رکھنے والا ہو اس لئے بہر صورت حدیث کو دوسروں تک پہونچانا ضروری ہے تا کہ وہ روایت ہوتے ہوتے فقہا تک پہونچ جائے اور وہ اس حدیث سے احکام شرعیہ استنباط کر سکیں کہ یہی حدیث کا مقصد ہے اسی لئے عصر حاضر کے محقق عالم حضرت مولانا محمد یوسف بنوری فرماتے ہیں کہ جس طرح حدیث کے بغیر قرآن پر عمل نہیں کیا جا سکتا اسی طرح فقہ کے بغیر حدیث پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ مترجم

[1] یعنی اُمت محمدیہ میں ان لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو اس طرح ٹھکرائیں ۔ مترجم

حرکت پر بہت سخت صدمہ ہوا اور فوراً بیوی کو مسئلہ پوچھنے کے لئے بھیجا وہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے پاس آئیں اور اُن سے یہ واقعہ بیان کیا حضرت ام سلمہ نے فرمایا (اس میں کچھ حرج نہیں) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی روزے میں اپنی ازواج مطہرات کا بوسہ لے لیا کرتے ہیں۔ وہ عورت اپنے خاوند کے پاس واپس آئی اور حضرت ام سلمہ کا جواب اس کو بتلایا۔ اس جواب سے اطمینان ہونے کے بجائے اس کا غم واندوہ اور بھی بڑھ گیا اور اس نے کہا ہم رسول اللہ کے مانند نہیں ہوسکتے خدا اپنے رسول کے لئے جو چاہے حلال کردے (یعنی یہ آپ کی خصوصیت ہوسکتی ہے) چنانچہ وہ عورت دوبارہ حضرت ام سلمہ کے پاس آئی اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہاں موجود تھے آپ نے دریافت فرمایا: یہ عورت کیوں آئی ہے؟ حضرت ام سلمہ نے آپ سے واقعہ بیان کیا اس پر آپ نے فرمایا: تم نے اسے یہ کیوں نہیں بتادیا کہ میں بھی ایسا کرلیا کرتا ہوں؟ حضرت ام سلمہ نے عرض کیا: میں نے تو پہلے ہی اسے بتلادیا تھا اور یہ اپنے خاوند کے پاس گئی بھی اور اسے میرا یہ جواب بھی بتلایا تو اس کے دل میں اور بھی اُلجھن پیدا ہوگئی اور اس نے کہا "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مانند نہیں ہوسکتے خدا اپنے رسول کے لئے جو چاہے حلال کردے" یہ سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برہم ہوگئے اور فرمایا: خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور اس کے احکام کو بھی تم سب سے زیادہ جانتا ہوں (یعنی یہ شریعت کا حکم ہے اس میں میری کوئی خصوصیت نہیں)

امام شافعی فرماتے ہیں (مذکورہ بالا سند سے تو یہ حدیث مرسل ہے لیکن) میں نے یہ حدیث اپنے کسی شیخ سے متصل سند کے ساتھ بھی سُنی ہے مجھے اس وقت ان کا نام یاد نہیں[1] اس کے بعد امام شافعی فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ام سلمہ سے

---

(۱) استاذ احمد شاکر الرسالہ کے مصحح لکھتے ہیں: زرقانی شرح موطا میں عبدالرزاق نے بسند عطا اس کو متصل روایت کیا ہے یعنی وہ شیخ عبدالرزاق ہیں۔

یہ فرمانا کہ تم نے یہ کیوں نہیں بتلا دیا کہ میں بھی ایسا کر لیتا ہوں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ام سلمہ کا آپ کے اس فعل کی خبر دینا اس امر کی دلیل ہے کہ آپ کے ہر فعل کو حجت شرعیہ کی حیثیت سے) ماننا چاہیے (حالانکہ ام سلمہ کا بیان یقیناً خبر واحد ہے) اس لئے کہ آپ ام سلمہ کو اپنے فعل سے آگاہ کرنے کا حکم اسی وقت دے سکتے ہیں جب کہ وہ اس شخص کے لئے حجت شرعیہ ہو جس کو وہ آپ کے فعل سے آگاہ کریں اسی طرح اُس شخص کی بیوی اگر اس کے نزدیک سچی اور قابل اعتماد ہو تو اس کا اپنے شوہر کو خبر دینا بھی جبھی مفید ہو سکتا ہے کہ اس کی خبر حجت شرعیہ ہو (ورنہ اس کو بھیجنا اور اور ام سلمہ کا اس کو خبر دینا دونوں بے سود ہوں گے) حالانکہ آپ ان دونوں کی خبروں کی اپنی خاموشی سے تصدیق فرما رہے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ خبر واحد دین میں حجت ہے)

(۴) ہمارے شیخ امام مالک نے عبداللہ بن دینار عن ابن عمر کی سند سے روایت کیا کہ ابن عمر نے کہا کہ: قبا میں لوگ صبح کی نماز پڑھ رہے تھے کہ اسی اثنا میں کوئی شخص آیا اور اس نے (اسی حالت میں) کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ابھی قرآن کی آیت نازل ہوئی ہے اور آپ کو نماز میں قبلہ (کعبہ) کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے (تم بھی کعبہ کی طرف رُخ کر لو) وہ لوگ شام (بیت المقدس) کی طرف رُخ کئے نماز پڑھ رہے تھے۔ (یہ خبر سنتے ہی وہ) کعبہ کی طرف گھوم گئے۔ قبا کے باشندے انصار میں سب سے پہلے اسلام لانے والے لوگوں میں سے تھے دینی واقفیت اور سمجھ بوجھ میں بھی اوروں سے بڑھے ہوئے تھے اور وہ اُس قبلہ (بیت المقدس) کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھ رہے تھے جس کی طرف نماز میں رُخ کرنے کے مامور تھے ایسی صورت میں وہ قبلہ کے بارے میں اللہ کے فرض کردہ حکم (بیت المقدس کی جانب نماز پڑھنے کے حکم) کو وہ اس وقت تک نہیں چھوڑ سکتے جب تک کہ اُنھیں اس (تحویل قبلہ) کا حکم کسی ایسے ذریعہ سے نہ پہنچا ہو جو ان کے نزدیک حجت شرعیہ ہو، ظاہر ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے نہیں تھے اور نہ اُنھوں نے قرآن کریم کی ان آیات کو سُنا تھا جو تحویل قبلہ کے بارے میں نازل ہوئی تھیں اگر ایسا ہوتا تو ان کا بیت المقدس کے بجائے کعبہ کی طرف

ٔرخ کرنا کتاب اللہ پر یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سُنی ہوئی خبر پر مبنی ہوتا نہ ہی یہ خبر کسی جماعت کثیر کے ذریعہ ان کو پہونچی تھی (کہ خبر متواتر ہوتی) بلکہ اُنھوں نے اس معاملہ میں صرف ایک ایسے شخص کی خبر پر جو ان کے نزدیک سچا اور قابل اعتماد تھا عمل کر کے اس قطعی فرض (استقبال بیت المقدس) کو چھوڑ دیا جس پر ان کا عمل چلا آرہا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے جو خبر ان کو دی گئی کہ قبلہ بدل چکا ہے اس پر عمل کر لیا اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اُنھوں نے — انشاء اللہ — اس خبر پر عمل صرف اس لئے کیا کہ ان کو قطعی طور پر اس کا علم تھا کہ خبر واحد ایسی حجت شرعیہ ہے جس سے شرعی حکم ثابت ہو سکتا ہے جبکہ خبر دینے والا سچا اور قابل اعتماد ہو۔ نیز وہ دین کے ایک اہم مسئلہ میں یہ نیا اقدام اس وقت تک نہیں کر سکتے تھے جب تک کہ اُنھیں قطعی[1] طور پر اس کا علم نہ ہو کہ وہ (اہم سے اہم دینی مسئلہ میں) ایسے اقدام کے شرعاً مجاز ہیں اور نہ ہی وہ اس خبر پر عمل کو اس وقت تک کے لئے موخر کر سکتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دیں کہ آپ کی جانب سے یہ خبر۔

---

[1] علماء اصول حدیث نے لکھا ہے کہ خبر واحد کے ساتھ جب مفید یقین قرینے جمع ہو جائیں تو وہ خبر متواتر کی طرح قطعی اور یقینی ہو جاتی ہے۔ تحویل قبلہ کی یہ خبر اسی قبیل سے ہے اس لئے کہ خود قرآن کریم کی صریح آیات سیقول السفہاء من الناس سے لیکر فول وجہک شطر المسجد الحرام سے پہلے تک بتلا رہی تھیں کہ عنقریب تحویل قبلہ ہونے والی ہے یعنی نماز میں قبلہ بیت المقدس کے بجائے مسجد حرام کی طرف تبدیل ہونے والا ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے ساتھ تمام صحابہ کو تحویل قبلہ کے حکم کے نازل ہونے کا انتظار تھا لہذا تحویل قبلہ کے حکم کے نازل ہونے کی خبر سنتے ہی ہر شخص نے اس کا یقین کر لیا اور نماز میں ہی اپنا رُخ بدل لیا نہ آپ سے ملنے اور دریافت کرنے کا انتظار کیا اور نہ اپنے کانوں سے آیات سننے کا اس لئے کہ اگر وہ اس خبر کو سننے کے بعد ایسا نہ کرتے تو ان کی نماز نہ ہوتی اس بنا پر یہ خبر واحد قطعی ہونے کی وجہ سے اس سے پہلے کے قطعی حکم کے لئے ناسخ بن گئی۔ یہی صورت حال تحریم خمر کی خبر میں ہے صحابہ کو یقین تھا کہ صبح شام میں شراب حرام ہونے والی ہے اسی لئے بلا توقف و تامل اس پر عمل کیا گیا۔ ہر خبر واحد اتنی قوی اور اس طرح یقینی نہیں ہوتی ۱۲ مترجم۔

کہ قبلہ بدل گیا۔ پہونچنے کی وجہ سے ہم ایسا کر رہے ہیں۔ اور تحویل قبلہ سے متعلق۔
جو اُن پر فرض ہو چکا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خبر جو اُنھوں نے قبول
کی اگر اس کا قبول کرنا ان کے لئے صرف جائز ہوتا[1] (فرض نہ ہوتا) تو یقیناً رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے (مواخذہ) فرماتے: تم تو ایک یقینی قبلہ کی طرف نماز پڑھ
رہے تھے، تم اُس کو اس وقت تک چھوڑنے کے مجاز نہ تھے۔ ....
...... جب تک تمہیں کسی ایسے ذریعہ سے یقینی علم حاصل نہ ہو جاتا جو تمہارے
لئے حجت ہوتا خواہ میری زبان سے بالمشافہ سننا یا عامۃ الناس (جمہور) کا بیان یا
(کم از کم) ایک سے زائد آدمیوں کا بیان نہ ہوتا (آپ کا یہ مواخذہ نہ کرنا اس امر کی دلیل ہے
کہ خبر واحد بھی ایسی ہی حجت اور موجب علم یقینی ہے جیسے آپ سے بالمشافہ سننا یا عامۃ
الناس کا بیان اور بلا تاخیر و تردد اس پر عمل کرنا فرض ہے)

(۵) امام مالک نے اسحٰق بن عبداللہ بن ابی طلحہؓ کی سند سے روایت کیا کہ انس
بن مالک نے بیان کیا کہ: میں (ایک دن) ابو طلحہ، ابو عبیدۃ بن الجراح اور اُبی
بن کعب کو انگور کے شیرے اور کھجور کی شراب پلا رہا تھا کہ اسی اثنا میں ایک آنے
والا آیا اور اس نے (بلند آواز سے) کہا: "شراب حرام ہو گئی"۔ یہ سنتے ہی ابو طلحہ نے
مجھ سے کہا: انس! اُٹھو اور ان سب مٹکوں کو توڑ ڈالو"۔ انس کہتے ہیں: میں اُٹھا
اور ہمارا ایک موسل تھا میں نے اس کی نچلی جانب سے اسے مٹکوں پر دے مارا

---

(۱) استاذ احمد شاکر رسالہ کے حاشیہ میں امام شافعی کی اس عبارت کی تشریح اس طرح کرتے ہیں: خبر واحد کا قبول کرنا اُن پر فرض تھا اس کو چھوڑنا ان کے لئے جائز نہ تھا اس لئے کہ اگر خبر واحد کا قبول کرنا ان کے نزدیک محض ایک جائز امر ہوتا تو قبلہ کے بارے میں وہ ایک یقینی فرض (استقبال بیت المقدس) کو۔ وہ بھی نماز کی حالت میں۔ محض ایک غیر یقینی خبر کی بنا پر جس کا قبول کرنا نہ کرنا دونوں جائز ہوں ہرگز ترک نہ کرتے اور قبلہ (بیت المقدس) کی جانب سے نہ پھرتے اس لئے کہ ایک یقینی حکم دوسرے یقینی حکم سے ہی بدلا جا سکتا ہے۔

یہاں تک کہ سب ٹوٹ گئے (اور شراب بہ گئی) امام شافعی فرماتے ہیں: یہ وہ صحابہ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں ان کے علم و فضل، ان کے مرتبہ و مقام، اور ان کے تقدم صحبت (قدیم تر صحابی ہونے) سے کوئی بھی حقیقت شناس عالم انکار نہیں کر سکتا اور شراب اُس زمانہ میں حلال تھی، سب پیتے تھے تو ایسے زمانہ میں ایک آنے والا آتا ہے اور شراب کے حرام ہو جانے کی خبر دیتا ہے یہ سنتے ہی حضرت ابو طلحہ ــــ جو ان شراب کے مٹکیں کے مالک تھے ــــ تمام مٹکے توڑ دینے کا حکم دیدیتے ہیں اور خود ابو طلحہ اور ان کے رفقا یا ان میں سے کوئی ایک بھی یہ نہیں کہتا، ہمارے لئے تو شراب اس وقت تک حلال ہے جب تک کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود ملاقات نہ کرلیں (اور تحقیق نہ کرلیں) خاص کر جبکہ آپ ہم سے قریب ہی موجود ہیں (کچھ دور بھی نہیں ہیں) یا جب تک عام لوگوں کی زبان سے نہ سُن لیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات سے یہ قطعاً بعید ہے کہ وہ ایک حلال چیز کو اس طرح بہا دیں کیونکہ یہ کھلی ہوئی اضاعت مال ہے اور یہ حضرات مسرف ہرگز نہ تھے (واقعہ یہ ہے کہ صورتِ حال کا تقاضہ ــــ اس بارے میں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے آئی ہوئی کسی بھی خبر کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے ــــ وہی تھا جو اُنھوں نے کیا (کہ شراب فوراً چھوڑ دی اور مٹکے پھوڑ دیئے) اور جو خبر واحد اُنھوں نے قبول کی (اور اس پر عمل کیا) اگر یہ دُرست نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کو ایسی خبر کو قبول کرنے سے منع کرنے میں دریغ نہ کرتے۔

(۶) نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے (ایک مرتبہ) حضرت اُنیس کو حکم دیا کہ وہ اس شخص کی بیوی کے پاس جائیں جس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ اس کی بیوی نے زنا کیا ہے اور فرمایا: اگر وہ عورت ارتکاب زنا کا اقرار کرلے تو اس کو سنگسار کر دینا" چنانچہ انیس گئے (اور اس سے دریافت کیا) تو اس عورت نے اقرار کر لیا، تو انیس نے اسے سنگسار کر دیا۔ (اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا قابل اعتماد ذریعے سے پہونچنا حجت ملزمہ تھا

حکم پہونچانے والوں کے تعدد یا کثرت کو اس میں مطلق دخل نہ تھا اگرچہ حکم پہونچانے والا ایک شخص ہی کیوں نہ ہو وہ بے چوں وچرا اس پر عمل کرنے کو اپنا فرض سمجھتے تھے)

امام شافعی (اس حدیث کی سند کے متعلق) فرماتے ہیں: یہ حدیث ہم سے امام مالک اور سفیان بن عیینہ نے زہری عن عُبید اللہ بن عبد اللہ عن ابی ھریرہ اور زید بن خالد عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے بیان کی ہے۔

(۷) عبد العزیز دراوردی نے ابن الہاد عن عبد اللہ بن ابی سلمہ عن عمرو بن زریق المسلمی عن امہ کی سند سے ہم سے بیان کیا کہ عمرو بن زریق کی ماں کہتی ہیں: ہم لوگ منیٰ میں مقیم تھے کہ ناگاہ ہم نے سُنا کہ علی بن ابی طالب اونٹ پر سوار (اعلان کر رہے ہیں) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ (ایام منیٰ) کھانے پینے کے دن ہیں لہٰذا (ان دنوں میں) کوئی شخص روزہ نہ رکھے" چنانچہ لوگوں نے اس حکم کی پیروی کی (اور کسی نے روزہ نہ رکھا) حضرت علی اپنے اونٹ پر سوار چلا چلا کر یہ اعلان کر رہے تھے۔

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت روزہ کے اس حکم کو صرف ایک سچے اور معتبر آدمی کے ذریعہ اسی لئے بھیجا تھا کہ ان (سننے والوں) پر لازم ہے کہ وہ صرف خبر دینے والے کی صداقت وعدالت پر اعتماد کر کے اس حکم کو مانیں (گویا حکم پہونچانے والوں کا تعدد یا کثرت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں بھی وجوب عمل میں معتبر اور موثر نہ تھی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ہی تمام حاجی مقیم تھے آپ یہ بھی کر سکتے تھے کہ کسی کو بھیجکر ان سب حاجیوں کو بلا لیتے اور بالمشافہ سب کے سامنے یہ حکم بیان فرما دیتے یا آپ متعدد آدمیوں کے ذریعہ یہ حکم ان کے پاس بھجواتے لیکن آپ نے صرف ایک ہی آدمی کو بھیجا جس کی صداقت سے لوگ خوب اچھی طرح واقف تھے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ نے اپنا حکم صرف ایک آدمی کے ذریعہ صرف اس لئے بھیجا (کہ آپ جانتے تھے) کہ اس شخص کا بیان ہی اُن

کے نزدیک حجت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھیجی ہوئی خبر کو (اگرچہ خبر دینے والا ایک ہی ثقہ شخص ہو) قبول کرنا ان کے لئے لازم ہے خواہ وہ ان کے حق میں ہو خواہ ان کے خلاف۔

امام شافعی (اس تنقیح کے بعد) فرماتے ہیں جبکہ صورت حال یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا حکم ایک جماعت کے ذریعہ بھی بھیج سکتے تھے (ان سب کو اپنے پاس بُلا کر بالمشافہ بھی بیان کر سکتے تھے) اس کے باوجود آپ نے اپنا حکم صرف ایک ثقہ شخص کے ذریعہ ہی بھیجا تو آپ کی وفات کے بعد ان لوگوں کے حق میں جو نہ خود بالمشافہ آپ کی زبان مبارک سے سُن سکتے ہیں نہ آپ ہی ان کے پاس جماعت کثیر کو بھیج سکتے ہیں ان کے حق میں تو بدرجہ اولیٰ ایک ثقہ شخص کی خبر حجت ہوگی۔

(۹) ۹ھ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق کو امیر حج بنا کر مکہ مکرمہ بھیجا تھا وہاں مختلف شہروں اور قبیلوں کے حاجی حج کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ حضرت ابو بکر نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق) مناسک حج ان سب کو ادا کرائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ان کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں سے ان کو آگاہ کیا (اور بلے چون وچرا سب نے اُن پر عمل کیا کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ ایک آدمی کی خبر ہم کیسے مان لیں)

(۱۰) اور اسی سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنی جانب سے عام مشرکین کے متعلق اور غیر مسلم قبائل سے کئے ہوئے معاہدوں کے متعلق اعلان کرنے کے لئے) حضرت علی بن ابی طالب کو بھی مکہ مکرمہ بھیجا تھا اور دسویں تاریخ کو (منیٰ میں) حضرت علی نے عرب قبائل کے مجمع عام میں کھڑے ہو کر (اخراج مشرکین اور معاہدوں سے متعلق) سورۂ براءت کی آیات پڑھ کر سنائیں اور عام کفار اور مشرکین کو مکہ مکرمہ میں جو امن حاصل تھی اس کے برطرف ختم کر دینے کا اعلان کیا (کہ اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو چار ماہ کے اندر اندر جہاں چاہیں چلے جائیں)

اور جن قبائل سے کچھ معاہدے کئے ہوئے تھے ان کے معاہدوں کی مدت سے آگاہ کیا (کہ اس کے بعد وہ معاہدے ختم ہو جائیں گے) اور کچھ باتوں سے ان کو منع بھی فرمایا (مثلاً یہ کہ آئندہ کوئی مشرک حج نہیں کر سکتا یا مکہ میں نہیں رہ سکتا) اہل مکہ حضرت ابوبکر اور حضرت علی سے ان کے علم وفضل سے تقویٰ ودینداری سے اور صداقت وامانت سے خوب اچھی طرح واقف تھے اور جو نووارد حاجی ان دونوں سے یا ان میں سے کسی ایک سے واقف نہ تھے ان کو واقف کرنے والے لوگ موجود تھے۔ اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو (اتنے اہم احکام واعلانات پہونچانے کے لئے) اسی لئے بھیجا تھا کہ آپ کی طرف سے تنہا اس کا بیان ان لوگوں کے نزدیک بھی حجت تھا جن کے پاس آپ نے اس کو بھیجا تھا (گویا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور نہ صرف تمام مسلمان بلکہ مسلم اور غیر مسلم دوست اور دشمن سب کے نزدیک "ایک" قابل اعتماد خبر دینے والے کی خبر کا حجت ہونا بالکل مسلم تھا)

(۱۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (دین کے احکام پہونچانے کے لئے) عرب کے تمام اطراف میں اپنے عُمّال جگہ جگہ پھیلا دیئے تھے جن کے نام بھی معلوم ہیں اور وہ مقامات بھی معلوم ہیں جہاں آپ نے ان کا تقرر فرمایا تھا۔ چنانچہ آپ نے قیس بن عاصم کو اپنے قبیلہ ... میں ابن نویرہ کو اپنے قبیلہ ... میں اور زبرقان کو اپنے قبیلہ ... میں (دین کے احکام پہونچانے کے لئے) بھیجا تھا کیونکہ ان کے قبائل ان سے خوب اچھی طرح واقف تھے کہ یہ سچے (اور قابل اعتماد) لوگ ہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے پاس بحرین کا وفد آیا ہے۔ اس وفد کے تمام افراد معروف لوگ تھے (ان کی درخواست پر) آپ نے ان کے ہمراہ ابن سعید بن العاص کو (احکام دین سکھلانے کے لئے) بھیجا تھا۔ حضرت معاذ بن جبل کو (والی بناکر) یمن بھیجا تھا اور انھیں یہ حکم بھی دیا تھا کہ جو لوگ تمہاری اطاعت قبول کرلیں (ان کا فرض ہے کہ) وہ ان لوگوں سے جنگ

کریں جو اطاعت نہ کریں اور ان کو وہ تمام احکام بتلائیں جو اللہ نے اُن پر فرض کئے ہیں اور ان (کے اموال) سے وہ حقوق (زکوٰۃ وصدقات) وصول کریں جو ان (کے اموال) پر واجب ہیں۔ حضرت معاذ کو آپ نے یمن صرف اس لئے بھیجا تھا کہ یمن والے معاذ سے ان کے رتبہ مقام اور صدق و دیانت سے خوب اچھی طرح واقف تھے ان کے علاوہ اور جس صحابی کو بھی (کسی جگہ کا) والی بنا کر بھیجا اس کو یہ حکم بھی دیا کہ وہ ان لوگوں سے جن پر آپ نے انکو والی بنا کر بھیجا ہے وہ تمام حقوق وصول کریں جو خدا نے ان کے ذمے عائد کئے ہیں۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو بھی سچا اور قابل اعتماد آدمی ان لوگوں کے پاس گیا ہے ان میں سے کسی بھی شخص نے یہ کبھی نہیں کہا کہ تم تو ایک اکیلے آدمی ہو (تمہاری بات ہم کیسے مان لیں) تم ہم سے اسوقت تک کچھ بھی وصول نہیں کرسکتے جب تک کہ ہم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ حکم نہ سُن لیں کہ ہمارے ذمے یہ حق واجب ہے"۔ اور جہاں تک میں سمجھا ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اطراف و نواحی میں وہاں کے جانے پہچانے اور قابل اعتماد لوگوں کو اسی وقت بھیجا ہے جب اُن کے متعلق آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان جیسے ثقہ لوگوں کو ان علاقوں میں بھیجنا ان لوگوں پر حجت قائم کرنے کے لئے کافی ہے۔

(۱۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوجی دستوں پر جو امرا مقرر فرمائے ہیں ان کی صورت حال بھی اسی جیسی ہے (کہ آپ نے ہر فوجی دستہ پر ایسے ہی جانے پہچانے اور قابل اعتماد شخص کو امیر مقرر فرمایا ہے جس کے متعلق یقین ہوا ہے کہ اس ایک شخص کی ہر بات ان لوگوں کے لئے حجت اور واجب العمل ہو گی) چنانچہ آپ نے موتہ کی جنگ کے لئے ایک فوجی دستہ بھیجا اور اس کا امیر حضرت زید بن حارثہ کو بنایا اور فرمایا: اگر یہ شہید ہو جائیں تو ان کی جگہ حضرت جعفر امیر ہوں گے اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو ان کی جگہ ابن رواحہ امیر ہوں گے اور ابن انیس کو تنہا فوجی دستے کے طور پر بھیجا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوجی دستوں پر جن حضرات کو امیر بنا کر بھیجا ہے (وہ صرف جنگ کے معاملات ہی کے امیر نہیں ہوتے تھے،

بلکہ) ہر امیر اپنے ماتحتوں پر حکمراں بھی ہوتا تھا (اس کا ہر حکم ان کے لئے واجب الاطاعت ہوتا تھا) اس لئے کہ ان اُمراء کا کام یہ بھی ہوتا تھا کہ جن لوگوں تک دعوت اسلام ابھی تک نہیں پہونچی ہے ان کو اوّل اسلام قبول کرنے کی دعوت دیں اور جن لوگوں سے (اسلام نہ قبول کرنے کی وجہ سے) جنگ جائز ہو ان سے جنگ کریں۔

غرض ہر والی (و حاکم جس کو آپ نے (کہیں) روانہ کیا اور ہر فوجی دستہ کا امیر ایک متنفس ہی ہوا ہے ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکا کہ آپ نے دو یا تین یا چار یا اس سے زائد آدمیوں کو (اپنی طرف سے) بھیجا ہو (اور نہ یہ عقلاً درست ہی تھا اس لئے کہ حاکم کے حکم کو ماننا واجب اور لازم ہوتا ہے)

(۱۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی زمانہ (سنہ) میں دنیا کے بارہ بادشاہوں کے پاس بارہ ایلچی (خطوط لیکر) بھیجے اور ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ یہ ایلچی (اور خطوط) اُنھیں بادشاہوں کے پاس بھیجے تھے جنکو آپ کی (بعثت اور) دعوت اسلام کی خبر پہونچ چکی تھی (کہ آپ انبیاء سابقین کی طرح نئے آسمانی مذہب کو دنیا میں پھیلانے کے لئے خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں) اور اس دعوت اسلام کے بارے میں اُن پر حجت قائم ہو چکی تھی' اور ان خطوط میں کچھ ایسی علامتیں بھی نہیں لکھی تھیں جن سے مکتوب الیہ یہ باور کر سکیں کہ یہ آپ کے ہی خطوط ہیں (بلکہ صرف ایلچیوں کے اعتماد پر مدار تھا اسی لئے) آپ نے ایلچیوں کے انتخاب میں ایسا ہی اہتمام فرمایا جیسے امراء لشکر اور حکّام اطراف کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ معروف اور قابل اعتماد لوگوں کو بھیجیں (جن پر مکتوب الیہم اعتماد کر سکیں) چنانچہ حضرت دحیہ کلبی کو اُس خطّہ میں (ایلچی بنا کر) بھیجا جہاں وہ معروف اور جانے پہچانے تھے۔ (اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر کوئی بھی مکتوب الیہ آپ کے ایلچی سے ناواقف ہوتا تو سب سے پہلے) وہ یہ مطالبہ کرتا کہ تم اپنے ایلچی ہونے کا ثبوت دو تاکہ ایلچی کے بیان کے متعلق

شکوک وشبہات کا ازالہ ہو جائے اسی طرح اس ایلچی کا بھی فرض تھا کہ وہ آپ کا پیغام (اور خط) پیش کرنے میں اس وقت تک توقف کرے کہ مکتوب الیہ کے شکوک و شبہات کا ازالہ ہو جائے (مگر یہ دونوں باتیں نہیں ہوئیں نہ کسی مکتوب الیہ نے آپ کے کسی ایلچی سے ثبوت طلب کیا اور نہ ہی کسی ایلچی کو توقف کرنا پڑا صرف اس وجہ سے کہ مکتوب الیہ ایلچی سے واقف تھے اور اسے قابل اعتماد جانتے تھے انہیں یقین تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی ان کو بھیجا ہے اور یہ آپ ہی کا پیغام پہونچا رہے ہیں حالانکہ ہر ایلچی فرد واحد تھا اس سے معلوم ہوا کہ ثقہ اور عادل فرد واحد کی خبر حجت ہے اور تمام دنیا میں مانی جاتی ہے)

(۱۴) اوامر ونواہی (احکام) شرعیہ پر مشتمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین آپ کے مقرر کردہ عمال وحکام کے نام بارگاہ نبوت سے برابر بھیجے جاتے ان عمال وحکام میں سے کسی ایک کی بھی کبھی یہ جرأت نہ ہوئی کہ ان کو نافذ نہ کرے (اور کہے کہ فرد واحد کی خبر ہے میں اس پر کیسے یقین کر لوں کہ آپ کا ہی حکم ہے) ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ہی افراد کو قاصد بنا کر بھیجتے تھے جو ان لوگوں کی نظروں میں جن کے پاس بھیجا جاتا تھا سچے اور قابل اعتماد ہوتے تھے۔ اور جب بھی کسی مکتوب الیہ کو آپ کے کسی قاصد کی سچائی اور دیانتداری کے متعلق شبہ ہوا ہے (اور اس نے تحقیق وتجسس کیا ہے) تو اس قاصد کو ویسا ہی (سچا اور قابل اعتماد) پایا ہے (جیسا آپ کے نامہ بر کو ہونا چاہیے) اور اگر کبھی کسی مکتوب الیہ کو آپ کی تحریر کے بارے میں تغیر وتبدل کا شبہ ہوا ہوتا یا کچھ ایسے حالات سامنے آئے ہوتے جو تہمت کا موجب ہوں مثلاً یہ کہ نامہ بر نے پیغام سمجھنے یا یاد رکھنے میں بے توجہی یا لاپرواہی سے کام لیا ہے تو وہ ضرور اپنے شک وشبہ کو دور کرنے کے لئے تحقیق وتجسس کرتا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم اس کے پاس بھیجا گیا ہے اس کو نافذ کر سکے (مگر نہ کبھی آپ کے نامہ بر کے متعلق ایسا واقعہ پیش آیا ہے نہ آپ کے کسی پیغام کو کبھی شک وشبہ کی نظر سے

دیکھا گیا صرف اس لئے کہ آپ ایسے ہی لوگوں کو قاصد بنا کر بھیجتے تھے جن کی صداقت و ثقاہت معروف ہوتی تھی بہر حال آپ کا حکم پہنچانے والا ہمیشہ فرد واحد ہی ہوا ہے، اور اس کی خبر پر عمل کرنا لازم سمجھا گیا ہے)

(۱۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی یہی صورت حال آپ کے خلفاء کے فرامین (اور پیغام رسانوں) کی تھی جو وہ اپنے عمال و حکام کو بھیجتے تھے (کہ قاصد ہمیشہ فرد واحد ہوتا تھا مگر سچا اور قابل اعتماد) نیز تمام دنیا کے مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ ان کا خلیفہ فرد واحد ہوگا، قاضی بھی ایک ہی ہوگا امیر بھی ایک ہی گا اور امام بھی ایک ہی ہوگا (اور یہ سب کے سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے احکامات کو نافذ کرنے اور ان پر عمل کرانے والے ہیں مگر کسی نے آج تک ان کے فرد واحد ہونے کی بنا پر اعتراض نہیں کیا)

چنانچہ عام مسلمانوں نے حضرت ابوبکر صدیق کو خلیفہ چنا (وہ فرد واحد ہی تھے) حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو خلیفہ بنایا (وہ بھی فرد واحد تھے) اس کے بعد حضرت عمر نے انتخاب خلیفہ کا معاملہ چھ صحابہ کرام کی محدود مجلس شوریٰ کے سپرد کر دیا کہ وہ ان چھ آدمیوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کر لیں چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت عثمان کو خلیفہ انتخاب کر لیا (بہر صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو مسلمانوں تک پہونچانے اور اس پر عمل کرانے والا خلیفۃ المسلمین اور مسلمان حاکم ایک ہی متنفس ہوا ہے اور اس کا ہر قول شرعاً حجت ہے)

(۱۶) حکمراں (حکومتی معاملات میں) اور قاضی وغیرہ عدالتی مقامات میں ہمیشہ فیصلے کرتے رہے ہیں اور ان کے بعد کے لوگ (ماتحت لوگ) اُن کے ان فیصلوں کو (بلا تامل) نافذ کیا کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ ان حکام اور قضات کے یہ (شرعی) فیصلے درحقیقت ان کی طرف سے ایک خبر[1] کا حکم رکھتے تھے۔

---

[1] یعنی کسی حاکم یا قاضی کے فیصلہ دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ شرعی ثبوت کی بنا پر یہ خبر دیتا ہے (باقی صفحہ ۳۷۷ پر)

پس رسول اللہ علیہ وسلم کی سنت اور مسلمانوں کے اجماع سے ۔ جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ۔ ثابت ہوتا ہے کہ شہادت، خبر اور حکم (فیصلہ) تینوں میں فرق ہے ۔ دیکھئے ایک قاضی جب ایک شخص (مدعی) کے حق میں دوسرے شخص (مدعی علیہ) کے خلاف فیصلہ دیتا ہے تو اس کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ اس گواہی کی بنا پر جو اس کے نزدیک ثابت ہے یا اقرار کی بنیاد پر جو اس کے سامنے کیا گیا ہے خبر دیتا ہے کہ اس شخص (مدعی) کا حق اس شخص (مدعی علیہ) کے ذمے ثابت ہے اور اس کے متعلق فیصلہ نافذ کر دیتا ہے (یعنے مدعی علیہ سے مدعی کا حق دلا دیتا ہے) تو جب کہ اس حاکم یا قاضی کے اس خبر دینے سے اس پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے علم کی بنیاد پر اس کو نافذ کرے تو یہ مآل کے اعتبار سے بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی حرام یا حلال کی خبر دینے والے شخص پر اپنے مشاہدہ کی بنا پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو حرام یا حلال قرار دے ۔ اور اگر یہ (ثبوت حق کی) خبر دینے والا قاضی ایسے گواہوں (کی گواہی) کی بنیاد پر خبر دے جنہوں نے ایسے شخص کے خلاف گواہی دی ہے جس نے اپنا مقدمہ اس قاضی کی عدالت میں پیش ہی نہیں کیا یا فریق مخالف کے کسی نجی اقرار کی بنا پر خبر دے تو یہ قاضی اس وقت اپنے اس علم کی بنا پر فیصلہ دینے کا مجاز نہ ہوگا اس لئے کہ یہ مقدمہ اس کی عدالت میں پیش ہی نہیں ہوا یا کسی دوسرے قاضی کی عدالت میں پیش ہے تو (اس کے باوجود) اس قاضی نے ان گواہوں کی بنیاد پر اس شخص اور اس کے فریق مخالف کے درمیان وہی فیصلہ کر دیا ہے جس سے گواہوں کی گواہی کی بنیاد پر مشہود علیہ (مدعی علیہ) سے چیز لیکر مشہود لہ (مدعی) کو دینی لازم ہوتی ہے

بقیہ صفحہ ۳۷۶) کہ فلاں شخص پر فلاں شخص کا حق واجب ہے یا فلاں شخص مجرم ہے اس نے فلاں جرم کیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ شخص واحد کی خبر ہے جس کی حجیت کی قوت کا یہ عالم ہے کہ مسلمانوں کے جان و مال اس خبر کی بنا پر شرعاً مباح ہو جاتے ہیں اور بے چوں و چرا لئے اور دیئے جاتے ہیں ۔ اس سے ثابت ہوا کہ خبر واحد ثقہ یقیناً حجت ہے ۔ (مترجم)

(تو اس کا یہ فیصلہ صحیح نہ ہوگا اور) اس خبر دہندہ قاضی کی حیثیت اس وقت بالکل ایسی ہوگی جیسے کسی قاضی کی عدالت میں گواہی دینے والے کی ہوتی ہے لہذا اس کی گواہی وہ اس وقت قبول کرے گا۔ قاضی ہو یا غیر قاضی۔ جبکہ دوسرا گواہ بھی اس کے ساتھ گواہی دے۔ جیسے کہ یہی قاضی کسی بھی معاملہ میں کسی قاضی کی عدالت میں گواہی دے تو وہ تنہا اس کی گواہی قبول نہیں کرے گا اور دوسرے گواہ کا مطالبہ کرے گا اور نہ وہ اس کا مجاز ہوگا کہ تنہا اس قاضی کی گواہی کی بنیاد پر حکم نافذ کر دے[۱]"

(۱۷) سفیان بن عیینہ اور عبدالوہاب نے یحییٰ بن سعید عن سعید بن المسیب کی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر فاروق نے انگوٹھے کی دیت پندرہ اونٹ اور اس سے متصل انگلی (مسبحہ) کی دس اونٹ اور درمیانی انگلی کی دس اونٹ اور چھنگلیا سے متصل انگلی کے نو اونٹ اور چھنگلیا کی دیت چھ اونٹ تجویز کئے تھے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر کی یہ تجویز اس پر مبنی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے ہاتھ کی دیت میں پچاس اونٹوں کا فیصلہ فرمایا ہے۔ حضرت عمر۔ انشاء اللہ۔ اس سے واقف تھے۔ اور ایک ہاتھ میں چھوٹی بڑی پانچ انگلیاں ہوتی ہیں جن میں سے ہر ایک کی منفعت، موزونیت دوسری انگلی سے مختلف ہے اس لحاظ سے حضرت عمر نے اپنے اجتہاد سے

---

[۱] خبر واحد، قضاء قاضی اور شہادت شاہد میں فرق | مذکورہ بالا بیان کا حاصل یہ ہے کہ (۱) شاہد کی شہادت بھی شخص واحد کی خبر ہے مگر جب تک دوسرا گواہ اس کے ساتھ گواہی نہ دے وہ حجت نہیں ہوتی (۲) حکم قاضی بھی شخص واحد کی خبر ہے مگر اس کے حجت ہونے کے لئے اس کی عدالت میں مقدمہ ہونا لابدی ہے اس کے بغیر قاضی کی خبر کی حیثیت ایک شاہد کی شہادت سے زیادہ نہیں (۳) خبر واحد بھی شخص واحد کی خبر ہے مگر وہ بذات خود حجت ہے نہ اس کی حجیت میں عدالت اور اس میں مقدمہ پیش ہونا شرط ہے اور نہ دوسرے خبر دہندہ کا ہونا۔ بالفاظ دیگر خبر واحد غیر مشروط حجت ہے اور قضاء قاضی اور شہادت دونوں کی حجیت مشروط ہے۔ ۱۲ مترجم

پچاس اونٹ ہاتھ کی پانچ انگلیوں پر ان کے فرق مراتب و تناسب کے لحاظ سے (مذکورہ بالا طریق پر) تقسیم کر دیئے تھے اور ہر انگلی کی دیت اس کی حیثیت کے مطابق تجویز کر دی تھی در حقیقت حضرت عمر کی یہ تجویز اسی حدیث سے مستنبط ہے۔ لیکن جب عمرو بن حزم کے خاندان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی (اہل یمن کے نام لکھی ہوئی) تحریر ہاتھ آگئی (جو آپ نے عمرو بن حزم کے ہاتھ بھیجی تھی) جس میں آپ نے تصریح فرمائی ہے: ہر انگلی چھوٹی ہو یا بڑی اس کی دیت دس اونٹ ہیں تو (علماء و فقہاء امت نے) اسی کو اختیار کر لیا (اور حضرت عمر کے اجتہاد کو ترک کر دیا) لیکن خاندان عمرو بن حزم کے اس نوشتہ کو اسی وقت قبول کیا جب محقق ہو گیا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تحریر (اور آپ ہی کا حکم) ہے

امام شافعی فرماتے ہیں: اس حدیث سے دو باتیں (نہایت اہم) ثابت ہوتی ہیں (۱) ایک تو خبر واحد کو (اجتہاد کے مقابلہ پر) قبول کرنا (۲) دوسرے یہ کہ حدیث کو اس وقت قبول کیا جائیگا جب اس کا ثبوت محقق ہو جائے، اگرچہ کسی بھی امام کا اس حدیث پر عمل نہ ہو جس کو علماء امت نے (تحقیق کے بعد) قبول کیا ہے نیز اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر کسی مسئلہ میں کسی امام کا عمل ہو بھی چکا ہو اور بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مل جائے جو اس عمل کے خلاف ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بذات خود حجت ہوتی ہے نہ کہ کسی دوسرے کے عمل کی وجہ سے (یعنی کسی حدیث کی حجیت کی تائید کے لئے کسی امام کا اس پر عمل کرنا ضروری نہیں) چنانچہ (اس حدیث کے سامنے آنے کے بعد مسلمانوں نے یہ نہیں کہا کہ حضرت عمر نے تو ہمارے سامنے مہاجرین و انصار کی موجودگی میں اس کے خلاف عمل کیا ہے اور اس وقت تم نے یا تمہارے علاوہ کسی اور نے یہ نہیں بتلایا کہ تمہارے پاس اس کے خلاف حدیث موجود ہے بلکہ (علماء امت نے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر جس کا قبول کرنا ضروری تھا۔ (بلا توقف) عمل کیا اور اس کے خلاف پر عمل کو ترک

کردیا۔ اور اگر حضرت عمر کو بھی یہ حدیث پہونچ جاتی تو (یقین ہے) کہ وہ بھی — انشاء اللہ — اسی پر عمل کرتے۔ جیسا کہ بعض دوسرے مسائل میں اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر عمل کیا ہے (اور اپنے اجتہاد کو ترک کردیا ہے) یہی ہے تقاضہ حضرت عمر کی خدا ترسی کا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی پیروی کے بارے میں اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے کا اور ان کے علم و فضل کا اور اس (یقین و ایمان) کا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے ہوتے کسی کی مجال نہیں کہ حکم دے اور یہ کہ اللہ کی اطاعت رسول کی اطاعت میں منحصر ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص یہ کہے کہ (حضرت عمر کے متعلق یہ آپ کا حسن ظن ہے ورنہ تو (اس سلسلہ میں) آپ مجھے کچھ ایسے واقعات بتلائیے جن سے یہ ثابت ہو کہ حضرت عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پہونچنے کے بعد (اس کے خلاف) اپنے عمل کو ترک کردیا ہے اور حدیث پر عمل کیا ہے۔ میں نے کہا: اگر میں ایسے واقعات بتلادوں تو تم اس سے کیا نتیجہ اخذ کروگے؟

مناظر: اگر آپ ایسے واقعات بتلادیں گے تو وہ دو امر کی قطعی دلیل ہوں گے

(۱) ایک یہ کہ (کسی مسئلہ میں) رائے (اور اجتہاد) سے حکم اس وقت لگایا جاتا ہے جبکہ حدیث نہ ہو (۲) دوسرے یہ کہ جب حدیث سامنے آجائے تو (ہر مجتہد پر) واجب ہے کہ وہ اپنی رائے اور اس پر عمل ترک کردے اور لوگوں پر بھی واجب ہے کہ وہ ہر ایسے عمل کو ترک کردیں جس کے خلاف سنت موجود ہے اور یہ نظریہ باطل ہوجائے گا کہ سنت بعد[۱] کی خبر سے ہی ثابت ہوتی ہے۔ اور ثابت ہوجائے گا کہ

---

[۱] یعنے کوئی سنت اسی وقت قابل قبول ہوتی ہے جبکہ یہ ثابت ہوجائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس پر کسی نے عمل کیا ہے یہ بعض قدما کا مسلک تھا۔ مترجم

کوئی چیز بھی جو سنت کے خلاف ہو اس کو کمزور نہیں کر سکتی (یعنے سنت کی حجیت کو کوئی اس کے خلاف چیز متاثر نہیں کر سکتی)۔

امام شافعی فرماتے ہیں: تو دیکھئے) سفیان بن عیینہ نے زہری عن سعید بن المسیب کی سند سے ہم سے حدیث بیان کی کہ عمر بن الخطاب فرمایا کرتے تھے کہ دیت (خون بہا کی رقم) عاقلہ (مقتول کی برادری کے مردوں) کے لئے ہے اور عورت کو (اپنے مقتول) شوہر کی دیت میں سے میراث کا حصہ نہیں ملے گا (کہ وہ عاقلہ نہیں ہے) یہاں تک کہ ضحاک بن سفیان نے حضرت عمر کو بتلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے پاس یہ (فرمان) لکھکر بھیجا تھا کہ اشیم ضبی (مقتول) کی دیت میں سے اس کی بیوی کو میراث کا حصہ دو۔ تو (یہ حدیث سنکر) حضرت عمر نے اپنے اجتہادی فیصلہ کو چھوڑ دیا اور اس حدیث کو اختیار کر لیا۔ امام شافعی فرماتے ہیں: میں اس حدیث کی وضاحت کر چکا ہوں (کتاب الام ج ۶، ص ۷۷، پر ملاحظہ فرمائے)۔

(۱۹) نیز سفیان بن عیینہ نے ہم سے عمرو بن دینار اور ابن طاؤس عن طاؤس کی سند سے روایت بیان کی کہ (ایک مرتبہ) حضرت عمر نے (صحابہ سے خطاب کرکے) فرمایا: میں اس شخص کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جنین (پیٹ کے بچے) کی دیت (خون بہا) کے بارے میں کچھ سنا ہو (وہ مجھ سے بیان کر دے) تو حمل بن نابغہ بن مالک کھڑے ہوئے اور کہا: "میری دو نوعمر سوکنیں تھیں ان میں سے ایک نے دوسری کے پیٹ پر خیمہ کی میخ اٹھا کر ماری تو اس کا پیٹ کا بچہ مرا ہوا گر گیا تو اس کی دیت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غلام (یا کنیز) کا حکم[۵] دیا۔" تو (اس پر) حضرت عمر نے

---

[۵] جنین کی دیت میں غلام یا کنیز اس وقت آتے ہیں جب بچہ پیٹ سے مردہ گرے اور اگر اسقاط کے وقت زندہ ہو اور اس کے بعد مرے تو اس میں پوری دیت آتی ہے (نہایہ بحوالہ حواشی الرسالہ ص ۴۲۷)

فرمایا: اگر میں یہ حدیث نہ سنتا تو کچھ اور ہی فیصلہ کرتا۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا: ہم تو اس جیسے (غیر منصوص) مسئلہ میں قریب تھا کہ کچھ اور ہی فیصلہ کر دیں۔ بہر حال حضرت عمر نے ضحاک کی اس حدیث کی وجہ سے جو فیصلہ کرنا چاہتے تھے اس سے رجوع کیا اور اپنی رائے کے خلاف اس حدیث پر عمل کیا اور جنین کی دیت کے بارے میں بتلایا کہ اگر یہ حدیث نہ سنتے تو کچھ اور فیصلہ کرتے چنانچہ (دوسری روایت کے الفاظ ہیں) فرمایا: قریب تھا کہ ہم کچھ اور ہی فیصلہ کر دیں۔

امام شافعی فرماتے ہیں: گویا حضرت عمر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ جب کہ یہ معروف حدیث موجود ہے کہ جان کی دیت (خون بہا) میں سو اونٹ آتے ہیں تو جنین (پیٹ کا بچہ) دو حال سے خالی نہیں یا وہ زندہ تھا (اور ضرب کی وجہ سے مرا ہے) تو اس صورت میں تو سو اونٹ آئیں گے یا وہ (چوٹ لگنے سے پہلے ہی) مر چکا تھا، تو اس صورت میں کچھ بھی دیت نہیں آئے گی۔ (حضرت عمر کو چونکہ حدیث نہیں پہونچی تھی اس لئے انھوں نے اپنی رائے سے فیصلہ کرنے کا ارادہ کیا تھا) تو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کا (ضحاک کی حدیث سے) ان کو علم ہو گیا تو انھوں نے آپ کے فیصلہ کو فوراً تسلیم کر لیا۔ حضرت عمر نے اپنے اس فیصلہ کے خلاف، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کی پیروی کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ پایا، جو حدیث نہ پہونچنے کی وجہ سے انھوں نے اپنے اجتہاد سے کرنے کا ارادہ کیا تھا تو جب ان کو اپنے فیصلہ کے خلاف حدیث پہونچ گئی تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو اختیار کر لیا اور اپنے فیصلہ کو ترک کر دیا۔ تمام احکام و مسائل شرعیہ میں ان کا طریق کار یہی تھا[۵۱] کہ وہ نص کے مقابلہ

---

[۵۱] امام شافعی اختلاف الحدیث کے ذیل میں ضحاک کی حدیث (نمبر) اور حمل بن مالک (نمبر) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ اس امر کی دلیل ہے کہ خبر واحد کا بیان کرنے والا جب اس شخص کے نزدیک سچا ہو جس کو خبر دے رہا ہے تو اس کی حدیث قبول کی جائے گی (اور حجت ہوگی) اور اگر کسی بھی وجہ سے (باقی صفحہ ۳۸۳ پر)

میں اپنے اجتہاد کو ترک کر دیا کرتے تھے) یہی طریق کار سب لوگوں کو اختیار کرنا لازم ہے۔

(۲۰) اسی طرح امام مالک نے، ابن شہاب عن سالم کی سند سے روایت بیان کی کہ حضرت عمر صرف عبدالرحمن بن عوف کی حدیث سُنکر ہی لوگوں کو لیکر واپس لوٹے تھے۔ امام شافعی فرماتے ہیں: یعنی جب حضرت عمر مسلمانوں کو لیکر شام جا رہے تھے اور ان کو یہ خبر پہونچی تھی کہ شام میں طاعون پھیلا ہوا ہے (اور عبدالرحمن بن عوف نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سُنائی کہ جب تم کسی بستی کے متعلق سنو کہ وہاں طاعون پھیلا ہوا ہے تو وہاں مت جاؤ اور جب تم کسی بستی میں موجود ہو اور وہاں طاعون پھیل جائے تو وہاں سے طاعون کی وجہ سے مت بھاگو"۔ تو حضرت عمر نے اپنا ارادہ بدل دیا اور شام نہیں گئے)

(۲۱) امام مالک نے جعفر بن محمد عن ابیہ کی سند سے یہ روایت بیان کی کہ (ایک مرتبہ) حضرت عمر نے (صحابہ کے سامنے) مجوسیوں کا ذکر کیا اور کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان کے ساتھ کیا معاملہ کروں"، تو (یہ سُنکر) عبدالرحمن بن عوف کھڑے ہوئے

(بقیہ صفحہ ۳۸۲) کسی کے لئے خبر واحد کا رد کرنا جائز ہوتا تو یقیناً عمر بن الخطاب ضحاک سے کہتے تو تو ایک نجد کا رہنے والا آدمی ہے اور حمل سے کہتے تو تہامہ کا باشندہ ہے تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور خدمت میں رہنے کا اتفاق (یقیناً) بہت ہی کم میسر آیا ہے اس کے برعکس میں اور میرے رفقا مہاجر و انصار صحابہ سفر و حضر میں ہر وقت اور ہر حالت میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ رہے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم سب تو اس حدیث سے نا آشنا ہوں اور ایک اکیلے شخص کو اس حدیث کا علم ہو؟ ہو سکتا ہے کہ تجھے غلط فہمی ہوگئی ہو تو بھول گیا ہو" (اس قسم کے کسی شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا) بلکہ حق (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے) سامنے آجانے کے بعد بلا تردد و توقف اس کی پیروی کی اور اپنی رائے سے رجوع کر لیا اور مقتول شوہر کی دیت میں سے اس کی بیوی کو حصہ نہ دینے کا اور جنین کی دیت میں اس فیصلہ کا ۔۔ کہ اگر زندہ تھا تو پوری دیت آئے گی ورنہ بالکل دیت نہیں آئے گی ۔۔ ارادہ ترک کر دیا ساتھ ہی اس پر بھی متنبہ کر دیا کہ میں اپنا فیصلہ اس صحیح حدیث کے سامنے آجانے کی بنا پر ترک کر رہا ہوں۔

اور کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سُنا ہے کہ آپ نے فرمایا: مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب کا سا معاملہ کرنا (یعنے اہل کتاب کی طرح ان سے جزیہ لینا) (۱)

امام شافعی فرماتے ہیں سفیان نے عمرو بن دینار کے واسطہ سے بیان کیا کہ عمرو بن دینار نے بجالہ سے سُنا کہ حضرت عمر نے مجوسیوں سے اس وقت تک جزیہ قبول نہیں کیا جب تک کہ اُنھوں نے عبدالرحمٰن بن عوف سے یہ حدیث نہ سُن لی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا ہے۔

امام شافعی جملہ معترضہ کے طور پر فرماتے ہیں:

ہر وہ حدیث جو میں نے (اس رسالہ میں) منقطع یعنے مُرسل لکھی ہے میں نے اس کو یا اپنے مشائخ سے متصلاً سنا ہے یا عام محدثین کے حلقہ میں وہ لوگ جن سے یہ حدیثیں مروی ہیں مشہور و معروف ہیں تمام محدثین ان کو اور ان کی ان روایتوں کو جانتے پہچانتے ہیں (اس رسالہ میں ان روایتوں کو متصلاً بیان نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اُن احادیث کو جن کی سندیں مجھے پختہ طور پر یاد نہ تھیں محض اپنے حافظہ سے لکھنا پسند نہ کیا اور میری تحریری یادداشتیں اس وقت میرے پاس موجود نہیں ہیں۔ اس لئے میں نے (حجیت خبر واحد کے ثبوت میں) صرف انہی حدیثوں کو پیش کیا جو مجھے اچھی طرح یاد تھیں اور جو محدثین کے حلقہ میں مشہور و معروف تھیں

اس کے بعد امام شافعی عبدالرحمٰن بن عوف کی حدیث کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:-

---

(۱) امام مالک نے موطا میں اس حدیث کو مُرسل بیان کیا ہے اسی طرح ابن منذر اور دارقطنی نے بھی لیکن ان سب کتابوں میں اس حدیث کے راوی سب کے سب ثقہ ہیں علاوہ ازیں طبرانی میں مسلم بن العلاء الحضرمی کی حدیث اس کی شاہد موجود ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب کا سا معاملہ کرو۔ ابو عبید نے کتاب الاموال میں بھی اس حدیث کو موصولاً روایت کیا ہے۔

بہرحال حضرت عمر نے مجوسیوں کے بارے میں عبدالرحمٰن بن عوف کو حدیث کو قبول کیا اور ان سے جزیہ لے لیا (حالانکہ وہ خبر واحد ہے اور) حضرت عمر قرآن عظیم میں آیت کریمہ ذیل شب و روز تلاوت کرتے تھے۔

من الذین اوتوا الکتاب	ان لوگوں سے جن کو آسمانی کتاب دی گئی
حتی یعطوا الجزیۃ	(جنگ کرو) یہاں تک کہ وہ (عاجز ہو کر)
عن ید وھم صاغرون	ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ (اسلامی
٭ ٭ ٭ ٭	حکومت کی) رعایا بن جائیں۔

نیز وہ قرآن عظیم میں (عام) کافروں سے اسلام قبول کرنے تک جنگ جاری رکھنے سے متعلق احکام بھی پڑھتے تھے اور مجوسیوں کے متعلق خاص طور پر کوئی حدیث ان کے علم میں نہ تھی اور مجوسی ان کے خیال میں اہل کتاب نہ تھے (اس لئے ان کو مجوسیوں سے جزیہ قبول کرنے میں تردد تھا) تو عبدالرحمٰن بن عوف سے (مجوسیوں کے متعلق) حدیث سنتے ہی اسے قبول کر لیا اور اس کی پیروی کی اور بجالہ کی یہ حدیث متصل ہے اس بجالہ نے سن شعور میں حضرت عمر کا زمانہ پایا ہے یہ ان کے بعض عمال کا کاتب (محرر کلرک) رہا ہے۔

اس کے بعد امام شافعی حضرت عمر کے متعلق جو خبر واحد کو قبول کرنے کے سلسلہ میں اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ بعض اوقات ایک راوی کی خبر کے ساتھ دوسرے راوی کی خبر کا بھی مطالبہ کیا کرتے تھے ــ حضرت ابوموسیٰ اشعری کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے ــ اس کا ذکر کرتے ہیں اور اس کا جواب دیتے ہیں کہ حضرت عمر کے اس مطالبہ کا موجب حسب ذیل تین وجوہات میں سے کوئی ایک وجہ ہوئی ہے

(۱) (قبول حدیث میں) احتیاط اور مزید تاکید (۲) خبر دہندہ کا غیر معروف ہونا (۳) خبر دہندہ کا (ان کے نزدیک) ثقہ نہ ہونا

حضرت عمر کا موقف ابوموسیٰ کی حدیث قبول کرنے کے بارے میں پہلی وجہ ــ احتیاط ــ پر مبنی ہے اس لئے کہ ابوموسیٰ اشعری (مسلمہ طور پر) ثقہ اور امین تھے اور اس

کا ثبوت حضرت عمر کا ابو موسیٰ سے یہ فرمانا ہے: یاد رہے کہ میں (اپنے اس طرز عمل سے) تمہیں (حدیث کے بارے میں) متہم (ناقابل اعتماد) نہیں گردانتا بلکہ مجھے اس بات کا اندیشہ ہوا کہ (اگر اسی آسانی سے حدیث قبول کر لی گئی تو آگے چل کر) لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر حدیثیں گھڑنے لگیں گے" (اس لئے مسلمانوں کو قبول حدیث میں بہت احتیاط برتنی چاہیئے)

امام شافعی اس توجیہ کی تاکید کے ذیل میں فرماتے ہیں:۔

حضرت عمر کے متعلق ایسے بہت سے واقعات مروی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ خبر واحد کو (بلا تردد و بلا توقف) قبول کیا کرتے تھے (جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں) تو یہ کسی طرح درست نہیں ہو سکتا کہ حضرت عمر کبھی تو خبر واحد کو قبول کریں اور کبھی قبول نہ کریں۔

اس کے بعد امام شافعی حجیت خبر واحد کے دلائل کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔

(۲۲) خبر واحد کے حجت ہونے کی دلیل تو خود قرآن عظیم میں موجود ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

انا ارسلنا نوحا الی قومه	بیشک ہم نے ہی نوح کو ان کی قوم کی طرف (رسول بنا کر) بھیجا۔

اسی طرح حضرت ابراہیم حضرت اسمٰعیل حضرت ہود، حضرت صالح حضرت شعیب حضرت لوط اور (آخر میں) حضرت محمد صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین کے اپنی اپنی قوم اور اُمتوں کی طرف بھیجنے سے متعلق قرآن کریم کی آیات پیش کرتے ہیں جو اس امر کی دلیل ہیں کہ فرد واحد کی خبر حجت ہے (اس لئے کہ ان انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام میں سے ہر ایک فرد واحد تھا جس نے اپنے رسول ہونے کی خبر اُمت کو دی ہے) اس کے بعد (انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ) حسب ذیل آیت کریمہ پیش کرتے ہیں:۔

واضرب لهم مثلاً اصحاب القریة اذ جاءها المرسلون (الی آخر الآیت)

اور ان کے سامنے بستی والوں کی مثال بیان کرو جبکہ ان کے پاس (عیسیٰ علیہ السلام کے فرستادے آئے۔

پس (ان فرستادگان عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں) دوسرے اور اس کے بعد تیسرے قاصد کو بھیجنا ان پر حجت قائم کرنے کی تقویت پر مبنی تھا (ورنہ ایک قاصد بھی حجت قائم کرنے کے لئے کافی تھا عززنا کا لفظ اس کی دلیل ہے) غرض اسی طرح فرد واحد کے ذریعہ اللہ جلّ وعلیٰ نے امتوں پر حجت قائم کی ہے اور تاکید و تقویت کے لئے زیادتی اس سے مانع نہیں ہے کہ فرد واحد کے ذریعہ حجت قائم ہو جاتی ہے اس لئے کہ اس فرد واحد (نبی مرسل) کو اللہ جلّ وعلیٰ ایسے خارق عادت آیات و معجزات عطا فرما دیتے ہیں جن کی بنا پر وہ عام مخلوق سے ممتاز ہوتا ہے (اسی طرح راوی کی صداقت وعدالت بھی اس کو عام لوگوں سے ممتاز کر دیتی ہے)

(۲۳) امام مالک نے سعد بن اسحاق بن کعب بن عجرہ عن عمتہ زینب بنت کعب کی سند سے حدیث بیان کی کہ فریعہ بنت مالک بن سنان نے زینب کو بتلایا کہ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوئی اور متوفی شوہر کے مکان سے اپنے خاندان بنی خدرہ میں منتقل ہونے کی آپ سے اجازت چاہی"

اس عورت کا شوہر اپنے مفرور غلاموں کی تلاش میں نکلا تھا جب قدوم کے علاقہ میں پہونچا تو اس کو (اکیلا پا کر) ان غلاموں نے قتل کر ڈالا تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میرے خاوند نے میرے لئے کوئی ایسی رہائش کی جگہ نہیں چھوڑی جس کی میں مالک ہوں لہذا مجھے اپنے قبیلہ واپس جانے کی اجازت دیدیجئے، اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: بہت اچھا" میں واپس ہو کر ابھی حجرہ تک یا مسجد تک ـــ شک راوی کی جانب سے ہے ـــ ہی پہونچی تھی کہ آپ نے مجھے بلایا ـــ یا کہا مجھے حکم دیا۔

یہ بھی شک راوی ہے ۔ اور فرمایا: تم نے کیا دریافت کیا تھا؟ تو میں نے اپنے شوہر کا پورا واقعہ پھر دوہرا دیا تو اس کو سنکر آپ نے مجھے حکم دیا: تم اپنے شوہر کے گھر میں ہی قیام کرو یہاں تک کہ فرض عدت کی مدت پوری ہو جائے" فریعہ کہتی ہے: تو میں نے عدت کے چار مہینے دس دن وہیں پورے کئے۔ جب حضرت عثمان کا زمانہ آیا تو انھوں نے اس واقعہ کو دریافت کرنے کی غرض سے مجھے آدمی بھیجکر بلایا اور واقعہ دریافت کیا میں نے ان کو یہ پورا قصہ اور آپ کا حکم بتلا دیا تو حضرت عثمان نے اسی کے مطابق فیصلہ کیا (۱) دیکھئے حضرت عثمان اپنی جلالت قدر اور کمال علم و فضل کے باوجود مہاجرین و انصار کے مجمع میں ایک عورت کے بیان پر فیصلہ دیتے ہیں (اور ہر شخص بے چوں و چرا اس کو قبول کرتا ہے کوئی نہیں کہتا کہ یہ تو ایک عورت کی خبر ہے آپ صرف اس پر فیصلہ کیسے کرتے ہیں یہ تو حجت نہیں ہے)

(۲۴) ہم سے فقیہ مکہ مسلم بن خالد زنجی نے بسند ابن جریج حدیث بیان کی کہ الحسن بن مسلم نے (حضرت ابن عباس کے معروف شاگرد) طاؤس سے روایت نقل کی طاؤس کہتے ہیں: میں (ایک دن) حضرت ابن عباسؓ کے ہمراہ تھا کہ اتنے میں زید بن ثابت (آئے اور انھوں) نے حضرت ابن عباس کہا: کیا آپ یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ حائضہ عورت (حج کے بعد) آخری زیارت کعبہ (یعنی طواف صدر) کئے بغیر (اپنے وطن) واپس جا سکتی ہے؟ تو ابن عباس نے فرمایا: اگر یہ بات نہیں ہے تو تم خود فلاں انصاری عورت (ام سلیم بنت ملحان) سے دریافت کر لو کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو یہ حکم دیا ہے (یا نہیں) تو حضرت زید بن ثابت ہنستے ہوئے واپس ہوئے اور کہا: میں تو آپ کو بھی سچا ہی سمجھتا ہوں۔

---

(۱) اس حدیث کو ابوداؤد، ترمذی اور نسائی سب نے امام مالک کی سند سے روایت کیا ہے حتیٰ کہ امام مالک کے شیخ زہری نے بھی امام مالک کی سند ہی سے اسی حدیث کو روایت کیا ہے اور بہت سے محدثین نے امام مالک کی متابعت (تائید) کی ہے۔ حواشی الرسالہ ص ۴۳۹

امام شافعی فرماتے ہیں: (دیکھئے) زید بن ثابت نے . . . . کسی بھی حاجی کے بغیر بیت اللہ کی آخری زیارت (یعنے طواف صدر) کئے واپس جانے کی ممانعت سنی تھی، اور حائضہ عورت بھی ان کے نزدیک اس ممانعت کے تحت داخل ہونے والے حاجیوں میں شامل تھی جب ابن عباس نے حائضہ عورت کے بارے میں یہ فتویٰ دیا کہ اگر حائضہ عورت نے (دسویں تاریخ) یوم نحر کے بعد طواف زیارت کر لیا ہے تو وہ (طواف صدر کئے بغیر) واپس جا سکتی ہے تو زید بن ثابت نے ابن عباس کے اس فتوے کو صحیح نہ سمجھا جب حضرت ابن عباس نے انصاری عورت کے حوالہ سے ان کو خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حائضہ عورت کو واپس جانے کی اجازت دی ہے تو اس عورت سے دریافت کیا اس عورت نے ان کو (اس اجازت) کی خبر دی تو زید بن ثابت نے (بلا تامل) اس عورت کی تصدیق کی اور ابن عباس سے اختلاف ترک کر دینا اپنے لئے ضروری سمجھا حالانکہ ابن عباس (اور خود زید ابن ثابت) کے پاس اس عورت کی خبر کے علاوہ اور کوئی دلیل نہ تھی۔

(۲۵) سفیان نے عمرو عن سعید بن جبیر کی سند سے روایت بیان کی کہ سعید بن جبیر کہتے ہیں: میں نے حضرت ابن عباس سے عرض کیا کہ نوف بکالی[۲] دعوی کرتا ہے کہ خضر کے ساتھ جس موسیٰ کا واقعہ قرآن میں مذکور ہے وہ بنی اسرائیل کے (نبی)

---

(۱) ان دونوں حدیثوں کو امام احمد نے اپنی مسند میں اور بیہقی نے سنن میں مختلف طرق سے بیان کیا ہے ابن عباس کی حدیث کو شیخین امام بخاری امام مسلم وغیرہ نے بھی ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ آخر میں بیت اللہ کی زیارت (یعنے طواف صدر) کر کے واپس جائیں لیکن حائضہ عورتوں پر تخفیف فرمائی (اور ان کو بغیر طواف صدر کئے واپس جانے کی اجازت دی۔ حاشیہ الرسالہ ص ۴۴۱

(۲) نوف کی والدہ کعب احبار کی بیوی تھیں۔ یہ بنی اسرائیل کے واقعات بیان کیا کرتے تھے یہ تابعی ہیں بنی بکال سے ان کا نسبی تعلق ہے قبیلہ بنی بکال حمیر کی ایک شاخ ہے سنہ ۹۰ھ اور سنہ ۱۰۰ھ کے درمیان کسی سال میں ان کی وفات ہوئی ہے۔ حاشیہ ص ۴۴۲

موسیٰ (علیہ السلام) نہیں ہیں۔ یہ سنکر ابن عباس نے کہا: غلط کہا خدا کے دشمن نے، مجھ سے تو ابی بن کعب نے حدیث بیان کی ہے کہ (ایک مرتبہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے خطبہ دیا اس کے بعد موسیٰ (علیہ السلام) اور خضر کے واقعہ کا ذکر فرمایا اور اس میں کچھ ایسی باتیں بیان فرمائیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ہی خضر کے ساتھی تھے (۱)

تو (دیکھئے) حضرت ابن عباس باوجود اپنی فقاہت اور تقویٰ و پرہیزگاری کے (تنہا) ابی بن کعب کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کو درست قرار دیتے ہیں یہاں تک کہ اسی کی بنا پر ایک مسلمان (نوف بکالی) کو جھوٹا کہہ دیتے ہیں صرف اس لئے کہ ابی بن کعب ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے (نبی) موسیٰ علیہ السلام ہی خضر کے ساتھی تھے (جن کا قصہ قرآن میں مذکور ہے حالانکہ ابی بن کعب کی حدیث خبر واحد ہے)

(۲۶) ہمارے شیخ مسلم اور عبد المجید نے ابن جریج سے روایت کیا کہ طاؤس نے مجھے بتلایا کہ میں نے عصر کی نماز کے بعد دو نفل پڑھنے کے بارے میں حضرت ابن عباس سے مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے ان دو نفلوں کے پڑھنے سے منع کیا۔ طاؤس کہتے ہیں: میں نے کہا: میں تو نہیں چھوڑتا تو اس پر ابن عباس نے کہا اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے:

ماکان لمومن ولا مومنة	نہ کسی مرد کو اور نہ کسی عورت کو یہ حق
اذا قضی اللہ ورسولہ امرا	پہونچتا ہے کہ جب خدا اور اس کا
ان یکون لھم الخیرة من امرھم	رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو ان کو
ومن یعص اللہ ورسولہ	اپنے معاملہ میں کوئی اختیار ہو اور جو شخص

---

(۱) امام بخاری اور امام مسلم نے اس حدیث کو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بیان کیا ہے۔

فقد ضل ضلالا مبینا ۔ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے وہ کھلے طور پر گمراہ ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭

تو دیکھو) ابن عباس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے طاؤس پر (رکعتین بعد العصر کے بارے میں) حجت قائم کر دینے کو کافی سمجھا ہے اور قرآن کریم کی آیت پڑھکر یہ بتلایا ہے کہ تم پر فرض ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول نے کسی چیز کے بارے میں فیصلہ کر دیا تو پھر تمہیں اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا) کوئی اختیار باقی نہ رہنا چاہیئے (اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکعتین بعد العصر پڑھنے سے منع فرما چکے ہیں) طاؤس کو اسی وقت ابن عباس کی حدیث کے ذریعہ سے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کا علم ہوا ہے طاؤس نے اس حدیث کو یہ کہکر رد نہیں کیا کہ یہ تو تمہاری اکیلے کی حدیث ہے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے ثبوت کے لئے تنہا آپ کی خبر کو کافی نہیں سمجھتا ہو سکتا ہے کہ آپ بھول گئے ہوں۔

امام شافعی فرماتے ہیں اگر کوئی یہ کہے کہ ہو سکتا ہے کہ (ابن عباس کے احترام کی وجہ سے) طاؤس نے یہ کہنا مناسب نہ سمجھا ہو؟ (یہ احتمال قطعاً غلط ہے) اس لئے کہ ابن عباس کا مقام اس سے بہت بلند ہے کہ جس چیز کو کوئی شخص حق سمجھے وہ (ان کی مروت یا خوف کی وجہ سے) اس کو ان کے سامنے کہنے سے احتراز کرے (حقیقت یہ ہے کہ اول) ابن عباس نے طاؤس کو عصر کی نماز کے بعد دو رکعت پڑھنے سے خود منع کیا ہے تو اس پر طاؤس نے کہا ہے: میں تو ان کو نہیں چھوڑتا"، اس سے پہلے کہ ابن عباس اس کو بتلائیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے (گویا طاؤس نے اس ممانعت کو ابن عباس کی ذاتی رائے سمجھکر کہا تھا کہ میں تو نہیں چھوڑتا لیکن جب حدیث مرفوع کا ابن عباس کے ذریعہ علم ہو گیا تو انھوں نے اس کو تسلیم کر لیا)۔

(۲۷) صفیان عمرو بن دینار عن ابن عمر کی سند سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ

ابن عمر نے فرمایا: ہم مزارعت کیا کرتے تھے (یعنے کسانوں کو زمینیں بٹائی پر دیا کرتے تھے) اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھتے تھے یہاں تک کہ رافع بن خدیج نے ہمیں بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت سے منع فرمایا ہے تو ہم نے اس حدیث کی وجہ سے مزارعت چھوڑ دی۔ ظاہر ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن عمر مزارعت کے ذریعہ کافی نفع اُٹھاتے تھے اور اس عقد مزارعت کو حلال سمجھتے تھے لیکن جب ان سے ایک ایسے شخص — رافع بن خدیج — نے جو حدیث کے بارے میں متہم نہیں یعنے ثقہ اور قابل اعتماد ہے یہ حدیث بیان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت سے منع فرمایا ہے تو انھیں اس حدیث کو سُن لینے کے بعد مزارعت کرنے کی ہمت نہیں ہوئی نہ ہی ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سُن لینے کے بعد اپنی رائے (اجتہاد) سے کام لینے کی جرأت ہوئی نہ اُنھوں نے یہ کہا: آج سے پہلے تو کسی نے مزارعت کو بُرا نہیں کہا اسی بنا پر ہم ہمیشہ مزارعت کرتے رہے ہیں۔ اس تنقیح سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کوئی بھی ایسا تعامل جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر مبنی نہ ہو وہ (اس کے خلاف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو کمزور نہیں کرتا۔

(۲۸) امام مالک نے زید بن اسلم عن عطاء بن یسار کی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان نے سونے یا چاندی کا ایک بڑا پیالہ اس کے وزن سے زیادہ قیمت پر (کسی کے ہاتھ) فروخت کیا تو حضرت ابو الدرداء نے ان کو بتلایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کی خرید و فروخت سے منع کرتے ہوئے سُنا ہے۔ اس پر معاویہ نے کہا: میں تو اس بیع میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ یہ جواب سُنکر ابو الدرداء بولے: کون مجھے معذور سمجھ سکتا ہے معاویہ کے بارے میں؟ میں تو ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سُناتا ہوں اور یہ (اس کے خلاف) مجھے اپنی رائے بتلاتے ہیں؟ میں اب اس سرزمین میں تمہارے ساتھ ہرگز نہیں رہوں گا (۱)

---

(۱) امام شافعی اس طرح اس واقعہ کے بیان کرنے میں منفرد ہیں حافظ ابن عبد البر کہتے ہیں: (باقی صفحہ ۳۹۳ پر)

(۲۹) ہمیں بتلایا گیا ہے کہ ابو سعید خدری ایک شخص سے ملے اور اس کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بیان کی تو اس شخص نے اس حدیث کے خلاف دوسری حدیث بیان کردی تو (اس مقابلہ) پر ابو سعید خدری نے کہا: خدا کی قسم آج کے بعد میں اور تو ایک مکان کی چھت کے نیچے ہرگز نہ دیکھے جاسکیں گے۔ (یعنی میں تیرے ساتھ ہرگز نہ رہوں گا)

تو دیکھئے حضرت ابو الدرداء نے خبر واحد کے ذریعہ حضرت معاویہ پر حجت قائم کرنے کو کافی سمجھا اور جب حضرت معاویہ نے ان کی بات نہ مانی تو وہ اُس سرزمین کو ہی حضرت معاویہ کی اس جرأت کی بنا پر کہ وہ رسول اللہ کی ایک ثقہ راوی کی حدیث کو ترک کر رہے ہیں، چھوڑ کر چلے گئے جہاں وہ رہتے تھے۔

امام شافعی فرماتے ہیں: جس شخص کے سامنے کوئی حدیث بیان کی جائے اور وہ حدیث کو قبول نہ کرے تو یہ بہت زیادہ دل تنگی (اور ناگواری) کا موجب ہوتا ہے (اسی لئے ابو سعید خدری نے یہ قسم کھائی) اور اس شخص نے جو ابو سعید خدری کی حدیث کے خلاف حدیث بیان کی اس میں دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں ایک یہ کہ وہ ابو سعید کی حدیث کے خلاف ہو دوسرے یہ کہ خلاف نہ ہو (یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ حدیث ابو سعید خدری کی حدیث کے خلاف ہی ہو تاہم اس شخص کا یہ معارضہ ناقابل برداشت تھا)

(۳۰) اہل مدینہ کے ایک ایسے شیخ نے جو میرے نزدیک (حدیث میں) متہم نہ تھا (یعنی ثقہ اور قابل اعتماد تھا) مجھ سے ابن ابی ذئب عن مخلد بن خفاف کی سند سے روایت نقل کی کہ مخلد نے بیان کیا کہ میں نے ایک غلام خریدا اور اس سے (نوکری یا مزدوری کرا کے) آمدنی حاصل کرتا رہا کچھ دن بعد مجھے اس غلام میں (ایک پوشیدہ)

(بقیہ صفحہ ۳۹۲) حضرت معاویہ کا یہ واقعہ عبادۃ بن الصامت کے ساتھ محدثین کے نزدیک محفوظ ہے لیکن سند اسکی بھی صحیح ہے اس لئے یہ حدیث افراد صحیح میں شمار ہوگی حاشیہ ۴۴۶

عیب کا پتہ چلا تو میں نے یہ (دھوکہ دہی کا) مقدمہ (حاکم مدینہ) عمر بن عبدالعزیز کی عدالت میں پیش کیا تو انھوں نے میرے حق میں تو غلام کو واپس کر دینے کا فیصلہ دیا اور میرے خلاف (اتنے دنوں کی) آمدنی (بائع کو) واپس کرنے کا حکم دیا تو میں (اس سلسلہ میں) عروۃ بن زبیر کے پاس گیا اور ان کو سارا ماجرا سنایا۔ عروہ نے کہا: میں شام کو عمر بن عبدالعزیز کے پاس جاؤں گا اور انہیں بتاؤں گا کہ حضرت عائشہ نے مجھ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قسم کے مقدمہ میں فیصلہ یہ فرمایا ہے: "الخراج بالضمان" "آمدنی ذمہ داری[۱] کے عوض میں ہے" تو میں جلدی سے (یعنے عروۃ سے پہلے) عمر بن عبدالعزیز کے پاس گیا اور ان کو یہ حدیث سنائی جو عروہ نے حضرت عائشہ کے واسطہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی تھی تو عمر بن عبدالعزیز نے کہا: جو مجھے میسر آیا (یعنی ہو سکا) وہ فیصلہ میں نے کر دیا خدا شاہد ہے کہ میں نے اس فیصلہ میں حق (تک پہونچنے) کی ہی کوشش کی تھی اب مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پہونچ گئی، میں عمر کے (یعنے اپنے) فیصلہ کو رد کرتا ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت (یعنے فیصلہ) کو نافذ کرتا ہوں اس کے بعد عروہ بھی پہونچ گئے (اور حضرت عائشہ کی حدیث انھیں سنا دی) تو عمر بن عبدالعزیز نے فیصلہ دیا کہ میں اس شخص (بائع) سے آمدنی کی رقم واپس لے لوں جس کا میرے خلاف فیصلہ ہو چکا تھا (۱)

(۳۱) ایک ایسے ثقہ شیخ نے جن کو میں (روایت حدیث میں) متہم (ناقابل اعتبار) نہیں سمجھتا، ابن ابی ذئب سے یہ واقعہ نقل کیا کہ (حاکم مدینہ) سعید بن ابراہیم نے

۱۔ یعنے اس زمانہ میں اگر غلام ہلاک ہو جاتا تو میرے ذمہ پڑتا علاوہ ازیں ان دنوں میں غلام کے خورد و نوش کا خرچ بھی میں نے اٹھایا ہے لہٰذا ان دنوں کی آمدنی بھی مجھے ملنی چاہیئے۔ مترجم (۱) اس حدیث سے متعلق استاذ احمد شاکر نے بہت طویل بحث کی ہے ملاحظہ ہو حواشی الرسالہ ص ۴۴۹

ایک شخص کے خلاف ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن (جو ربیعۃ الرای کے نام سے مشہور ہیں) کے اجتہاد کے مطابق فیصلہ کردیا تو ابن ابی ذئب کہتے ہیں: میں نے سعد کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنائی جو اُس فیصلہ کے خلاف تھی جو سعد نے کیا تھا۔ تو اس پر سعد نے ربیعہ سے کہا: یہ ابن ابی ذئب ہیں، میرے نزدیک یہ ثقہ ہیں یہ آپ کے فیصلہ کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرتے ہیں (اب بتلائے میں کیا کروں؟) اس پر ربیعہ نے سعد سے کہا: آپ (حاکم ہیں) آپ نے اجتہاد سے ایک فیصلہ کیا ہے (از روے قاعدہ) آپ کا فیصلہ نافذ ہو چکا۔ اس پر سعد نے کہا: عجیب بات ہے کیا میں سعد کے (یعنے اپنے) فیصلہ کو نافذ کردوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو رد کردوں (یہ ہرگز نہیں ہوسکتا) بلکہ میں سعد بن ام سعد کے (یعنے اپنے) فیصلہ کو رد کرتا ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو نافذ کرتا ہوں چنانچہ سعد نے (اسی وقت) سعد بن ابراہیم کے (یعنے اپنے) فیصلہ کے کاغذات منگوائے اور ان کو پھاڑ دیا اور (محض حدیث کی بنا پر اپنے فیصلہ کے برخلاف) مدعیٰ علیہ کے حق میں فیصلہ دیدیا (حالانکہ ابن ابی ذئب کی حدیث خبر واحد تھی)

(۳۲) امام شافعی فرماتے ہیں: مجھ سے ابوحنیفہ بن سماک بن الفضل الشہابی نے ابن ابی ذئب عن المقبری عن ابی شریح الکعبی کے سند سے حدیث بیان کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے سال خطبہ میں اعلان فرمایا ہے: "جس شخص کا کوئی (عزیز) قتل ہو جائے اس کو دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے چاہے اس کی دیت (خون بہا) لے لے چاہے قصاص" (راوی واقعہ) ابوحنیفہ کہتے ہیں: میں نے یہ حدیث سننے کے بعد ابن ابی ذئب سے دریافت کیا: اے ابوالحارث آپ اس حدیث کو مانتے ہیں؟ تو (وہ بڑے ناراض ہوئے اور) انھوں نے میرے سینہ پر زور سے ہاتھ مارا اور خوب زور زور سے چلائے اور مجھے بہت برا بھلا کہا کہ میں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرتا ہوں

اور تو کہتا ہے کیا تم اس کو مانتے ہو؟ جی ہاں میں اس کو مانتا ہوں اور یہی مجھ پر اور ہر اس شخص پر جو اس حدیث کو سنے فرض ہے دسُن لو) اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوق میں سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو (مخلوق کی ہدایت کے لئے) انتخاب کیا ہے (اور رسول بنا کر بھیجا ہے) اور آپ ہی کے ذریعہ سے اور آپ ہی کے ہاتوں پر مخلوق کو ہدایت دی ہے اور لوگوں کے لئے وہی شریعت پسند کی ہے جو آپ کے لئے تجویز کی اور آپ کی زبان سے اس کا اعلان کرایا لہٰذا اب تمام مخلوق کا فرض ہے کہ وہ آپ کی اطاعت کریں خوشی سے یا ناخوشی سے کسی بھی مسلمان کے لئے اس سے مفر نہیں" راوی کہتا ہے وہ دیر تک اسی قسم کی باتیں کہتے رہے اور (خاموش نہ ہوئے) یہاں تک کہ میں آرزو کرنے لگا کہ کاش یہ خاموش ہو جاتے۔

امام شافعی فرماتے ہیں: خبر واحد کے حجت ہونے کے ثبوت میں اور بھی بہت سی احادیث موجود ہیں یہاں ہم انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۳۳) ہمارے سلف صالحین کا اور ان کے بعد ہر عہد کے علما تک جن کو ہم نے دیکھا (خبر واحد کے حجت ہونے کے بارے میں) یہی طریقہ اور معمول رہا ہے (کہ وہ سب خبر واحد کو حجت مانتے رہے ہیں) اور اسی طرح مختلف بلاد اسلامیہ کے علما کی جو روایات ہم تک پہونچی ہیں ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے (کہ وہ سب خبر واحد کو حجت مانتے رہے ہیں)

امام شافعی فرماتے ہیں: علماء مدینہ میں لیجئے ہم (۱) سعید کو دیکھتے ہیں کہ وہ بیع صرف کے بارے میں ابو سعید خدری کی مرفوع حدیث بیان کرتے ہیں اور اس کو سنت (حکم شرعی) قرار دیتے ہیں، ابو ہریرہ سے مرفوع حدیث روایت کرتے ہیں اور اس کو سنت (حکم شرعی) قرار دیتے ہیں اسی طرح ان کے علاوہ اور ایک ایک صحابی کی مرفوع حدیث روایت کرتے ہیں اور اسے سنت قرار دیتے ہیں۔

(۲) عروۃ کو لیجئے وہ کہتے ہیں مجھ سے حضرت عائشہ نے حدیث بیان کی

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا ہے : الخراج بالضمان اور اس حدیث کو سنت قرار دیتے ہیں اسی طرح عروہ حضرت عائشہ سے اور بہت سی مرفوع حدیثیں روایت کرتے ہیں اور ان کو سنت قرار دیتے ہیں اور ان سے حلال و حرام کے احکام ثابت کرتے ہیں اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عروہ کہتے ہیں : مجھ سے اسامہ بن زید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فلاں حدیث بیان کی اور عبد اللہ بن عمر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فلاں حدیث بیان کی اور ہر ایک کی حدیث کو خبر واحد ہونے کے باوجود سنت اور حجت قرار دیتے ہیں (یہ تو مرفوع احادیث تھیں) عروہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ مجھ سے عبد الرحمٰن بن عبد القاری نے اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت عمر کی فلاں حدیث بیان کی اور یحییٰ بن عبد الرحمٰن ابن حاطب نے اپنے والد (عبد الرحمٰن) کے واسطہ سے حضرت عمر کی فلاں حدیث بیان کی اور ان میں سے ہر فرد واحد کی روایت کو حضرت عمر کی حدیث کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں (۳) اسی طرح (علماء مدینہ میں) ہم قاسم بن محمد کو دیکھتے ہیں وہ کہتے ہیں حضرت عائشہ نے مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فلاں حدیث بیان کی ایک اور حدیث میں کہتے ہیں ابن عمر نے مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فلاں حدیث بیان کی اور ہر ایک کی حدیث کو خبر واحد ہونے کے باوجود سنت (اور حجت) قرار دیتے ہیں نیز قاسم کہتے ہیں : عبد الرحمٰن اور مجمع فرزندان یزید بن جاریہ نے خنساء بنت خدام سے فلاں مرفوع حدیث روایت کی اور اس کو حجت قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ ایک عورت کی خبر ہے ۔ (۴) اسی طرح (علماء مدینہ میں) علی بن حسین کو لیجئے وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے عمرو بن عثمان نے اسامہ بن زید کے واسطہ سے حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے لا یرث المسلم الکافر (مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا) اور اس حدیث کو سنت قرار دیتے ہیں اور نہ صرف علی بن حسین بلکہ تمام علما اسی اسامہ کی حدیث کی بنا پر جو خبر واحد ہے اسے سنت (اور حکم شرعی) قرار دیتے ہیں۔

(۵) اسی طرح محمد علی بن حسین حضرت جابر سے ایک مرفوع حدیث اور عبید اللہ بن ابی رافع عن ابی ہریرۃ کی سند سے ایک اور مرفوع حدیث بیان کرتے ہیں اور ہر حدیث کو سنت اور حجت قرار دیتے ہیں (۶) اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ: محمد بن جبیر بن مطعم (۷) نافع بن جبیر بن مطعم (۸) یزید بن طلحۃ بن رُکانہ (۹) محمد بن طلحۃ بن رُکانہ (۱۰) نافع بن عجیر بن عبد یزید (۱۱) ابو سلمہ بن عبد الرحمن (۱۲) حمید بن عبد الرحمن (۱۳) طلحۃ بن عبد اللہ بن عوف (۱۴) مصعب بن سعد بن ابی وقاص (۱۵) ابراہیم بن عبد الرحمن عوف (۱۶) خارجہ بن زید بن ثابت (۱۷) عبد الرحمن بن کعب بن مالک (۱۸) عبد اللہ بن ابی قتادہ (۱۹) سلیمان بن یسار (۲۰) عطاء بن یسار وغیرہ تمام محدثین اہل مدینہ کسی بھی صحابی یا تابعی کی روایت کے متعلق کہتے ہیں کہ فلاں صحابی نے یا فلاں تابعی نے فلاں صحابی سے یہ مرفوع حدیث بیان کی اور اس کو سنت اور حجت قرار دیتے ہیں حالانکہ وہ خبر واحد ہوتی۔

محدثین مکہ میں سے ہم (۱) عطاء کو (۲) طاؤس کو (۳) مجاہد کو (۴) ابن ابی مُلیکہ کو (۵) عکرمہ بن خالد کو (۶) عبید اللہ بن یزید کو (۷) عبد اللہ بن باباکو۔ (۸) ابن ابی عمار وغیرہ کو مکہ میں، وہب بن منبہ کو یمن میں، مکحول کو شام میں اور عبد الرحمن بن غُنم اور حسن، اور ابن سیرین کو بصرہ میں اور اسود اور علقمہ اور شعبی کو کوفہ میں اور ان کے علاوہ بلاد و امصار کے محدثین اور کبار علماء ان سب کے متعلق ہمیں وثوق کے ساتھ معلوم ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث خبر واحد کو حجت مانتے ہیں اور (حکم شرعی کے ثبوت میں) اسی پر اکتفا کرتے ہیں اسی پر فتویٰ دیتے ہیں ان کبار محدثین میں سے ہر محدث اپنے سے اوپر کے طبقہ کے شیخ کی خبر واحد کو قبول کرتا ہے اور ان سے نیچے کے طبقہ کے محدثین ان کی خبر واحد کو قبول کرتے ہیں۔

(۳۴) اور اگر کسی بھی شخص کے لئے درست ہوتا ۔ کہ وہ علم خاصہ کے تحت (اہل علم کے اس خالص طبقہ کے علم کے تحت جن کا اجماع امام شافعی کے نزدیک حجت ہے) یہ کہے (دعویٰ کرے) کہ قدیم اور جدید عہد کے تمام مسلمانوں کا خبر واحد

کے حجت ہونے اور اسی پر اکتفا کرنے پر اجماع ہو چکا ہے اس بنا پر کہ مسلمانوں کے فقہا میں سے ایک بھی متنفس ایسا علم میں نہیں آیا جو خبر واحد کو حجت نہ مانتے ہوں تو میرے لئے بھی یہ کہہ دینا (دعویٰ کرنا) درست ہوتا لیکن میں اتنا تو ضرور ہی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے مسلمان فقہا کے متعلق بالکل یاد نہیں کہ انھوں نے خبر واحد کو حجت ماننے میں اختلاف کیا ہو، اس بنا پر کہ یہ دعویٰ ان سب کے حق میں میرے (مذکورہ بالا) بیان سے ثابت ہے (یعنی خبر واحد کے حجت ہونے پر تمام مسلمانوں کے اجماع کا دعویٰ تو مشکل ہے ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان فقہا سے خبر واحد کی حجیت میں اختلاف ثابت نہیں)

اس کے بعد امام شافعی (خبر واحد کی حجیت پر) جو اعتراض کیا جاتا ہے اس کا ذکر کرتے ہیں:

کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ بعض علماء ان حدیثوں پر عمل نہیں کرتے جو ان کے سامنے روایت کی جاتی ہیں۔

اور اس کا جواب دیتے ہیں:

کہ ان علماء کے لئے ترک عمل بالحدیث کا کوئی نہ کوئی عذر ضرور ہوا ہے خواہ یہ کہ ان کے پاس بھی حدیث ہوتی ہے جو ان احادیث کے خلاف ہوتی ہے یا اس کے راوی ان کے نزدیک روایت حدیث میں متہم ہوتے ہیں یعنی ثقہ نہیں ہوتے یا حدیث کے دو مفہوم ہو سکتے ہوں گے (ایک کو انھوں نے چھوڑ دیا اور دوسرے کو لے لیا ہوگا) اور یہ تو کسی عقلمند فقیہ کے متعلق وہم بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حدیث (خبر واحد) کو حجت مان لینے کے بعد بغیر کسی تاویل اور بغیر کسی عذر کے کسی حدیث کو ترک کر دے۔ اور جو شخص بغیر کسی تاویل اور عذر کے حدیث کو رد کرنے کا مسلک اختیار کرے وہ تو ہمارے نزدیک ایسی کھلی ہوئی خطا کا مرتکب ہے جس کے لئے دنیا میں کوئی عذر نہیں۔

مصنف کہتے ہیں: اس طرح امام شافعی رحمہ اللہ نے محکم بیان اور کتاب و سنت عمل صحابہ و تابعین و تبع تابعین و فقہاء مسلمین کے پختہ دلائل سے ثابت کر دیا کہ خبر واحد پر عمل کرنا اور اس کو اختیار کرنا (ہر مسلمان پر) واجب ہے۔

پانچویں فصل

معتزلہ اور متکلمین

(عقلیت پرستوں) کا رویہ سُنّت کے ساتھ

سنت کے متعلق معتزلہ کے موقف کے سلسلہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں :-

کہ آیا وہ سنت کی دونوں قسموں متواتر و آحاد کو حجت ماننے میں جمہور مسلمین کے ہمنوا ہیں ؟ یا دونوں قسموں کے حجت ہونے کے منکر ہیں ؟ یا صرف خبر متواتر کو حجت مانتے ہیں اور خبر واحد کو حجت نہیں مانتے ؟

علامہ آمدی ایک معتزلی مفکر ابوالحسین بصری کے متعلق لکھتے ہیں کہ :-

(۱) ابوالحسین بصری ان لوگوں میں سے ہیں جو از روئے عقل تعبدی امور (عبادات) میں خبر واحد کی پیروی کے واجب ہونے کے قائل ہوتے ہیں (۱)

(۲) باقی ابوعلی جبائی اور متکلمین (عقلیت پرستوں) کی ایک جماعت کے متعلق لکھتے ہیں :-

کہ ابوعلی جبائی اور متکلمین (عقلیت پرستوں) کی ایک جماعت کہتی ہے کہ از روئے

---

(۱) الاحکام ج ۲ ص ۷۵

عقل خبر واحد کو تعبدی امور (عبادات) میں قبول کرنا جائز نہیں (۱)

علامہ جلال الدین سیوطی تدریب الراوی (۲) میں ابو علی جبای سے نقل کرتے ہیں کہ :۔

ابو علی جبائی ایک عادل اور ثقہ راوی کی خبر اس وقت تک نہیں قبول کرتے تھے جبتک کہ دوسرے عادل اور ثقہ راوی کی خبر اس کے ساتھ نہ ملجائے یا کتاب اللہ کی واضح نص سے یا کسی دوسری حدیث کی واضح نص سے اسکی تائید و تقویت نہ ہوجائے یا وہ حدیث صحابہ کرام کے درمیان شائع و ذائع رہی ہو یا کسی (امام مجتہد) نے اس پر عمل کیا ہو۔

(۲) ابوالحسین بصری نے بھی اپنی کتاب معتمد میں ابو علی کے اس قول کو نقل کیا ہے

(۳) استاذ ابو نصر تمیمی نے ابو علی جبائی کے متعلق لکھا ہے کہ :۔

ابو علی علی الاطلاق اس وقت تک خبر واحد کو نہیں مانتے جب تک چار ثقہ راوی اس کو روایت نہ کریں۔

(۴) علامہ ابن حزم نے بیان کیا ہے کہ :۔

تمام اہل اسلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر حدیث کو جو ایک ثقہ راوی نے بیان کی ہو قبول کیا کرتے تھے ہر فرقہ اپنے علم اور مسلک کی روشنی میں اسی پر قائم تھا اہل سنت بھی خوارج بھی۔ شیعہ بھی اور قدریہ (معتزلہ) بھی یہاں تک کہ تاریخ کی ایک صدی بعد عقلیت پرست معتزلہ منظر عام پر آئے اور انھوں نے خبر واحد کے متعلق اس اجماع کی مخالفت کی۔ خود ابن عبید (اپنے مخصوص نظریات کو اختیار کرنے سے پہلے) امام حسن بصری سے جو حدیث مروی ہوتی اس پر عمل کیا کرتا اور اسی پر فتویٰ دیا کرتا تھا یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے تاریخ اسلام سے ادنیٰ تعلق رکھنے والا شخص بھی ناواقف نہیں ہو سکتا (۳)

لیکن خود ابن حزم ایک دوسرے مقام پر علی الاطلاق (بلا استثنا) معتزلہ کو خبر واحد کی حجیت کا منکر قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں :

تمام ہی معتزلہ اور خوارج کا مسلک ہے کہ خبر واحد موجب علم (یقین) نہیں ہوتی

---

(۱) الاحکام ج ۲ ص ۶۸ (۲) تدریب الراوی ص ۱۷ (۳) الاحکام لابن حزم ج ۱ ص ۱۱۴

ان کا کہنا ہے کہ جس خبر میں جھوٹ یا غلطی کا امکان ہو اس سے اللہ کے دین میں کوئی بھی حکم ثابت کرنا جائز نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس کی نسبت خدا کی طرف کی جا سکتی ہے اور نہ خدا کے رسول کی طرف (۱)

(۵) حافظ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں معتزلہ کی نسبت لکھا ہے :-

معتزلہ نے گناہ گار مسلمانوں کی شفاعت کے ثبوت میں جتنی واضح اور محکم نصوص (صریح احادیث) موجود ہیں ان سب کا فما تنفعھم شفاعۃ الشافعین جیسی متشابہ (مبہم اور محتاج تاویل) آیات کی بنا پر انکار کر دیا (۲)

آپ دیکھتے ہیں یہ اقتباسات اور اقوال ایک دوسرے سے اس قدر متناقض اور متعارض ہیں کہ ان کی بنیاد پر ہم معتزلہ کے متعلق اس مسئلہ میں کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سکتے اس لئے ہم اس سلسلہ میں علم کلام کی کتابوں کی طرف مراجعت ضروری سمجھتے ہیں تاکہ اس مسئلہ میں معتزلہ کے بارے میں علماء ملل و نحل کی رائے سے واقف ہو سکیں۔

چنانچہ میں نے دیکھا کہ امام ابو منصور بغدادی، صاحب مواقف اور امام رازی نظامیہ — معتزلہ کے ایک فرقہ — کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ :- نظامیہ تو خبر متواتر کے حجت ہونے اور اس کے مفید علم (یقین) ہونے کا بھی انکار کرتے ہیں ان کا نظریہ تو یہ ہے کہ تواتر بھی جھوٹ پر مبنی ہو سکتا ہے اور اُمت کا اجماع بھی خطا اور غلطی پر مبنی ہو سکتا ہے (لہٰذا نہ خبر متواتر حجت ہے نہ اجماع) جیسا کہ امام رازی نے نظّامیہ کی طرف خبر واحد کی حجیت سے انکار کی نسبت کی ہے۔

چونکہ یہ فرقہ نظامیہ معتزلہ کے بائیس فرقوں میں سے ایک بڑا فرقہ تھا (۳) اور حجیت سنت کے بارے میں اُن کا موقف صحابہ کی عدالت کے بارے میں ان کے موقف پر مبنی تھا (نہ وہ صحابہ کو سچا اور قابل اعتماد مانتے تھے نہ ان سے مروی احادیث کو حجت مانتے تھے) اس سلسلے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ امام ابو منصور بغدادی متوفی ۴۲۹ھ نے اپنی کتاب الفرق بین الفرق میں صحابہ کرام کے بارے میں ان کے موقف اور حدیث کے بارے میں ان کے زعماء (سربراہوں) کے موقف کے سلسلہ میں

---

(۱) الاحکام لابن حزم ج ۱ ص ۱۱۹ (۲) اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۲۱ (۳) الفرق بین الفرق ص ۹۷

جو کچھ لکھا ہے قارئین کی بصیرت کے لئے یہاں نقل کردوں۔

امام ابومنصور بغدادی نے معتزلہ کے اُن عقائد کا ذکر کرنے کے بعد جن پر وہ سب متفق ہیں، اُن عقائد کا ذکر کیا ہے جن میں ان کا آپس میں اختلاف ہے چنانچہ وہ فرقہ واصلیہ سے اس بیان کو شروع کرتے ہیں۔

فرقہ واصلیہ اور واصل بن عطاء متوفی سنہ ۱۱۳ھ

فرقہ واصلیہ، واصل بن عطاء کے متبعین کا گروہ تھا، واصل بن عطاء کے حالات کے ذیل میں وہ لکھتے ہیں:۔

پھر واصل بن عطاء سلف سے (علماء معتزلہ سے) جُدا ہوگیا اور ایک تیسری بدعت کی بنا ڈالی اس کی تفصیل یہ ہے کہ واصل نے اپنے زمانہ کے لوگوں میں حضرت علی اور اُن کے رفقاء کے بارے میں اور حضرت طلحہ، زبیر، عائشہ اور تمام "اصحاب جمل" کے بارے میں (رضی اللہ عنہم) شدید اختلاف پایا چنانچہ خوارج کا عقیدہ تھا کہ جنگ جمل میں حضرت طلحہ، زبیر، عائشہ اور ان کے ساتھی (اصحاب جمل) حضرت علی سے جنگ کر کے کافر ہو گئے اور یہ کہ حضرت علی جنگ جمل میں اپنے مخالفین سے جنگ کرنے میں حق پر تھے، اسی طرح حضرت علی جنگ صفین میں حضرت معاویہ اور ان کے ساتھیوں سے جنگ کرنے میں تحکیم (ثالثی) کے واقعہ سے پہلے تک حق پر تھے لیکن تحکیم کو قبول کرنے کے بعد علی بھی کافر ہو گئے اس کے برعکس اہل سنت جنگ جمل اور جنگ صفین میں شریک ہونے والے دونوں فریق کے مسلمان ہونے کے قائل تھے ہاں اتنا ضرور ہے کہ حضرت علی ان کے نزدیک اپنے مخالفین سے جنگ کرنے میں حق پر تھے اور ان کے مخالفین نافرمان اور خطاکار تھے لیکن ان کی یہ خطاء (اجتہادی) نہ کفر تھی اور نہ ایسا فسق جس سے ان کی شہادت قابل قبول نہ رہے چنانچہ علماء اہل سنت دونوں فریق میں سے ہر فرقہ کے دو عادل گواہوں کی گواہی پر فیصلہ کر دینے کو جائز قرار دیتے تھے۔
واصل بن عطاء نے مذکورہ بالا دونوں فرقوں سے الگ ایک تیسری راہ

اختیار کی واصل کا عقیدہ تھا کہ ہر دو فریق (اصحاب علیؓ اور اصحاب عائشہؓ ومعاویہ میں سے ہر فریق) کا فسق شخصی نہ تھا بلکہ بحیثیت مجموعی سب کے سب فاسق تھے اور یہ کہ ان ہر دو گروہوں کے فاسقوں کو شخصی طور پر متعین نہیں کیا جا سکتا (کہ فلاں شخص کافر ہے)، وہ کہتا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں فریق میں بحیثیت مجموعًا حضرت علیؓ اور ان کے رفقا مثلاً حسنؓ، حسینؓ، ابن عباسؓ، عمارؓ بن یاسرؓ، ابوایوب انصاریؓ اور تمام وہ صحابہ جو جنگ جمل میں حضرت علی کے ساتھ تھے وہ پوری جماعت فاسق ہو اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں فریق میں سے حضرت عائشہؓ، طلحہؓ زبیرؓ اور تمام جنگ جمل میں حصہ لینے والے صحابہ بحیثیت مجموعی سب فاسق ہوں، اس کے بعد ان دونوں فریقوں کے بارے میں اپنے شک وتردد کو صحیح ثابت کرنے کے لئے واصل کہتا ہے، اگر علیؓ اور طلحہ یا علیؓ اور زبیر یا حضرت علی کے رفقاء میں کا کوئی شخص اور جنگ جمل میں حصہ لینے والوں میں کا کوئی شخص میرے سامنے ایک سبزی ترکاری کی گٹھی پر بھی گواہی دیں تو میں ان کی شہادت پر فیصلہ نہیں دوں گا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ان دونوں گواہوں میں سے کوئی ایک شخص بلا تعیین ضرور فاسق ہے (اور دوسرا تنہا ہے نصاب شہادت پورا نہیں) بالکل ایسے ہی جیسے کہ میں "دو لعان" کرنے والوں کی شہادت پر فیصلہ نہیں دے سکتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ان میں سے ایک شخص بلا تعیین ضرور فاسق ہے (اور دوسرا اکیلا ہے، نصاب شہادت پورا نہ ہوگا) لیکن اگر ان دونوں گروہوں میں سے ہر گروہ کے دو دو شخص گواہی دیں تو میں ان کی شہادت قبول کرلوں گا (۱) (کیونکہ ہر فریق کے دو نفروں میں سے صرف ایک شخص فاسق ہے دوسرا نہیں لہذا نصاب شہادت پورا ہو جائے گا)

فرقہ عمرویہ اور عمرو بن عبید المتوفی ۱۴۳ھ

اس کے بعد امام ابو منصور بغدادی معتزلہ کے فرقہ عمرویہ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ،

---

(۱) الفرق بین الفرق ص ۱۰۱ - ۲۰ -

یہ لوگ عمرو بن عبید کے پیرو تھے۔ عمرو بن عبید اس (ردِ شہادت بر بناء فسق) بحث میں واصل بن عطاء سے بھی دو قدم آگے بڑھ گیا چنانچہ وہ کہتا ہے: جنگ جمل میں حصہ لینے اور لڑنے والے دونوں فریق (فرداً فرداً بھی اور مجموعی طور پر بھی) فاسق تھے چنانچہ وہ دونوں فریق میں سے کسی ایک کی شہادت کو بھی قبول نہیں کرتا۔ واصل بن عطاء اور عمرو بن عُبید کے بعد قدریہ یعنی معتزلہ کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہوگیا چنانچہ نظّام، معمر، اور جاحظ نے تو جنگ جمل کے متحارب فریقین کے بارے میں واصل بن عطا کا مسلک اختیار کیا (کہ ہر فریق مجموعی حیثیت سے فاسق تھا) لیکن ھاشم اوقص کی رائے تھی کہ ان دونوں جنگوں کے قائدین تو نجات یافتہ ہیں لیکن ان کے پیرو ہلاک ہو گئے (۱) (کافر ہو گئے)

ھُذیلیہ والو الہذیل المتوفی ۲۲۶ یا ۲۳۵ھ

امام ابو منصور بغدادی اس کے بعد معتزلہ کے فرقہ ھُذیلیہ کا ذکر کرتے ہیں:۔

یہ لوگ ابو الھذیل محمد بن الھذیل کے پیرو تھے جو علّاف کے نام سے مشہور ہے اس کی وفات ۲۲۶ھ یا ۲۳۵ھ ہوئی ہے۔ اس کے رسوا کُن عقائد ونظریات بیشمار ہیں۔ اُمت کے تمام فرقے حتیٰ کہ معتزلہ بھی اس کو کافر کہتے ہیں۔ معتزلہ کے بڑے بڑے ائمہ نے جیسے "مردار" کے نام سے معروف امام، جبّائی، جعفر بن حرب نے اس کی تکفیر پر مستقل کتابیں لکھی ہیں جن میں اس کو کافر کہنے کے اسباب ووجوہات اور اس کے رُسوا کُن کافرانہ خیالات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اس کے بعد امام عبدالقاہر بھی اس کے کچھ رسوا کُن خیالات بیان فرماتے ہیں:۔

چھٹا رسوا کُن عقیدہ! یہ علّاف کا عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے

---

(۱) الفرق بین الفرق ص ۷۲

معجزات جو جو اس کے دائرہ سے باہر ہیں اور ان کے علاوہ وہ تمام امور جو حسی نہیں ہیں ان کا علم احادیث کے ذریعہ اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک کم از کم بیس آدمی ان کو بیان نہ کریں اُن میں بھی ایک یا ایک سے زیادہ اہل جنت (یعنے معتزلہ) میں سے ضرور ہوں" وہ (بزعم خود) کافروں اور فاسقوں کی خبر کو حجت ہرگز نہیں قرار دیتا اگرچہ ان کی تعداد تواتر کی اس حد تک کیوں نہ پہونچ جائے جن کا جھوٹ بولنے پر اتفاق کر لینا محال ہو جبتک کہ ان میں کم از کم ایک آدمی اہل جنت (یعنے معتزلہ) میں سے نہ ہو۔ ابو الہذیل کا نظریہ ہے کہ چار آدمیوں سے کم کی خبر سے تو کوئی بھی حکم ثابت نہیں ہوتا چار سے اوپر بیس تک کی خبر سے کبھی علم صحیح ہو جاتا ہے کبھی نہیں ہاں بیس آدمیوں کی خبر سے جبکہ ان میں ایک جنتی (معتزلی) بھی ہو، علم صحیح (یقینی) لامحالہ حاصل ہو جاتا ہے۔ بیس آدمیوں کی خبر کے حجت ہونے پر وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استدلال کرتا ہے۔

ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین۔	اگر تم میں سے بیس آدمی ثابت قدم ہوں گے تو وہ دو سو (کافروں) پر غالب آجائیں گے

وہ کہتا ہے بیس آدمیوں کو دو سو کافروں سے لڑنے کی اجازت اسی وجہ سے دی گئی ہے کہ وہ (بیس آدمی) ان پر (دعوت اسلام دینے میں) حجت ہیں۔

اس کے بعد الفرق کے مصنف (امام ابو منصور) فرماتے ہیں کہ امام عبد القادر نے فرمایا ہے:

ابو الہذیل کا مقصد خبر (حدیث) کو حجت ماننے کے لئے بیس راویوں کی تعداد ضروری قرار دینے سے جن میں سے ایک جنتی ضرور ہو صرف یہ ہے کہ احکام شرعیہ سے متعلق تمام احادیث کو ناقابل اعتبار اور اثبات احکام شرعیہ کے فائدے سے عاری بنا دے اس لئے کہ ابو الہذیل نے جو شرط لگائی ہے کہ ان بیس میں ایک جنتی بھی ہو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک فرد مسلک اعتزال میں ہشد تقدیر میں

مقدوراتِ الٰہیہ کے فنا پذیر ہونے میں معتزلی مکتب فکر کا ہم عقیدہ اور ہم مسلک فرد ہو کیونکہ جو شخص اِن عقائد باطلہ کو نہیں مانتا وہ ابو الہذیل کے نزدیک نہ مومن ہے نہ اہل جنت میں سے۔ ابو الہذیل سے پہلے کسی معتزلی نے بھی اس بدعت کو اختراع نہیں کیا کہ کسی حدیث کے حجت ہونے کے لئے بیس راوی جن میں ایک معتزلی ہو ضروری ہیں (۱) (گویا اس نظریہ میں ابو الہذیل معتزلہ کے حلقہ میں بھی منفرد ہے لہٰذا اس کا یہ نظریہ خود اس کے اپنے قول کے اعتبار سے باطل ہے)

نظّامیہ، ابو اسحٰق نظام متوفی ۲۲۰ھ (یا بعد)

اس کے بعد امام عبد القادر فرقہ نظامیہ کا تذکرہ کرتے ہیں جو ابو اسحٰق بن سیار کے پیرو ہیں جو علمی دنیا میں النظام کے نام سے مشہور ہے اور تفصیل سے تبلاتے ہیں کہ نظام کے عقائد میں زندیقوں اور فلسفیوں کے ساتھ اختلاط وارتباط اور میل جول کی وجہ سے فساد کس طرح سرایت کر گیا تھا۔ چنانچہ نظام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام حسی اور مشاہد معجزات سے متعلق روایات کا مثلاً شق قمر (چاند کے دو ٹکڑے ہونا) سنگریزوں کا آپ کے دست مبارک پر تسبیح پڑھنا، آپ کی انگلیوں سے پانی پھوٹ نکلنا وغیرہ سے متعلق تمام روایات کا سرے سے انکار کر دیا تاکہ اس راہ سے وہ آپ کی نبوت کا بھی انکار کر سکے شریعت اسلامیہ کے تمام فروعی احکام ــ عبادات وغیرہ ــ بھی اس کے فلسفہ زدہ مزاج کے ناموافق اور گراں تھے لیکن علانیہ ان کے انکار کی جرأت نہ کر سکا اس لئے اس نے احکام شرعیہ (کا انکار کرنے کے بجائے ان) کو ثابت کرنے والے تمام دلائل کو باطل قرار دیدیا اسی لئے اجماع کے حجت ہونے کا انکار کر دیا اسی طرح فروعی احکام شرعیہ میں قیاس کے حجت ہونے کا انکار کر دیا اور ان تمام احادیث (اخبار آحاد) کے حجت ہونے کا بھی انکار کر دیا جو علم قطعی یقینی کے لئے مفید نہ ہوں (یعنی اخبار آحاد ہوں) پھر جب اسے تمام صحابہ کے فروعی مسائل میں اجتہاد کرنے پر اجماع کا علم ہوا تو اس نے بڑے بڑے صحابہ کرام کے بارے میں ایسی ہرزہ سرائی کی کہ کل (قیامت کے دن) وہ اپنی رسوائی کی داستان (نامہ اعمال) میں ہی پڑھے گا۔ کبار صحابہ کے فتووں کو ہدف طعن وتشنیع بنایا نہ صرف یہ بلکہ اُمت کے تمام ہی فرقوں کے کبار مفتیین کے فتاویٰ پر بھی طعن وتشنیع کے پتھر برسائے عام اس سے کہ وہ اہل رائے

---

(۱) حوالہ سابق ص ۷۷

کے فتوے ہوں یا اہل حدیث کے یا خوارج، شیعہ اور نجاسیہ[1] کے غرض کسی کو نہیں بخشا۔

اس کے بعد امام ابو منصور بغدادی لکھتے ہیں کہ: بیشتر معتزلہ نظام کو کافر قرار دینے پر متفق ہیں اس کے ان گمراہ عقائد کی بجز چند افراد کے عام معتزلہ نے بھی پیروی نہیں کی ان چند افراد میں اسواری، ابن خابط، فضل حدثی اور جاحظ شامل ہیں انھوں نے بھی اس کی بعض بعض گمراہیوں کی مخالفت کی ہے۔ معتزلہ کے اکثر شیوخ اس کی تکفیر کے قائل ہیں چنانچہ ابو الہذیل، جبائی، اسکافی جعفر بن حرب وغیرہ نے تو اس کے گمراہ کن عقائد کے رد میں مستقل کتابیں لکھی ہیں اور اس کو علانیہ کافر قرار دیا ہے

اس کے بعد امام ابو منصور بغدادی نے بھی نظام کے رسوا کن عقائد و نظریات گنانے شروع کئے ہیں چنانچہ سولہویں فضیحت کے ذیل میں نظام کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ خبر متواتر اگرچہ اس کے نقل کرنے والے اس خبر کو سننے والے کے نزدیک کتنے ہی ان گنت کیوں نہ ہوں اور اگرچہ ان کے عزائم و مشاغل کیسے ہی مختلف کیوں نہ ہوں اور ان کے محرکات چاہے کتنے ہی الگ الگ کیوں نہ ہوں، پھر بھی وہ خبر جھوٹی ہو سکتی ہے حالانکہ دوسری طرف اسکا قول یہ بھی ہے کہ اخبار آحاد میں بعض خبریں ایسی بھی ہوتی ہیں جو علم الیقین کے لئے موجب ہوتی ہیں

نظام کے اس نظریہ کی بنا پر معتزلہ کے ساتھ ساتھ ہمارے ائمہ نے بھی اس کی تکفیر کی ہے۔ اس کے بعد سترہویں فضیحت کے ذیل میں لکھتے ہیں: نظام کا یہ بھی نظریہ تھا کہ ہر زمانہ میں بھی اور اسی طرح تمام زمانوں (پوری تاریخ اسلام) میں بھی رائے اور اجتہاد کے اعتبار سے امت خطا اور غلطی پر ہو سکتی ہے اس نظریہ کے تحت بطور نتیجہ لازم آتا ہے کہ وہ کسی بھی ایسی بات کو قابل اعتماد نہ مانے جس پر امت متفق ہو چکی ہو اس لئے کہ اس کے مفروضہ کی بنا پر اس میں غلطی کا امکان ہے۔ اور چونکہ احکام شرعیہ اپنے ماخذ کے اعتبار سے مختلف ہیں بعض احکام مسلمانوں نے اخبار متواترہ سے اخذ کئے ہیں اور بعض اخبار آحاد سے اور بعض احکام پر امت کا اجماع ہے اور بعض احکام اجتہاد و قیاس

---

(۱) یہ لوگ حسین بن محمد نجار کے پیرو تھے یہ نجار بشر مریسی کے رفقاء میں سے ہے اس نے نظام سے مناظرہ کیا مگر کامیاب نہ ہوا اور اسی صدمہ سے مر گیا ۲۳۰ھ۔ یہ فرقہ کچھ عقائد میں اہل سنت کے موافق تھا اور کچھ میں قدریہ کا ہم خیال تھا اور کچھ عقائد میں یہ لوگ منفرد تھے۔ الفرق ص ۱۲۶۔

سے اخذ واستنباط کئے ہیں (یہی چار ادلہ شرعیہ ہیں) اور نظام تواتر کی حجیت کا بھی انکار کر چکا اور اجماع کے حجت ہونے کا بھی منکر ہے اور قیاس کو بھی باطل قرار دے دیا اور خبر واحد بھی جب علم ضروری (یقینی) کے لئے مفید نہ ہو تو باطل ہے اس طرح گویا وہ تمام فروعی احکام شرعیہ کے ماخذوں (اور دلائل) کو باطل قرار دے کر پوری شریعت ہی کو باطل قرار دینا چاہتا تھا۔

اکیسویں فضیحت کے ذیل میں امام ابومنصور بغدادی لکھتے ہیں: ان گمراہ کن نظریات وعقائد کے علاوہ جن کا ہم نے ذکر کیا نظام نے تمام صحابہ اور تابعین کی طرف منسوب اخبار واحادیث کو یہ کہکر ہدف طعن وتشنیع بنایا ہے کہ یہ (دراصل) انھوں نے اپنے اجتہاد سے فتوے[۵] دیئے ہیں چنانچہ جاحظ نے اپنی کتاب المعارف میں اور ایک دوسری کتاب میں جو الفتیا کے نام سے مشہور ہے، بیان کیا ہے کہ نظام نے تمام محدثین پر حضرت ابوہریرہ کی احادیث روایت کرنے کی بنا پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور اس نے دعویٰ کیا ہے کہ ابوہریرۃ اعلیٰ درجہ کے جھوٹے تھے (۱) حضرت عمر کو بھی نظام نے نہیں بخشا ان پر الزام لگایا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر حضرت عمر کو اپنے دین (کی حقانیت) میں شک تھا اسی طرح حضرت عمر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے وقت بھی شک میں گرفتار تھے (بالفاظ دیگر حضرت عمر کا ایمان سطحی تھا اور شکوک وشبہات میں ہمیشہ گرفتار رہے) تیسرے یہ کہ حضرت عمر ان لوگوں میں سے تھے جو (غزوہ خیبر سے واپسی پر) "عقبہ" کی شب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئے تھے چوتھے یہ کہ حضرت عمر نے حضرت فاطمہ کو مارا پیٹا تھا اور رسول کی میراث کا انکار کیا تھا۔ نظام نے حضرت عمر پر نصر بن الحارث کو مدینہ سے شہر بدر کر دینے پر بھی پھبتی لے دی کی ہے۔ نظام کہتا ہے کہ حضرت عمر نے ہی نماز تراویح کی بدعت اختراع کی تھی اور حج میں "تمتع" کرنے سے منع کیا تھا اور موالی (عجمی النسل آزاد کردہ غلام) کو عرب عورتوں سے نکاح کرنے سے منع کر دیا تھا۔

---

[۵] بالکل یہی بات مشہور مستشرق گولڈزیہر نے کہی ہے۔ مترجم

(۱) اس کی تردید ہم آئندہ فصل میں جو ہم نے استاذ احمد امین کے رد میں لکھی ہے بیان کریں گے اس لئے کہ استاذ احمد امین نے ابوہریرہ کے سلسلہ میں متقدمین میں سے نظام کی اور دور حاضر میں مستشرقین کی رائے کا ہی سرقہ کیا ہے۔ مترجم

حضرت عثمان غنی بھی نظام کی طعن و تشنیع سے نہ بچ سکے چنانچہ اس نے حضرت عثمان پر حسب ذیل اعتراضات کئے ہیں۔

(۱) حضرت عثمان نے حکم بن العاص کو (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت کے باوجود) مدینہ میں پناہ دی (۲) ولید بن عقبہ (جیسے شرابی) کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا جس نے نشہ کی حالت میں لوگوں کو نماز تک پڑھائی (۳) سعید بن العاص کے نکاح پر چالیس ہزار درہم سے اس کی مالی امداد کی (۴) نظام کا دعویٰ ہے کہ حضرت عثمان نے چراگاہیں اپنے لئے مخصوص کرلی تھیں[۱]۔

اس کے بعد حضرت علی پر نظام کے اعتراضات کا ذکر کیا ہے، نظام کہتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی سے دریافت کیا گیا: ایک گائے نے ایک گدھے کو مار ڈالا (اس کا کیا حکم ہے) حضرت علی نے فرمایا: اس مسئلہ میں (نص تو کوئی ہے نہیں) میں اپنی رائے سے فیصلہ کرتا ہوں اس پر نظام کہتا ہے: حضرت علی اپنی رائے سے فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں؟

حضرت عبداللہ بن مسعود پر بھی نظام نے متعدد اعتراضات کئے ہیں چنانچہ ابن مسعود نے بروع بنت واشق کی حدیث میں فرمایا تھا: میں اپنی رائے سے فیصلہ دیتا ہوں اگر وہ ٹھیک ہو تو سمجھو اللہ کی طرف سے ہے اور غلط ہو تو سمجھنا یہ میری طرف سے ہے (ابن مسعود کو اپنی رائے سے فیصلہ کرنے کا حق کس نے دیا) حضرت ابن مسعود نے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث روایت کی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: نیک بخت وہ ہے جو اپنی ماں کے پیٹ سے ہی نیک بخت ہوتا ہے اور بدبخت وہ ہے جو اپنی ماں کے پیٹ سے ہی بدبخت ہوتا ہے" نظام کہتا ہے ابن مسعود کی یہ حدیث بالکل جھوٹ ہے۔ اسی طرح ابن مسعود کی شق قمر کی حدیث اور لیلۃ الجن سے متعلق جنوں کی حدیث کی بھی نظام تکذیب[۲] کرتا ہے (کہ یہ ابن مسعود کا جھوٹ ہے)

---

[۱] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر مودودی کے اعتراضات یہی نظام ہی کا مال مسروقہ ہیں۔

[۲] یہاں یہ سوال پیدا ہوتا کہ جبکہ معتزلہ اور ان کی ذریت مستشرقین و مستغربین (استشراق زدہ مسلمانوں) کے نزدیک تمام احادیث خواہ متواتر ہوں خواہ آحاد ناقابل استدلال ہیں تو صحابہ اور تابعین پر انہی احادیث کے ذریعہ الزامات عائد کر کے ان کی نیتوں پر حملے کرنے کے لئے وہی احادیث حجت کیسے بن سکتی ہیں؟ ان کو چاہیئے کہ وہ خلفاء راشدین اور کبار صحابہ پر جو بہتان لگا رہے ہیں اس کا قطعی اور یقینی ثبوت پیش کریں (باقی صفحہ ۴۱۴ پر)

اس کے بعد نظام اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ جن صحابہ نے شرعی مسائل میں اپنی رائے سے فیصلے دیئے ہیں اس کی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں (۱) ایک یہ کہ انھوں نے گمان کیا ہو کہ یہ اجتہاد سے فیصلے کرنا ان کے لئے جائز ہے اور وہ اس حقیقت سے جاہل رہے ہوں کہ شرعی فتاویٰ میں رائے سے فیصلے کرنا اُن پر حرام ہے (۲) دوسرے یہ کہ شرعی احکام میں اختلاف کا ذکر کرنے سے ان کا مقصد یہ ہو کہ وہ دین میں اختلاف پیدا کر دیں اور (اس کے نتیجے میں ان کو مختلف مذاہب کی سربراہی کا اعزاز حاصل ہو اس لئے انھوں نے اپنی رائے سے فیصلے کرنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ نظام کہتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی اغراض و خواہشات کو دین پر ترجیح دیتے تھے (۱)

اس کے بعد امام ابو منصور بغدادی فرماتے ہیں (۲) نظام نے صحابہ کرام کی طرف جہل اور نفاق کو بھی منسوب کیا ہے (یعنی جاہل اور منافق کہا ہے) اس کے معنی یہ ہیں کہ نظام کے نظریہ کے مطابق تمام صحابہ العیاذ باللہ مخلد فی النار ہوں گے (یعنے ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے) کیونکہ نظام کے نظریہ کے مطابق جو شخص احکام دین سے جاہل ہو وہ کافر ہے اور جو شخص جان بوجھ کر بلا دلیل اختلاف کرے وہ کافر ہے یا فاسق ہے اور معتزلہ کے عقیدہ کے مطابق یہ دونوں مخلد فی النار ہیں۔

نظام کے متعلق یہ بیان ابو منصور بغدادی کا ہے، شہرستانی متوفی ۵۴۸ھ نے اپنی کتاب الملل والنحل میں ان میں سے اکثر امور کی تائید کی ہے۔

اس بحث و تنقیح کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ فتنہ (خانہ جنگی) کے بعد سے صحابہ کرام کے بارے میں معتزلی مکتب فکر متعدد فرقوں میں بٹ گیا ہے (۱) بعض فرقوں کی نظر میں ان کی عدالت مشکوک

(بقیہ صفحہ ۴۱۰) دراصل یہ لوگ اپنی اغراض کا منشہ (دین سے گلو خلاصی) کے تحت صحابۂ تابعین اور کبار محدثین کو مطعون کرنا اور تمام ذخیرہ احادیث کو ناکارہ بنانا چاہتے ہیں اگرچہ اس مقصد کے لئے انہیں کیسی ہی گری پڑی حدیث یا افسانوی روایت ہی کا سہارا کیوں نہ لینا پڑے کس قدر قابل شرم و رسوائی ہے یہ حرکت کہ اپنے بلند بانگ دعووں کو ثابت کرنے کے لئے انہی حدیثوں اور روایتوں سے یہ لوگ کام لیتے ہیں جن کے حجت اور قابل استدلال ہونے کے منکر ہیں ؟! بالکل یہی بات مستشرقین کے پیر و مرشد گولڈ زیہر نے اپنی کتاب العقیدۃ والشریعہ میں کہی ہے ۱۲ مترجم (۱) الفرق بین الفرق ص ۸۹ - ۹۰ (۲) ۱۹۲

تھی جیسے واصل بن عطا اور اس کے متبعین (۲) بعض فرقے ان کے فاسق وفاجر ہونے پر یقین رکھتے تھے جیسے عمرو بن عبید اور اس کے پیرو (۳) کچھ فرقے صرف بڑے بڑے صحابہ کو ہدف طعن و تشنیع بناتے ہیں اور ان پر جھوٹ، جہالت اور نفاق کے الزامات لگاتے ہیں جیسے نظام اور اس کے متبعین اسی بنا پر موخر الذکر یعنے واصل بن عطاء اور عمرو بن عبید اور ان کے تمام متبعین ان صحابہ کرام کے واسطہ سے جتنی احادیث مروی ہیں ان کا رد کرنا واجب و لازم سمجھتے ہیں (۴) اسی طرح ابو ہذیل کے نزدیک اخبار آحاد سے کوئی حکم شرعی ثابت نہیں ہو سکتا جب تک اس کو بیس صحابی روایت نہ کریں جن میں ایک جنتی یعنی معتزلی ہونا ضروری ہے (۵) نظام (نہ صرف اخبار آحاد بلکہ) اجماع اور قیاس کے حجت ہونے اور حدیث متواتر کے قطعی ہونے کا بھی منکر ہے۔

سنت کے بارے میں معتزلہ کے اس انتہا پسندانہ رویہ اور عام مسلمانوں کے برعکس متضاد توقف کو، علماء سنت اور معتزلہ کے درمیان اختلافات میں شدت و حدت پیدا کر دینے میں بہت بڑا دخل ہے اس نزاع و شقاق کے نتیجہ میں دونوں گروہ ایک دوسرے پر تہمتوں اور بہتانوں کے تیر برسانے لگے معتزلہ نے محدثین پر جھوٹی اور بے اصل حدیثیں روایت کرنے اور گھڑنے کا الزام لگایا اور کہا کہ یہ لوگ تو بس حدیثوں کی پوٹ ہیں جو روایت کرتے ہیں اس کو سمجھتے تک نہیں اور اس سلسلہ میں ایسی عجیب وغریب داستانیں بیان کرنی شروع کیں جو عوام کے متعلق تو ممکن ہے صحیح ہوں لیکن کبار محدثین کے متعلق تو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتیں(۱) اسکے مقابلہ میں اہل حدیث نے ائمہ معتزلہ پر فسق وفجور اور دین میں نئی نئی بدعتیں گھڑنے اور اپنی رائے سے عقائد اختراع کرنے کے الزامات لگانے شروع کر دیئے

چنانچہ ابن قتیبہ نے اپنی کتاب تاویل مختلف الحدیث میں اور امام ابو منصور بغدادی نے اپنی کتاب الفرق بین الفرق میں نظام کے متعلق نقل کیا ہے کہ نظام کے نزدیک کنایہ سے طلاق واقع نہیں ہوتی نیز یہ کہ جس شخص نے "ظہار" میں اپنی عورت کے پیٹ یا شرمگاہ کا ذکر کیا اس سے ظہار نہیں ہوتا نیز یہ کہ محض نیند سے وضو نہیں ٹوٹتا جب تک اس کے ساتھ حدث نہ واقع ہو نیز یہ کہ جس شخص نے عمداً فرض نماز چھوڑ دی اس کی نہ قضا درست ہے اور نہ اس پر قضا واجب ہے۔ ابن قتیبہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ نظام ایک شرابی کبابی اور آوارہ مزاج آدمی تھا صبح شام شراب کے نشہ میں دھت رہتا تھا نظام نے ہی شراب کی شان میں یہ اشعار کہے ہیں۔

---

(۱) امام ابوحنیفہ پر بحث کے ذیل میں ہم اس کے نمونے پیش کریں گے۔

ما زلت آخذ روح الزق في لطف	مشکیزہ کی روح (شراب) میں مزے لے لیکر لیتا رہا (پیتا رہا)
واستبيح دما من غير مذبوح	اور بغیر ذبح کئے خون (بادہ احمر) کو میں نے حلال کر لیا ہے
حتى انثنيت ولي روحان في بدن	یہاں تک میں نشہ سے مست ہو گیا اور اب میرے جسم میں دو روحیں موجود ہیں
والزق مطرح جسم بلا روح	اور مشکیزہ ایک جسم بے روح میرے سامنے پڑا ہے (۱)

ثمامہ بن اشرس جس نے خلیفہ مامون الرشید کے زمانہ میں اسلامی تاریخ کے سب سے بڑے فتنہ تحریک خلق قرآن کی قیادت کی تھی ابن قتیبہ نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جمعہ کے دن ثمامہ نے لوگوں کو جامع مسجد کی طرف اس اندیشہ کی وجہ سے کہ نماز فوت نہ ہو جائے دوڑتے ہوئے دیکھا تو یہ دیکھکر ثمامہ نے اپنے ایک ساتھی سے کہا: "ذرا ان گدھوں اور بیلوں کو تو دیکھو کیسی دوڑ لگا رہے ہیں۔" اس کے بعد خبیث کہتا ہے: اس عربی نے لوگوں کے ساتھ کیا کیا؟" (۲) عربی سے اس خبیث کی مراد سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔

بہر حال واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ابن قتیبہ اور ابو منصور البغدادی نے معتزلہ کے اماموں کے متعلق جو کچھ کہا ہے اگرچہ وہ ایک مخالف کا بیان ہے اپنے مخالف فریق کے متعلق۔ تاہم یہ بیان فی الجملہ درست ہے کیونکہ معتزلہ کے بڑے بڑے اماموں میں بھی دینداری کا فقدان نظر آتا ہے نیز وہ بعض محرمات شرعیہ کے ارتکاب سے بھی نہیں بچتے تھے۔ چنانچہ جاحظ جو معتزلہ کے ائمہ میں شمار ہوتا ہے اپنی کتاب المضاحک میں لکھتا ہے کہ ایک دن مامون گھوڑے پر سوار جا رہا تھا راستہ میں اس نے ثمامہ کو نشہ میں مست زمین پر لوٹتے ہوئے دیکھا تو مامون نے حیران ہو کر کہا: ارے ثمامہ! تو ثمامہ بولا: جی ہاں بخدا! تو مامون نے کہا: تجھے شرم نہیں آتی؟ ثمامہ نے جواب دیا: نہیں خدا کی قسم نہیں آتی۔ اس پر مامون نے کہا: تجھ پر خدا کی لعنت ثمامہ بولا: لعنت صد لعنت۔ اسی ثمامہ کے متعلق روایت ہے کہ ایک دن ثمامہ کے غلام نے کہا: اٹھ جائیے نماز پڑھ لیجیے، ثمامہ نے سنی ان سنی کر دی تو غلام نے پھر کہا: وقت تنگ ہو گیا ہے اٹھئے نماز پڑھ لیجئے پھر آرام کیجئے ثمامہ بولا: آرام تو مجھے جب ملے جب تم میرا پیچھا چھوڑ دو (۳)

---

(۱) تاویل مختلف الحدیث ص ۲۱۔ (۲) حوالہ سابق ص ۹۰ (۳) الفرق بین الفرق ص ۱۰۴

حقیقت کچھ بھی ہو بہرحال دونوں فریقوں کے درمیان نزاع وجدال روز بروز بڑھتا رہا یہانتک کہ ۲۱۸ھ میں تاریخ اسلام کا سب سے بڑا فتنہ خلق قرآن پھوٹ پڑا عباسی خلیفہ مامون الرشید بذات خود اس فتنہ کا زبردست علمبردار تھا، عباسی حکومت سرکاری طور پر مسلمانوں کو اپنے معتقدات کے خلاف اعتقاد رکھنے پر مجبور کرنے لگی۔ اس فتنہ کے زمانہ میں محدثین ہی کو دین کی حمایت اور دفاع کا امتیازی مقام حاصل تھا۔

جبکہ یہ لوگ ان کے پیچھے پڑ گئے تھے ان کے خلاف (عوام کو خوب) بھڑکایا (خود ان کو طرح طرح کی) دھمکیاں دیں ایذائیں پہونچائیں بلکہ قید و بند اور دار و رسن میں بھی کوتاہی نہ کی امام حدیث و سنت امام احمد بن حنبل (جیسی مسلم اور بزرگ ہستی) کا تیرہ سال تک قید و بند اور مار پیٹ کے مصائب اور ایذارسانیاں جھیلنے پر مجبور رہنا (محدثین کی) اُن تکالیف اور ایذارسانیوں کا بیّن ثبوت ہے جو علماءِ حدیث کو اس فتنہ کے دوران اُٹھانی پڑی ہیں آخر خدا خدا کر کے ۲۳۲ھ متوکل باللہ عباسی خلیفہ سریر آرائے خلافت ہوا تو اس نے حکومتی سطح پر اہل سنت اور علماءِ حدیث کی جانب اپنے میلان کا اظہار کیا (اور معتزلہ کا زور توڑا) اور علماءِ حدیث اور عوام کو اس آزمائش و مصیبت سے نجات دی اور محدثین کے مرتبہ اور مقام کو بلند کیا اور معتزلہ کی چیرہ دستیوں کا خاتمہ کیا یہاں تک کہ اس کے بعد معتزلہ کو تاریخ اسلام میں کوئی قابل ذکر مقام و منصب اور اقتدار میسر نہ آسکا۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان دونوں گروہوں کی اس طویل نظریاتی جنگ، باہمی خصومت و نزاع اور مذہبی کش مکش کے نتیجہ میں سنت کو دو انتہائی سخت نقصان پہونچے۔

(۱) اوّل یہ کہ صحابہ کرام کی صداقت و دیانت کے اعلیٰ و ارفع مقام و منصب کے محکم حصار میں ائمہ معتزلہ کی افتراء پردازیوں اور بہتان تراشیوں نے ایسے خطرناک رخنے ڈالدیئے کہ ان سوراخوں کی راہ سے متعصب اور اعداءِ اسلام مستشرقین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس صحابہ اور دین کے محافظ و مبارک ہستیوں کے محفوظ قلعہ میں گھس جانے کے مواقع ہاتھ آگئے اور انھوں نے (انتہائی بیباکی سے) صحابہ کرام پر جھوٹ بولنے اور اللہ کے دین کے ساتھ کھیل کرنے کے الزامات (دل کھول کر) لگائے اور اس سلسلہ میں نظّام اور اس جیسے بے دین لوگوں نے جو صحابہ پر الزامات لگائے تھے اور ان کے منصب و مقام پر جو زبان درازیاں کی تھیں ان کو بطور ثبوت پیش کیا۔ بدقسمتی سے

ہمارے زمانہ کے بعض مسلمان اہل قلم بھی انہی دشمنان اسلام کے نقش قدم پر چل پڑے۔ آئندہ باب میں ہم اس سلسلہ میں استاذ احمد امین مصری کی کارگذاریاں وضاحت کے ساتھ پیش کریں گے

(۲) دوم یہ کہ معتزلہ عام طور پر فقہ میں امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب (تلامذہ) کے مذہب کے پیرو ہوتے تھے۔ بشر مریسی جو اپنے زمانہ میں معتزلہ کے اندر سب سے بلند مقام کا مالک تھا اس کے متعلق لوگوں نے بیان کیا ہے کہ وہ فقہ میں امام ابو یوسف کا متبع تھا لیکن جب اس نے خلق قرآن کے مسئلہ میں اپنے معتزلی عقائد کا اعلان کیا تو امام ابو یوسف نے اس سے قطع تعلق کر دیا (۱)

لہٰذا معتزلہ اور اہل سنت کے درمیان جب اس نظریاتی جنگ اور مخالفت و منازعت کا سلسلہ زور پکڑ گیا تو محدثین نے ہر اس شخص کو جو خلق قرآن کا قائل ہو مجروح و مطعون کرنا شروع کر دیا اس عداوت و خصومت نے بعض غالی محدثین کو اس حد تک پہونچا دیا کہ انھوں نے امام ابو حنیفہ کے بہت سے اصحاب (تلامذہ) کو بھی مجروح و مطعون کرنا شروع کر دیا صرف اس بنا پر کہ وہ غیر منصوص مسائل شرعیہ میں (معتزلہ کی طرح) اجتہاد سے فیصلے کرتے تھے ان ناکردہ گناہ اصحاب امام ابو حنیفہ کا اس کے سوا اور کوئی گناہ نہ تھا کہ فقہی مسائل میں امام ابو حنیفہ کا مذہب ان کے مخالفین یعنی معتزلہ نے اختیار کیا ہوا تھا بڑھتے بڑھتے نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ ان محدثین کے نقش قدم پر چلنے والے نام نہاد محدثین کی زبان درازیوں سے خود امام ابو حنیفہ بھی نہ بچ سکے چنانچہ انھوں نے امام ابو حنیفہ کی طرف بھی خلق قرآن کے عقیدہ کو منسوب کر دیا (۲) حالانکہ ثقہ اور محتاط محدثین و مورخین کے بیانات سے جو حقیقت امام ابو حنیفہ کے متعلق پایۂ ثبوت کو پہونچی ہے وہ بالکل اس کے خلاف ہے (کہ امام ابو حنیفہ خلق قرآن کے ہرگز قائل نہ تھے) امام محمد بن حسن الشیبانی فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص نے کسی معتزلی امام کے پیچھے نماز پڑھ لی ہے اپنی نماز لوٹانی چاہیئے۔

امام ابو یوسف سے معتزلہ کے متعلق دریافت کیا گیا (کہ معتزلہ مسلمان ہیں یا کافر) تو

---

(۱) الفرق بین الفرق ص ۱۲۴ (۲) تانیب الخطیب ص ۵۲

انھوں نے جواب دیا: معتزلہ تو زندیق ہیں (بے دین ہیں) (۱)

غرض اس نظریاتی جنگ کے تیروں نے ایک ایسے گروہ کو بھی طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جو اس جنگ میں مطلق شریک نہ تھے۔

بالکل ممکن تھا کہ یہ فتنۂ اعتزال اتنی شدت اختیار نہ کرتا اگر بنو عباس کے تین خلیفہ اس آگ کی چنگاریوں کو ہوا نہ دیتے۔ سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے پہلے بھی اور بعد میں (جو ہوا وہ بھی اور جو نہ ہوا وہ بھی)۔

---

(۱) الفرق بین الفرق ص ۱۰۳

چھٹی فصل

سنّت کے ساتھ عہد حاضر کے بعض اہل قلم کا روّیہ

اس سے قبل ہم سنت سے متعلق بعض اسلامی فرقوں کے شکوک و شبہات اور دورِ حاضر کے ایک معاصر مصنف کے شبہات اور حجیت سنت سے انکار کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہ انداز تحقیق سنت پر یلغار کا ایک اور ہی انداز ہے جس کو (بد قسمتی سے) مسلمانوں ہی کا ایسا گروہ انجام دے رہا ہے جنہیں مستشرقین کا شرف تلمذ حاصل ہے (اور انہی کے زیر تربیت انکا ذہن و فکر پروان چڑھا ہے)

سنت پر یورش کی (اس قسم کی خصوصیت یہ ہے کہ) یہ قسم اتنی واضح اور بے نقاب نہیں ہے، جتنی مستشرقین کے افکار و نظریات کی یورش اب سے پہلے کھل کر سامنے آچکی ہے بلکہ اس یلغار کے چہرہ پر علم و تحقیق (سائنٹیفک ریسرچ) کا نقاب پڑا ہوا ہے۔ یہ نئی یورش کھل کر میدان میں آنے سے بچتی ہے دسیسہ کاری اور فریب کاری کو (علانیہ حملے کرنے پر) ترجیح دیتی ہے مکاری اور روباہ بازی میں اس کو بڑا کمال حاصل ہے تاکہ عام مسلمانوں کے دینی جذبات ان مصنفین و مولفین کے خلاف مشتعل نہ ہوں۔[1]

---

[1] سنت کے خلاف سامراجی حکومتوں، عیسائی مشنریوں اور یہودی مستشرقین کی یہ ایک سوچی سمجھی (باقی صفحہ ۴۱۸ پر)

ہم آئندہ چل کر ثابت کریں گے کہ سنت کے خلاف یورش کا یہ رنگ (جس کو یہ لوگ عوام کو مرعوب کرنے کی غرض سے علمی تحقیق یا سائنٹیفک ریسرچ کہتے ہیں) اپنے اثر کے اعتبار سے کتنا خبیث اور نتائج کے اعتبار سے کس قدر مضرت رساں اور سنت کے خلاف حربہ ہونے کی حیثیت سے کتنا قوی اور خطرناک حربہ ہے۔ اللہ سے ہی ہم مدد چاہتے ہیں (کہ وہ سنت کے خلاف اس جدید محاذ پر بھی ہمیں کامیابی عطا فرمائے) وہی ہمارے لئے کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔

دور حاضر کے ان (استشراق زدہ) اہل قلم مصنفین میں جنہوں نے یہ پُرفریب طریق کار اختیار کیا ہے استاذ (پروفیسر) احمد امین مصری کا نام سرِ فہرست ہے آپ دارالقضاء الشرعی کے فارغ التحصیل اور سند یافتہ تھے کلیۃ الآداب کے سابق عمید (پرنسپل) تھے، آپ نے تاریخ اسلام پر فجر الاسلام، ضحی الاسلام اور ظہر الاسلام کے ناموں سے تین کتابیں تالیف کی ہیں۔

آپ نے فجر الاسلام میں الحدیث کے عنوان سے سنت و حدیث پر بحث کی ہے، جس میں ہر کو تنکر میں لپیٹنے اور حق کو باطل کے ساتھ خلط کرنے کی انتہائی پرفریب کوشش کی ہے۔ اس لئے اب میں

(بقیہ حاشیہ ۴۱۷) سازش ہے جس کے اختیار کرنے پر یہ لوگ اس وقت کمربستہ ہوئے جبکہ ان کے خلاف مسلمانوں کے دینی اور ملی جذبات اسقدر مشتعل اور ان کی تصانیف سے اس قدر متنفر ہو گئے کہ اسلام سے متعلق ان کی لکھی ہوئی ہر تصنیف کو مسلمان یہ کہکر ردی کی ٹوکری میں پھینک دینے کے عادی ہو گئے کہ: "یہ مستشرقین تو سامراجی حکومتوں اور عیسائی مشنریوں کے ایجنٹ ہیں اسلام کے خلاف زہر اگل کر یہ اپنی روزی حلال کرتے ہیں"۔ تب ان سامراجی حکومتوں اور عیسائی مشنریوں نے مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں میں مشرقی علوم کے شعبے کھولنے کا فیصلہ کیا تاکہ اپنے زیر اثر اسلامی ممالک کے مسلمان طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کا سبز باغ دکھا کر اور گرانقدر تعلیمی وظائف کا لالچ دے کر مغربی ممالک اور یورپین سوسائٹی میں کم از کم چار سال ان یہودی مستشرقین کی زیر تربیت رکھیں اور ان کے نوخیز ذہنوں اور انداز فکر کو استشراقی سانچہ میں ڈھال کر "مسلمان مستشرقین" پیدا کریں اور وہ مسلمان اپنے ملکوں میں جا کر علمی تحقیق کے پُرفریب نام سے دانستہ یا نادانستہ طور پر اسلام کی بیخکنی کریں یعنی وہ کام کریں جو مستشرقین نہیں کر سکے۔ جیسا کہ خود مصنف علیہ الرحمہ اپنی اسی کتاب کے مقدمہ میں مستشرقین یورپ سے ایک ملاقات کے عنوان سے مفصل طور پر بیان کر چکے ہیں۔ مترجم۔

بھی آستینیں چڑھا کر میدان میں آتا ہوں اور اس سلسلہ میں اوّل میں اسلامی حقائق میں ان کی تحریفوں کا اور راہ حق سے فرار وگریز کے کرشموں کا اور ان ناپاک اور شرمناک حملوں کا جو انھوں نے بعض کبار صحابہ وتابعین کی مقدس ہستیوں پر کئے ہیں خلاصہ بیان کرتا ہوں اور پھر ان کی پول کھولتا ہوں۔

کتاب فجر الاسلام کی فصل الحدیث کا خلاصہ

پروفیسر احمد امین مصری نے اپنی کتاب فجر الاسلام میں الحدیث کے عنوان سے ایک علیحدہ فصل میں خصوصیت کے ساتھ حدیث پر مستقل بحث کی ہے جو تقریباً بیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس فصل میں انھوں نے سنت اور اس کی تدوین کی تاریخ سپرد قلم کرنے کا قصد کیا ہے چنانچہ ابتداء میں انھوں نے شریعت میں سنت کے معنی اور تشریع اسلامی میں اس کے مرتبہ اور مقام سے بحث کی ہے، اس کے بعد انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ حدیث نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد مبارک میں مدون بالکل نہیں ہوئی، بلکہ بعض صحابہ بطور خود محض اپنے یاد کرنے کے لئے حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے۔

اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خود صحابہ کے بھی روایت حدیث کے بارے میں دو گروہ ہوگئے تھے ایک گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حدیثیں روایت کرنے کو برا سمجھتا تھا نہ صرف یہ بلکہ ہر راوی حدیث سے اس کی روایت کی صحت پر دلیل کا مطالبہ کرتا تھا۔ اس کے برعکس دوسرا گروہ کثرت سے حدیثیں روایت کرتا تھا (نہ صرف یہ بلکہ زیادہ سے زیادہ حدیثیں امت تک پہونچانے کو اپنا فرض سمجھتا تھا)

اور حدیث کے کسی ایک کتاب میں مدون نہ ہونے اور رواۃ حدیث کے اپنی یادداشت پر اعتماد کرنے کی وجہ سے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے کثرت سے حدیثیں گھڑنے اور آپ پر جھوٹ بولنے کا آغاز ہوا ہے (گویا اس کی ذمہ دار العیاذ باللہ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی کوتاہی ہے)

پروفیسر احمد امین نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ پر جھوٹ بولنے کی ابتداء آپ کے زمانہ میں ہی اور آپ کی وفات سے پہلے ہو چکی تھی اسی سلسلہ میں وہ اس طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ مختلف ملکوں اور قوموں کے افراد کا اسلام میں داخل ہونا بھی وضع حدیث کے بارے میں بے حد

اثر انداز ہوا ہے جس کے نتیجہ میں حدیثوں کی تعداد کی کثرت اس حد تک پہونچ گئی کہ امام بخاری نے اپنے زمانہ میں شائع اور متداول چھ لاکھ حدیثوں میں سے اپنی کتاب صحیح بخاری میں درج کرنے کے لئے صرف ڈھائی ہزار صحیح حدیثوں کو انتخاب کیا ہے۔

اس کے بعد مصنف موصوف نے ان اہم ترین (تاریخی) امور کا ذکر کیا ہے جو وضع حدیث کے محرک اور سبب بنے ہیں۔ جن سے ہم اس کتاب کی گذشتہ فصلوں میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ اور بتلاتے ہیں کہ اسی وجہ سے لوگوں نے حدیث سے اعراض کرنے میں اتنا غلو اختیار کر لیا تھا کہ وہ بجز اس حدیث کے جس کا کتاب وسنت سے نہایت محکم تعلق ہو اور کسی حدیث کو قبول ہی نہیں کرتے تھے، اور اس بحث کو علماء حدیث کی ان عظیم مساعی کے ذکر پر ختم کرتے ہیں جو انھوں نے وضع حدیث کا مقابلہ کرنے میں انجام دیں۔ اور اسی سلسلہ میں اس اعتراض کا بھی ذکر کیا ہے جو علماء حدیث پر کیا جاتا ہے کہ انھوں نے سند کو پرکھنے کا جس شدت سے اہتمام کیا ہے اس کا عشر عشیر بھی متن کی چھان بین میں اہتمام نہیں کیا۔

اس کے بعد مصنف نے سب سے زیادہ حدیثیں بیان کرنے والے صحابہ (مکثرین) کا ذکر کیا ہے اور اس سلسلہ میں وہ سب سے پہلے حضرت ابو ہریرہ کا نام لیتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ:۔

(۱) ابوہریرہ حدیثیں لکھتے نہ تھے بلکہ وہ اپنی یادداشت سے حدیثیں روایت کیا کرتے تھے (۲) اور یہ کہ وہ ایسی احادیث بھی بکثرت روایت کیا کرتے تھے جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بالمشافہ اور براہ راست نہیں سنی ہوتی تھیں (۳) اور یہ کہ اسی لئے بعض صحابہ ان کی حدیثوں میں شک کیا کرتے تھے اور ان کی حدیثوں کے پرکھنے میں بڑی سختی برتتے تھے۔

اس کے بعد مؤلف موصوف نے اس فصل کو ان تاریخی اَدْوَار کے بیان پر ختم کیا ہے جن میں تدریجاً سنت کی تدوین ہوتی رہی جس کا سلسلہ امام بخاری، امام مسلم اور کتب ستہ کے دیگر مصنفین پر منتہی ہوا ہے

ایک ضروری تنبیہ یہ ہے کتاب فجر الاسلام کی فصل الحدیث کا خلاصہ جو صفحہ ۲۵۵ سے ۲۷۴ تک تقریباً بیس صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس فصل پر تفصیلی تنقید شروع کرنے سے پہلے میں یہ بات جتلا دینا چاہتا ہوں کہ استاذ احمد امین مرحوم کا نظریہ سنت کے متعلق (سب کو معلوم) اور مشہور و معروف ہے، ہوا یہ کہ اتفاق سے مصر میں ایک نام نہاد مسلمان ملحد اسمٰعیل ادھم

نے ۱۳۵۳ھ میں تاریخ سنت کے موضوع پر ایک رسالہ شائع کیا جس میں اُس نے برملا اعلان کیا کہ :-

"حدیث کا یہ گراں قدر سرمایہ جو ہمارے سامنے موجود اور کتب صحاح ستہ میں محفوظ ہے نہ صرف یہ کہ اس کی عمارت محکم بنیادوں اور ستونوں پر قائم نہیں بلکہ مشکوک و مشتبہ بھی ہے اور موضوع (من گھڑت) ہونے کے آثار اُن پر نمایاں ہیں۔"

اس رسالہ کے شائع ہوتے ہی مصر کے علمی حلقوں میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور اس کے خلاف شدید غم و غصہ کا اظہار کیا گیا نوبت یہاں تک پہنچی کہ مشائخ ازہر کے مطالبہ پر مصری حکومت اس رسالہ کو ضبط کرنے اور اس کی اشاعت کو خلاف قانون قرار دینے پر مجبور ہو گئی اور خود مصنف بھی ایک مکتوب کے ذریعہ جو اس نے ایک دینی رسالہ میں شائع کرایا تھا اپنی صفائی پیش کرنے پر مجبور ہوا (۱) اس مکتوب میں اس نے دعویٰ کیا کہ سنت و حدیث کی صحت کے بارے میں جس شک و شبہ کا میں نے اظہار کیا ہے اس میں منفرد نہیں ہوں بلکہ مصر کے بڑے بڑے اُدباء اور علماء بھی اس نظریہ میں میرے ہمنوا اور ہم زبان ہیں۔ ان علماء کی فہرست میں استاذ احمد امین کا بھی ذکر کیا اور یہ کہ استاذ احمد امین کو میں نے اس سلسلہ میں ایک خط بھی لکھا ہے۔

ہمیں انتظار رہا کہ استاذ احمد امین اس بیان کی تردید کریں گے مگر انھوں نے اس بیان کی نہ صرف یہ کہ کوئی تردید نہیں کی بلکہ اس کے برعکس ایک ہفت روزہ ادبی رسالہ (۲) میں جن تاثرات کا اظہار کیا ان سے پتہ چلتا تھا کہ انھیں اپنے اس رفیق (اسمٰعیل ادہم) کے ساتھ علماء مصر کے اس برتاؤ سے سخت تکلیف ہوئی ہے اور اُنھوں نے علماء مصر کی اس گرفت کو آزادی رائے کے خلاف جنگ اور علمی تحقیقات کی راہ میں ایک سنگ گراں قرار دیا تھا۔

اور جب ۱۳۶۰ھ میں جامعہ ازہر کے اندر امام زہری رحمہ اللہ کے خلاف ہرزہ سرائی کے بارے میں ہنگامہ برپا ہوا تو استاذ احمد امین مرحوم نے ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر سے جن کے خلاف یہ تمام ہنگامہ برپا ہوا تھا، کہا تھا :-

جامعہ ازہر آزاد علمی آراء کو سننے کے لئے ابھی تیار نہیں ہے ایسی صورت

---

(۱) مجلۃ الفتح شمارہ ۴۹۷ ص ۱۲ (۲) مجلۃ الرسالۃ

میں آپ طریقہ یہ اختیار کریں کہ مستشرقین کے جن افکار و نظریات کی اشاعت آپ کرنا چاہیں اُن کو صراحت کے ساتھ مستشرقین کے نام سے پیش نہ کیا کریں بلکہ اس طرح پیش کیا کریں جیسے یہ خود آپ کی تحقیق ہے نیز ان استشراقی افکار و نظریات کو ایسے لطیف اور نرم و نازک لباس میں پیش کیا کریں کہ اُسے چھوکر بھی علماء ازہر کے جذبات مشتعل نہ ہوں جیساکہ خود میں نے فجر الاسلام اور ضحی الاسلام میں کیا ہے"

استاذ احمد امین کا یہ بیان میں نے اسی دہنگامہ کے زمانہ میں ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر کی زبانی سُنا ہے جو استاذ احمد امین سے براہ راست ناقل ہیں۔

اس حقیقت کے سامنے آجانے کے بعد اگر ہم ان (استاذ احمد امین) کے مستشرقانہ نظریات کو تنقید کی کسوٹی پر سختی سے کسیں اور سُنت و حدیث کے متعلق جو اوہام و شکوک اُنھوں نے پیدا کئے ہیں اور اسلامی حقائق میں جو تحریفیں انھوں نے کی ہیں انکا راز ہم طشت از بام کریں تو ہمیں ان لوگوں میں سے ہرگز نہ سمجھا جائے گا جو ایک بے قصور شخص کو کسی جرم میں پھانسنے کے لئے الزامات تراشا کرتے ہیں بلکہ ہم ان لوگوں میں سے ہوں گے جو کسی ایسے تہمت زدہ شخص کے متعلق اظہار حقیقت کے لئے دلائل جمع کیا کرتے ہیں جو خود شکوک و شبہات کے دلدل میں پھنسا ہوا ہو اور بہت سی تہمتیں اس کے دامن کو داغدار بنا چکی ہوں۔

قارئین اس حقیقت کی روشنی میں فجر الاسلام میں بیا کردہ سنت اور اس کی تاریخ پر ہماری تنقید ملاحظہ فرمائیں۔

میں اس سلسلہ میں سیر حاصل تحقیقی اور تنقیدی مباحث خود استاذ احمد امین کی زندگی میں شائع کر چکا ہوں اور استاذ احمد امین کے علم میں یہ مباحث و مقالات آبھی چکے ہیں بلکہ اُنھوں نے اعتراف بھی کیا ہے کہ ان کی کتاب فجر الاسلام پر یہ پہلی علمی تنقید ہے (۱)

کیا حدیثیں وضع کرنے کی ابتدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی ہو چکی تھی ــ؟

مصنف فجر الاسلام ص ۲۵۸ پر وضع حدیث کے آغاز سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

---

(۱) اس کی اطلاع مجھے مجلۃ الفتح کے دفتر میں ـــ جس کے مدیر استاذ محب الدین الخطیب تھے۔ ایک مجلس کے اندر محقق عالم ڈاکٹر عبد الوافی نے دی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وضع حدیث کا آغاز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہی ہو چکا تھا اس لئے کہ ظن غالب یہ ہے کہ یہ حدیث:

من کذب علی متعمداً فلیتبوء مقعدہ من النار
جس شخص نے عمداً مجھ پر جھوٹ بولا اسے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لینا چاہیئے

یقیناً کسی ایسے موقعہ پر بیان کی گئی ہوگی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولا گیا ہوگا۔

یہ شبہ جس کا اظہار مصنف کر رہے ہیں نہ اس کا کسی مسلّم تاریخ میں کوئی ثبوت موجود ہے اور نہ ہی ان معتبر کتابوں کے اندر جن میں مذکورہ بالا حدیث مروی ہے کوئی واقعہ اس حدیث سے متعلق بیان کیا گیا ہے۔

جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے تو یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات ایک بھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جس میں کسی بھی اسلام لانے والے یا آپ کا فیض صحبت حاصل کرنے والے مسلمان نے کبھی بھی کوئی بات از خود گھڑی ہو اور اس کو اس طرح بیان کیا ہو کہ گویا وہ آپ کی حدیث ہے اگر اس قسم کا کوئی ایک واقعہ بھی پیش آتا تو اس کی شناعت اور قباحت کی بنا پر صحابہ کرام اس کو خوب اچھالتے (اور ایسا کرنے والے کو خوب خوب رسوا کرتے تاکہ کوئی اور شخص اس قسم کی خباثت کرنے کی جرأت نہ کرے) بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس شرمناک اور رسواکن واقعہ پر سکوت کرتے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی حیات طیبہ سے متعلق (ہر موافق ومخالف) ایک ایک بات کے نقل کرنے کے انتہا درجہ حریص تھے یہاں تک کہ انھوں نے آپ کی چال ڈھال نشست برخاست آرام کرنے کی کیفیت لباس و پوشاک اور آپ کے سر مبارک کے سفید بالوں کی تعداد تک بیان کر دی ہے۔

رہا مذکورہ بالا حدیث بیان فرمانے کا داعیہ اور محرک تو حدیث کی صحیح اور قابل اعتماد تمام کتابیں اس پر متفق ہیں کہ آپ نے یہ ارشاد اس وقت فرمایا ہے جبکہ آپ نے صحابہ کرام کو اپنے بعد آنے والوں کو اپنی حدیثیں پہونچانے کا حکم[1] دیا تھا۔

---

[1] اور اس غرض سے کہ آپ کی احادیث انتہائی احتیاط کے ساتھ یاد کریں اور جیسی آپ سے (باقی صفحہ ۴۲۴ پر)

(۱) چنانچہ امام بخاریؒ نے اس حدیث کو حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت سے ماخذ کو عن بنی اسرائیل کے ذیل میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے:-

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: بلغوا عنی ولو آیۃ وحدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج(۱) ومن کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری جانب سے ضرور پہونچاؤ اگرچہ ایک آیت ہی ہو اور (علماء) بنی اسرائیل سے (ان کے واقعات) روایت کرو کوئی مضائقہ نہیں (مگر یاد رکھو) جس شخص نے قصداً میرے اوپر جھوٹ بولا اسے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لینا چاہیئے۔

(۲) اور امام مسلم نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے ذیل کے الفاظ میں نقل کیا ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ وحدثوا عنی ولا حرج ومن کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری حدیثیں (قرآن کی طرح) لکھا مت کرو اور جس نے لکھ لی ہوں اسے مٹا ڈالنی چاہئیں اور میری حدیثیں زبانی ضرور بیان کرو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور (یاد رکھو) جس نے قصداً مجھ پر جھوٹ بولا اسے اپنا ٹھکانا جہنم میں ضرور بنا لینا چاہیئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲۳) کوئی بات سُنی یا دیکھی ہو، ہو بہو ویسی ہی بلا کسی ادنیٰ تصرف کے دوسروں تک پہونچائیں، کذب فی الحدیث (حدیث میں جھوٹ بولنے) پر اتنی شدید وعید بیان فرمائی کہ صحیح مسلم میں ہے فلیلج النار (اسے جہنم میں داخل ہونا پڑیگا) تاکہ صحابہ اور دوسرے راویان حدیث انتہائی اہتمام اور احتیاط کے ساتھ یاد کریں اور دوسروں تک پہونچائیں جیسا کہ حضرت زید بن ثابت وغیرہ سے مروی حدیث ذیل میں ان حاملین حدیث کو جو ہو بہو آپ کی حدیث کو دوسروں تک پہونچائیں سرخروئی کی بشارت دی ہے ارشاد ہے:

نضر اللہ امرأ سمع مقالتی فوعاھا واداھا کما سمع الحدیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا سرخرو کرے اس شخص کو جس نے میری بات سُنی پس اسکو محفوظ کر لیا اور جیسے سنا ویسے ہی دوسروں تک پہونچا دیا۔ (مترجم)

(جامع بیان العلم ج ا ص ۳۹ تا ۴۲) (والدارمی ص۔۔۔)

(۱) یعنی گذشتہ اُمتوں کے ان واقعات کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں جو کتاب اللہ اور صحیح احادیث (باقی صفحہ ۴۲۵ پر)

(۳) اور امام ابو عیسیٰ ترمذیؒ نے اس حدیث کو حضرت ابن عباس سے ذیل کے الفاظ میں روایت کیا ہے:-

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے
اتقوا الحدیث عنی الا ما علمتم	فرمایا: تم مجھ سے حدیث روایت کرنے سے احتراز کیا
فمن کذب علی متعمدا	کرو بجز اس حدیث کے جس کا تمہیں (خوب اچھی طرح) علم ہو
فلیتبوأ مقعدہ من النار	اس لئے کہ جس نے جان کر مجھ پر جھوٹ بولا اسے اپنا
* * * *	ٹھکانا جہنم میں بنا لینا چاہیے

(۴) اور امام احمدؒ نے حضرت ابو موسیٰ الغافقی کی روایت سے حسب ذیل الفاظ میں ذکر کیا ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری وصیت
کان آخر ما عھد الینا ان قال:	جو ہمیں فرمائی وہ یہ تھی کہ تم کتاب اللہ کو مضبوطی سے
علیکم بکتاب اللہ وسترجعون	پکڑلو اور عنقریب ایسے لوگوں سے تمہارا سابقہ پڑے
الی قوم یحبون الحدیث عنی،	گا جو میری حدیثیں بیان کرنا پسند کرتے ہوں گے پس
فمن قال عنی مالم اقل	(یاد رکھو) جس نے میری طرف سے کوئی ایسی بات کہی
فلیتبوأ مقعدہ من النار	جو میں نے نہ کہی ہو اسے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لینا چاہیئے
ومن حفظ شیئا فلیحدث	ہاں جس نے میری کوئی حدیث (اچھی طرح) یاد کرلی ہو وہ
بہ (۱)	اسے ضرور بیان کرے۔

ان حضرات محدثین کے علاوہ اور محدثین نے بھی قریب قریب اسی مضمون کو روایت کیا ہے

ان روایتوں سے یہ بات عیاں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم تھا کہ اسلام عنقریب (مشرق سے مغرب تک) پھیلے گا اور مختلف قوموں اور نسلوں کے لوگ اسلام میں داخل ہوں گے اس لئے آپ نے قطعی صورت میں تنبیہ فرمادی کہ مجھ سے حدیثوں کے روایت کرتے وقت انتہائی احتیاط اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲۴) میں مذکورہ واقعات کے خلاف نہ ہوں۔

(۱) امام ابو جعفر طحاوی نے اپنی کتاب مشکل الآثار میں قریب قریب انہی الفاظ کے ساتھ اس حدیث کو نقل کیا ہے

(باقی صفحہ ۴۲۶ پر)

چھان بین سے کام لینا، ہر راوی حدیث کا فرض ہے اور جو بات میں نے نہ کہی ہو اس کو میری طرف منسوب کرنے سے احتراز کرنا انتہا درجہ ضروری اور فرض ہے اور خاص طور پر صحابہ کرام کو مخاطب کر کے یہ وعید اس لئے سنائی کہ وہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اُمت تک پہونچانے والے تھے اور وہی آپ کی نبوت و رسالت کے چشم دید گواہ تھے۔ ان روایتوں میں ذرہ برابر بھی اس طرف اشارہ نہیں کہ یہ حدیث کسی ایسے موقعہ پر آپ نے بیان فرمائی تھی کہ کوئی واقعہ آپ پر جھوٹ بولنے کا پیش آیا تھا۔

اس سلسلہ میں دو روایتیں اور بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس حدیث کے بیان کرنے کا موجب اُس کے علاوہ کچھ اور ہے جو ان صحیح روایات میں مذکور ہے (اور انہی کی بنیاد پر مستشرقین اور ان کے متبعین نے یہ دعویٰ کرنے کی جرأت کی ہے کہ وضع حدیث کا آغاز آپ کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا)

اوّل: امام طحاوی نے اپنی کتاب مشکل الآثار میں عبداللہ بن بریدۃ عن ابیہ کی سند سے روایت کیا ہے کہ:۔

> مدینہ کے اطراف میں بسنے والے ایک قبیلہ میں ایک شخص پہونچا اور اس نے ان سے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے درمیان اپنی رائے سے فلاں فلاں معاملہ میں فیصلہ کردوں اور (دراصل) اس شخص نے جاہلیت کے زمانہ میں (اس قبیلہ کی ایک عورت سے شادی کا پیغام دیا تھا لیکن انھوں نے اس کو رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا تو (یہ جھوٹ بول کر) وہ اس عورت کے پاس چلا گیا تو ان لوگوں نے یہ واقعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہونچایا تاکہ آپ سے اس معاملہ کی تحقیق کریں آپ نے فرمایا: بالکل جھوٹ بولا خدا کے دشمن نے، اس کے بعد آپ نے ایک شخص کو وہاں بھیجا اور فرمایا: اگر وہ شخص تمہیں

(بقیہ حاشیہ ۴۲۵) اس میں ابو موسیٰ غافقی یہ بھی فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث حجۃ الوداع کے موقعہ پر (اپنے وفات سے صرف ستر روز پہلے) بیان فرمائی تھی ج ا ص ۱۷۔

زندہ ملے تو تم اس کی گردن مار دو (قتل کر دو) لیکن میرا خیال ہے کہ تم اس کو زندہ نہ پاؤ گے تو اگر وہ تمہیں مردہ ملے تو اس کے جثہ کو آگ لگا دو (چنانچہ وہ شخص اس قبیلہ میں گیا) تو اس شخص نے اس کو اس حالت میں پایا کہ سانپ نے اسکو ڈس لیا تھا جس سے وہ مرگیا تھا چنانچہ اس کی نعش کو جلا دیا اس موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے جان کر مجھ پر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے (۱)

دوم: حافظ طبرانی نے اپنی کتاب اوسط میں عبداللہ بن عمرو بن العاص کی سند سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کا لباس پہنا پھر مدینہ کے ایک خاندان والوں کے ہاں آیا اور ان سے کہا میں چاہوں اتر سکتا ہوں اور قیام کر سکتا ہوں) انھوں نے اس کے لئے ایک مکان مہیا کر دیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی تو آپ نے حضرت ابو بکر و عمر کو حکم دیا: تم جاؤ اگر وہ شخص تمہیں زندہ مل جائے تو اس کو قتل کر دو اور اس کی نعش کو آگ میں جلا دو اور اگر مردہ ملے تو تم (سمجھ لینا کہ) تم اس کو جہنم رسید کرنے کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیئے گئے اور میرا تو گمان ہے کہ تمہیں اس کو قتل کرنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی (تمہارے پہونچنے سے پہلے وہ مرچکا ہوگا) تو تم اس کی نعش کو آگ میں جلا دینا۔ یہ دونوں حضرات وہاں پہونچے تو معلوم ہوا کہ وہ رات میں پیشاب کرنے کے لئے نکلا تھا کہ ایک زہریلے ناگ نے اس کو ڈس لیا جس سے وہ مرگیا چنانچہ ان دونوں نے اس کے جثہ کو آگ میں جلا دیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس آکر اس کی اطلاع دیدی تو اس موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے قصداً مجھ پر جھوٹ بولا اس کو اپنا ٹھکانا آگ میں بنا لینا چاہیئے

یہ دونوں روایتیں مختلف پہلوؤں سے محل نظر ہیں:۔

---

(۱) مشکل الآثار ج ۱ ص ۱۶۴

اوّل: یہ کہ ان دونوں حدیثوں کا متن قطعاً منکر اور غیر معروف ہے اس پر موضوع ہونے کی علامتیں بالکل واضح اور کھلی ہوئی نظر آرہی ہیں اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے متعلق پورے ذخیرے میں ہمیں یہ بات کہیں نہیں ملتی کہ آپ نے کبھی بھی کسی مرے ہوئے شخص کی نعش کو جلا ڈالنے کا حکم دیا ہو حدیث کی معتبر کتابوں میں بھی ہمیں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ آپ نے اپنی پوری زندگی میں کبھی ایک مرتبہ بھی ایسا کیا ہو، (غرض ان دو روایتوں کے علاوہ کسی بھی اور کتاب میں اچھی بری، قوی ضعیف روایت کا نام ونشان تک نہیں ملتا کہ آپ نے کسی زندہ انسان کو آگ میں جلانے کا یا مرے ہوئے شخص کی نعش کو آگ میں جلانے کا حکم دیا[1] ہو یا آپ کی زندگی میں ایسا کبھی ہوا ہو)

دوم: ان دونوں روایتوں کی سند ضعیف ہے ان کے راویوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کی روایت قبول نہیں کی جاتی[2] اسی لئے امام سخاوی رحمہ اللہ اس قصہ پر موضوع ہونے کا حکم لگایا ہے اور کہا ہے: "یہ قصہ صحیح نہیں ہوسکتا"۔

سوم: بالفرض ہم ان دونوں روایتوں کی صحت کو تسلیم بھی کرلیں تب بھی ان دونوں روایتوں میں تو تصریح ہے کہ ان کا تعلق ایک خالص دنیاوی معاملہ میں ایسی دھوکہ دہی اور کذب بیانی سے ہے جو جھوٹ بولنے والے کی ذات سے متعلق اور مخصوص ہے۔ اس کو بھلا ایک عام دینی امور سے متعلق ایسی حدیث میں جھوٹ بولنے سے کیا نسبت ہوسکتی ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بتا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے[3]

---

[1] بلکہ اس کے برعکس آپ نے چیونٹیوں اور کیڑے مکوڑوں تک کو آگ میں جلانے سے منع فرمایا ہے آپ کا ارشاد ہے لا ینبغی ان یعذب بالنار الا رب النار (رواہ ابوداؤد) انسان کو زندہ یا مردہ جلانا تو کجا۔ مترجم

[2] ان دونوں روایتوں کی سندمیں صالح بن حیان قرشی کوفی راوی ہے جس کو جرح وتعدیل کے امام یحیٰ بن معین نے ضعیف قرار دیا ہے امام نسائی کہتے ہیں: ثقہ نہیں ہے امام بخاری کہتے ہیں فیہ نظر یہ، راوی محل بحث ہے ابن عدی کہتے ہیں اس کی روایتیں عام طور پر محفوظ نہیں ہوتیں۔ (میزان الاعتدال ص ۴۵۵)

[3] یعنی زیر بحث حدیث میں جس شدید وعید کا ذکر کیا گیا ہے اور حدیث کو محفوظ رکھنے کا جو اہتمام کیا گیا ہے۔ از روئے عقل بھی ایسا اہتمام ایک شخصی کے دنیوی معاملہ میں جھوٹ بولنے کے بارے میں ہرگز نہیں کیا جاسکتا۔

اور کس طرح ممکن ہے کہ ایک خالص دنیاوی معاملہ میں جو ایک شخص خاص کی ذات سے متعلق ہے جھوٹ بولنے کے واقعہ کو — جس کا راوی بھی صرف ایک شخص ہے وہ بھی قابل اعتماد نہیں — اس امر کی دلیل ٹھیرایا جائے کہ رسول اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں میں جھوٹ بولنے کا رواج آپ کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا جس کی وجہ سے آپ کو اتنی شدت کے ساتھ تمام صحابہ کو تنبیہ کرنے اور ایسی شدید وعید سنانے کی ضرورت پیش آئی (جیسا کہ مستشرقین اور ان کے چیلے کہتے ہیں)

چہارم :- ان دونوں روایتوں سے یہ بات بھی قطعی طور پر ثابت ہے کہ جس شخص نے یہ جھوٹ گھڑا تھا وہ یقیناً کوئی مجہول اور گمنام شخص تھا (جس کو نہ وہ لوگ جانتے ہیں جن کو دھوکا دیا اور نہ آپ اور دوسرے صحابہ ہی جانتے پہچانتے ہیں) صحابہ میں سے ہرگز نہ تھا لہٰذا اس واقعہ سے صحابہ کی سچائی اور دیانت داری میں جو شخص (مستشرقین اور ان کے چیلے) شک وشبہ پیدا کرنا چاہے اس کے لئے اس واقعہ سے استدلال کرنے کی مطلق گنجائش نہیں۔

بہرحال اس بحث وتنقیح سے آپ اتنا تو یقیناً سمجھ گئے ہوں گے کہ زیر بحث حدیث من تقول الخ کے بیان کرنے کا محرک کچھ بھی ہو خواہ وہ جو عام حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے — جس کا بیان آپ پڑھ چکے ہیں — یا وہ واقعہ ہو جو ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے جن کو بعض مسلّم ناقدین حدیث نے غیر صحیح کہا ہے، ان میں سے کسی ایک سے بھی یہ قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی حدیثیں وضع کی جانے لگی تھیں، لہٰذا اس حدیث سے اس دعوے کے ثبوت میں سہارا لینا ایسی غلطی ہے جس کی کوئی بھی بنیاد نہیں لہٰذا اس دعوے کو ہرگز تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

خلاصہ کلام اس وجہ سے بھی یہ دعویٰ نہیں تسلیم کیا جا سکتا کہ اس کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی طرف جھوٹ بولنے کی نسبت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے حالانکہ یہ حق اور واقعہ کے بھی منافی ہے اور ان صحابہ کرام کی معروف ومسلّم تاریخ کے بھی منافی ہے اور عام صحابہ کی صداقت وعدالت پر، شیعہ، خوارج اور معتزلہ کے علاوہ باقی تمام امت مسلمہ کا اجماع بھی اس کے خلاف ہے — جیسا کہ آپ اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں۔

تو اگر استاذ احمد امین کا مقصد اس دعوے اور اس کے ثبوت میں دلائل پیش کرنے سے اسی مردود نظریہ — یعنی صحابہ کرام کی صداقت و عدالت کو مجروح کرنے — کی طرف اشارہ کرنا ہے اور حضرت ابو ہریرہ کے خلاف جو وہ زہر افشانی کرنا چاہتے ہیں اور صحابہ کے ایک دوسرے پر تنقید کرنے سے جو وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں یعنے کذب صحابہ یہ اس کی تمہید ہے تاکہ وہ اس تدبیر سے سنت کی عمارت کو ڈھانے کے لئے یہ ڈائنا میٹ استعمال کر سکیں تو انھوں نے غلط راستہ اختیار کیا ہے اور حق سے بہت دور جا پڑے ہیں اور اتنے بڑے اور اتنے اہم دعوے کی بنیاد محض اوہام اور مفروضات پر رکھ رہے ہیں جن کی نہ صحیح تاریخ تائید کرتی ہے نہ ثابت شدہ احادیث (مگر وہ بیچارے مجبور ہیں اُن کے اُستادوں نے یہی سکھایا ہے بقول فارسی شاعر؎

(ع ہر چہ استاد ازل گفت بگو می گویم)

استاذ احمد امین موصوف کے حق میں انصاف کی بات یہی ہے کہ اس تمام بحث و تحقیق میں جس استدلال کا انھوں نے سہارا لیا ہے۔ وہ ان کی اپنی کاوش فکر اور علمی تحقیق کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ نہج البلاغۃ(۱) میں حضرت علی کی طرف جو خطبہ منسوب ہے یہ تقریباً اس کی عبارت سے بعینہٖ ماخوذ ہے (اور اپنی مخصوص پالیسی کے تحت اُنھوں نے اپنی تحقیق کے طور پر پیش کیا ہے) اس لئے کہ استاذ احمد امین نے اپنی اس تحقیق کے دو صفحہ بعد ہی مذکورہ بالا خطبہ کی ابن الحدید(۱) نے جو شرح لکھی ہے اس کی عبارت کو بعینہٖ نقل کیا ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس خطبہ اور اس کی شرح سے باخبر ہیں۔

لیکن اگر صحابہ کرام کو مجروح کرنے اور اُن پر جھوٹ بولنے کی تہمت لگانے سے غالی شیعوں کی غرض یہ ہو کہ وہ حضرت علی کی امامت اور ائمۂ اہل بیت کی عصمت کے لئے راستہ ہموار کریں تو استاذ موصوف کی غرض اس سے اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ان لوگوں (یعنے صحابہ) کی صداقت و امانت میں نت نئے شکوک و شبہات پیدا کریں جنھوں نے سنت و حدیث کو ہم تک پہونچایا!

---

(۱) شرح ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۱۳۔ مؤلف امام احمد کا یہ قول اس سے پہلے فجر الاسلام میں قرآن سے بحث کے ذیل میں نقل کر چکے ہیں۔

ہے اور انہی سے ہم نے یہ گرانقدر سرمایہ حاصل کیا ہے؟

تفسیر قرآن سے متعلق حدیثیں

استاذ احمد امین اپنی کتاب فجر الاسلام کے ص ۲۵۹ پر لکھتے ہیں:۔

وضع حدیث کی مقدار (کہ کس قدر حدیثیں گھڑی گئی ہیں) کا اندازہ لگانے کے لئے یہ دلیل بہت کافی ہے کہ:

تفسیر کی احادیث — جن کے بارے میں امام احمد سے منقول ہے کہ اُنھوں نے فرمایا:

میرے نزدیک ان احادیث تفسیر میں سے ایک حدیث بھی صحیح نہیں"۔ امام احمد کے اس قول کے تحت ہزاروں حدیثیں کتب حدیث میں جمع کی گئی ہیں (جو بقول امام احمد سب موضوع ہیں)

(۲) اسی طرح امام بخاری — جن کی کتاب صحیح بخاری، سات ہزار[۱] حدیثوں پر مشتمل ہے جن میں سے تقریباً تین ہزار مکرر ہیں — کے متعلق بھی "لوگوں" نے کہا ہے کہ:۔ امام بخاری نے یہ سات ہزار حدیثیں ان چھ لاکھ حدیثوں میں سے چھانٹی اور صحیح قرار دی ہیں جو ان کے زمانہ میں رائج اور متداول تھیں (اس کے معنی یہ ہوئے کہ پانچ لاکھ ترانوے ہزار حدیثیں غیر صحیح اور موضوع امام بخاری

---

[۱] صحیح بخاری کی احادیث کی یہ تعداد مصنف نے سُنی سُنائی لکھدی ہے حافظ ابن حجر عسقلانی نے مقدمہ فتح الباری میں ایک ایک حدیث گن کر حسب ذیل تعداد بتلائی ہے۔

مع التکرار		بدون التکرار	
مرفوعات	۷۳۹۷	مرفوعات	۲۴۶۴
تعلیقات	۱۳۴۱	تعلیقات	۱۵۹
متابعات	۳۸۴	کل	۲۶۲۳
کل	۹۱۲۲		

بہر حال کل احادیث کی تعداد سات ہزار اور بدون تکرار تقریباً چار ہزار کسی نے بھی نہیں لکھی مترجم

کے زمانہ میں رائج تھیں)

وضع حدیث کی کثرت کا تو کوئی بھی انکار نہیں کرتا لیکن استاذ موصوف نے موضوع حدیثوں کی مقدار بتلانے کے لیئے جن دو شہادتوں سے استدلال کیا ہے۔

(۱) ایک تفسیر کی احادیث (۲) دوسرے امام بخاری کی احادیث (یہ دونو استدلال محل نظر ہیں اول ہم تفسیر کی احادیث سے بحث کرتے ہیں اس کے بعد امام بخاری کی احادیث سے)

(۱) تفسیر کی احادیث کے متعلق ان کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سب ہی احادیث تفسیر کو مشکوک بنانا چاہتے ہیں اس لیئے کہ وہ (اس کے ثبوت میں) امام احمد کا قول نقل کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک ان احادیث تفسیر میں سے کوئی بھی حدیث صحیح نہیں ہے باوجودیکہ محدثین نے (کتب حدیث میں) تفسیر سے متعلق سیکڑوں حدیثیں جمع کی ہیں۔ اور حدیث کے باب میں امام احمد کا مرتبہ اور مقام کسی پر بھی مخفی نہیں تو جب وہ احادیث تفسیر کے بارے میں یہ کہیں کہ ان میں سے ایک بھی حدیث صحیح نہیں تو اس کے معنی تو یہی ہوئے کہ جتنی حدیثیں بھی تفسیر سے متعلق (کتب حدیث میں) مروی ہیں امام احمد کے نزدیک ان کی صحت تو ضرور ہی مشکوک ہے چاہے ان پر موضوع ہونے کا حکم نہ بھی لگایا ہو۔

کیا استاذ احمد امین کی بحث سے یہ منطقی نتیجہ نہیں نکلتا؟

لہٰذا ہم اس سلسلہ میں دو پہلو سے بحث کرنا چاہتے ہیں (۱) ایک تفسیر کی احادیث کے بارے میں (۲) دوسرے امام احمد کے اس قول کے بارے میں جو انھوں نے نقل کیا ہے۔

(۱) احادیث تفسیر

جس شخص نے بھی حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اس پر یہ حقیقت مخفی نہیں کہ ان کتب حدیث میں تفسیر سے متعلق احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ ایسے صحیح طریق اور اسانید کے ساتھ مروی ہے جن کے صحیح ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ حدیث کی کوئی کتاب بھی ایسی نہیں جس میں مؤلف نے تفسیر پر علیحدہ باب قائم نہ کیا ہو اور اس باب میں ان احادیث کا ذکر نہ کیا ہو جو تفسیر قرآن سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یا صحابہ و تابعین سے مروی ہیں۔

علاوہ ازیں علماء تفسیر نے مفسر سے متعلق یہ شرط عائد کی ہے کہ جو شخص کتاب اللہ کی تفسیر کرے اس کا فرض ہے کہ وہ ان روایات پر بھروسہ کرے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تفسیر

سے متعلق مروی ہیں۔

چنانچہ امام ابو جعفر طبری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر جو قرآن اتارا ہے اس کی بہت سی آیات ایسی ہیں جن کی مراد کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان محتاج تاویل آیات سے مراد وہ تمام آیات ہیں جو امر و نہی اور ندب و استحباب وغیرہ احکام شرعیہ سے متعلق ہیں (۱)

ابو حیان اپنی تفسیر بحر محیط میں ایک مفسر قرآن جن چیزوں کا محتاج ہے ان کے ذیل میں لکھتے ہیں:۔

چوتھی وجہ! کلام اللہ کے مبہم لفظ کے معنی کی تعیین، مجمل لفظ کی تفصیل، شان نزول اور ناسخ و منسوخ کا علم ایک مفسر کے لئے ازبس ضروری ہے اور ان امور کے علم کا ماخذ و مرجع صرف رسول اللہ صلی اللہ سے منقول صحیح روایات ہی ہو سکتی ہیں اور اس کا تعلق علم حدیث سے ہے، چنانچہ بڑی بڑی حدیث کی کتابیں اور امہات حدیث — صحاح ستہ — جو ہم نے (اپنے مشائخ) سے سنیں اور روایت

ملہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے آیۃ کریمہ ثم ان علینا بیانہ کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسے قرآن کے الفاظ خود یاد کرائے ہیں ایسے ہی اپنے کلام کی مراد بھی خود بتلائی ہے اور پھر آیۃ کریمہ وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم کے تحت لوگوں کو اس سے آگاہ کرنے پر آپ کو مامور فرمایا ہے لہذا رسول اللہ کا بیان خود اللہ کا بیان ہے اور کسی متکلم کے کلام کی قطعی اور یقینی مراد وہی ہو سکتی ہے جو متکلم خود بتلائے ایسی صورت میں جس طرح آیۃ کریمہ انا نحن نزلنا الذکر کے تحت الفاظ قرآن کا محفوظ ہونا ناگزیر ہے اسی طرح لتبین للناس کے تحت تفسیر قرآن سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی احادیث کا موجود و محفوظ ہونا بھی ناگزیر ہے اور اسی لئے ایک مفسر کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی تفسیر قرآن سے انحراف قطعاً ناجائز اور حرام ہے۔ مترجم

(۱) ج ۱ ص ۲۵ قدیم ایڈیشن۔

کیں، وہ سب ان (احادیث تفسیر) پر مشتمل ہیں مثلاً صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابوداؤد اور ان کے علاوہ کتب حدیث کے نام بھی شمار کرائے۔

حافظ جلال الدین سیوطی اپنی کتاب الاتقان میں لکھتے ہیں:۔

حافظ ابن تیمیہ نے کہا ہے کہ (تفسیر قرآن کے سلسلہ میں) یہ معلوم ہونا از بس ضروری ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو قرآن کے معانی بھی اسی طرح بتلائے ہیں جیسے ان کو الفاظ قرآن سکھلائے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فرمان:۔

لتبین للناس ما نزل الیھم	تاکہ تم اُن پر واضح کرو جو اُن کے لئے اُتارا گیا ہے۔

کے تحت یہ بیان معانی قرآن بھی داخل ہے (اس لئے کہ آپ بیانِ معانی قرآن کے بھی مامور ہیں لہذا بیانِ معانی قرآن سے متعلق احادیث ضرور ہونی چاہیں)

یہ تو ایک بات ہوئی باقی مشہور مفسر زرکشی نے تو قرآن عظیم کو تفسیر کے اعتبار سے دو حصوں پر منقسم کیا ہے

(۱) ایک وہ حصہ جسکی تفسیر بنقل صحیح موجود ہے خواہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہو یا صحابہ اور تابعین سے۔

(۲) دوسرا وہ حصہ جس کی تفسیر منقول نہیں ہے۔

آپ دیکھتے ہیں ان حضرات نے تفسیر قرآن کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے (۱) منقول، (۲) اور غیر منقول اور مفسر کے لئے لازم قرار دیا ہے کہ وہ (قرآن کی تفسیر کرتے وقت) اول تفسیر منقول کی طرف رجوع کرے اور اس کا علم حاصل کرے (جو احادیث صحیح کے ذریعہ ہی ممکن ہے) تو اگر تفسیر قرآن سے متعلق کوئی صحیح حدیث نہ ہوتی بلکہ بکثرت صحیح حدیثیں موجود نہ ہوتیں تو یہ علماء ایسا نہ کرتے (یعنی تفسیر کے اعتبار سے قرآن کے دو حصے نہ کرتے اور مفسر پر اول تفسیر قرآن سے متعلق احادیث کی طرف رجوع کرنے کو ضروری نہ قرار دیتے)

اور علماء تفسیر میں تو بعض علماء ایسے بھی ہیں جن کا مسلک یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر صرف انہی احادیث و روایات سے جائز ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔

چنانچہ حافظ جلال الدین سیوطی اتقان میں لکھتے ہیں:۔

قرآن عظیم کی تفسیر کے بارے میں علما کا اختلاف ہے ایک گروہ کہتا ہے کہ ہر شخص کو (جو عربی جانتا ہو) قرآن کی تفسیر میں غور وخوض کرنا جائز نہیں چاہے وہ کتنا ہی بڑا ادیب ہو، عالم ہو، عقلی دلائل، فقہ، نحو، تاریخی وقائع وآثار وغیرہ علوم وفنون میں کتنی ہی وسیع معلومات رکھتا ہو تب بھی قرآن کی تفسیر میں اس کے لئے صرف انہی احادیث وروایات پر اعتماد کرنا ضروری ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔

یہ مذکورہ بالا قول اگرچہ جمہور علماء کے نزدیک مقبول ومعتبر نہیں ہے تاہم اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ تفسیر قرآن سے متعلق اتنی احادیث وآثار ضرور موجود ہیں (جو تفسیر قرآن میں کفایت کر سکتے ہیں) اور کسی بھی عالم کے لئے اُن سے ناواقفیت روا نہیں ہے اور نہ ہی کسی عالم کو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ ان کا انکار کرے۔

بھلا یہ کیسے درست ہو سکتا ہے (کہ تفسیر کے باب میں ایک حدیث بھی صحیح نہ ہو) دراں حالیکہ امام شافعی مختصر البویطی میں بیان کرتے ہیں۔

متشابہ آیات کی تفسیر اُس کے سوا جائز نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے یا کسی صحابی کی حدیث سے یا علماء کے اجماع سے ثابت ہو۔

ہاں یہ ضرور صحیح ہے کہ قرآن کریم کی جتنی آیات کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بنقل صحیح ثابت ہے وہ ان آیات کی بہ نسبت کم ہیں جن کی تفسیر آپ سے منقول نہیں۔ اسی طرح تفسیر کے ذیل میں جتنی احادیث صحیح ہیں وہ اُن سے کم ہیں جو صحیح نہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ اس مختصر اور صحیح حصہٴ احادیث تفسیر کے بارے میں بھی لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کئے جائیں (کہ یہ تو علمی اور دینی خیانت ہے)

(۳) احادیث تفسیر کے متعلق امام احمد کے قول کی تحقیق

باقی مؤلف موصوف احمد امین مصری

نے امام احمد کا جو قول تفسیر کی احادیث کے متعلق نقل کیا ہے تو امام احمد کے اس قول میں دراصل ان کے حسب ذیل اقوال کی طرف اشارہ ہے جو انہی سے منقول ہیں :۔

(۱) ایک قول یہ ہے : تین چیزیں ہیں جن کی کوئی اصل نہیں (۱) تفسیر (۲) ملاحم (لڑائیاں) (۳) مغازی (غزوات)

(۲) دوسری روایت ہے : تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصل نہیں (۱) المغازی (۲) والملاحم (۳) والتفسیر۔

امام احمد کے ان اقوال کی روشنی میں ان کا زیر بحث قول : تفسیر میں کوئی چیز بھی صحیح نہیں " چند پہلو سے محتاج بحث ہے ۔

(۱) اول یہ کہ امام احمد کے زیر بحث قول : تفسیر میں کوئی حدیث نہیں کے متعلق ہمارا دل کہتا ہے کہ یہ امام احمد کا قول نہیں ہے اس لئے کہ خود امام احمد نے اپنی مسند میں تفسیر سے متعلق بہت سی حدیثیں (اپنے مشائخ سے) روایت کی ہیں تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی (مایۂ ناز) مسند میں احادیث تفسیر کی تخریج بھی کریں اپنے مشائخ سے ان کو روایت بھی کریں اور پھر خود ہی یہ حکم بھی لگائیں کہ تفسیر میں کوئی حدیث بھی صحیح نہیں ؟ (اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ وہ نہ صرف اپنی مسند کو بلکہ اپنے مشائخ کو بھی مجروح و مطعون کر رہے ہیں)

علاوہ ازیں (اگر ہم امام احمد کے مذکورہ بالا اقوال کو صحیح مان لیں تو) اس کا تو مقتضیٰ یہ ہے کہ (نہ صرف احادیث بلکہ) عربوں کے تمام واقعات مسلمانوں کے تمام غزوات سب کے سب ہی سرے سے جھوٹے ہیں بھلا یہ کون صحیح العقل انسان کہہ سکتا ہے ؟

(۲) دوم یہ کہ (احادیث تفسیر کی) صحت کی نفی سے ان کا موضوع ہونا یا ضعیف ہونا نہیں لازم آتا (جیسا کہ مولف امام احمد کے الفاظ لا یصح سے احادیث تفسیر کے موضوع ہونے پر استدلال کرنا چاہتے ہیں) دراں حالیکہ (محدثین کے حلقہ میں) امام احمد کے متعلق تو معروف و مشہور ہے کہ جن احادیث کے صحیح ہونے کی امام احمد نفی کیا کرتے ہیں وہ (عموماً محدثین کے ہاں) مقبول ہوتی ہیں چنانچہ محدثین نے امام احمد کے ان الفاظ لا یصح فی ذالک شیئی کو امام احمد کی مخصوص اصطلاح قرار دیا ہے (جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ امام احمد کے معیار صحت کے مطابق صحیح نہیں)

چنانچہ مولانا عبدالحی لکھنوی اپنی کتاب الرفع والتکمیل میں لکھتے ہیں:۔

محدثین اکثر کہدیا کرتے ہیں لا یصح — یہ حدیث صحیح نہیں — یا لا یثبت — یہ حدیث ثابت نہیں — ان الفاظ سے بے علم اور ناواقف لوگ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ وہ حدیث موضوع یا ضعیف ہے مگر یہ ان لوگوں کی محدثین کی اصطلاحات سے جہالت اور ان کی تصریحات سے ناواقفیت پر مبنی ہوتا ہے چنانچہ ملا علی قاری نے تذکرۃ الموضوعات میں تصریح کی ہے کہ: (کسی حدیث کا کسی محدث کے نزدیک) ثبوت نہ ہونے سے اس کا موضوع ہونا لازم نہیں آتا (یعنے کسی حدیث کے موضوع ہونے کے لئے وضع کا کسی دلیل سے ثابت ہونا ضروری ہے محض کسی محدث کے نزدیک اس کا ثبوت نہ ہونا کافی نہیں، ہوسکتا ہے کہ دوسرے محدثین کے نزدیک وہ حدیث ثابت ہو)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اذکار کی احادیث کی تخریج کے سلسلہ میں نتائج الافکار کے نام سے مشہور کتاب لکھی ہے اس کتاب میں حافظ ابن حجر کہتے ہیں:۔

امام احمد بن حنبل سے بنقل صحیح ثابت ہے کہ انھوں نے فرمایا: مجھے کسی ایسی ثابت (صحیح) حدیث کا علم نہیں جس سے وضو میں بسم اللہ پڑھنے کا ثبوت ہوتا ہو۔

اس پر حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

(امام احمد) کے اپنے علم کی نفی سے (حدیث کے) ثبوت کی نفی نہیں لازم آتی اور علی سبیل التنزل (بالفرض تسلیم) (حدیث کے) ثبوت کی نفی سے اس کے ضعف کا ثبوت نہیں لازم آتا اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ ثبوت سے امام احمد کی مراد صحت ہو (یعنے امام احمد کا مطلب یہ ہو کہ صحیح حدیث کوئی نہیں ہے) لہذا (امام احمد کے اس قول سے (زیادہ سے زیادہ صحیح حدیث کی نفی ہوتی ہے) حسن کی نفی نہیں ہوتی۔[1]

---

[1] اسی طرح احادیث تفسیر کی صحت کی نفی سے بھی زیادہ سے زیادہ تفسیر میں صحیح احادیث کی نفی ہوگی باقی صفحہ ۴۳۸ پر)

(۳) سوم یہ کہ دراصل امام احمد نے یہ نہیں کہا کہ تفسیر میں کوئی بھی حدیث صحیح نہیں ہے بلکہ انھوں نے یہ فرمایا ہے کہ ان تینوں علوم میں مستقل اور علیحدہ کتاب کوئی نہیں (جیساکہ مشہور ہے) اس کی دلیل یہ ہے کہ دوسری روایت میں صراحتًا ثلاثۃ کتب کے الفاظ موجود ہیں (حاصل یہ ہوا کہ کتب حدیث میں ان تین موضوعات سے متعلق مستقل کتابیں موجود نہیں ہیں جو کہتا ہے غلط کہتا ہے بلکہ عام کتب حدیث میں جہاں اور مضامین سے متعلق احادیث مذکور ہیں۔ مغازی، ملاحم اور تفسیر سے متعلق احادیث بھی انہی کتابوں میں موجود ہیں) چنانچہ خطیب بغدادی نے بھی (امام احمد کی اس عبارت کے) یہی معنی سمجھے ہیں وہ فرماتے ہیں:-

> امام احمد کا یہ قول ان تین مضامین سے متعلق مستقل اور خاص کتابوں کی نفی پر محمول ہے جیسا کہ احادیث تفسیر سے متعلق کلبی اور مقاتل ابن سلیمان کی کتابیں سب سے زیادہ مشہور سمجھی جاتی ہیں چنانچہ امام احمد نے کلبی کی کتاب تفسیر کے متعلق تو خاص طور پر کہا ہے کہ یہ کتاب اول سے آخر تک جھوٹ کی پوٹ ہے اس کا پڑھنا بھی جائز نہیں۔

(۴) چہارم یہ کہ ممکن ہے امام احمد کے اس قول کا مطلب یہ ہو کہ تفسیر میں صحیح احادیث غیر صحیح احادیث کی بہ نسبت بہت ہی کم ہیں (نہ ہونے کے برابر ہیں) بہت سے اہل علم نے امام احمد کے اس قول کو اسی مفہوم پر محمول کیا ہے چنانچہ سیوطی نے الاتقان میں لکھا ہے:-

> امام ابن تیمیہ نے فرمایا ہے کہ احادیث تفسیر کا وہ حصہ جس کی صحت کو معلوم کیا جاسکتا ہے (اور پرکھا جاسکتا ہے) وہ بحمد اللہ وافر مقدار میں موجود ہے اگرچہ امام احمد نے فرمایا ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں الخ اس کی وجہ یہ ہے کہ تفسیر سے متعلق روایات بیشتر مرسل ہیں (اس لئے امام احمد نے بے اصل فرمایا ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳۷) یعنے امام احمد کا مطلب یہ ہوگا کہ تفسیر میں حدیثیں تو ہیں مگر صحیح نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ صحیح حدیث نہ ہونے کی صورت میں حسن حدیثیں مقبول ہوتی ہیں۔ مترجم

البرہان میں امام زرکشی لکھتے ہیں :-

تفسیر قرآن کے طالب علم کے لئے بہت سے ماخذ ہیں مگر ان میں سب سے اہم چار ہیں (۱) اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول تفسیر، یہ ماخذ ہی زینت اوراقِ تفسیر ہے لیکن اس میں ضعیف اور موضوع روایتوں سے ہوشیار رہنا اور بچنا ازبس ضروری ہے کیونکہ تفسیر کے باب میں ایسی (بے اصل) روایتیں بکثرت موجود ہیں اسی لئے امام احمد نے فرمایا ہے: حدیث کی تین کتابیں رائج ہیں جن کی کچھ اصل نہیں کتب مغازی کتب ملاحم اور کتب تفسیر۔ امام احمد کے تلامذہ میں سے محققین کی رائے ہے کہ اس قول سے امام احمد کی مراد یہ ہے کہ ان تین قسم کی احادیث میں سے بیشتر احادیث کی سندیں صحیح اور متصل نہیں ہیں ورنہ تو ان تینوں ابواب میں بہت سی صحیح حدیثیں موجود ہیں۔

مختصر یہ کہ تفسیر کی تمام احادیث میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی غرض سے امام احمد کے قول سے استدلال کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا اس کی تردید کے لئے تو حدیث کی بڑی بڑی صحیح کتابوں مثلاً صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا مالک اور جامع ترمذی بلکہ خود مسند احمد میں احادیث تفسیر کا وجود بہت کافی و وافی ہے (جیسے ان کتب صحاح کی اور تمام احادیث مسلم طور پر امت کے نزدیک صحیح ہیں ایسے ہی تفسیر کی احادیث بھی باجماع امت صحیح ہیں)

(۲) کیا امام بخاری نے اپنی کتاب میں تمام صحیح حدیثیں جمع کر دی ہیں۔

مولف موصوف استاذ احمد امین نے موضوع احادیث کی مقدار بتلانے کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ: امام بخاری نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے صحیح حدیثیں چھانٹی ہیں اس سلسلہ میں ہم دو پہلوؤں سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) ان احادیث کی تعداد جو امام بخاری کے زمانہ میں متداول اور رائج تھیں

اس میں شک نہیں کہ امام بخاری کے زمانہ میں جو احادیث محدثین کے حلقوں میں متداول اور رائج تھیں ان کی تعداد بہت زیادہ تھی جو چھ لاکھ تک بلکہ اس سے بھی آگے تک پہونچتی ہے۔ امام احمد سے تو منقول ہے کہ "کل حدیثوں میں سے کچھ اوپر

سات لاکھ حدیثیں صحیح ہیں " اور حافظ ابو زرعہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

اس نوجوان کو تو سات لاکھ حدیثیں حفظ یاد ہیں "

لیکن (دیکھنا یہ ہے کہ) اس حیرت انگیز کثرت احادیث کی حقیقت کیا ہے؟ اور کیا (واقعی یہ ساری حدیثیں مختلف مضامین سے متعلق ہیں؟ (یعنے سات لاکھ احکام وامور دین سے متعلق یہ سات لاکھ حدیثیں ہیں) یا یہ تعداد حدیثوں کے مختلف طرق اور اسانید کی ہے؟ (اور ایک ایک حدیث کی دسیوں بیسیوں سندیں ہیں جن سے وہ ایک حدیث مروی ہے اور سندوں کے اعتبار سے ہی ان کو شمار کیا گیا ہے) نیز کیا یہ ساری حدیثیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب اور مرفوع حدیثیں ہیں؟ یا ان میں صحابہ اور تابعین کی طرف منسوب حدیثیں بھی ہیں؟ (یعنے آثار صحابہ اور تابعین کے اقوال بھی اس میں شامل ہیں)

ان سوالات کا جواب دینے کے لئے ضروری ہے کہ ہم لفظ حدیث، خبر اور اثر کے معنی اور اس میں علماء اصول حدیث کے اختلاف کو بیان کریں۔

(۱) محدثین کا ایک گروہ کہتا ہے کہ :- حدیث صرف اس قول یا فعل یا تقریر (بیان سکوتی) کو کہتے ہیں جس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کی طرف کی جائے لہٰذا (اس اصطلاح کے مطابق) جب حدیث کا لفظ مطلق استعمال کیا جائے تو اس سے یہ حدیث مرفوع ہی مراد ہو گی۔ ہاں کسی قرینہ کی بنا پر لفظ حدیث موقوف (اثر صحابی یا قول تابعی) کے لئے بھی استعمال کر لیتے ہیں۔

باقی خبر کا لفظ حدیث کی بہ نسبت عام ہے مرفوع اور موقوف دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ (جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب اقوال وافعال کو خبر کہتے ہیں ایسے ہی) صحابہ اور تابعین کی طرف جو (اقوال وافعال) منسوب ہوں ان کو بھی خبر کہتے ہیں۔ اس اصطلاح کے مطابق ہر حدیث کو خبر تو کہہ سکتے ہیں لیکن ہر خبر کو حدیث نہیں کہہ سکتے۔

(۲) بعض محدثین کہتے ہیں کہ: حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب اقوال وافعال یعنے مرفوع کو بھی کہتے ہیں اور صحابہ وتابعین کی طرف منسوب اقوال وافعال یعنے موقوف کو بھی کہتے ہیں تو اس اصطلاح کے مطابق حدیث کا لفظ خبر کے ہم معنی ہو گا (ہر حدیث کو خبر اور ہر خبر کو حدیث کہہ سکیں گے چاہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وفعل ہو چاہے صحابہ اور تابعین کا قول وفعل ہو)

رہا اثر کا لفظ تو اس اصطلاح کے اعتبار سے اس کا مفہوم بھی وہی ہے جو پہلے قول کے اعتبار سے خبر کا ہے یعنی اثر کا لفظ بھی خبر کے ہم معنی ہے مرفوع اور موقوف دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

(۳) خراسان کے فقہاء (اثر اور خبر میں فرق کرتے ہیں) "موقوف" (صحابہ و تابعین کے قول و فعل) کو اثر کہتے ہیں اور "مرفوع" (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل) کو خبر کہتے ہیں (۱)

حدیث، خبر اور اثر کی تعریف (اور مصداق کی تعیین) کے بارے میں محدثین کا اختلاف یہ ہے۔ اس اختلاف کو سمجھ لینے کے بعد اب ہم احادیث کی چھ لاکھ یا سات لاکھ حیران کن تعداد کی حقیقت بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ اس تعداد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول اقوال (و افعال) بھی شامل ہیں جیسا کہ اس تعداد میں ایک حدیث کے متن، طرق اور سلسلہ اسانید بھی شامل ہیں (یعنے ہر مرفوع اور موقوف حدیث کو اور ہر حدیث کے ہر سلسلۂ سند کو ایک مستقل حدیث شمار کیا گیا ہے) اس لئے کہ ہر محدث مختلف اور متعدد سندوں سے مروی ایک حدیث کو (علیحدہ علیحدہ) روایت کرتا ہے (اور ہر سند کے ساتھ اس حدیث کو ایک علیحدہ حدیث شمار کرتا ہے) اس لئے کہ صحابی یا تابعی سے ہر حدیث کو روایت کرنے والے متعدد راوی ہوتے ہیں — اور عموماً ایسا ہی ہوتا ہے (اس لئے کہ عموماً ہر صحابی سے چند تابعی ایک حدیث روایت کرتے ہیں پھر ہر تابعی سے اُسی حدیث کو چند در چند تبع تابعی روایت کرتے ہیں اور پھر ہر مرحلہ میں اسی حدیث کے راویوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی جاتی ہے — اس لئے ہر محدث ہر حدیث کے تمام طریقے (یعنے ہر ہر سلسلہ سند) کو ہر ہر راوی سے جمع کرنے (اور علیحدہ علیحدہ کرنے) کا اہتمام[لہ] کرتا ہے تو بسا اوقات ان کی تعداد دس دس تک پہونچ

---

(۱) توجیہ النظر ص ۳ لہ اس اہتمام کی داعی متعدد وجوہ ہوئے ہیں (۱) ایک یہ کہ حافظ حدیث ہر حدیث کو اس کی ہر سند کے ساتھ علیحدہ علیحدہ خود بھی یاد کرتا ہے اور اسی طرح علیحدہ علیحدہ اپنے شاگردوں کے سامنے بیان کرتا اور یاد کراتا ہے مثلاً ایک محدث نے اگر ایک دن اپنے شاگردوں کے سامنے پانچ حدیثیں روایت کیں جن میں سے ہر حدیث کی دس دس سندیں ہیں تو اس کے تلامذہ یوں نہیں کہتے کہ آج ہم نے اپنے شیخ سے پانچ حدیثیں سنیں اور یاد کیں بلکہ یوں کہتے ہیں کہ آج ہم نے اپنے شیخ سے پچاس حدیثیں سنی اور یاد کیں۔ (باقی صفحہ ۴۴۲ پر)

پہونچ جاتی ہے تو وہ ان دس سندوں کو (جو اس نے اپنے دس مشائخ سے سنیں) دس حدیثیں شمار کرتا ہے حالانکہ وہ صرف ایک حدیث ہوتی ہے (اس لئے کہ اس نے تو اپنے دس مشائخ سے علیحدہ علیحدہ دس سندوں سے اس حدیث کو سنا ہے اور یاد کیا ہے) چنانچہ ابراہیم بن سعید جوہری کہا کرتے تھے: جو حدیث میرے پاس سو طریقوں یعنی سندوں سے موجود نہ ہو تو اس حدیث میں اپنے آپ کو بس یتیم سمجھتا ہوں (۱)

اور اس طریق پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور بیان سکوتی کے ساتھ صحابہ اور تابعین کے اقوال و افعال کو بھی جمع کر لیا جائے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اور صحابہ و تابعین کی طرف منسوب ہر حدیث (یعنے ہر مرفوع و موقوف حدیث) کے تمام طریقوں یعنے سندوں کو بھی جمع کر لیا جائے (اور ہر سند کو ایک علیحدہ حدیث شمار کیا جائے) تو ان سب حدیثوں کی تعداد کا لاکھوں تک پہونچ جانا ہرگز کوئی تعجب خیز امر اور اچنبھے کی بات نہیں رہتی

---

(۱) تأنیب الخطیب ۱۵۱۔

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۴۴۱) اسی طرح وہ لکھتے وقت یا اپنی یادداشت کا حال بیان کرتے وقت یوں نہیں کہتے کہ فلاں شیخ کی پانچ حدیثیں ہمیں یاد ہیں بلکہ یوں کہتے ہیں کہ فلاں شیخ کی پچاس حدیثیں ہمیں یاد ہیں یا ہمارے پاس لکھی ہوئی ہیں اس لئے کہ واقعہ بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ پانچ حدیثیں پچاس سندوں سے علیحدہ علیحدہ سنتے یاد کرتے اور لکھتے ہیں (۲) دوسری وجہ اس اہتمام کی یہ ہوتی ہے کہ مقبول حدیث کے دو مرتبے ہیں (۱) صحیح (۲) اور حسن اور ہر مرتبہ کی حدیث کے راویوں کے درمیان حفظ و سماع وغیرہ کے اعتبار سے کافی فرق مراتب ہوتا ہے مثلاً حدیث صحیح کے بعض راوی اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں بعض متوسط بعض ادنیٰ، اسی طرح غیر مقبول یعنے ضعیف حدیثوں کے درمیان بھی وجوہ ضعف اور راویوں کے حفظ و سماع وغیرہ کے اعتبار سے بہت کافی فرق مراتب ہوتا ہے اس لئے ہر محدث ہر حدیث کو اس کے ہر سلسلۂ سند کے ساتھ علیحدہ علیحدہ روایت کرتا ہے کیونکہ ان میں کوئی سلسلۂ سند یا اس کا کوئی راوی اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے کوئی ادنیٰ درجہ کا، کسی سند میں کوئی راوی ضعیف ہوتا ہے تو دوسری سند میں اس کی جگہ قوی راوی موجود ہوتا ہے، کسی سند میں ایک ضعف کی وجہ موجود ہوتی ہے تو دوسری سند میں وہ وجہ نہیں ہوتی اس طرح ایک سند یا ایک راوی کے ضعف کی تلافی دوسری سند یا راوی سے ہو جاتی ہے (۲) تیسری وجہ اس اہتمام کی

(باقی صفحہ ۴۴۳ پر)

چنانچہ علامہ طاہر الجزائری کہتے ہیں:۔

ہم یہ بتلا چکے ہیں کہ بعض محدثین مرفوع اور موقوف دونوں قسم کی حدیثوں کے لئے لفظ حدیث استعمال کر لیا کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھنے کے بعد وہ اشکال زائل ہو جاتا ہے جو بہت سے ناواقف لوگوں کو یہ سنکر پیش آتا ہے: کہ فلاں شخص کو سات لاکھ صحیح حدیثیں یاد تھیں کیونکہ وہ لوگ اس قسم کے اقوال کو حقیقت سے بعید سمجھتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں: کہاں ہیں وہ سات لاکھ حدیثیں؟ اور ہم تک وہ کیوں نہیں پہونچیں؟ حفاظ حدیث نے ان سب کو نہ سہی انکا دسواں حصہ تو نقل کیا ہوتا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴۲) یہ ہوتی ہے کہ اصل حدیث یعنے متن کے الفاظ، تعبیرات اور تمام یا ناتمام ہونے کا حال تمام طرق کو جمع کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے اور حدیث کا مفہوم یا اس کا حکم سمجھنے میں اس سے بجید بصیرت حاصل ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی سلسلۂ سند کے ساتھ حدیث کا پورا متن مذکور ہوتا ہے اور کسی کے ساتھ اس کا کوئی حصہ یا کوئی جزو، کسی سند کے ساتھ حدیث بلفظہ مروی ہوتی ہے اور کسی سند کے ساتھ بالمعنی مروی ہوتی ہے علی ہذا القیاس۔

ہر حدیث کے تمام طرق اور اسانید کو جمع کرنے میں محدثین کے انتہائی اہتمام کرنے کے یہ چند عام فہم وجوہات ہیں جو اہل علم اصول حدیث سے کما حقہ واقف ہیں اور کتب حدیث کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہیں وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ حفاظت و صیانت حدیث رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عظیم مقصد کے پیش نظر محدثین اُمت — شکر اللہ مساعیہم — کے لئے ہر حدیث کی ہر سند اور ہر سند کے ہر راوی کو یاد کرنا ناگزیر تھا۔

اگر محدثین رحمہم اللہ کی ان کاوشوں اور کاہشوں کو، کوئی شخص بچشم خود دیکھنا چاہے تو مطبوعہ اور متداول کتابوں میں صحیح مسلم اور شرح معانی الآثار کو دیکھ لے شاید ہی کوئی حدیث ایسی ملے جسے مؤلف نے ایک یا دو سندوں سے بیان کیا ہو ورنہ ہر حدیث کی دس دس، پانچ پانچ سندیں اور سند در سند یعنے تحویلیں ملیں گی۔ باقی ان دقیق فرقوں کو اور خفی اغراض و مقاصد کو جن کے تحت یہ اہتمام کیا گیا ہے تو وہی عالم حدیث سمجھ سکتا ہے جسے علوم حدیث و اسماء الرجال پر پورا عبور و بصیرت اور دسترس حاصل ہو۔ ۱۲ مترجم

اتنی بہت سی حدیثیں ثابت ہونے کے باوجود ان کو مہمل چھوڑ دینا اُن کے لئے کیونکر گوارا ہو گیا؟ حالانکہ حفاظ حدیث کا جو والہانہ شغف و اہتمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو محفوظ کرنے کے متعلق مشہور ہے اس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ جہاں تک ہوتا ان میں سے ایک حدیث بھی نہ چھوٹتی؟ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حفاظ حدیث کے چند اقوال حدیثوں کی محفوظ مقدار کے متعلق جو منقول ہیں ہم یہاں ذکر کر دیں (۱) امام احمد سے منقول ہے کہ اُنھوں نے فرمایا: کچھ اوپر سات لاکھ حدیثیں صحیح ہیں" اور حافظ ابوزرعہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: "اس نوجوان کو سات لاکھ حدیثیں زبانی یاد ہیں" اس پر امام بیہقی کہتے ہیں: امام احمد کی مراد اس تعداد سے تمام صحیح احادیث، صحابہ کے آثار اور تابعین کے اقوال (یعنے مرفوع و موقوف تمام صحیح حدیثیں سات لاکھ) ہیں (۲) حافظ ابوبکر محمد بن عمر الرازی کا قول ہے: ابوزرعہ رازی کو سات لاکھ حدیثیں یاد تھیں، اور صرف تفسیر سے متعلق اکتالیس ہزار حدیثیں ابوزرعہ کو حفظ یاد تھیں (۳) امام بخاری سے منقول ہے فرمایا: مجھے ایک لاکھ صحیح حدیثیں اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں حفظ یاد ہیں (۴) امام مسلم سے منقول ہے فرمایا: میں نے اس مسند صحیح یعنے صحیح مسلم کو اپنے مشائخ سے بلاواسطہ سُنی ہوئی تین لاکھ حدیثوں سے انتخاب کیا ہے اور حافظ ابوزرعہ کے متعلق جو منقول ہے کہ ان کو ایک لاکھ چالیس ہزار حدیثیں صرف تفسیر میں یاد تھیں اس پر آپ کے تعجب کو رفع کرنے کے لئے یہ بات کافی ہونی چاہیے کہ آیت کریمہ لتسئلن یومئذ عن النعیم میں جو نعیم کا لفظ آیا ہے اس کی تفسیر میں مفسرین نے دس قول نقل کئے ہیں جن میں سے ہر قول کو حدیث کہا جاتا ہے اُن محدثین کی اصطلاح میں جو حدیث کا لفظ عام معنی میں استعمال کرتے ہیں (اور مرفوع و موقوف دونوں کو حدیث کہتے ہیں) اسی طرح آیت کریمہ: الذین یراؤن ویمنعون الماعون میں جو ماعون کا لفظ آیا ہے اس کی تفسیر میں چھ اقوال ہیں جن میں سے پہلے قول کے سوا باقی

اقوال کو (محدثین کے عرف میں) حدیث شمار کیا جاتا ہے (۱) (اس طرح ابوزرعہ جیسے فقید العصر حافظ حدیث کو پورے قرآن عظیم کی تفسیر میں اگر ایک لاکھ چالیس ہزار اقوال یاد ہوں تو کون سے تعجب کی بات ہے)

(۲) امام بخاری کے نزدیک صحیح احادیث

فجر الاسلام کے فاضل مؤلف نے (موضوع احادیث کی مقدار بتلانے کے سلسلہ میں) دعویٰ کیا ہے کہ امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں جو احادیث جمع کی ہیں جن کی تعداد مکرر کو چھوڑ کر چار ہزار ہے یعنی کل یہ چار ہزار حدیثیں ہی ان کے نزدیک ان چھ لاکھ حدیثوں میں صحیح تھیں جو اُن کے زمانہ میں متداول اور رائج تھیں (باقی سب موضوع ہیں) مؤلف موصوف کا یہ دعویٰ علماء حدیث کے نزدیک غیر معروف اور غیر مسلم ہے بلکہ اس کے برعکس محدثین کے حلقہ میں معروف اور مسلم تو یہ ہے کہ امام بخاری نے اپنی کتاب میں وہ تمام کی تمام حدیثیں جمع نہیں کی ہیں جو ان کے نزدیک صحیح تھیں[1]

حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ اپنی مشہور و معروف تالیف مقدمۃ ابن الصلاح میں لکھتے ہیں :-

> امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی اپنی صحیح میں تمام صحیح احادیث کا استیعاب اور احاطہ نہیں کیا ہے اور نہ ہی اُنھوں نے اس کا اہتمام والتزام کیا ہے (کہ کل صحیح حدیثوں کو جمع کریں) اس لئے کہ خود امام بخاری سے منقول ہے کہ: میں نے اپنی کتاب الجامع الصحیح میں صرف صحیح حدیثوں کو ہی درج کیا (غیر صحیح اس میں کوئی حدیث نہیں باقی) طول کتاب کے اندیشہ سے میں نے بہت سی صحیح حدیثیں چھوڑ دی ہیں (ورنہ کتاب حد سے زیادہ بڑی ہو جاتی) - امام مسلم سے منقول ہے کہ: یہ بات نہیں

---

(۱) توجیہ النظر ص ۴۰، نیز دیکھئے فتح الملہم شرح صحیح مسلم ص ۲ -

[1] جیسا کہ پس صحیح خود امام بخاری کا بیان آگے آتا ہے کہ مجھے ایک لاکھ صحیح حدیثیں یاد ہیں صحیح بخاری میں محض بخوف طوالت ان میں کا ایک نہایت قلیل حصہ ذکر کر دیا ہے اور جو صحیح حدیثیں میں نے چھوڑ دی ہیں اور صحیح بخاری میں ذکر نہیں کیں وہ تو بہت زیادہ ہیں - ملاحظہ فرمائیے مقدمہ فتح الباری ص ۱۲۵ (مترجم)

ہے کہ ہر وہ حدیث جو میرے نزدیک صحیح ہے اس کو میں نے یہاں (صحیح مسلم میں) درج کر دیا ہے، میں نے تو یہاں (صحیح مسلم میں) صرف ان صحیح حدیثوں کو درج کیا ہے جن کی صحت پر محدثین کا اجماع ہے (۱)

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :-

پھر امام بخاری اور امام مسلم نے ان تمام احادیث کو جمع کرنے کا اہتمام و التزام نہیں کیا ہے جن پر (محدثین کی جانب سے) صحیح ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے کیونکہ ان دونوں اماموں نے ایسی بہت سی حدیثوں پر صحیح ہونے کا حکم لگایا ہے جو انہوں نے اپنی کتابوں (صحیح بخاری و صحیح مسلم) میں درج نہیں کی ہیں جیسا کہ امام ترمذی بالمشافہ امام بخاری سے ایسی بہت سی حدیثوں کی تصحیح (صحیح ہونا) نقل کرتے ہیں جو امام بخاری کی کتاب صحیح بخاری میں مذکور نہیں ہیں بلکہ کتب سنن وغیرہ میں مذکور ہیں (۲)

حافظ حازمی اپنی کتاب شروط الائمۃ الخمسۃ میں لکھتے ہیں :-

امام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں ہر صحیح حدیث کو درج کرنے کا اہتمام و التزام نہیں کیا ہے۔ اس کی تصدیق امام بخاری کے بیان سے ہوتی ہے جو ابوالفضل عبداللہ بن احمد بن محمد نے بسند طلحہ عن ابی سعید المالینی انبانا عبداللہ بن عدی قال حدثنی محمد بن احمد قال سمعت محمد بن حمدویہ امام بخاری سے نقل کیا ہے کہ :- "مجھے ایک لاکھ صحیح حدیثیں یاد ہیں اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں یاد ہیں"۔ نیز امام بخاری سے ہی بسند متصل دوسری روایت نقل کرتے ہیں کہ : میں نے اپنی اس کتاب میں کوئی ایسی حدیث درج نہیں کی جو صحیح نہ ہو باقی جو صحیح حدیثیں میں نے چھوڑ دیں وہ بھی بہت ہیں (۳)

---

(۱) مقدمہ علوم الحدیث ص ۱۰ (۲) اختصار علوم الحدیث ص ۹-۱۰
(۳) شروط الائمۃ الخمسہ ص ۴۷

توجبکہ یہ محققین علماء حدیث اس امر کی تصریح کر رہے ہیں کہ امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں تمام صحیح حدیثوں کا احاطہ نہیں کیا (اور نہ ہی ان کا یہ مقصد) ہے اور یہ کہ ان کو ایک لاکھ صحیح حدیثیں یاد تھیں تو ایسی صورت میں فاضل مؤلف فجرالاسلام کا امام بخاری کے متعلق فیصلہ (کہ امام بخاری کے زمانہ میں متداول سات لاکھ حدیثوں میں صرف چار ہزار صحیح حدیثیں تھیں جو انھوں نے چھانٹ کر صحیح بخاری میں جمع کر دیں باقی چھ لاکھ چھیانوے ہزار حدیثیں امام بخاری کے نزدیک صحیح نہ تھیں بلکہ موضوع تھیں) کسی طرح بھی صحیح اور قابل تسلیم نہیں ہو سکتا۔

یہ بحث و تنقیح اسی صورت میں ہے کہ مولف کے دعوے میں لفظ قالوا (لوگوں نے کہا ہے) سے علماء حدیث اور محدثین مراد ہوں (یعنے مؤلف کے بیان کو علمی اور تحقیقی معیار پر محمول کیا جائے) ورنہ اگر ان کی مراد قالوا (لوگوں نے کہا ہے) سے عوام الناس ہوں اور انھوں نے (ایک سنی سنائی بات کی طرح) قالوا اسی طرح کہہ دیا ہے جیسے طلبہ عام طور پر کہہ دیا کرتے ہیں تو یہ اور بات ہے۔ بہر حال یہ مقام علم اور تحقیق کا مقام ہے (یہاں ایسی بے سروپا باتوں کی توقع ایک محقق سے ہرگز نہیں کی جا سکتی)۔

حافظ عبداللہ بن مبارک

عبداللہ بن مبارک، اور کیا وہ مغفّل (سادہ لوح) آدمی تھے؟

مؤلف فجرالاسلام ص ۲۶۰ پر وضاعین

(حدیثیں گھڑنے والے لوگوں) پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

بعض محدثین ایسے نیک نیت (اور سادہ لوح) ہوئے ہیں کہ جو حدیث بھی ان کے سامنے آتی اسے صحیح سمجھ کر حفظ کر لیا کرتے تھے وہ بذات خود سچے اور راستگو ہوتے تھے اس لئے جو حدیث بھی (کسی سے) سنتے اس کو (دوسروں سے) بیان کر دیتے اور لوگ ان کی سچائی سے دھوکہ کھا کر اس حدیث کو قبول کر لیا کرتے تھے (حالانکہ وہ حدیث موضوع اور بے اصل ہوتی) جیسا کہ عبداللہ بن مبارک کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ خود تو ثقہ اور راست گو تھے لیکن وہ ہر آتے جاتے

(اور راہ چلتے) کی حدیث (بلاتحقیق) قبول کرلیا کرتے تھے۔

کتاب کے حاشیہ میں مؤلف موصوف اشارہ کرتے ہیں کہ:۔

"ابن مبارک کے متعلق یہ قول (اور یہ رائے) صحیح مسلم کے مقدمہ میں مذکور ہے"

مولف موصوف وضّاعین حدیث کے متعلق یہ بحث کر رہے ہیں اور یہ حدیثیں گھڑنے والے وہ لوگ ہوا کرتے تھے جو اپنی مختلف اغراض (خبیثہ) کی خاطر۔ ہم بھی وضع حدیث کے ذیل میں ان مختلف اغراض کا ذکر کر چکے ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے از خود حدیثیں گھڑ لیا کرتے تھے۔

لیکن وہ نیک نیت محدث جو ہر اُس حدیث کو جو اس کے سامنے آئے قبول کرلے (اور دوسروں سے روایت کردے) اور وہ بذاتِ خود روایت حدیث میں سچا ہو ایسے راوی حدیث کو تو کسی بھی طرح (اور کسی کے نزدیک بھی) وضاعین حدیث میں شمار نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ خود اس نے نہ سندِ حدیث میں جھوٹ بولا اور نہ متنِ حدیث میں زیادہ سے زیادہ اس کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ "بے احتیاط" ہے کہ بغیر جرح وتنقید کے اور بغیر تحقیق و تجسس کے ہر (سُنی سُنائی) حدیث کو قبول کرلیتا ہے تو ایسے راوی کی حدیث (کا حکم یہ ہے کہ اس) کو قبول کرنے میں توقف کیا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کی روایت کی تحقیق ہو جائے اگر اس نے ثقہ راویوں سے حدیث روایت کی ہو اور اس حدیث کی روایت کرنے میں دوسرے ثقہ راوی بھی اس کے ساتھ شریک اور مؤید ہوں تو اس کی روایت (اس تحقیق وتائید کے بعد) قبول کرلی جائے گی ورنہ نہیں۔

لیکن ایسے راوی حدیث کو وضاعین حدیث میں داخل کر دینا جیسا کہ مؤلف موصوف نے کیا ہے فحش غلطی ہے جو طرزِ تعبیر اور اندازِ تصنیف، دقتِ نظر اور احتیاط کے فقدان کا نتیجہ ہے۔

علاوہ ازیں وضاعین حدیث کے بحث کے ضمن میں عبداللہ بن مبارک کا تذکرہ بھی یہ تاثر پیدا کرتا ہے کہ عبداللہ بن مبارک بھی (العیاذ باللہ) وضاعین حدیث میں سے ہیں (حالانکہ ان کے متعلق جو کچھ مؤلف نے کہا ہے اگر اسے لفظ بلفظ تسلیم بھی کرلیا جائے تو ان کو زیادہ سے زیادہ غیر محتاط راوی حدیث کہا جا سکتا ہے نہ کہ وضّاع حدیث ۔ (درحقیقت مولف کی یہ وہی دسیسہ کاری ہے جس کا انھوں نے ڈاکٹر حسن علی عبدالقادر کو مشورہ دیا تھا)

یہ تو مولف موصوف کے بیان پر معروضی (بغرض تسلیم) تنقید ہے باقی موضوعی (مثبت) تنقید کے نقطۂ نظر سے مولف کے بیان کا حاصل تین باتیں ہیں :۔

اوّل! عبداللہ بن مبارک نیک نیت (اور سادہ لوح) تھے جو حدیث بھی (کسی سے) سُنتے رُواۃ حدیث کی چھان بین کئے بغیر بیان کر دیا کرتے تھے۔

دوم! لوگ ان کی راست گوئی سے دھوکہ کھا جاتے اور جو حدیثیں بھی ان سے سنتے ان کو صحیح سمجھکر قبول کر لیتے۔

سوم! جو عبارت مولف نے صحیح مسلم کے مقدمہ سے نقل کی ہے وہ عبداللہ بن مبارک ہی کے بارے میں ہے۔

(۱) فاضل مولف عبداللہ بن مبارک کے متعلق ان تینوں نظریوں کے قائم کرنے میں انتہائی فحش غلطی (بلکہ افتراء پردازی) کے مرتکب ہوئے ہیں (ذیل میں ہم دلائل و حقائق کی روشنی میں ہر نظریہ پر جداگانہ بحث کرتے ہیں)

اوّل: مولف کا یہ نظریہ کہ: عبداللہ مبارک نیک نیت اور سادہ لوح تھے جو حدیث سنتے (بلا تحقیق و تنقید) بیان کر دیا کرتے تھے، حق و حقیقت سے قطعاً بعید ہے واقعات سے اسے دور کا واسطہ بھی نہیں بلکہ اس کے بالکل برعکس عبداللہ بن مبارک تو اپنے زمانہ کے ان سخت گیر ائمہ حدیث میں سے تھے جنہوں نے رجال حدیث پر تنقید کا انتہائی شدت کے ساتھ اہتمام کیا ہے۔

امام مسلم رحمہ اللہ ہی کو لے لیجئے وہ اپنی کتاب صحیح مسلم کے مقدمہ میں رجال حدیث پر عبداللہ ابن مبارک کی تنقید کی متعدد مثالیں ذکر کرتے ہیں (اور رجال حدیث پر جرح و تنقید کے جواز کے ثبوت میں ان کو بطور سند پیش کرتے ہیں):

(۱) چنانچہ امام مسلم اپنے شیخ محمد بن قُہزاذ سے بروایت ابو اسحٰق ابراہیم بن عیسیٰ طالقانی نقل کرتے ہیں کہ ابو اسحٰق کہتے ہیں: میں نے عبداللہ بن مبارک سے کہا اے ابو عبدالرحمٰن یہ حدیث (کیسی ہے؟ صحیح ہے یا نہیں؟):

ان من البر ان تصلی لابویک مع صلوتک	بیشک نیکی کے بعد نیکی یہ ہے کہ تم اپنی نماز کے ساتھ اپنے ماں باپ کے لئے

وتصوم لهما مع صومک — نماز پڑھا کرو اور اپنے روزے کے ساتھ
÷ ÷ ÷ ÷ ان کے لئے روزے رکھا کرو۔

تو اس پر عبداللہ بن مبارک نے سوال کیا: اے ابو اسحق یہ کس راوی سے مروی ہے؟ تو میں نے کہا: شہاب بن خداش سے تو انھوں نے کہا: (شہاب تو) ثقہ ہے، شہاب نے کس سے روایت کی؟ میں نے کہا: حجاج بن دینار سے۔ انھوں نے کہا (حجاج بھی) ثقہ ہے، حجاج نے کس سے؟ میں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو عبداللہ بن مبارک بولے: اے ابو اسحاق! حجاج بن دینار کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تو اتنی طویل و عریض مسافتیں ہیں جن کو طے کرنے میں تو اونٹوں کی گردنیں بھی ٹوٹ جائیں لیکن (ماں باپ کی طرف سے) صدقہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (یعنی حجاج بن دینار تو تبع تابعی ہے اس کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کم از کم دو واسطے تو قطعی ہیں ایک تابعی دوسرے صحابی لہذا حدیث منقطع اور نا قابل قبول ہے باقی رہا اصل مسئلہ تو ماں باپ کی طرف سے صدقہ کے صحیح ہونے میں تو ائمہ مجتہدین کا کوئی اختلاف نہیں لیکن نماز اور روزہ میں اختلاف ہے جمہور کے نزدیک نہ کوئی کسی کی طرف سے نماز پڑھ سکتا ہے نہ روزہ رکھ سکتا ہے)

(۲) اسی طرح امام مسلم نے اپنے شیخ محمد بن عبداللہ بن قہزاذ سے بروایت علی ابن شقیق نقل کیا ہے کہ میں نے عبداللہ بن مبارک کو سب کے سامنے (مجمع عام میں) یہ کہتے ہوئے سنا ہے عمرو بن ثابت کی حدیثیں چھوڑ دو، (مت روایت کرو) اس لئے کہ وہ سلف صالحین (یعنی صحابہ) کو گالیاں دیا کرتا تھا۔

(۳) اسی طرح امام مسلم اپنے شیخ احمد بن یوسف کے واسطہ سے عبدالرزاق سے روایت کرتے ہیں کہ: وہ کہتے ہیں۔

میں نے عبداللہ بن مبارک کی زبان سے صاف لفظوں میں کسی کو کذاب کہتے نہیں سنا بجز عبدالقدوس شامی کے کہ عبدالقدوس کو کذاب (اعلی درجہ کا جھوٹا) کہتے سنا ہے۔

یہ تو چند مثالیں ہیں، ان کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں ہیں جن کو امام مسلم نے صحیح مسلم کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔ ان روایات سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ عبداللہ بن مبارک رجال حدیث کے بڑے زبردست نقاد تھے اور حدیثوں کی سندیں جانچنے پرکھنے میں بڑا اہتمام کیا کرتے تھے۔

(۴) اس سے بھی زیادہ صریح ابن مبارک کی وہ روایت ہے جو امام مسلم نے مقدمہ میں بواسطہ محمد بن قہزاز عباس بن ابی رزمہ سے نقل کی ہے: عباس کہتے ہیں میں نے عبداللہ بن مبارک کی زبان سے سُنا: ہمارے اور راویان حدیث کے درمیان قوائم[1] (پائے) موجود ہیں یعنی حدیث کی سندیں۔

(۵) حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں مُسیب بن واضح سے نقل کیا ہے کہ:۔

(ایک مرتبہ) عبداللہ بن مُبارک سے سوال کیا گیا: حدیث کس (قسم کے) راوی کی قبول کی جائے؟ تو میں نے ابن مبارک کی زبان سے سُنا: جو شخص اللہ

---

[1] حافظ عبداللہ بن مُبارک کی مراد قوائم سے سندیں ہیں یعنے راویان حدیث جب ہمارے سامنے کوئی حدیث بیان کرتے ہیں تو ہم اس کی سند کا مطالبہ کرتے ہیں اگر سند کے رجال ثقہ اور قابل اعتماد ہوتے ہیں تو ہم ان کی حدیث کو قبول کر لیتے ہیں ورنہ رد کر دیتے ہیں یہ ایک تمثیل ہے گویا حدیث بمنزلہ ایک تخت کے ہے اور رجال سند اس کے پائے ہیں جس طرح تخت کے استحکام کا مدار اس کے پایوں پر ہوتا ہے اسی طرح حدیث کی قوت کا مدار رجال سند کی قوت پر ہوتا ہے امام ترمذی کتاب العلل میں بسند خود عبداللہ بن مبارک کا اس سے زیادہ واضح الفاظ میں روایت کرتے ہیں۔ عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں۔

اسناد تو میرے نزدیک (اصل) دین ہے اگر اسناد نہ ہوتی تو جس کا جی چاہتا کہدیا کرتا (اور اب تو جب کسی حدیث کے راوی سے) سوال کیا جاتا ہے: تم سے یہ حدیث کس نے بیان کی (اس کا نام بتلاؤ) تو وہ حیران رہ جاتا ہے" اسی طرح امام ترمذی بسند خود عبداللہ بن مبارک کا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں: عبداللہ بن مبارک کے سامنے ایک حدیث بیان کی گئی تو اس پر فرمایا: اس کے لئے تو پختہ اینٹوں کے آثار چاہئیں"۔ یہ ہے عبداللہ بن مبارک کا تثبت اور چھان بین رجال سند اور رواۃ حدیث کے متعلق کیا اس حقیقت کے باوجود مولف فجر الاسلام کا بیان شرمناک افترا نہیں ہے؟ مترجم

کے واسطے حدیث کو حاصل کرے گا وہ اس کی اسناد کی چھان بین اور جانچ پڑتال) میں متشدد (اور سخت گیر) ہوگا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک طالب حدیث ثقہ راوی سے (حدیث حاصل کرنے کے لئے) ملاقات کرتا ہے لیکن وہ (ثقہ راوی) کسی غیر ثقہ راوی سے حدیث روایت کر دیتا ہے اور بعض اوقات کسی غیر ثقہ راوی سے ملاقات کرتا ہے مگر وہ (غیر ثقہ) جو حدیث بیان کرتا ہے اس کا راوی ثقہ ہوتا ہے اور حدیث کی سند کے تو ہر راوی کا ثقہ ہونا ضروری ہے۔" (لہٰذا صرف اپنے مروی عنہ یعنی شیخ کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کی بنیاد پر حدیث کی صحت کا فیصلہ نہ کرنا چاہیئے بلکہ پوری سند کو جانچنا پرکھنا ضروری ہے)

(۶) حافظ ذہبی نے یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ :۔

"ایک مرتبہ) عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے ایک زندیق (وضاع حدیث) کو قتل کرنے کے لئے گرفتار کرایا تو اس نے کہا : (مجھے تو تم قتل کر دو گے لیکن) جو ایک ہزار حدیثیں میں نے وضع کی ہیں (اور محدثین کے حلقوں میں متداول ہیں) ان کا تم کیا کرو گے ؟ اس پر رشید نے کہا : او خدا کے دشمن ! تو ابو اسحٰق فزاری اور حافظ عبد اللہ بن مبارک کو نہیں جانتا ؟ یہ ان کا کھوج لگا کر ایک ایک موضوع حرف نکال پھینکیں گے۔

(۷) ایک مرتبہ ابن مبارک سے کہا گیا : حضرت ان (بے شمار) موضوع احادیث کا کیا ہوگا ؟ انھوں نے جواب دیا : ان کے لئے حدیث کے ماہر نقاد اور پرکھنے والے موجود اور زندہ رہیں گے۔

(۸) حافظ ذہبی نے ابراہیم ابن اسحٰق سے نقل کیا ہے کہ :۔

میں نے عبد اللہ بن مبارک کو یہ کہتے سنا ہے : میں نے چار ہزار شیوخ سے حدیث حاصل کی ہے مگر ان میں سے صرف ایک ہزار شیوخ کی حدیثیں روایت کی ہیں (اور تین ہزار شیوخ کی حدیثوں کو چھوڑ دیا)

(حافظ عبداللہ بن مبارک کے نقد حدیث و رجال حدیث سے متعلق انتہائی اہتمام اور سخت گیری سے متعلق) ان تمام مذکورہ بالا اقوال سے مؤلف فجر الاسلام نے اس جلیل القدر امام حدیث کے متعلق جو موقف اختیار کیا ہے کہ "ابن مبارک کا دل پاک و صاف تھا یہاں تک کہ وہ جو بھی سنتے اسے چلتا کر دیا کرتے تھے۔" اس موقف کی پول بخوبی کھل جاتی ہے (کہ یہ محض افترا اور بہتان اور حدیث و ائمہ حدیث سے چھپے ہوئے عناد پر مبنی ہے)

(۲) باقی فاضل مؤلف نے جو یہ ہرزہ سرائی کی ہے کہ "ان کی ذاتی سچائی سے لوگ دھوکہ میں آجاتے تھے" یہ بھی صریح جھوٹ ہے اس لئے کہ ابھی آپ (ائمہ جرح و تعدیل کے بیانات) سن چکے ہیں کہ ابن مبارک حدیث کے اعلیٰ درجہ کے نقاد اور رجال سند کے بارے میں انتہائی سخت گیر تھے (پوری سند کے ایک ایک راوی کو پرکھے بغیر بات ہی نہیں کرتے تھے) تو جب کسی محدث میں صداقت، عدالت اور تثبت (قبول حدیث میں انتہائی احتیاط) تینوں صفتیں جمع ہو جائیں تو اس سے حدیث حاصل کرنا تو ضروری اور واجب ہو جاتا ہے اور ایسے (محتاط اور سخت گیر) محدث کے متعلق (کوئی دشمن بھی) یہ نہیں کہہ سکتا کہ "لوگ اس کی سچائی سے دھوکہ کھا جاتے تھے"

یہ تو شان ہے ابن مبارک کی، اس کے علاوہ عبداللہ بن مبارک کو ثقہ تسلیم کرنے پر (اُن کے مسلم) امام حدیث ہونے پر اور علم حدیث میں ان کی جلالت قدر پر تو تمام ہی ائمہ جرح و تعدیل کا اتفاق ہے چنانچہ:۔

(۱) عبدالرحمٰن بن مہدی کا مقولہ ہے:۔

حدیث کے امام تو بس چار ہیں (۱) سفیان ثوری (۲) مالک بن انس (۳) حماد بن زید (۴) اور عبداللہ بن مبارک۔

(۲) امام احمد بن حنبل نے عبداللہ بن مبارک کے بارے میں کہا ہے:

عبداللہ بن مبارک کے زمانہ میں اُن سے زیادہ حدیث کی تلاش و جستجو کرنے والا اور کوئی نہیں تھا وہ (اوصاف محدثین کی) عظیم خوبیوں کے مالک تھے اور (روایت حدیث میں) ان کی بہ نسبت کم لغزشوں والا کوئی نہ تھا وہ (حقیقی معنی میں) بڑے محدث تھے (غایت احتیاط کی بنا پر) حدیثیں (اپنی) کتاب سے بیان

کیا کرتے تھے (صرف حافظہ پر اعتماد نہیں کرتے تھے)

(۳) یحییٰ بن معین کہتے ہیں :۔

ابن مبارک انتہائی زیرک، انتہائی محتاط اور ثقہ محدث تھے، (صحیح معنی میں) حدیث کے عالم تھے، صحیح حدیثیں ہی روایت کیا کرتے تھے۔

(۴) محمد بن سعید طبقات ابن سعد میں لکھتے ہیں :۔

ابن مبارک ثقہ تھے، (غلطیوں سے) محفوظ تھے، (حدیث کے باب میں) حجت تھے، کثیر الحدیث تھے (یعنے کثرت سے حدیثیں بیان کیا کرتے تھے)

(۵) ابو عبداللہ حاکم نے ابن مبارک کے بارے میں کہا ہے :

ابن مبارک اپنے عہد میں تمام روئے زمین کے امام تھے اور (علماء و محدثین کے طبقہ میں) علم حدیث میں، زہد و تقویٰ میں، شجاعت و سخاوت میں سب سے بڑھکر تھے

(۶) امام نسائی نے ابن مبارک کے متعلق کہا ہے :۔

ہمارے علم میں ابن مبارک کے زمانہ میں ان سے زیادہ حدیث کا عالم اور نہ ہی ہر یہ . یدہ خصلت کا ان سے زیادہ جامع کوئی نہیں تھا

(۷) امام نووی شرح صحیح مسلم میں ان کا ترجمہ (حالات) لکھنے کے بعد کہتے ہیں :

ابن مبارک کی جلالت قدر، امامت حدیث، علو ئے مقام اور رفعت مرتبہ پر تمام علما کا اجماع ہے (۱)

تو ایک ایسا شخص جس کے تثبت فی الحدیث، جودت حدیث اور روایت حدیث میں لغزشوں کی قلت پر چوٹی کے ناقدین حدیث اور سر فہرست ائمہ جرح و تعدیل متفق ہوں انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ آخر زمانہ میں ایک شخص اٹھے اور اس کے بارے میں لکھ مارے کہ :۔ لوگ ان کی سچائی

---

(۱) ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ نے اپنی کتاب مقدمہ جرح و تعدیل میں حافظ عبداللہ مبارک کا نہایت سیر حاصل اور مستقل ترجمہ لکھا ہے جس کے ذیل میں ابن مبارک کے متعلق علماء حدیث کی تعریفیں نقل کی ہیں اور رواۃ حدیث اور نقد رجال کے متعلق ان کے وسیع علم پر مبسوط بحث کی ہے۔

سے دھوکہ کھا کر ان کی حدیثوں کو قبول کر لیا کرتے تھے" (کتنا عظیم افتراء اور علمی بددیانتی ہے)

ایک اور عجیب بات! ائمہ جرح و تعدیل کا عبداللہ بن مبارک کی امامت حدیث، علوم ثبت اور حدیث میں اعلیٰ وارفع مقام کا متفقہ اقرار و اعتراف ہی خود اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ مؤلف فجر الاسلام نے جو اُن پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ "ہر سُنی سُنائی حدیث کو بیان کر دیا کرتے تھے" قطعاً بے بنیاد (اور افتراء محض ہے) اس لئے کہ:

(۱) امام مسلم بسند خود امام مالک سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: جو شخص ہر سنی سنائی بات (دوسروں سے) بیان کر دیتا ہو وہ جھوٹ سے نہیں بچ سکتا۔

(۲) عبدالرحمٰن بن مہدی سے منقول ہے کہ: کوئی محدث حدیث کا ایسا امام جس کی محدثین پیروی کریں اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اپنی سُنی ہوئی حدیثوں میں سے کچھ نہ کچھ حدیثیں (جن میں ذرا سا بھی شبہ ہو) بیان کرنے سے نہ رُکے۔

ان اقوال کے علاوہ اور بھی محدثین کے بہت سے اقوال ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ محدثین اس وقت تک کسی محدث کی امامت کا اعتراف نہیں کرتے جب تک کہ اس کے متعلق یہ ثابت نہ ہو جائے کہ جو حدیثیں اسے یاد ہیں ان کی پوری چھان بین کر لی ہے اور جو حدیثیں وہ روایت کرتا ہے اُن پر خوب اچھی طرح غور و فکر کر لیتا ہے اور ہر سُنی سُنائی حدیث کو وہ بیان نہیں کرتا (اور ابن مبارک کی امامتِ حدیث کو تمام محدثین اور ائمہ جرح و تعدیل متفقہ طور پر تسلیم کرتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ ابن مبارک مؤلف فجر الاسلام کے علی الرغم ان تمام کمالات کے مالک ہیں)

(۳) مؤلف فجر الاسلام عبداللہ بن مبارک کے متعلق حاشیہ میں مقدمہ صحیح مسلم کی جو عبارت نقل کی ہے اس کو دیکھ کر تو انسان مؤلف کی اس عجیب و غریب حرکت پر ششدر رہ جاتا ہے (اور علمی امانت و دیانت اپنا سر پیٹ لیتی ہے) صحیح مسلم کے مقدمہ کی عبارت اس طرح ہے:

وحدثنی ابن قھزاذ قال سمعت وھباً یقول عن سفیان عن

(امام مسلم کہتے ہیں) اور مجھ سے ابن قہزاد نے بیان کیا کہ مجھ سے وھب نے بواسطہ سفیان، ابن مبارک

عبد اللہ بن مبارک قال: بقیۃ	کا یہ قول نقل کیا کہ ابن مبارک نے کہا: "بقیہ زبان
صدوق اللسان ولکنہ یاخذ عمن	کا تو سچا ہے لیکن ہر چلتے پھرتے سے حدیث لے لیتا ہے
اقبل وادبر۔	

اس عبارت کو پڑھکر آپ کو (اور ہر قاری کو) ذرہ برابر بھی اس میں شک یا تردد نہ ہوگا کہ یہ ابن مبارک کی رائے ہے (مشہور محدث) بقیہ کے متعلق جو ان کے زمانہ میں ایک محدث تھے لیکن مولف فجر الاسلام اس نص (صریح عبارت) کو (دانستہ یا نادانستہ طور پر) عبد اللہ بن مبارک کے متعلق سمجھ بیٹھے کہ یہ ابن مبارک کے متعلق (سفیان کی) رائے ہے اور عبد اللہ مبارک ان اوصاف کے ساتھ موصوف ہیں حالانکہ سند کا (مذکورہ بالا) سیاق ان کو ایسا سمجھنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کیونکہ سلسلہ سند اس طرح ہے عن سفیان عن ابن المبارک قال تو دیکھئے قال کا فاعل ابن المبارک ہیں لہذا ابن مبارک تو قائل اور رائے قائم کرنے والے ہوئے نہ کہ وہ شخص جس کے متعلق یہ بات کہی جا رہی ہے (وہ شخص تو بقیہ ہیں)

علاوہ ازیں صحیح مسلم کی (مذکورہ بالا) عبارت میں لفظ بقیہ ہے نہ کہ ثقۃ کیونکہ ابن المبارک بقیۃ بن الولید محدث حمصی کے متعلق کلام کر رہے ہیں اور بقیہ حمصی ہی میں وہ صفات پائی جاتی ہیں جو ابن المبارک نے بیان کی ہیں۔ اس کی تائید خود امام مسلم کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو تھوڑا سا آگے چلکر ابو اسحٰق فزاری کے واسطہ سے ذکر کی ہے وہ یہ ہے۔

اکتب عن بقیۃ ما روی	بقیہ کی وہ حدیثیں لکھو جو وہ معروف راویوں سے
عن المعروفین ولا تکتب عنہ	روایت کرتے ہیں اور وہ حدیثیں مت لکھو جو وہ
ما روی عن غیر المعروفین	غیر معروف راویوں سے روایت کرتے ہیں۔

نیز اس کی تائید عبد اللہ بن المبارک کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ذہبی نے بقیہ کے بارے میں خود ابن المبارک سے نقل کیا ہے کہ:۔

> بقیہ ضعیف راویوں سے تدلیس کرتے ہیں (یعنے بصیغۂ عن روایت کر کے ان ضعیف راویوں کو چھپا لیتے ہیں) اور ہر کس وناکس سے حدیث روایت کر دیتے ہیں۔

معنی کے اعتبار سے یہ بالکل وہی رائے ہے جو امام مسلم نے بقیہ کے متعلق بیان کی ہے
اس تحقیق و تنقیح کے بعد یہ حقیقت قطعی طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ صحیح مسلم کی (مذکورہ بالا)
عبارت میں مؤلف فجر الاسلام نے دو غلطیاں ضرور کی ہیں۔
(۱) ایک یہ کہ مؤلف نے یہ گمان کر لیا (خدا جانے کیوں؟ اور کیسے؟) کہ یہ (عبارت)
ابن المبارک پر کلام (جرح) ہے جو کسی اور شخص (سفیان) نے کی ہے حالانکہ یہ کلام (جرح)
ابن المبارک کا ہے دوسرے شخص (یعنی بقیہ) کے بارے میں۔
(۲) دوسرے یہ کہ وہ صحیح مسلم کی عبارت میں تقیہ کا لفظ نقل کرتے ہیں حالانکہ صحیح مسلم میں
لفظ بقیہ ہے (جس کا جی چاہے صحیح مسلم کھول کر دیکھ لے)
تجزیہ: ان (دانستہ یا نادانستہ) غلط کاریوں کی وجہ تین کے سوا چوتھی نہیں ہو سکتی۔
(۱) یا تو یہ کہ مولف صحیح مسلم میں خود اس عبارت کو سمجھ نہیں سکے اس لئے ان سے
یہ غلطی سرزد ہو گئی۔
(۲) یا یہ کہ عبارت کو سمجھ تو گئے ہیں لیکن اپنی مطلب برآری (یعنی ابن المبارک کو بدنام
کرنے) کی غرض سے عبارت میں عمداً یہ تحریف کی ہے۔
(۳) یا یہ کہ انھوں نے کسی (گولڈ زیہر جیسے) مستشرق کی کتاب میں یہ مسخ شدہ عبارت دیکھ
لی ہے اور شریعت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے ان دشمنوں کی اس نقل پر ہی
اکتفا کر لیا ہے (اور خود صحیح مسلم کی مراجعت کی زحمت گوارا نہیں کی)
میں (ازراہ نیک نیتی) اس آخری وجہ کو ہی ترجیح دیتا ہوں (کہ مؤلف نے صحیح مسلم کی مراجعت
کئے بغیر کسی مستشرق کی کتاب سے عبارت نقل کر دی ہے) کیونکہ صحیح مسلم کی صریح عبارت اتنی
واضح اور کھلی ہوئی ہے کہ مؤلف (جیسے ادیب اور صاحب طرز مصنف) سے قطعاً بعید ہے کہ وہ
صحیح مسلم کی اس عبارت کو نہ سمجھیں اور یہ بھی مصنف سے بعید معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسی مشہور و
معروف کتاب کی عبارت میں جس سے کسی مسلمان عالم کا گھر خالی نہیں ہو سکتا عمداً تحریف
کرنے کی جسارت کریں۔
میں نے صحیح مسلم کے بہت سے مطبوعہ نسخوں کی مراجعت کی کہ شاید کسی نسخہ میں یہ عبارت

جیسا کہ مؤلف نے نقل کی ہے، غلطی سے چھپ گئی ہو تو کسی درجہ میں مصنف کے لئے عذر اور صفائی کا سامان پیدا ہو جائے اگرچہ پھر بھی کلام کا سیاق و سباق مؤلف کے اختیار کردہ مفہوم کی تغلیط و تردید کر رہا ہے۔ لیکن صحیح مسلم کے تمام کے تمام مطبوعہ نسخوں میں بلا کسی تحریف (یا طباعت کی غلطی) کے (مذکورہ بالا) صحیح عبارت ہی موجود ہے۔

اس لئے میرے نزدیک یہی وجہ قابل ترجیح ہے کہ اسلام کے دشمنوں (مستشرقوں) میں سے کسی نہ کسی دشمن نے یہ تحریف کی ہے خواہ عمداً حدیث کے اتنے بڑے اور ایسے جلیل القدر امام کی سیرت وصورت کو بگاڑنے اور مسخ کرنے کی غرض سے ایسا کیا ہو جیسا کہ گولڈ تسیہر نے امام زہری کے ساتھ کیا ہے (جس کی تفصیل آپ ساتویں فصل میں پڑھیں گے)، یا پھر اس مستشرق سے (از راہ جہل) غلطی ہوئی ہے کہ لفظ بقیہ کو اس نے نقۃ پڑھ لیا کیونکہ لکھنے میں دونوں لفظ ایک ہی جیسے لکھے جاتے ہیں (صرف نقطوں کا فرق ہے)

باقی دیکھنا یہ ہے کہ اس مستشرق کو تو ہم اس لئے معذور سمجھ لیں کہ وہ عجمی ہے (اس کی زبان عربی نہیں ہے)، یا وہ اسلام کا وفادار (یعنے مسلمان) نہیں ہے یا عربی کا ذوق نہیں رکھتا جس سے سیاق و سباق کلام سے اس کے صحیح معنی اور مفہوم کو سمجھ سکے تو مولف فجر الاسلام کے پاس اس جاہل اور دشمن اسلام کے قدم بقدم چلنے (اور اس کے بیان کو وحی آسمانی سمجھکر اس طرح ایمان لے آئیں کہ صحیح مسلم کی مراجعت تک گوارا نہ کریں) کے لئے کیا عذر ہے (اور ان کے پاس اپنی براءت پیش کرنے کی کیا گنجائش ہے)، خصوصاً جبکہ وہ اس عبارت کی بنیاد پر ہی ایک مانے ہوئے جلیل القدر امام حدیث اور ناقد اسانید و رجال کے متعلق ایک انتہائی خطرناک اور فاسد رائے قائم کرنا چاہتے ہیں۔

وہ حدیثیں جنکے متعلق مؤلف فجر الاسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ موضوع ہیں

دروازے بند کرنیکی حدیث

اس کے بعد مؤلف نے ص ۲۶۰ پر ان امور سے بحث کی ہے جو وضاعین حدیث کو حدیثیں گھڑنے پر آمادہ کرنے کا باعث ہوئے۔ ان امور میں سب سے پہلا سبب انھوں نے حضرت علی اور حضرت ابوبکر کے، حضرت علی اور حضرت معاویہ کے، حضرت عبد اللہ بن زبیر اور عبد الملک بن مروان کے اور اس کے بعد بنو امیہ

اور بنو عباس کے درمیان باہمی نزاع اور سیاسی خصومت کو بتلایا ہے۔

مؤلف کا یہ تجزیہ بالکل واضح ہے نہ اس میں کوئی خفا ہے اور نہ اس میں کسی کو کلام ہو سکتا ہے اس کے بعد مؤلف ابن ابی الحدید کا بیان نقل کرتے ہیں جس میں اس نے تصریح کی ہے کہ:۔

> اصل جھوٹ (اور سب سے پہلا جھوٹ) فضائل کی حدیثوں میں آیا ہے اور شیعوں کی جانب سے آیا ہے تو جب حضرت ابوبکر کے حامیوں نے شیعوں کی اس کارستانی کو دیکھا تو اُنھوں نے بھی ان حدیثوں کے مقابلہ میں حضرت ابوبکر کی فضائل میں حدیثیں بناڈالیں مثلاً یہ حدیث:
>
> | | |
> |---|---|
> | لو کنت متخذ اخلیلا لاتخذت ابا بکر خلیلا | اگر میں کسی کو اپنا دوست بناتا تو ابوبکر کو دوست بناتا۔ |
>
> حضرت ابوبکر کے حامیوں نے یہ حدیث اس حدیث کے مقابلہ میں بنائی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (مہاجرین وانصار کے درمیان مواخات قائم کرنے کے موقعہ پر) حضرت علی کو اپنا بھائی بنایا ہے۔
>
> اسی سلسلہ میں (حضرت ابوبکر کے حق میں) دروازے بند کرنے کی حدیث بھی وضع کی گئی ہے جو درحقیقت حضرت علی کے حق میں تھی لیکن حضرت ابوبکر کے حامیوں نے اس کو حضرت ابوبکر کے حق میں بدل ڈالا الخ

اس میں تو کسی شک وشبہ کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی کہ ابن ابی الحدید ان دونوں حدیثوں کو موضوع قرار دینے میں معذور ہے اس لئے کہ وہ معتزلی بھی ہے اور شیعہ بھی اور اپنی شیعیت کے باعث وہ تعصب سے کام لینے پر مجبور ہے لیکن (اس سلسلہ میں) ہم ابن ابی الحدید پر گرفت نہ کرنے (اور سکوت اختیار کرنے) میں استاذ احمد امین کے پاس کوئی عذر نہیں پاتے بجز اس کے کہ ہم یہ کہیں کہ وہ بھی اس معاملہ میں ابن ابی الحدید کے ساتھ متفق ہیں کہ یہ دونوں حدیثیں موضوع ہیں حالانکہ یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں ائمہ حدیث نے ان کی تخریج کی ہے۔

(۱) پہلی حدیث کو امام بخاری نے صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس اور حضرت ابن الزبیر

سے روایت کیا ہے اور امام مسلم نے صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے (یعنے چار تو صرف صحابی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حدیث کے روایت کرنے والے تابعین اور تبع تابعین کا تو کہنا ہی کیا ہے)

(۲) دوسری حدیث جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر کی کھڑکی کے علاوہ سب دروازے بند کر دینے کا حکم دیا ہے اس کو بھی امام بخاری نے حضرت ابو سعید اور حضرت ابن عباس سے صحیح بخاری میں روایت کیا ہے اور امام مسلم نے حضرت ابو سعید، حضرت جندب اور حضرت ابی ابن کعب سے صحیح مسلم میں روایت کیا ہے نیز ان دونوں حدیثوں کو امام بخاری اور امام مسلم کے علاوہ امام مالک نے امام ترمذی نے حافظ طبرانی نے امام احمد نے حافظ ابن عساکر نے اور ابن حبان وغیرہ نے (اپنی اپنی کتابوں میں) بھی روایت کیا ہے۔

باقی شیعوں کی وہ حدیث جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور حضرت علی کے درمیان مواخات کرائی تھی تو نہ یہ حدیث کسی قابل اعتماد صحیح سند سے مروی ہے اور نہ اس حدیث کا مستند کتب حدیث میں سے کسی کتاب میں ذکر ہے اور نہ ہی کسی ثقہ اور قابل اعتماد راوی حدیث نے اس کو روایت کیا ہے چنانچہ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

> یہ حدیث تمام ائمہ حدیث کے نزدیک موضوع ہے جن علماء کو حدیث کی ذرا سی بھی پہچان ہے ان میں سے کسی کو بھی اس میں شک نہیں ہے کہ یہ حدیث گھڑی ہوئی ہے اور اس کا گھڑنے والا قطعاً جاہل اور ایسا جھوٹا ہے جس کا جھوٹ بالکل کھلا ہوا اور واضح ہے (۱)

باقی دروازے بند کرنے کی وہ حدیث جس کو شیعہ راوی روایت کرتے ہیں اور اس میں حضرت علی کے دروازے کا استثناء ذکر کرتے ہیں (کہ حضرت علی کے دروازے کو چھوڑ کر باقی تمام دروازے بند کر دو) تو اس حدیث کو بھی اکثر و بیشتر ناقدین حدیث موضوع بتلاتے ہیں۔

ابن جوزی، عراقی، ابن تیمیہ وغیرہ ائمہ و حفاظ حدیث نے اس حدیث پر موضوع ہونے کا حکم لگایا ہے۔

---

(۱) منہاج السنۃ ج ۴ ص ۹۶

بفرض محال اگر یہ حدیث صحیح بھی تسلیم کرلی جائے تو علماء حدیث نے اس کے جوابات دیئے ہیں (اور تطبیق و توفیق کی صورتیں بیان کی ہیں) جن کو حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں بیان کیا ہے (جن کا حاصل یہ ہے) کہ:۔

ابتداءً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بجز حضرت علی کے دروازے کے باقی سب دروازے بند کرنے کا حکم دیا تھا جب سب دروازے بند کر دیئے گئے تو لوگوں نے قریب سے مسجد میں داخل ہونے کی غرض سے دریچے کھول لئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کے دریچے کے علاوہ باقی تمام دریچوں کو بھی بند کر دینے کا حکم دیا (اور حضرت ابوبکر کے دریچے اور حضرت علی کے دروازے کے علاوہ تمام مسجد کی طرف کھلنے والے دریچے اور دروازے بند کر دیئے گئے لہذا دونوں حدیثیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں اور ان میں کوئی تعارض یا تضاد نہیں ہے) باقی حضرت ابوبکر سے متعلق جو بعض حدیثوں میں دروازے کا لفظ آیا ہے اس کو (یہ حضرات) دریچہ پر محمول کرتے ہیں تاکہ (حضرت علی سے متعلق) دوسری روایات کے ساتھ مطابقت و موافقت پیدا ہو سکے (اور تعارض دور ہے)

اس کے بعد حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

یہ توجیہہ وہ طریق (تطبیق) ہے جس سے دونوں قسم کی حدیثوں کو جمع کر لینے میں کوئی حرج نہیں چنانچہ امام جعفر طحاوی نے اپنی کتاب مشکل الآثار میں اور امام ابوبکر کلاباذی نے معانی الاخبار میں اسی طریق پر دونوں حدیثوں میں تطبیق دی ہے اور تصریح کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے مکان کا دروازہ مسجد کے باہر تھا اور دریچہ مسجد کے اندر کھلتا تھا۔ اور حضرت علیؓ کے مکان کا صرف ایک ہی دروازہ تھا جو مسجد کے اندر کھلتا تھا اور کوئی دوسرا دروازہ یا دریچہ نہ تھا۔

فضائل کی حدیثیں

فجر الاسلام کے صفحہ ۲۶۱ پر مؤلف احمد امین لکھتے ہیں:۔

"بہت سی حدیثیں — جنہیں آپ (کتب حدیث میں) پڑھتے ہیں — غازی کرتی

ہیں کہ وہ بلاشبہ اموئیوں یا عباسیوں یا علویوں کی تائید میں یا ان کو گرانے (اور ذلیل کرنے) کی غرض سے گھڑی گئی ہیں، اسی کے تحت وہ احادیث بھی آتی ہیں جن کو گھڑنے والوں نے (مختلف) قبیلوں کے فضائل میں گھڑا ہے چنانچہ کتنی بہت سی حدیثیں ہیں جو قریش کے، انصار کے جہینہ اور مزینہ کے فضائل میں گھڑی گئی ہیں یہی حال شہروں (اور ملکوں) کی حمایت اور طرفداری کا ہے چنانچہ آپ کوئی بھی بڑا شہر ایسا نہ پائیں گے جس کی فضیلت میں ایک یا دو نہیں بلکہ کئی کئی حدیثیں نہ ہوں چنانچہ مکہ، مدینہ، اُحد، حجاز، یمن، شام، بیت المقدس، مصر، فارس وغیرہ شہروں اور ملکوں میں سے ہر ایک کی فضیلت میں متعدد حدیثیں موجود ہیں" الخ

(یہ حقیقت ہے کہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے سرفروش صحابہ کے درمیان زندگی بسر فرمائی ہے جو ہر وقت اپنی جانیں اور مال آپ پر قربان کرنے کے لئے تیار رہتے اور قربان کرتے تھے لیکن اس فدائیت، جاں نثاری اور خداداد خوبیوں میں وہ سب یکساں نہ تھے بلکہ ان کے درمیان کافی تفاوت اور فرقِ مراتب تھا بالکل اسی طرح جیسے اسلام کی دعوت پر لبیک کہنے میں وہ ایک دوسرے سے مختلف تھے (اور اس اعتبار سے بھی ان میں فرقِ مراتب تھا) ایسی صورت میں، اس میں کونسے تعجب کی بات ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بعض (جاں نثار) صحابہ کی خصوصیت کے ساتھ تعریف فرمائیں یا ان کے متعلق اپنی خوشنودی کا اظہار فرمادیں یا ان کی ایسی خداداد خوبیوں کا ذکر فرمادیں جن سے (دوسروں کے مقابلہ میں) ان کی فضیلت اور (عنداللہ) ان کے مرتبہ کا اظہار ہوتا ہو یہی بات (اشخاص کی طرح، مقامات اور امکنہ کے متعلق کہی جاسکتی ہے چنانچہ) ہم مکہ کے بارے میں یہی بات کہہ سکتے ہیں جہاں سے دعوت اسلام کی ابتدا ہوئی، مدینہ کے بارے میں جہاں (سب سے پہلے روئے زمین پر) اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی گئی اور بیت المقدس کے بارے میں جس کی خدا نے بھی اپنی کتاب (قرآن) میں تعریف فرمائی ہے اور ان کے علاوہ اُن شہروں اور قبیلوں کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے جن کے باشندے امورِ خیر (یعنے ایمان و اسلام) کی طرف انتہائی سرعت کے ساتھ بڑھے اور ان کے فرزندوں نے اللہ کے راستہ میں اور اسلام کی راہ

میں دوسروں سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

جیسا کہ یہ بھی قطعاً ممکن ہے ۔ بلکہ واقعتاً ایسا ہو بھی چکا ہے ۔ کہ متعصب اور جاہل مسلمانوں نے اپنے سرداروں، یا شہروں یا قبیلوں کے فضائل میں (از خود) حدیثیں گھڑلی ہوں اور صحیح احادیث میں ان میں سے کسی کے جو فضائل بیان ہوئے ہیں ان میں اضافہ کر لیا ہو یا از خود ایسے فضائل گھڑ لئے ہوں جو کسی بھی صحیح حدیث میں نہیں آئے۔

فضائل کی حدیثوں میں یہ دونوں احتمال ایسے یقینی ہیں جن میں کسی کو بھی نزاع یا اختلاف نہیں ہو سکتا چنانچہ بعض شخصیتوں شہروں اور قبیلوں کے فضائل میں صحیح حدیثیں موجود ہیں (اور ہونی چاہئیں یہی عقل کا تقاضا ہے) اور فضائل کے ہی باب میں جھوٹی حدیثوں کے وجود سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ایسی صورت میں ایک انصاف پسند عالم اور محقق کی شان یہ ہوا کرتی ہے کہ وہ نہ سب ہی احادیث فضائل کی تصدیق و تصویب میں جلد بازی سے کام لیتا ہے اور نہ ان سب کی تکذیب و تردید میں ہی جلد بازی سے کام لیتا ہے۔ ایسی حدیثوں میں فی الجملہ جھوٹ کا وجود اس کو نہ اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ سب ہی فضیلت کی حدیثوں کو جھٹلانے لگے اور نہ اس پر آمادہ کرتا ہے کہ فضائل میں بعض صحیح حدیثوں کے موجود ہونے کی وجہ سے سب ہی فضائل کی حدیثوں کو صحیح تسلیم کر لے۔

علماء حدیث نے سچی اور صحیح، جھوٹی اور غلط حدیثوں کے پہچاننے کے کچھ طریقے تجویز کئے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ سند اور متن دونوں کی (علم اصول حدیث کے قواعد کی روشنی میں) جانچ پڑتال کی جائے اور جو حدیث سند اور متن دونوں کے اعتبار سے معیار صحت پر پوری اترے اسے صحیح کہا جائے اور جو حدیث صحیح ثابت نہ ہو اسے رد کر دیا جائے۔

اس قسم کے حالات میں (جرح و تنقید کا) یہی طریقہ معقول بھی ہے اور جب ہمارے علماء حدیث کو حدیثوں کی اس ہولناک کثرت سے نمٹنا پڑا ہے تو انھوں نے بھی یہی معقول طریقہ اختیار کیا ہے خصوصاً ایسی احادیث کے بارے میں جو فضائل سے متعلق تھیں چنانچہ کافی بحث و تمحیص اور چھان بین کے بعد فضائل سے متعلق احادیث کی خاصی بڑی تعداد کو صحیح قرار دے کر انھوں نے

اپنی تصانیف میں درج کیا ہے مثلاً امام بخاری کی صحیح بخاری ہی کو لیجئے۔ جس کے بارے میں فجرالاسلام کے مولف خود اعتراف کرتے ہیں کہ "صحیح بخاری حدیث کی تمام کتابوں میں سب سے زیادہ صحیح کتاب ہے اس میں حدیثیں درج کرنے میں سب سے زیادہ دقّت نظر اور باریک بینی سے کام لیا گیا ہے اور نقدِ حدیث و رجالِ حدیث کے بارے میں امام بخاری سب سے زیادہ سخت گیر اور نقشہ دپسند ہیں۔ اس صحیح بخاری میں امام بخاری نے (فضائل سے متعلق متعدد ابواب علیحدہ علیحدہ قائم کئے ہیں اور ان میں وہ احادیث درج کی ہیں جو انصار و مہاجرین کے فضائل سے متعلق امام بخاری کے معیار تنقید پر صحیح ہیں، اسی طرح ان دونوں گروہوں کے بعض افراد کے ناموں سے مثلاً ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، سعدؓ، اُبیؓ، معاذؓ اور بہت سے بڑے بڑے صحابہ کے فضائل میں جو صحیح احادیث موجود ہیں مستقل ابواب کے تحت بیان کی ہیں اسی طرح مکہ، مدینہ، یمن اور شام وغیرہ شہروں کے فضائل میں جو صحیح احادیث وارد ہیں مستقل ابواب کے تحت بیان کی ہیں، اسی طرح قریش، مزینہ اور جہینہ وغیرہ قبائل کے فضائل میں بھی امام بخاری نے مستقل ابواب کے تحت حدیثیں بیان کی ہیں۔ اسی طرح دوسرے ائمہ حدیث مثلاً امام احمد، امام مسلم امام ترمذی وغیرہ کے معیار پر جو فضائل کی حدیثیں صحیح ثابت ہوئیں ان کو انھوں نے اپنی اپنی کتابوں میں مستقل ابواب کے تحت نام بنام درج کیا ہے۔

اتنا ہی نہیں کیا بلکہ اسی کے ساتھ ان حضرات نے فضائل کی ان احادیث کی بھی مدلل طریقہ پر نشاندہی کی جو گھڑی ہوئی ہیں۔ اور ان کے راویوں کا حال بھی خوب اچھی طرح بے نقاب کیا ہے اور ان پر نہایت دقیق جرح و تنقید بھی کی ہے نیز ان ائمہ حدیث نے ان اسباب و وجوہ اور حالات پر بھی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے جو ان احادیث کے گھڑنے کا محرک ہوئے ہیں۔

(یہ وہ روشن حقائق ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا) پھر آخر وہ کیا چیز ہے جس کے باعث مولف فجرالاسلام ان واضح حقائق سے انجان بن جاتے ہیں اور ایک سرے سے فضائل کی تمام حدیثوں میں شک و شبہ پیدا کرنے لگتے ہیں؟ بلاشبہ یہ انداز تحقیق (سنت کے خلاف) مستشرقین کی وہ سوچی سمجھی پالیسی ہے جس کی تفصیل آپ آئندہ اوراق میں (ساتویں فصل میں) پڑھیں گے اسی پالیسی کی پیروی پروفیسر احمد امین نے کی ہے، خدا ہی مددگار ہے۔

امام ابوحنیفہ کی حدیثیں

اس کے بعد مؤلف فجر الاسلام صفحہ ۱۶۲ پر وضع حدیث کا دوسرا محرک کلامی اور فقہی اختلافات کو قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> اور اسی طرح آپ فقہ میں کوئی بھی ایسا اختلافی مسئلہ نہیں پائیں گے جس میں موافق و مخالف ہر دو صورتوں کی تائید میں حدیثیں موجود نہ ہوں ایک حدیث اس کی تائید کر رہی ہے تو دوسری حدیث اس کی یہاں تک کہ امام ابوحنیفہ کے مذہب کی تائید میں بھی بکثرت حدیثیں موجود ہیں جن کے متعلق علماء نقل کرتے ہیں کہ: امام ابوحنیفہ کے پاس تو صرف چند حدیثیں تھیں، مشہور مورخ ابن خلدون نے ان کی تعداد سترہ بتلائی ہے حالانکہ ان کی کتابیں بے شمار حدیثوں سے بھری پڑی ہیں اور بعض اوقات تو ان حدیثوں کی عبارت (حدیث کی عبارت کی بہ نسبت) فقہی عبارت کے بہت زیادہ مشابہ[۱۵] ہوتی ہے۔

فقہی اور کلامی اختلافات کا وضع حدیث پر اثر تو ضرور پڑا ہے اس سے تو ہم انکار نہیں کرتے چنانچہ تحریک وضع حدیث اور اس کے اسباب و محرکات پر بحث کے دوران ہم اس طرف اشارہ بھی کر چکے ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ کہ امام ابوحنیفہ کے پاس صرف سترہ حدیثیں صحیح تھیں اور اس دعوے کو علماء کی طرف منسوب کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں[۱۶] ہو سکتا۔ اس دعوے میں (اور اس سے فقہی اور کلامی احادیث کے

---

[۱۵] جس سے پتہ چلتا ہے کہ دراصل وہ فقیہ کی عبارت ہے۔ مخالفین کو مرعوب اور خاموش کرنے کی غرض سے سلسلہ سند کا اضافہ کر کے اسے حدیث مرفوع بنا دیا ہے۔ استغفر اللہ بالکل یہی بات استشراقی امام گولڈ زیہر نے کہی ہے ملاحظہ فرمائیے العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام ص ۵۰ بحوالہ الدفاع عن العقیدۃ والشریعہ صفحہ ۰۰ اسی لئے پاکستان کے پروفیسر احمد امین یعنی ڈاکٹر فضل الرحمٰن فقہی اور کلامی احادیث کو مشکوک اور ناقابل اعتماد یعنی گھڑی ہوئی قرار دیتے ہیں ملاحظہ فرمائیے ماہنامہ فکر و نظر بابت ماہ ـــــــ ۰۰ ۱۲ مترجم

[۱۶] اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ سترہ حدیثوں کا تذکرہ مورخ ابن خلدون کے علاوہ دنیا کا کوئی بھی تذکرہ نگار یا علم اسماء الرجال کا ماہر امام ابوحنیفہ کے متعلق سترہ حدیثوں کا ذکر نہیں کرتا اور ابن خلدون بھی اس قول کا حوالہ مطلق نہیں دیتے

(باقی صفحہ ۴۶۶ پر)

موضوع ہونے پر استدلال کرتے ہیں) مؤلف نے عمداً حق کی جانب کو چھوڑا ہے اور علماء محققین کے راستہ سے یقیناً ہٹ گئے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب مسائل کی تفریعات اور احکام فقہیہ کے استخراج کے لحاظ سے تمام فقہی مذاہب میں سب سے زیادہ وسیع مذہب ہے یہاں تک کہ امام ابوحنیفہ سے جو مسائل منقول اور مروی ہیں ان کی تعداد لاکھوں تک پہونچتی ہے اور یہ ہرگز عقل میں آنے والی بات نہیں ہو سکتی کہ ابوحنیفہ صرف احکام کی چند آیات اور کچھ اوپر دس حدیثوں سے لاکھوں مسائل واحکام نکال سکتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ امام ابوحنیفہ نے یہ تمام احکام فقہیہ قیاس کے ذریعہ نکالے ہیں، تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ (بیشک امام ابوحنیفہ نے کتاب وسنت کی نص اور صحابہ کے کسی قول (اثر) کے موجود نہ ہونے کی صورت میں قیاس سے احکام نکالے ہیں مگر اس کے باوجود) امام ابوحنیفہ کے رفقاء اور تلامذہ نے جو حدیثیں امام ابوحنیفہ سے (بسند صحیح) مسانید ابوحنیفہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶۵) بلکہ یقال — کہا جاتا ہے — کے الفاظ سے ذکر کرتے ہیں جو اس قول کے ضعیف اور ناقابل اعتبار ہونے کی دلیل ہے اسی کے ساتھ ساتھ خود ابن خلدون نے امام ابوحنیفہ کو کبار مجتہدین فی علم الحدیث سے تعبیر کیا ہے اور امام ابوحنیفہ پر قلت حدیث کا بہتان لگانے والے لوگوں کے متعلق لکھتے ہیں

وقد تقول بعض المبغضين المتعسفين الی ان منهم من كان قليل البضاعة فی الحديث فلهذا قلت روايته الخ

بعض بغض وعداوت رکھنے والے کجراہ لوگوں نے بہتان لگایا کہ بعض ائمہ حدیث میں انتہائی تہی دست اور کم مایہ تھے اسی لئے ان کی روایتیں بہت کم ہیں۔

اور پھر پوری قوت کے ساتھ اس کی تردید کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے مقدمہ ابن خلدون طبع مصر صفحہ ۴۴۴ و ۴۴۵ لیکن استشراقی مصنفین اور ان کے طرز تحقیق (سائنٹفک ریسرچ) کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہر بڑے سے بڑے مصنف کی عبارت میں سے صرف اپنے مطلب کے الفاظ لے لیتے ہیں۔ اگرچہ اس مصنف نے بغرض تردید تکذیب ہی ان کو ذکر کیا ہو۔ اور آگے پیچھے سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور حوالہ دیدیتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ اصل کتاب کو اٹھا کر کون دیکھتا ہے کہ ہم اپنی چوری کے کھلنے سے ڈریں — اللہ بچائے ان سے۔ ۱۲ مترجم

میں روایت کی ہیں ان مسانید۔ (کتب حدیث) کی تعداد کچھ اوپر دس (سترہ) تک پہونچ گئی ہے (اور ہر مسند سیکڑوں مرفوع اور موقوف حدیثوں پر مشتمل ہے)

ان مسانید و آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ ابو حنیفہ کی فقہ کا بہت بڑا حصہ سنت اور حدیث سے ماخوذ ہے اور یہ کہنا کسی طرح بھی صحیح نہیں کہ ابو حنیفہ کے پاس صرف کچھ اوپر دس (سترہ) حدیثیں تھیں اس لئے کہ کیسے ممکن ہے کہ ابو حنیفہ کے پاس صحیح حدیثیں نہ ہوں۔ دراں حالیکہ وہ (قدم قدم پر) حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں۔

باقی رہا ابن خلدون کا قول تو (اس کو سند کے طور پر پیش کرنا انتہائی غیر ذمہ داری بلکہ دیدہ دلیری کی بات ہے اس لئے کہ) ابن خلدون تو خود اس کو بصیغۂ تمریض (نا قابل اعتبار انداز میں) نقل کر رہے ہیں (نہ قائل کا نام ہے نہ ماخذ کا حوالہ ہے "کہا گیا ہے" کس نے کہا ہے؟ کہاں کہا ہے؟ کچھ نہیں بتاتے یہ بھی کوئی بات ہوئی) یہ تو خود اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ابن خلدون کو اس کا یقین نہیں ہے۔ علاوہ ازیں (امام ابو حنیفہ کے پاس حدیثوں کی قلت کے متعلق) ابن خلدون نے جو کچھ کہا ہے علماء متقدمین میں سے کسی کے ہاں بھی ہمیں اس کا پتہ نہیں چلتا (ابن خلدون پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ بات کہی ہے) بلکہ (اس کے برعکس) بڑی کثرت سے علماء متقدمین کی تصریحات موجود ہیں جو بتلاتی ہیں کہ امام ابو حنیفہ کے پاس بہت بڑی تعداد صحیح احادیث کی موجود تھی۔

اس کتاب کے آخر میں ہم نے امام ابو حنیفہ کے نام سے ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے اس کے ذیل میں ہم اس موضوع (احادیث ابو حنیفہ) پر نہایت دقیق تحقیقی بحث کریں گے انشاء اللہ العزیز۔

سنت پر اعتماد کرنے میں لوگوں کا حد سے متجاوز غلو

مؤلف فجر الاسلام ص ۲۹۳ پر وضع حدیث کے اسباب و محرکات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> مجھے تو ایسا محسوس[1] ہوتا ہے کہ وضع حدیث کے اہم ترین اسباب و محرکات میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس زمانہ میں لوگوں نے اس معاملہ میں

---

[1] پاکستانی پروفیسر احمد امین یعنے ڈاکٹر فضل الرحمن کے لفظوں میں کہئے "قیاس یہ کہتا ہے"۔ مترجم

(حدیث سے استدلال کرنے میں) انتہا درجہ غلو اختیار کر رکھا تھا کہ وہ کسی بھی علمی مسئلہ (یا فقہی حکم) کو اس وقت تک نہیں قبول کرتے تھے جب تک کہ کتاب وسنت کے ساتھ اس کا مضبوط علاقہ نہ ہو یعنے جب تک اس کے ثبوت میں کوئی قرآن کی آیت یا حدیث نہ ہو) اس کے علاوہ (جو بھی احکام ومسائل بیان کئے جاتے لوگوں کی نظروں میں ان کی کوئی قدر وقیمت (اور اہمیت) نہ ہوتی چنانچہ حلال وحرام کے جن احکام کی بنیاد صرف اجتہاد پر ہوتی ان کی وہ قدر ومنزلت نہ ہوتی جو ان (احکام ومسائل) کی ہوتی جن کی بنیاد حدیث پر قائم ہوتی بلکہ ان کے آس پاس بھی نہ پہونچتی بلکہ اس زمانہ میں بہت سے علماء تو اس قسم کے احکام ومسائل کو (جن کی بنیاد صرف اجتہاد پر ہو) سرے سے رد کر دیا کرتے تھے اور بعض علماء تو (اس غلو میں اس درجہ پر پہونچ گئے تھے کہ) جو لوگ یہ رویہ اختیار کرتے (یعنے اجتہاد وقیاس پر مبنی احکام ومسائل بیان کرتے) ان پر بڑی طعن وتشنیع کیا کرتے (اور ازراہ طعن ان کو "اصحاب رائے" کہا کرتے) تھے۔ اور حکمت وموعظت حسنہ کے جن مضامین کی اصل ہندی یا یونانی یا فارسی ہوتی یا توراۃ وانجیل کی شرحوں (بائبلوں) سے ماخوذ ہوتے ان کی طرف تو نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے (اگرچہ وہ فی الحقیقت صحیح ہی کیوں نہ ہوتے) چنانچہ اس (حد سے متجاوز غلو) نے بہت سے لوگوں کو اس پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس قسم کی تمام چیزوں (یعنے اجتہادی احکام ومسائل اور اخلاقی مضامین) کو دینی رنگ میں ضرور رنگ دیں (یعنے حدیث وقرآن کی شکل میں پیش کریں) تاکہ لوگ ان کو قبول کریں تو (قرآن تو قطعی طور پر محفوظ تھا) اس مقصد کے لئے انہوں نے حدیث ہی کا ایک ایسا دروازہ پایا جو ان کے سامنے چوپٹ کھلا ہوا تھا چنانچہ اسی حدیث کے دروازہ سے وہ

لوگوں کے سروں پر سوار ہو گئے اور اپنی اس خیرو سری اور حدیث سازی میں خدا تک سے نہیں ڈرے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم حدیث کی شکل میں مصنوعی فقہی احکام، ہندی حکمت زردشتی فلسفہ اور اسرائیلی و مسیحی مواعظ سب کچھ موجود پاتے ہیں۔

سلف و خلف (اگلے پچھلے)، تمام مسلمان علماء و محققین کا اس پر اتفاق رہا ہے۔ بجز معدودہ چند اہل بدعت اور گمراہ فرقوں کے جو کسی شمار میں نہیں۔ کہ تشریع اسلامی (اسلامی قانون شریعت) کے اصول میں کتاب و سنت ایسے دو بنیادی اصول ہیں کہ کسی بھی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ (اسلامی احکام کے سلسلہ میں) کوئی ایسا حکم لگائے اور فیصلہ کرے جو ان دونوں۔ کتاب و سنت۔ کی تعلیمات کے خلاف ہو اور نہ ہی کسی بھی مجتہد کو اس کی اجازت ہے کہ وہ ان دونوں ماخذوں کی طرف رجوع کئے بغیر کسی بھی مسئلہ میں (حق یا ناحق ہونے کا) کوئی فیصلہ دے۔

اس (متفق علیہ اصول) کے بعد علماء دین دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں:۔

(۱) ایک گروہ کا مسلک یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی نصوص (صریح آیات و احادیث) کو، علت حکم کی طرف التفات کئے بغیر، اختیار کیا جائے (اور ان پر عمل کیا جائے) یہ گروہ (احکام شرعیہ میں) قیاس (اور اجتہاد) کے توسع کا قائل نہیں (یعنی قیاس کو نہیں مانتا) علماء کا یہ گروہ ظاہریہ کہلاتا ہے، بیشتر محدثین (جامعین حدیث) کا مسلک یہی ہے۔

(۲) دوسرے گروہ کا مسلک یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی نصوص (صریح آیات و احادیث) سے شرعی احکام نکالنے کے لئے ان میں غور و فکر سے کام لینا چاہیئے (یعنی منصوص احکام کی علت کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے) چنانچہ یہ لوگ (احکام شرعیہ کے اخذ کرنے میں) کتاب و سنت کے ساتھ ساتھ قیاس سے بھی کام لیتے ہیں اور منصوص احکام کی علت حکم سے بحث کرتے ہیں اور (اسی علت حکم کی بنا پر) عام حکم کو خاص کر دیتے ہیں، مطلق حکم کو مقید کر دیتے ہیں اور ناسخ و منسوخ احکام کی تشخیص و تعیین کرتے ہیں جبکہ ان تمام تصرفات (تخصیص و تعمیم، اطلاق و تقیید اور تعیین ناسخ و منسوخ) کے لئے (شرعی یا عقلی) قرائن موجود پاتے ہیں۔ یہی علماء صحابہ کرام کے عہد سے لیکر آج تک کے عام مجتہدین و محدثین ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ان ائمہ مجتہدین و محدثین کے درمیان بھی قیاس پر عمل کرنے اور تنقیح علت کے ذریعہ احکام شرعیہ اخذ کرنے میں ۔ اور سنت و حدیث کے استیعاب میں، کسی حدیث کے صحیح ہونے کا حکم لگانے اور اس پر عمل کرنے کی شرائط میں ۔ فرق مراتب اور اختلاف نظر پایا جاتا ہے اور اسی فروعی اختلاف کے نتیجہ میں مجتہدین کے دو مکتب فکر وجود میں آئے ہیں ایک "اہل رائے" کا مکتب فکر اور ایک "اہل حدیث" کا۔ لیکن یہ ہر دو مکتب فکر اس پر کلیتاً متفق ہیں کہ احکام فقہیہ میں حدیث کو سرے سے نظرانداز کر کے کوئی اجتہاد نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان سب نے ہر مجتہد پر یہ لازم اور ضروری قرار دیا ہے کہ وہ احکام کی تمام حدیثوں کا احاطہ کرے (اور پیش نظر رکھے) اس (استقصاء حدیث) کی کوشش اور جدوجہد میں ذرہ برابر کوتاہی نہ کرے۔

حافظ ابن عبدالبرؒ نے اپنی کتاب جامع بیان العلم میں امام شافعی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

> کسی بھی حرام و حلال کے مسئلہ میں کسی بھی شخص کے لئے جائز نہیں کہ وہ کلام کرے (کوئی حکم لگائے) بجز اس کے کہ اس کا کلام علمی جہت پر مبنی ہو اور علمی جہت سے مراد وہ دلائل ہیں جن کی تصریح کتاب اللہ میں ہو یا سنت رسول اللہ میں ہو یا اجماع میں یا ان کے ہم معنی اصول پر مبنی قیاس ہیں۔

؎ حقیقت یہ ہے کہ جن ائمہ حدیث کی توجہ جمع حدیث کی بہ نسبت استنباط و استخراج احکام شرعیہ کی طرف زیادہ مرکوز رہی وہ کثرت اجتہاد کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بنا پر اہل الرای کہلائے اور جن ائمہ حدیث نے اپنی تمامتر توجہ کو جمع حدیث، تحقیق و تنقیح روایات اور جرح و تعدیل رواۃ پر مرکوز کر دیا وہ محدثین اور اہل حدیث کہلائے دونوں ہی کام دین کی حفاظت کے لئے ضروری تھے اس لئے تقسیم کار کے طور پر ہر گروہ نے اپنی اپنی اہلیت و صلاحیت اور ذوق کے تحت ایک ایک کام اپنے ذمہ لے لیا اور اس میں اپنی تمام تر توانائیاں اور عمریں صرف کر دیں اور اس طرح تکوینی طور پر منشاء الٰہی کے تحت علماء دین کے یہ دو مکتب فکر وجود میں آئے اور وانا لہ لحافظون ۔ اور ہم ہی اس دین کے محافظ ہیں ۔ کے وعدہ کے تحت دین کی حفاظت کا فرض انجام دیا والحمد للہ علی ذالک

ائمہ مجتہدین اس پر متفق ہیں کہ کسی بھی مسئلہ کے حکم کو اول کتاب اللہ میں دیکھنا (اور تلاش کرنا) چاہیئے پھر اس کے رسول کی سنت (حدیث) میں اور صحابہ کے اقوال میں (اس کے بعد اجماع میں) اگر اجماع نہ ہو تو پھر (انہی تینوں سے) حکم نکالنا اور قیاس کی طرف رجوع کرنا چاہیے آگے چل کر ہم ائمہ اربعہ (اور ان کے مسلک) پر بحث کے دوران ان ائمہ کے اصول اجتہاد پر بحث کریں گے جس سے ہمارے اس بیان کی مزید توثیق ہوگی۔

حکمت وموعظت کے مضامین

باقی رہے حکمت ودانائی اور پند وموعظت حسنہ کے مضامین تو ہمارے علم میں تو ائمہ دین میں سے کوئی بھی امام ایسا نہیں ہے جس نے اُن مضامین حکمت وموعظت کے اختیار کرنے کو صرف اس لئے ترک کیا ہو کہ وہ قرآن وحدیث میں موجود نہیں ہیں جب کہ وہ نہ شریعت کی تصریحات (نصوص) کے منافی ہوں اور نہ اسلامی شریعت کی روح اور اس کے اعلیٰ وارفع مقاصد سے متصادم ہوں بلکہ علماء سلف سے تو یہ مقولہ مشہور ومعروف چلا آتا ہے۔

ان الحکمۃ ضالۃ المومن، یلتقطھا انی وجدھا — بیشک حکمت تو مومن کی گم شدہ چیز ہے جہاں بھی ملے وہ اس کو اُٹھا لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کی ایک صفت یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ:۔

یستمعون القول فیتبعون احسنہ — وہ بات کو غور سے سُنتے ہیں اور جو اچھی بات ہوتی ہے اس کی پیروی کرتے ہیں۔

اور خود اللہ پاک نے گذرے ہوئے لوگوں کے (نصیحت آمیز اور عبرت آموز) قصے ان کی دانائی کی باتیں اور مواعظ، سے ہمیں آگاہ کیا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بھی یہی رہا ہے اس طرز عمل کا مقصد اس پر متنبہ کرنا ہے کہ گذشتہ قوموں کی ایسی باتیں قبول کرنے (اور ان پر عمل کرنے) میں کوئی حرج نہیں ہے جو شریعت کے مقاصد کے مخالف نہ ہوں۔

اسی پر علم اصول فقہ کا یہ قاعدہ مبنی ہے کہ:۔

شرع من قبلنا شرع لنا اذا قصہ اللہ ورسولہ — ہم سے پہلی اُمتوں کی شریعت .... ہمارے لئے بھی شریعت کا حکم رکھتی ہے جبکہ خدا اور

علینا من غیر نکیر — اس کے رسول نے بلا کسی اعتراض اور ناپسندیدگی کے اظہار کے اس کو ہمارے سامنے بیان کیا ہو۔

؎ ؎ ؎ ؎

امام بخاری علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے:۔

بلغوا عنّی ولو آیۃ وحدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج — میری طرف سے (خدا کا دین) پہونچا دو اگرچہ ایک آیت ہی ہو اور بنی اسرائیل سے (اسرائیلی روایات) نقل کرو اس میں کوئی حرج نہیں

؎ ؎ ؎ ؎ ؎

حافظ ابن حجرؒ (فتح الباری میں اس حدیث کے تحت) لکھتے ہیں:۔

یعنی بنی اسرائیل سے اسرائیلی روایات نقل کرنے میں کوئی تنگی نہیں ہے یہ (اجازت آپ نے) اس لئے (دی ہے) کہ ابتداء میں آپ نے بنی اسرائیل کی روایات قبول کرنے اور ان کی کتابیں پڑھنے سے منع فرما دیا تھا اس کے بعد یہ اجازت دی گئی ہے اور (ابتداء میں) یہ ممانعت اسلامی احکام میں استحکام اور دینی قواعد میں پختگی پیدا ہونے سے پہلے تک تھی اس اندیشہ سے کہ فتنہ[۱] پیدا نہ ہو لیکن جب یہ خدشہ دور ہو گیا تو اس کی اجازت دیدی گئی تاکہ بنی اسرائیل کے زمانہ میں جو عبرتناک واقعات پیش آئے (اور ان کے نتیجہ میں جو سختیاں اُن پر ہوئیں) ان کو سنکر

---

[۱] یعنی شریعت محمدیہ کے احکام شریعت موسویہ سے ملتبس نہ ہو جائیں اور مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ اسلامی شریعت کوئی مستقل شریعت نہیں ہے بلکہ شریعت عیسویہ کی طرح شریعت موسویہ ہی کا تتمہ ہے جب تدریجی طور پر شریعت محمدیہ کے تمام مستقل احکام منضبط ہو گئے اور دین اسلام کی تکمیل ہو گئی تو اس التباس کا اندیشہ نہ رہا تو آپ نے شریعت محمدیہ کا شریعت موسویہ سے موازنہ کرکے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی غرض سے انکے روایت کرنے کی اجازت دے دی کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے کتنی سہل اور آسان شریعت مسلمانوں کو عطا فرمائی ہے۔ ۱۲، از مترجم

مسلمان عبرت حاصل کریں (اور اللہ پاک کا شکر ادا کریں)

اس کے بعد حافظ ابن حجر امام مالک کا قول نقل کرتے ہیں:۔

(اسرائیلی روایات کی روایت سے) مراد ان کے دین میں جو اچھے امور تھے ان کا نقل کرنا ہے باقی جن اسرائیلی روایات کا جھوٹ ہونا معلوم ہو چکا ہے ان کا نقل کرنا ہرگز جائز نہیں۔ باختصار

چنانچہ بعض صحابہ نے تو کعب احبار اور وہب بن منبہ سے اتنی کثرت سے اسرائیلی روایات نقل کی ہیں کہ بعض تفسیریں تو اسرائیلیات سے بھری ہوئی ہیں بالکل اسی طرح جیسے تصوف اور اخلاق کی کتابیں اُن مضامین حکمت و موعظت سے لبریز ہیں جو گذشتہ قوموں سے منقول ہیں۔

ان حقائق کے ہوتے جن کا ہم نے ذکر کیا یہ دعویٰ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ "مسلمانوں نے حکمت اور موعظت کے اُن مضامین کو بالکل چھوڑ دیا ہے جن کی اصل غیر اسلامی تھی"۔

مختصر یہ کہ مؤلف فجر الاسلام نے (اسباب وضع حدیث کے سلسلہ میں) جس سبب کا سہارا لینے کی کوشش کی ہے (اور جو خیالی منصوبہ بنایا ہے) وہ بالکل بے اصل[1] ہے نہ اس کی کوئی بنیاد ہے اور نہ اس کی تائید میں کوئی دلیل ہے۔ اس کے برعکس ہماری اسلامی کتابیں ایسے دلائل وشواہد سے بھری پڑی ہیں جن سے مؤلف کے اس ادعا کی قطعی تردید ہوتی ہے۔

میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ[2] آخر مؤلف فجر الاسلام کو ان خیالی اور وہمی مفروضات کے اختراع

---

[1] لہٰذا ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ نہ ائمہ مجتہدین نے اپنی فقہی آراء اور اجتہادات کو مقبول و مستند بنانے کی غرض سے احادیث کی صورت میں ڈھالا ہے اور نہ ہی علماء حکمت واخلاق میں سے کسی متنفس نے حکمت و موعظت کے مضامین کو حدیثوں کی شکل میں ڈھالا ہے اور نہ ہی یہودیوں اور نصرانیوں کی اسرائیلی روایات کو احادیث کا جامہ پہنایا ہے یہ سب مستشرقانہ مفروضات اور ڈھکوسلے ہیں جن کے گھڑنے کا واحد مقصد ذخیرۂ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں شکوک وشبہات پیدا کرنا اور سنت کے محکم قلعہ میں رخنے ڈالنا ہے اور بس ۱۲ مترجم [2] ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی رحمہ اللہ کا ذہن اس افتراء اور بہتان تک نہیں پہونچا جو اس سنت پر سختی کے ساتھ عمل کرنے کے عنوان سے پاکستان کے ایک مستشرق ڈاکٹر فضل الرحمن سابق ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی

(باقی صفحہ ۴۷۴ پر)

کرنے پر کس چیز نے آمادہ کیا (اور کیا داعیہ پیش آیا) بجز اس کے کہ (یہ کہوں اور سمجھوں کہ) مؤلف کا مقصد یہ زعم (باطل) ہے کہ کتاب وسنت پر سختی کے ساتھ قائم رہنے نے دین کو یہ نقصان پہونچایا کہ لوگوں کو (حسب منشاء) حدیثیں گھڑنے پر مجبور کر دیا۔

صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کی عدالت

مؤلف فجرالاسلام صفحہ ۲۶۵ پر لکھتے ہیں:۔

ان ناقدین حدیث (علماء جرح وتعدیل) کی "اکثریت" نے اجمالی طور پر بھی اور تفصیلی طور پر (نام بنام) بھی تمام صحابہ کرام کو عدول اور ثقہ کہا ہے چنانچہ ان ناقدین نے صحابہ میں سے کسی ایک کے متعلق بھی کسی بھی قسم کی برائی کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی ان میں سے کسی کی طرف جھوٹ بولنے کی نسبت کی۔ (ہاں) ان میں سے چند ناقدین (ائمہ جرح وتعدیل) نے (جرح وتعدیل کا) جو معاملہ بعد کے لوگوں کے ساتھ کیا وہی معاملہ صحابہ کے ساتھ بھی کیا ہے (کسی پر جرح کی کسی کی تعدیل یعنے صحابہ کو بھی محل جرح وتعدیل قرار دیا ہے اور اس کسوٹی پر کسا ہے)

اس کے بعد وہ اگلے صفحہ پر یہی رقمطراز ہیں:۔

بہرحال "اکثر" ناقدین حدیث بالخصوص متاخرین کا طرز عمل یہی رہا ہے (کہ وہ صحابہ کرام کو جرح وتعدیل سے بالاتر سمجھتے ہیں اور) ہر صحابی کو عدول کہتے ہیں انھوں نے کسی ایک صحابی پر بھی نہ جھوٹ کا الزام لگایا نہ ہی وضع حدیث کا اور صرف بعد کے لوگوں (تابعین وتبع تابعین وغیرہ حاملین حدیث) پر جرح کی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۳) نے محدثین خصوصاً امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پر لگایا ہے کہ ان حضرات نے خود اپنی شخصی آراء اور فقہی اجتہادات کو حدیثوں کے قالب میں ڈھالا ہے اور ان میں سب سے پہلے اور سب سے بڑے حدیثیں گھڑنے والے امام شافعی تھے۔ العیاذ باللہ۔ دراصل ڈاکٹر امین مصری اور ڈاکٹر فضل الرحمن پاکستانی مستشرقین کی معنوی اولاد ہیں اور ان سب کا سلسلۂ نسب علمی اعتبار سے یہودی مستشرق گولڈ تسیہر سے ملتا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے کتابچہ "نیا اسلام" شائع کردہ مکتبہ اسلامی کراچی صفحہ ۵۵ خصوصاً۔ ۱۲ مترجم

تمام تابعین اور ان کے بعد عامۃ المسلمین اور تمام آئمۂ نقد حدیث اس پر کلی طور سے متفق ہیں کہ تمام صحابہ (جرح و تعدیل سے بالاتر اور) عدول ہیں۔ جھوٹ اور وضع حدیث سے ان کا دامن بالکل پاک وصاف ہے۔ خارجی، معتزلی اور شیعہ وہ شاذ و نادر فرقے ہیں جو اس اجماع و اتفاق سے الگ ہیں۔ یہ ہی امر واقعہ ہے اور یہی (مسلمانوں میں) مشہور و معروف (عقیدہ) ہے۔

لیکن فجرالاسلام کے مؤلف اپنی دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی "غرض" کی وجہ سے — جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ اس حقیقت واقعہ کے بارے میں ہمیں شک و شبہ میں ڈالنا چاہتے ہیں چنانچہ:

(۱) پہلا (بے اصل) دعویٰ تو وہ یہ کرتے ہیں کہ:۔

اکثر ناقدین حدیث نے صحابہ کو عادل بتلایا ہے (سب نے نہیں، گویا عدالت صحابہ متفق علیہ نہیں ہے)

حالانکہ تمام ائمۂ نقدِ حدیث کلی طور پر (بلا استثنا) تمام صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی عدالت پر متفق ہیں۔

(۲) اور دوسرا بے اصل دعویٰ یہ کیا کہ:۔

بعض ناقدین حدیث نے (جرح و تعدیل کا) وہ معاملہ صحابہ کے ساتھ بھی کیا ہے جو بعد کے لوگوں کے ساتھ کیا ہے۔

اور اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ امام غزالیؒ کی ایک عبارت پیش کرتے ہیں باوجودیکہ جن لوگوں نے صحابہ (کی عدالت) کے بارے میں کلام کیا ہے (اور جن کا ذکر امام غزالی کر رہے ہیں) وہ حدیث کے پرکھنے والے ائمہ میں سے قطعاً نہیں ہیں بلکہ وہ تو تاریخ اسلام میں "جانی پہچانی" (سیاسی) اغراض کے مالک متعصب لوگوں (معتزلہ، شیعہ اور روافض) میں سے ہیں جو بعض صحابہ (مثلاً حضرت ابوبکر و عمر) کے مقابلہ پر بعض صحابہ (مثلاً حضرت علی) کے حمایت کرنے والے ہوئے ہیں۔

چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:۔

اہل السنت والجماعت کے نزدیک تمام کے تمام صحابہ عدول (اعلیٰ درجہ کے ثقہ) ہیں۔

پھر فرماتے ہیں :-

معتزلہ کا یہ کہنا کہ "صحابہ عدول ہیں بجز ان صحابہ کے جنھوں نے حضرت علی سے جنگ کی"، بالکل غلط، بے بنیاد اور مردود ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں :-

رافضیوں کے فرقے، ان کی جہالت، حماقت اور ان کے یہ دعوے کہ :
سترہ صحابیوں کو چھوڑ کر ۔ جن کے وہ نام بھی گناتے ہیں ۔ باقی سب صحابہ کافر ہو گئے تھے" محض پاگلوں کی بکواس ہے جس کی کچھ بھی اصل نہیں (۱)

دیکھا آپ نے؟ جن لوگوں نے صحابہ کی عدالت کے بارے میں کلام کیا ہے وہ تو یہ فرقہ پرست لوگ ہیں جو اپنی سیاسی اغراض و میلانات کے اعتبار سے جانے پہچانے، اور بعض صحابہ کی حمایت کے لئے مشہور و معروف ہیں یہ ان ناقدین حدیث اور ائمہ جرح و تعدیل میں سے ہرگز نہیں ہیں جن کی تعریف خود مؤلف ذیل کے الفاظ میں کر چکے ہیں :-

علماء صادقین کی ایک (مقدس) جماعت، احادیث کو ان تمام آلودگیوں سے پاک و صاف کرنے اور کھری اور کھوٹی حدیثوں کو چھانٹنے اور فرق و امتیاز ظاہر کرنے کے لئے اٹھی (اور منظر عام پر آئی)

(۳) مولف کا تیسرا (شاطرانہ) دعویٰ یہ ہے :

صحابہ کو اکثر ناقدین حدیث خصوصاً متاخرین عدول کہتے ہیں (گو متقدمین میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس سے متفق نہیں ہیں)

حالانکہ علماء متقدمین سے کسی ایک عالم سے بھی ۔ تابعین میں سے ہو یا ان کے بعد کے محدثین سے ۔ کہیں ثابت نہیں کہ انھوں نے کسی صحابی پر جرح کی ہو یا اس کی حدیث کو چھوڑ دیا ہو، اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ مؤلف اس سلسلہ میں امام غزالیؒ کی ایک عبارت سے استشہاد کرتے ہیں حالانکہ امام غزالی کے الفاظ تو صاف اور صریح طور پر یہ بتلاتے ہیں کہ : علماء متقدمین کا تو صحابہ کے عدول ہونے

---

(۱) اختصار علوم الحدیث ص ۲۲۰ - ۲۲۲

پر کلی طور سے اتفاق اور اجماع ہے وہ کہتے ہیں :-

اور وہ عقیدہ جس پر امت کے تمام سلف و خلف ۔ اگلے پچھلے تمام علما ۔
متفق ہیں یہ ہی ہے (کہ تمام کے تمام صحابہ عدول ہیں)

آپ دیکھتے ہیں، یہ تو مؤلف کے ان بے سروپا دعووں کی کھلی تردید ہے کہ :-

صحابہ کو عدول کہنے والے متقدمین کی بہ نسبت متاخرین زیادہ ہیں ۔

کیا صحابہ ایک دوسرے کی تکذیب کیا کرتے تھے؟

مؤلف فجر الاسلام نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا (کہ عدالت صحابہ کے متفق علیہ عقیدہ اور مسئلہ کو مختلف فیہ بنا دیا) بلکہ اس زعم باطل کی بنیاد پر ایک اور بے سروپا دعوے کا بھی اضافہ کیا ہے صرف اس لئے کہ صحابہ کے تقدس کو اہانت کا نشانہ بنانے کا جو بیڑا انہوں نے اٹھایا ہے اس کی مزید تاکید و تقویت کی جا سکے چنانچہ وہ ص ۲۶۵ پر جو کچھ ہرزہ سرائی کر چکے ہیں اس کے آگے لکھتے ہیں :-

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ خود بھی اپنے زمانہ میں ایک دوسرے پر تنقید
کیا کرتے تھے اور بعض صحابہ کو بعض دوسرے صحابہ کے مقابلہ پر بلند تر رتبہ
کا مستحق (اور ان کو کمتر) قرار دیا کرتے تھے ۔

اس ہرزہ سرائی کا مقصد یہ ہے کہ جن اکثر و بیشتر ناقدین حدیث نے تمام صحابہ کو عدول کہا ہے ان کے اس موقف پر اعتراض کریں اور ثابت کریں کہ صحابہ کو علی الاطلاق (کلی طور پر) عدول کہنے کی مطلق گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ صحابہ کرام تو خود بھی ایک دوسرے کی سچائی کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور ایک دوسرے پر جرح و تنقید کیا کرتے تھے ۔ مؤلف موصوف نے اس دعوے کے ثبوت میں تین دلیلیں پیش کی ہیں :-

(۱) حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ کی حضرت ابو ہریرہ پر جرح و تنقید ۔

(۲) بعض صحابہ کا طرز عمل ۔ جس کا بیان اس سے پہلے گذر چکا ہے ۔ کہ جب ان کے سامنے کوئی ...... حدیث بیان کی جاتی تو وہ اس کی سچائی پر دلیل (گواہ) کا مطالبہ کرتے تھے ۔

(۳) حضرت عمر اور فاطمہ بنت قیس کے درمیان جو واقعہ پیش آیا تھا ۔

لیجئے ان تینوں دلیلوں سے مؤلف کے استدلال کی تردید میں دلائل سنئے جو ثابت کرتے ہیں کہ مولف کا یہ دعویٰ بالکل لنگ ہے نہ تاریخ سے بھی اس کو سہارا نہیں دیا جا سکتا۔

(۱) مؤلف کا یہ کہنا کہ صحابہ ایک دوسرے کی سچائی میں شک کیا کرتے تھے تو یہ تو ایک ایسا بے بنیاد دعویٰ ہے جس کا ثبوت صرف رافضیوں اور غالی شیعوں کی تصانیف سے ہی پیش کیا جا سکتا ہے جن میں انھوں نے حضرت علی سے ان تمام صحابہ کی تکذیب (وتکفیر) نقل کی ہے جنہوں نے ان کی مخالفت کی اور یہ بھی کہ حضرت علی نے اُن پر سب وشتم کیا ہے (گالیاں دی ہیں) اور ان کو خوب بُرا بھلا کہا ہے (اور کوسا ہے)۔ لیکن صحیح تاریخ اور سچی روایات جو ان غرض پرستوں کی کمینی خواہشات سے پاک وصاف ہیں اُن سے تو واضح طور پر اور کھلے لفظوں میں ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کی ذات گرامی اس سے بہت بلند اور بالاتر تھی کہ وہ ایک دوسرے کے حق میں گالی گلوج سے کام لیں یا ایک دوسرے کی سچائی میں شک کریں۔ اس حقیقت کے ثبوت کے لئے تو بڑی فراوانی سے دلائل موجود ہیں اس لئے کہ صحابہ کا حال تو یہ تھا کہ جب بھی کوئی صحابی دوسرے صحابی سے کوئی حدیث سنتا فوراً اس کی تصدیق کرتا اور اس کے دل میں اس راوی کے سچائی میں ذرا بھی شک وشبہ نہیں گزرتا تھا۔ اور پھر وہ اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بالکل ایسے ہی منسوب کرتا جیسے اس نے خود سنی ہے — صحابہ کی مُرسَل[۵۷] روایات کے تحت ہم اس سے قبل تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں حضرت انسؓ کا یہ قول بھی نقل کر چکے ہیں:۔

> ہم میں سے کوئی بھی صحابی دوسرے صحابی کو جھوٹا کبھی نہیں کہتا تھا۔

اور حضرت براءؓ بن عازب کا یہ قول بھی نقل کر چکے ہیں:۔

> یہ بات نہیں ہے کہ ہم نے ساری ہی حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سُنی ہیں، ہمارے ساتھی صحابی بھی ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔

---

[۵۷] علم اصول حدیث کی اصطلاح میں مُرسل صحابی وہ حدیث ہوتی ہے جس کو ایک صحابی دوسرے درمیانی صحابی کا نام لئے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرے جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں ۱۲ مترجم

ان بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ ایک دوسرے پر مکمل بھروسہ کیا کرتے تھے بھروسہ بھی ایسا کہ اس میں ذرہ برابر بھی شک وشبہ یا تردد کی آمیزش نہ ہوتی تھی اس لئے کہ ان کو اپنے رفقا کے تدین بالصدق (سچ کی پابندی) پر کامل یقین وایمان تھا اور یہ کہ صحابہ کے نزدیک صدق (راست گوئی) تمام فضیلتوں پر مقدم تھی، اسی کی بنیاد پر ان کا اسلام قائم تھا، اور اسی صدق کی بنا پر سابقین اولین (سب سے پہلے اسلام لانے والے لوگوں) میں سے برگزیدہ صحابہ سیادت کے اعلیٰ وارفع مقام پر پہونچے ہیں (لہٰذا ان کے متعلق دروغ گوئی کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا)

مؤلف کی تینوں دلیلوں کے جوابات

(۱) مؤلف نے حضرت ابوہریرۃ پر حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ کی تنقید سے جو استدلال کیا ہے ہم اس کا جواب تفصیلی طور پر آئندہ اوراق میں ایک مستقل عنوان حول ابی ھریرۃ کے تحت دیں گے انتظار کیجئے۔

(۲) رہا بعض صحابہ کا حدیث بیان کرنے والے صحابی سے اس کی راست گوئی پر دلیل طلب کرنا تو یہ دراصل اُس بحث کی طرف اشارہ ہے جو ہم مستقل عنوان "سنت کے متعلق صحابہ کرام کا موقف" کے تحت کر چکے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق نے مغیرہ بن شعبہؓ سے گواہ طلب کیا ہے اور حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰؓ اشعری سے گواہ طلب کیا ہے۔ ان دونوں حضرات نے بغیر دوسری شہادت کے (طلب کئے بھی بکثرت) صحابہ کی حدیثوں کو قبول کیا ہے اور یہ کہ بغیر شہادت طلب کئے حدیث کو قبول کر لینا ان دونوں حضرات کا معمول تھا اور خاص خاص مواقع کے علاوہ کبھی شاذونادر بھی انھوں نے اس معمول کے خلاف نہیں کیا اور ان مواقع میں بھی ان حضرات کا مقصد اپنے اس عمل سے مسلمانوں کو قبول حدیث میں انتہائی احتیاط اور جانچ پرکھ کی تعلیم دینا تھا۔

بھلا حضرت عمرؓ کو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت حدیث میں راست گوئی کے متعلق شک ہو سکتا تھا؟ دراں حالیکہ وہ ان سے صاف لفظوں میں فرماتے ہیں:-

> بلا شبہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے امین (امانتدار) ہو لیکن تم سے (اس گواہی طلب کرنے سے) میرا مقصد یہ تھا کہ لوگ (بلاتحقیق وتدقیق) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں روایت کرنے

پر جری نہ ہو جائیں

صحیح مسلم کی اُس روایت کو بھی ذرا دیکھئے جس میں حضرت اُبی بن کعبؓ حضرت عمرؓ سے ان کے اِس طرزِ عمل پر جو اُنھوں نے اس دور اندیشی اور احتیاط کوشی کی بنا پر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ انتہائی ناگواری کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں ۔

اے عمرؓ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کے لئے مصیبت مت بنو ۔

ذرا دیکھئے کیا یہ شدید غصہ اور ناراضگی کا اظہار اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ نے جو ایک صحابی (ابو موسیٰ) کے ساتھ طرزِ عمل اختیار کیا تھا وہ ایک وقتی معاملہ تھا اُن کا عام معمول نہ تھا۔

(۳) حضرت عمرؓ نے فاطمہ بنت قیس کے معاملہ میں جو رویہ اختیار کیا تھا اس کے متعلق مؤلف موصوف صفحہ ۲۶۵ پر لکھتے ہیں :۔

اس (تکذیب) کی مثال میں ہم وہ روایت پیش کرسکتے ہیں جو فاطمہ بنت قیس سے مروی ہے کہ ان کے شوہر نے ان کو طلاق دی تھی اور طلاق بھی قطعی دی تھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عدت کے زمانہ میں نفقہ اور رہائش کی جگہ (سکنیٰ) نہیں دلوائی اور فرمایا کہ تم ابن ام مکتوم کے مکان میں عدت گزارو وہ نابینا آدمی ہیں ۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے فاطمہؓ کی اس روایت کو یہ کہکر رد کر دیا تھا : ایک عورت کے کہنے سے ہم اللہ کی کتاب (کے حکم) کو اور اپنے نبی کی سنت کو نہیں چھوڑ سکتے ہمیں معلوم نہیں وہ سچ کہہ رہی ہے یا جھوٹ (آپ کی) بات کو اس نے اچھی طرح یاد بھی رکھا ہے یا (کچھ) بھول گئی ہے ۔

نیز حضرت عائشہؓ نے بھی (اس حدیث کے روایت کرنے پر فاطمہ سے کہا تھا : تو خدا سے نہیں ڈرتی ۔

یہ حدیث ، حدیث کی اکثر کتابوں میں مروی ہے اور فقہاء کے ہاں بھی مشہور و معروف ہے ، ہم اس پر مختلف پہلوؤں سے بحث کرنا چاہتے ہیں ۔

(۱) اول : صحابہ کرام کے (احادیث کی) فہم و فراست میں (اور اُن سے احکام اخذ کرنے میں) بہت مختلف درجے تھے اور بڑا فرق مراتب تھا۔

مثلاً کسی شخص کے ساتھ اس کے مخصوص حالات کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مخصوص معاملہ فرماتے تھے تو وہ اس کو لوگوں کے سامنے ایک عام حکم کی طرح بیان کر دیتا تھا تو اس پر صحابہ کے درمیان ایک خالص علمی اور فقہی بحث چھڑ جاتی جس کا اس شخص کی راست گوئی میں شک و شبہ پر مبنی تنقید سے مطلق تعلق نہ ہوتا نہ ہی اس کی تصدیق یا تکذیب سے اس بحث کا کوئی تعلق ہوتا چنانچہ ایک صحابی کوئی اور حدیث روایت کرتا اور اس کی بنا پر اس حدیث کو منسوخ یا (اس شخص کے ساتھ) مخصوص یا (ان حالات کے ساتھ) مقید قرار دیتا اور یہ صحابی کوئی حدیث بیان کرتا تو وہ اس (حدیث) کو اس شخص کے ساتھ مخصوص قرار دیتا جس کے لئے آپ نے مخصوص حالات کے تحت حکم دیا تھا۔ اسی طرح ایک صحابی ایک حدیث بیان کرتا تو دوسرا صحابی اس کو دوسری طرح بیان کرتا اور پہلے راوی کے متعلق کہتا کہ اس کو اس حدیث کے روایت کرنے میں وہم ہو گیا ہے یا بھول گیا ہے یا حدیث کو نا تمام روایت کیا ہے یا اور اسی قسم کی کوئی بات کہتا۔ چنانچہ وہ تمام آثار و واقعات جو صحابہ کے ایک دوسرے کی تردید سے یا ایک صحابی کے دوسرے صحابی کی غلطی نکالنے سے متعلق مروی ہیں ان سب کا منشا اور مصداق وہی علمی بحث و تنقیح ہے اس کے معنی اور مقصد ایک دوسرے کی تکذیب (جھوٹ بولنے کی تہمت لگانا) ہرگز نہیں ہیں۔

(۲) دوم یہ کہ (اس روایت میں) حضرت عمر کے یہ الفاظ "پتہ نہیں سچ بول رہی ہے یا جھوٹ" حدیث کی کسی ایک کتاب میں نہیں ہیں میں نے بڑے بڑے علمی اور عوامی کتبخانوں میں جہاں میں پہونچ سکا، حدیث کے جو بھی ماخذ (حوالہ کی کتابیں) مل سکتی تھیں سب چھان ماریں مگر یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ کہیں نہیں ملی بلکہ حدیث کی اور تمام کتابوں میں اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں "پتہ نہیں اسے یاد بھی رہا یا بھول گئی ہے"۔ ہاں بعض اصول فقہ کی کتابوں میں یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ — اصدقت ام کذبت — ضرور موجود ہے۔ چنانچہ مُسلّم الثبوت میں صحیح مسلم کے حوالہ کے ساتھ یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ بیان کی گئی ہے حالانکہ صحیح مسلم میں یہ روایت (اصدقت ام کذبت کے الفاظ کے ساتھ مطلق موجود نہیں بلکہ) اُنہی الفاظ کے ساتھ مذکور ہے جو حدیث

کی تمام کتابوں میں ہیں یعنے احفظت ام نسیت

اس (حوالہ کی غلطی) پر تعجب تو چھوڑیئے، اچنبھا تو دراصل فجر الاسلام کے مولف (کی اس دیدہ دلیری) پر ہے جو اس حدیث کو ان الفاظ — اصدقت ام کذبت — کے ساتھ نقل کرنے کے بعد حاشیہ میں لکھتے ہیں:-

(ثبوت کے لئے) صحیح مسلم پر امام نووی کی شرح دیکھئے اور شرح مُسلّم الثبوت بھی ملاحظہ ہو

لیکن جب ہم نے امام نووی کی شرح دیکھی تو صدقت ام کذبت والی روایت کا نام ونشان تک نہ تھا اور جب شرح مسلم الثبوت کی مراجعت کی تو وہاں یہ تصریح موجود تھی کہ:

> مسلم الثبوت کے مصنف نے جو اس حدیث میں (صحیح مسلم کے حوالہ سے) اصدقت ام کذبت کی زیادتی نقل کی ہے وہ صحیح مسلم میں موجود نہیں ہے۔

علاوہ ازیں خود مؤلف بھی خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلّم الثبوت حدیث کی کتاب نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث کا حال معلوم کرنے کے لئے مسلم الثبوت (کا نہ کوئی حوالہ دیتا ہے اور نہ کوئی اس) کی طرف رجوع کرتا ہے اس بارے میں انھوں نے (علماء حدیث کے بجائے) فقہا اور علماء اصول کی آنکھیں میچ کر پیروی کی ہے نہ خود الفاظ حدیث کی چھان بین کی اور نہ کتب حدیث کو اٹھا کر دیکھا۔ حالانکہ مؤلف جب تدوین حدیث کی تاریخ لکھنے بیٹھے ہیں تو ان کا فرض تھا کہ وہ حدیث کے الفاظ کی تعیین کے لئے (ان سے استدلال کرنے سے پہلے) حدیث کے اصلی ماخذوں — صحاح ستہ وغیرہ — کی طرف رجوع کرتے اور حدیث کے الفاظ انہی ماخذوں سے نقل کرتے اسی طرح جبکہ مؤلف ایک عالم (اور محقق بنے) ہیں تو ان کا ایک فرض یہ بھی تھا کہ وہ علما اور محققین کی صفات سے آراستہ ہوتے جنمیں سب سے اہم صفت (کسی عبارت کے نقل کرنے میں "امانت" اور تثبّت (انتہائی چھان بین) ہے لہذا ان کو کوئی عبارت بغیر (پوری طرح تحقیق کئے) اور اس بات کا اطمینان کئے بغیر نہ لکھنی چاہیئے تھی کہ اسی طرح حدیث میں آیا ہے اور یہی صحیح (اور درست) ہے لیکن انھوں نے ایسا بالکل نہیں کیا نہ انھوں نے (ان الفاظ کے نقل کرنے میں) کتب حدیث کی طرف رجوع کیا اور نہ ہی انھوں نے کتب حدیث اور کتب اصول

کا حوالہ دینے میں امانت و دیانت سے کام لیا بلکہ انھوں نے امام نووی کی شرح اور شرح مسلم الثبوت کی طرف ایک بالکل جھوٹی عبارت — اصدقت ام کذبت — کو منسوب کر دیا اور حوالہ دیدیا ہمیں معلوم نہیں آیا انھوں نے یاور کر لیا تھا کہ ان کی کتاب کے پڑھنے والے محض ان کے کہنے پر کہ "یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ ان دونوں ماخذوں میں موجود ہے" اکتفا کر لیں گے اور مطمئن ہو جائیں گے یا (ان کے خیال میں اس کا اندیشہ بھی تھا کہ) قارئین اس ادعا کو شک و شبہ کی نظر سے بھی دیکھ سکتے ہیں اور بذاتِ خود اس کی تحقیق اور کتب حوالہ کی مراجعت بھی کر سکتے ہیں۔

سوم! چلئے فرض کیجئے حدیث کے یہ الفاظ بھی — اصدقت ام کذبت — صحیح ہیں — حالانکہ ابھی تک ان کی صحت ثابت نہیں ہو سکی ہے — تب بھی مؤلف کو (دوسری تمام روایات کے پیش نظر) چاہیئے تھا کہ لفظ کذبت کے معنیٰ "غلط سمجھا" اور صدقت کے معنیٰ "صحیح سمجھا" لیتے اس لئے کہ (عربی میں خصوصاً اہل مدینہ کے محاورات میں کذب غلط کے معنیٰ میں اور صدق درست کے معنیٰ میں بکثرت استعمال ہوتا ہے چنانچہ) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:۔

اہل مدینہ کذب کا لفظ خطا (غلطی) کے معنیٰ میں استعمال کیا کرتے ہیں۔

(تاکہ صدقت ام کذبت اور حفظت ام نسیت دونوں معنیٰ کے اعتبار سے تضاد یا اختلاف باقی نہ رہتا کہ یہی ایک محدث کا فرض ہے کہ وہ اختلاف روایات کی صورت میں تضاد کو دور کرے)

چہارم! حضرت عمرؓ نے فاطمہ بنت قیسؓ کی حدیث کو (بلا دلیل رد نہیں کیا بلکہ) صرف اس لئے رد کیا ہے کہ انھوں نے اس حدیث کو کتاب و سنت کے دلائل کے خلاف اور متعارض پایا جو (اصل مسئلہ سے متعلق) ان کے پاس موجود تھے (اسی لئے وہ فرماتے ہیں لانَدَعُ کتابَ ربِّنا و سنۃَ نبیِّنا۔ ہم اپنے رب کی کتاب اور نبی کی سنت کو نہیں چھوڑ سکتے) اور تشریع اسلامی کا مسلم اور معروف قاعدہ ہے کہ جب دو دلیلیں ایک دوسرے کے (مخالف اور) معارض ہوں تو ان میں سے جو (زیادہ قوی) ہو اس کو اختیار کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ کتاب اللہ کا مدلول (ثابت شدہ حکم) یقیناً حدیث کے مدلول (ثابت شدہ حکم) سے زیادہ قوی ہے اس لئے حضرت عمر (کی تحقیق کے مطابق آن) کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ فاطمہ کی حدیث کو چھوڑ دیں اور جو

زیادہ قوی دلیل (قرآن) سے ثابت ہے اس کو اختیار کرلیں اور فاطمہ کی طرف سے یہ عذر کریں کہ ممکن ہے وہ بھول گئی ہو (یا اس نے غلط سمجھا ہو اور نسیان یا غلط فہمی کی وجہ سے یہ حدیث بیان کر رہی ہو) اس صورت میں (حضرت عمر کے اس طرز عمل سے) نہ فاطمہ کے متعلق کسی شک و شبہ کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ ہی اس پر طعن و تشنیع کا (لہذا مولف کا اس واقعہ سے یہ ثابت کرنا کہ صحابہ ایک دوسرے کی تکذیب کیا کرتے تھے قطعاً صحیح نہیں ہو سکتا)

پنجم! حضرت عائشہ کا (فاطمہ سے اپنے مخصوص واقعہ کو ایک عام حکم شرعی کے طور سے بیان کرنے پر) یہ فرمانا: "تو خدا سے نہیں ڈرتی" صرف اس پر مبنی ہے کہ حضرت عائشہ کو معلوم تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ کو ایک خاص وجہ کی بنا پر جو اس کے ساتھ مخصوص تھی، نفقہ اور سکنی (جائے رہائش) کا حکم نہیں دیا تھا نہ اس لئے کہ یہ ہر مطلقہ مبتوتہ (تین طلاق پانے والی عورت) کے لئے عام حکم شرعی ہے (کہ ایام عدت میں نفقہ اور سکنی کی مستحق نہیں ہوتی) تو جب حضرت عائشہ نے دیکھا کہ فاطمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کو جو اس کے ساتھ مخصوص تھا لوگوں کے سامنے اس طرح بیان کر رہی ہے جیسے یہ (ہر مطلقہ مبتوتہ کے لئے) عام حکم ہے تو انھوں نے (مذکورہ بالا قول سے) فاطمہ کو اس حقیقت پر متنبہ فرمایا کہ وہ لوگوں کے سامنے غلط مسئلہ نہ بیان کرے اور خدا سے ڈرے) اور اس کو سمجھایا کہ یہ حکم تو اسی کے ساتھ مخصوص تھا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں یہ صحیح روایت موجود ہے کہ:-

> فاطمہ نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے شوہر نے مجھے تین طلاقیں
> دیدی ہیں اور (اس کے مکان میں عدت گزارنے کی صورت میں) مجھے
> ڈر ہے کہ وہ میرے پاس نہ آگھسے تو اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
> وسلم نے اس کو (اس مکان کے چھوڑ دینے کا حکم دیا چنانچہ وہ (وہاں سے
> عبداللہ بن ام مکتوم کے مکان میں منتقل ہوگئی)

صحیح بخاری کی ایک روایت سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے جس میں حضرت عائشہ فرماتی ہیں

> فاطمہ کو یہ حدیث (اپنا واقعہ) لوگوں کے سامنے بیان نہ کرنا چاہیے
> اس لئے کہ فاطمہ ایک تنہا جگہ (غیر محفوظ مکان) میں رہ رہی تھی اس

وجہ سے آپ کو اس کے متعلق اندیشہ ہوا تو آپ نے اس کو (مکان تبدیل کر دینے کی) اجازت دیدی (۱)

مولف فجر الاسلام کی (عدالت صحابہ میں) شکوک وشبہات (پیدا کرنے والی ایک ایک دلیل) کا جواب دینے اور تردید کر دینے کے بعد یہ حقیقت قطعی طور سے صاف اور واضح ہو جاتی ہے کہ صحابہ نے نہ کبھی کسی صحابی کی سچائی میں ذرہ برابر شک وشبہ کیا ہے اور نہ کبھی ایک دوسرے پر اس طرح تنقید کی ہے کہ ایک فریق دوسرے فریق کو جھوٹا کہے اور (اس قسم کے) جتنے واقعات بھی مروی ہیں ۔ خواہ وہ ہوں جن کا مولف نے ذکر کیا ہے خواہ ان کے علاوہ ہوں وہ سب کے سب درحقیقت یا حدیث کا حکم سمجھنے (اور متعین کرنے) میں ایک علمی بحث وتنقیح سے متجاوز نہیں ہیں یا آنے والی نسلوں کو قبول حدیث میں انتہائی احتیاط برتنے کی تعلیم وتربیت پر مبنی ہیں کہ وہ بھی حدیث کے قبول کرنے میں ایسی ہی چھان بین کریں اور انتہائی احتیاط سے کام لیں جیسے صحابہ کا طرز عمل تھا اور یہ کہ اس قسم کے تمام واقعات تو تلاش حق میں صحابہ کی انتہائی حرص کا، علم حدیث کے بارے میں ان کے انتہا درجہ جذبۂ اخلاص کا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے بارے میں انتہائی اہتمام کا اور حدیث کی امانت کو ہر طرح کے شک وشبہ سے پاک وصاف امت تک پہونچانے کی کاوش کا روشن ثبوت اور محکم دلیل ہیں ۔

اللہ تعالیٰ صحابہ کرام کی اس مقدس نسل کو اپنی رضا وخوشنودی سے سرفراز فرمائیں جو انسانی تاریخ میں (تمام اقوام عالم کے مقابلہ میں) ممتاز مرتبہ اور مقام کی مالک ہوئی ہے اور ہماری طرف سے بھی اللہ پاک ملکوتی صفات کے مالک صحابہ کرام کو کما حقہ صلہ اور انعام عطا فرمائیں ۔

راویوں کی جرح وتعدیل میں ائمہ حدیث کے درمیان اختلاف اور اس کا منشا

مؤلف فجر الاسلام صفحہ ۲۶۶ پر لکھتے ہیں :۔

مذہبی نزاع اور اختلافات کا راویوں کی جرح وتعدیل پر بھی بڑا اثر پڑا ہے

---

(۱) تیسرے باب کی دوسری فصل میں اس (واقعہ) کی ایک اور تاویل (وجہ) بھی ہم نے بیان کی ہے۔

چنانچہ اہل سنت اکثر و بیشتر شیعہ راویوں کو مجروح قرار دیتے ہیں (نہ صرف یہ بلکہ) انھوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ: حضرت علی کے رفقا اور ان کے متبعین ان سے جو حدیثیں روایت کرتے ہیں وہ عموماً صحیح نہیں ہوتیں۔ حضرت علی کی صرف وہی روایتیں صحیح اور قابل اعتماد ہوتی ہیں جن کو عبداللہ بن مسعودؓ کے تلامذہ حضرت علی سے روایت کرتے ہیں، یہی رویہ شیعوں کا اہل سنت راویوں کے ساتھ ہے چنانچہ اکثر شیعہ حضرت علی کی صرف انہی روایتوں پر اعتماد کرتے ہیں جنکو خود شیعہ راوی حضرت علی اور اہل بیت سے روایت کرتے ہیں۔ یہی رویہ دوطرفہ جاری رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بعض علما (مثلاً اہل سنت) جن راویوں کو ثقہ اور عدول قرار دیتے ہیں دوسرے علماء (شیعہ حضرات) ان کو مجروح کہتے ہیں چنانچہ حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ:۔

اس فن (جرح و تعدیل) کے علماء میں سے کوئی دو عالم بھی کسی ضعیف راوی کی توثیق یا کسی ثقہ راوی کی تضعیف پر متفق نہیں ہیں" مؤلف فرماتے ہیں:۔

اگرچہ ذہبی کا یہ بیان مبالغہ سے خالی نہیں ہے تاہم اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے راویوں کی جرح و تعدیل میں علماء جرح و تعدیل کے نظریات کس قدر (اور کس بنیاد پر) مختلف ہیں مثال کے طور پر ہم محمد بن اسحق کا نام پیش کرتے ہیں جو اسلام کے دور اول کا سب سے بڑا مورخ ہے۔ اس محمد بن اسحق کے متعلق قتادہ کہتے ہیں: جب تک محمد بن اسحق زندہ رہا لوگوں میں علم (حدیث) باقی رہا۔" (اس کے برعکس) امام نسائی کہتے ہیں: محمد بن اسحاق قوی راوی نہیں ہے" سفیان کا کہنا ہے کہ: میں نے کسی کو نہیں سنا جو محمد بن اسحق پر (کوئی) الزام لگاتا ہو" دارقطنی فرماتے ہیں:۔ محمد بن اسحق اور اس کے باپ

(ابن اسحٰق) کی حدیث حجت نہیں"۔ امام مالک فرماتے ہیں: میں گواہی دیتا ہوں
کہ محمد بن اسحٰق بڑا ہی جھوٹا ہے"

اس سلسلہ میں بحث کے دو پہلو ہیں

(۱) جرح و تعدیل کے ضابطے (اور اختلاف رائے کا منشا)

(۲) حافظ ذہبی کی مذکورہ بالا عبارت اور محمد بن اسحٰق سے متعلق علماء جرح و تعدیل کی آراء

(۱) اول الذکر یعنے قواعد جرح و تعدیل کے بارے میں ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مؤلف نے (جان بوجھ کر) اس موقعہ پر جرح و تعدیل کے ضابطوں سے متعلق بحث میں انتہائی اجمال سے کام لیا ہے بالکل اسی طرح جیسا کہ انھوں نے مذہبی اختلاف کے اثر کو بیان کرنے میں (عمداً) اختصار سے کام لیا ہے اور اس کے بعد وہ اپنے اس قول سے کہ :-

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس راوی کو کچھ لوگ ثقہ کہتے ہیں دوسرے لوگ اسی
راوی کو ضعیف کہتے ہیں"

یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ علماء جرح و تعدیل کے درمیان اختلاف کا منشا مذہبی اختلاف ہے (یہ اجمال و اختصار اور اس سے پیدا کردہ یہ تاثر یقیناً علمی تحقیق اور محققانہ دیانت کے منافی ہے) راویوں کی جرح و تعدیل میں اختلاف پر بحث کرتے وقت ایک محقق کا فرض ہے کہ وہ اس اختلاف کی تفصیل بیان کرے کہ آیا اس اختلاف سے علماء اہل سنت کے درمیان کسی راوی کے متعلق آپس میں اختلاف مراد ہے یا علماء اہل سنت اور ان کے مخالف فرقوں کے درمیان کسی راوی کے متعلق اختلاف مراد ہے (اس اختلاف پر بحث اور اس سے کسی نتیجہ پر پہونچنے سے پہلے اس فرق کو واضح کرنا ناگزیر ہے)

علماء اہل سنت کے درمیان آپس میں جو کسی راوی کی جرح و تعدیل میں اختلاف ہوا ہے تو اس کا منشا تو صرف کسی راوی کے صدق یا کذب، اس کی عدالت و ثقاہت یا فسق و بد دیانتی، اس کے حفظ و ضبط یا وہم و نسیان کے بارے میں ان کے معیاروں، شرطوں اور نقطہ ہائے نظر کا اختلاف ہے (جس کا معیار سخت ہے وہ ایک راوی کو ضعیف اور مجروح قرار دیتا ہے جس کا معیار نرم ہے وہ اسی کو قوی اور ثقہ قرار دیتا ہے)

باقی رہا علماء اہل سنت اور ان کے مخالف فرقوں کے درمیان کسی راوی کی جرح و تعدیل

میں اختلاف کا منشا اور محرک محض مذہب کا اختلاف (اور مذہبی تعصب) کبھی بھی نہیں ہوا (جیسا کہ مولف ظاہر کرنا چاہتے ہیں) بلکہ علماء اہل سنت ــــ جیسا کہ ہم جرح وتعدیل کی بحث میں بیان کر چکے ہیں ــــ اپنے مخالف فرقہ کے راوی کو اس وقت تک مجروح (اور اس کی روایت کو رد) نہیں کرتے جب تک اس کی بدعت (گمراہ کن عقائد) کفر کی حد تک پہونچانے والی نہ ہو یا وہ صحابۂ رسول پر حملے کرتا اور برا بھلا کہتا ہو یا اپنی بدعت (مذہبی بد اعتقادی اور گمراہی) کا پرچار کرتا ہو یا پرچار نہ بھی کرتا ہو لیکن اس کی حدیث اس کے فاسد عقیدہ کی تائید کرتی ہو جس کا وہ معتقد اور مدعی ہے۔

ان صورتوں میں وہ درحقیقت راوی کی امانت ودیانت اور صداقت وعدالت کو مشتبہ سمجھتے ہیں اور شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں (اس لئے ازراہ احتیاط اس کی روایت کو قبول نہیں کرتے) لہٰذا علماء اہل سنت اور ان کے مخالفین کے درمیان جرح وتعدیل میں اختلاف بھی درحقیقت راوی کی عدالت وصداقت میں شک وشبہ پر ہی مبنی ہوا نہ کہ محض مذہبی تعصب اور اختلاف پر (جیسا کہ مؤلف تاثر دینا چاہتے ہیں کہ سُنی علماء شیعہ راویوں کو اور شیعہ علماء سُنی راویوں کو محض مذہبی تعصب کی وجہ سے مجروح کہکر ان کی روایتوں کو رد کر دیتے تھے (اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ متداول کتب حدیث میں ــــ جن میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم سب سے مقدم اور سرفہرست ہیں ــــ ان مبتدعین (گمراہ فرقوں کے پیرو راویوں) کی روایتیں بکثرت موجود ہیں جن کے متعلق تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ (اگرچہ عقائد کے اعتبار سے اہل سنت کے مخالف تھے مگر) حدیث میں جھوٹ کبھی نہیں بولتے تھے (اور نہ کسی بھی صورت میں حدیث میں جھوٹ بولنے کو جائز سمجھتے تھے) مثلاً خارجی فرقہ کا پیرو عمران بن حطّان اور شیعہ فرقہ کا پیرو ابان بن تغلب۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ابان بن تغلب کوفی کے ترجمہ (حالات) میں لکھا ہے:۔

> ابان بن تغلب کوفی کٹر شیعہ ہے لیکن بڑا ہی سچا ہے جھوٹ کبھی نہیں بولتا) لہٰذا ہمیں تو اس کی سچائی سے واسطہ ہے (جو حدیث وہ روایت کرتا ہے ہم جانتے ہیں کہ وہ سچی ہوتی ہے اس لئے ہم اس کو قبول کر لیتے ہیں) اس کی بدعت (گمراہی) کا وبال اس کی گردن پر وہ جانے ہمیں اس سے کیا واسطہ)

باقی رہا علماء جرح وتعدیل کا یہ فیصلہ کہ حضرت علی کے تلامذہ اور رفقا کی عام روایات کو وہ قبول نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان شیعہ راویوں نے (اپنی فرقہ وارانہ اغراض کو حاصل کرنے کے لئے) حضرت علی کی احادیث کو (ان میں قطع برید اور ردوبدل کر کے) تباہ وبرباد کر ڈالا تھا، خفیہ طور پر ان کی طرف ایسے اقوال منسوب کر دیئے تھے جن کو انھوں نے یقیناً نہیں کہا تھا (اور ایسے بہتان اُن پر لگائے تھے جن سے ان کا دامن قطعاً پاک تھا) چنانچہ محمد بن اسحاق سے مروی ہے کہ:-

حضرت علی (کی وفات) کے بعد ان کے متبعین نے جب یہ نئی نئی چیزیں (حدیثیں) گھڑلیں (اور ان کی طرف منسوب کر دیں) تو خود ان کے متبعین میں سے ہی ایک شخص[1] نے کہا: خدا ان کو غارت کرے کیسے زبردست علم کو انھوں نے تباہ کیا ہے۔

لہذا جب حضرت علی کے متبعین کے درمیان (حضرت علی پر) جھوٹ بولنے کا رواج عام ہو گیا تو علماء اہل سنت نے شیعہ راویوں کی روایات کو محض ازراہ تثبت واحتیاط چھوڑا ہے (نہ کہ مذہبی تعصب کی وجہ سے)

اس تفصیل اور اظہار حقیقت کے بعد قارئین بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ مولف فجر الاسلام نے (اپنی استشراقی ذہنیت کے تحت) اس بحث میں کس قدر اجمال اور اختصار سے کام لیا ہے (تاکہ اصل صورت حال قارئین سے اوجھل رہے) چہ جائیکہ مؤلف کا مبہم دعویٰ کہ:-

راویوں کی جرح وتعدیل میں محدثین کا اختلاف صرف مذہبی اختلاف (اور مذہبی عصبیت) پر مبنی ہے (یہ تو صریح بہتان ہے)

(۲) اس بحث کا دوسرا پہلو، مولف فجر الاسلام کا یہ دعویٰ ہے:-

اس (مذہبی عصبیت) کے نتیجہ میں حالت یہ ہوگی کہ جس راوی کو ایک گروہ (مثلاً سنی علماء) ثقہ کہتے ہیں اسی کو دوسرا گروہ (مثلاً شیعہ علماء) مجروح کہتے ہیں۔

---

[1] ملاحظہ فرمایئے مقدمہ صحیح مسلم ص ۱۲۱۰

اور اس کے ثبوت میں حافظ ذہبی کی عبارت کو پیش کرنا اور محمد بن اسحاق کے بارے میں جو علماء جرح و تعدیل کے اختلافات ہیں ان کو اس دعوے کی دلیل قرار دینا ہے۔

اس موقعہ پر مؤلف نے پے در پے ٹھوکریں کھائی ہیں۔

(۱) اول یہ کہ مولف کا مذہبی اختلاف کے نتیجہ کی مثال میں محمد بن اسحاق کے بارے میں علما کے اختلاف کو (بطور دلیل) پیش کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں اس لئے کہ محمد بن اسحاق کے متعلق علما کے اختلافات کسی مذہبی اختلاف پر مبنی ہو ہی نہیں سکتے اس لئے کہ محمد بن اسحاق بھی اہل سنت میں سے ہے اور جن لوگوں کے درمیان اس (کی جرح و تعدیل) کے بارے میں اختلافات ہیں وہ سب بھی اہل سنت ہی میں سے ہیں۔ لہٰذا اس مثال کو اس مقام پر بطور دلیل پیش کرنا قطعاً غلط ہے۔

(۲) دوم یہ کہ مولف نے حافظ ذہبی کی عبارت کا جو مطلب سمجھا ہے وہ اُس سے قطعاً مختلف ہے جو ذہبی کی عبارت سے مطلب نکلتا ہے اور اس سے بھی مختلف ہے جو خود ذہبی کا منشا ہے اس لئے کہ مؤلف نے اس عبارت کا یہ مطلب سمجھا (یا نکالا) ہے کہ:

> "علماء جرح و تعدیل کا یہ اختلاف ان کے نظریات میں شدید ترین اختلاف کی دلیل ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی دو عالم بھی کسی راوی کی توثیق یا تضعیف پر متفق نہیں ہیں بلکہ ایک عالم اُس کو ثقہ کہتا ہے تو دوسرا اسی کو مجروح اور ضعیف بتلاتا ہے یا اس کے برعکس (یعنے اگر ایک مجروح کہتا ہے تو دوسرا ثقہ بتلاتا ہے)

لیکن ذہبی کی عبارت میں معمولی سا غور کرنے والا شخص بھی سمجھ سکتا ہے کہ اس عبارت کا وہ مطلب نہیں ہے جو مولف نے سمجھا (یا نکالا) ہے اس لئے کہ ذہبی تو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ:

> اس فن (جرح و تعدیل) کے علما رجال سند (راویان حدیث) کے پرکھنے میں انتہا درجہ محتاط اور پختہ کار ہوتے ہیں ان میں اس قسم کا اختلاف کبھی واقع نہیں ہوا کہ جو راوی (محدثین کے حلقہ میں ضعیف مشہور ہو وہ اس کی توثیق کرنے لگیں یا جو راوی حافظہ کی پختگی اور راست گوئی میں مشہور و معروف ہو اس کی تضعیف کرنے لگیں علماء

جرح و تعدیل کا اختلاف تو صرف اسی راوی (کی جرح و تعدیل) میں
ہوتا ہے جو (محدثین کے حلقہ میں) ضعیف ہونے میں یا حافظ کی
پختگی میں معروف نہ ہو (اور غیر معروف ہونے کی وجہ سے تضعیف
اور توثیق دونوں کا احتمال ہو، ورنہ جو راوی ضعیف یا حفظ و ضبط میں
معروف ہوتے ہیں ان کے بارے میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا بلکہ ان
کی تضعیف یا توثیق پر سب متفق ہوتے ہیں)

اس کا تو حاصل یہ ہے کہ وہ کسی راوی کے متعلق وہی بات کہتے ہیں،
(اور اسی رائے کا اظہار کرتے ہیں) جو حقیقت پر مبنی ہوتی ہے ذرا غور کیجئے
اگر توثیق ضعیف اور تضعیف ثقہ سے ذہبی کی مراد وہی ہوتی جو مؤلف نے سمجھی ہے تو وہ یوں
کہتے[۵] کہ:

کوئی بھی دو عالم کسی بھی راوی کی توثیق یا تضعیف پر متفق نہیں
ہوئے۔

(۳) سوم یہ کہ محمد بن اسحاق کے بارے میں علماء کے اختلاف سے ذہبی کی عبارت کی
تائید نہیں نکلتی بلکہ اس اختلاف سے تو اس عبارت پر (اُلٹا) اعتراض وارد ہو رہا ہے (کہ دیکھو
محمد بن اسحٰق مشہور و معروف شخص ہے اس کے باوجود علما میں اس کے
متعلق کافی اختلاف ہے کوئی ثقہ کہتا ہے کوئی ضعیف)۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلم الثبوت
کے مصنف (ملا محب اللہ بہاری) نے (اس مسئلہ میں ذہبی کے ساتھ اتفاق رائے ظاہر کرنے
کی غرض سے) ذہبی کی یہ عبارت نقل کی ہے اس پر مسلم الثبوت کے شارح (مولینا بحر العلوم)

---

[۵] حالانکہ انھوں نے اس طرح نہیں کہا بلکہ ان کے الفاظ یہ ہیں:

اس فن کے کوئی سے دو عالم بھی کسی ضعیف راوی کی توثیق پر متفق نہیں ہوئے اور نہ کسی
ثقہ راوی کی تضعیف پر۔

کتنا بڑا فرق ہے ان دونوں تعبیروں میں۔ مترجم

نے اعتراض کیا ہے کہ یہ تعمیم (اور کلیہ) صحیح نہیں ہے (کہ علماء جرح و تعدیل میں اختلاف صرف غیر معروف راوی کے متعلق ہوتا ہے) اور ان اختلافات کے متعلق (ذہبی کا) استقراء (اور واقعات و نظائر کی تلاش و جستجو) بھی مکمل نہیں ہے چنانچہ دیکھئے محمد بن اسحاق کی جرح و تعدیل میں علماء کے درمیان اختلاف موجود ہے (حالانکہ وہ مشہور و معروف شخص ہے) اور شارح اپنے (اس دعوے کے ثبوت میں) محمد بن اسحاق کی جرح و تعدیل سے متعلق علما کے اقوال پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

دیکھئے اگر محمد بن اسحاق ثقہ ہے تو ان علما میں سے دو سے زیادہ علما اُس کی تضعیف پر متفق ہیں (اور ضعیف کہہ رہے ہیں) اور اگر وہ ضعیف ہے تو دو سے زیادہ علما اس کی توثیق پر متفق ہیں (اور ثقہ کہہ رہے ہیں)

لیکن مولف فجر الاسلام کو نہ شارح کی بات (اعتراض) پسند آئی اور نہ مصنف مسلم الثبوت کی بات (اس اصول میں ذہبی کی تائید)، اور نہ خود ذہبی کی مراد ان کو پسند آئی بلکہ محمد بن اسحاق کے بارے میں علماء جرح و تعدیل کی طرف سے جو کچھ کہا گیا ہے اس کو مؤلف نے اُس خود ساختہ مفہوم کی تائید و توثیق میں پیش کر دیا جو وہ ذہبی کی عبارت سے نکالنا چاہتے ہیں (کہ کسی بھی راوی کی جرح یا تعدیل پر کوئی سے دو عالموں کا بھی اتفاق نہیں ہے)

اب قارئین ہی فیصلہ کریں کہ کیا واقعی مؤلف نہ ذہبی کی عبارت سمجھے اور نہ شارح مسلم الثبوت کی، اور نہ وہ یہ سمجھے کہ محمد بن اسحٰق (کی جرح و تعدیل) کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس عام اصول

لہ اور جس راوی کی توثیق یا تضعیف پر دو یا دو سے زیادہ علماء جرح و تعدیل متفق ہو جائیں اُس راوی کے بارے میں علماء جرح و تعدیل کے درمیان اختلاف نہ ہونا چاہئے کیونکہ اس کے ثقہ یا ضعیف ہونے کی شہرت کے لئے دو عالموں کا اتفاق کافی ہے کہ یہی نصاب شہادت ہے بڑے سے بڑے معاملہ کے ثبوت کے لئے دو ثقہ گواہوں کی گواہی کافی ہوتی ہے لہٰذا محمد بن اسحٰق کے ضعیف یا ثقہ ہونے کے بارے میں اختلاف نہ ہونا چاہیئے تھا حالانکہ یہ اختلاف موجود ہے معلوم ہوا کہ یہ کلیہ صحیح نہیں ہے بلکہ مشہور و معروف ثقہ یا ضعیف راویوں کے بارے میں بھی علما جرح و تعدیل کے درمیان اختلاف موجود ہے۔ ۱۲ مترجم

اور کلیہ قاعدہ پر اعتراض وارد ہوتا ہے جو ذہبی کی عبارت کے عموم سے نکلتا ہے؟ یا وہ یہ سب کچھ سمجھ چکے ہیں لیکن تجاہل عارفانہ سے کام لیکر اور جان بوجھ کر انجان بنکے ذہبی کی عبارت سے اُس کے بر عکس مطلب نکالنے پر تلے ہوئے ہیں جو درحقیقت اس عبارت کا مطلب ہے، تاکہ وہ اِس (مسخ و تحریف) کے ذریعہ علماء جرح و تعدیل کی آراء کی اہمیت اور ان کی عظمت شان کو گرائیں اور پڑھنے والوں کے ذہنوں میں یہ بیٹھائیں۔

کہ علماء جرح و تعدیل کے درمیان کسی راوی کی جرح یا تعدیل کے اقوال اور فیصلے ہمیشہ ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہوتے ہیں اور یہ کہ ان کا یہ اختلاف صرف شخصی رجحانات مذہبی اختلافات اور تعصب پر مبنی ہوتا ہے اگر ائمہ حدیث میں سے ایک امام کسی راوی کی توثیق کرتا ہے تو (اس کی ضد میں) دوسرا امام اس کی تضعیف کر دیتا ہے۔

ایسی صورت میں ہم اس کے پابند نہیں ہیں کہ ہر اس حدیث کو قبول کرلیں جس کے راویوں کو کسی حدیث کے امام مثلاً امام بخاری نے قابل اعتماد سمجھا ہے اور ان کی توثیق کی ہے۔

قارئین کرام مولف کی اس شاطرانہ چال اور فریب کاری پر ذرا گہری نظر سے غور فرمائیں اور اس کی تہ میں جو نظریہ (انکار حدیث) کارفرما ہے اس کو سمجھیں۔

حدیث کی سند اور متن کو پرکھنے کے ضابطے

مولف فجر الاسلام صفحہ ۲۲۶ پر لکھتے ہیں:۔

علماء حدیث نے جرح و تعدیل کے ضابطے ضرور تجویز کئے ہیں۔ جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ـــ لیکن سچ یہ ہے ـــ اور سچی بات تو کہنی ہی پڑتی ہے ـــ کہ انھوں نے متن کو پرکھنے کی بہ نسبت سند کے پرکھنے کا اہتمام زیادہ کیا ہے چنانچہ ہم اس پہلو سے حدیث کی تنقید ان کے ہاں شاذ و نادر ہی پاتے ہیں کہ (۱) جو حدیث رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی گئی ہے وہ ان حالات سے مطابقت نہیں رکھتی جن میں بیان کی گئی ہے (اس لئے قبول نہیں کی جاسکتی) (۲) یا ثابت شدہ تاریخی واقعات اس حدیث کے خلاف ہیں (اس لئے یہ حدیث قابل قبول نہیں) (۳) یا حدیث کی عبارت ایسی فلسفیانہ قسم کی تعبیر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مانوس و معروف تعبیر (اور انداز بیان) کے خلاف ہے اس لئے یہ حدیث صحیح نہیں (۴) یا یہ کہ حدیث میں جو شرطیں اور قیدیں مذکور ہیں ان کی بنا پر وہ (حدیث کی بہ نسبت) فقہ کی عبارت کے زیادہ مشابہ ہے (اس لئے یہ حدیث نہیں بلکہ کسی مجتہد یا فقیہ کی فقہی عبارت ہے جس کے ساتھ سند لگا کر حدیث بنا دیا ہے) ان کے علاوہ اور اسی قسم کے تنقیدی پہلو، اس قسم کی تنقید ہمیں اُس تنقید کا سُوواں حصہ (۱/۱۰۰) بھی نہیں ملتی جس کا انھوں نے رجال سند کی جرح و تنقید میں اہتمام کیا ہے۔ خود امام بخاری اپنی جلالت قدر اور دقت نظر کے باوجود ایسی احادیث کو صحیح قرار دے کر اپنی کتاب صحیح بخاری میں بیان کرتے ہیں جن کو زمانہ کے واقعات اور تجربات و مشاہدات بتلاتے ہیں کہ یہ حدیثیں صحیح نہیں ہو سکتیں صرف اس بنا پر کہ انھوں نے محض رجال (سند کے راویوں) کے پرکھنے پر اکتفا کیا (متن کی طرف مطلق توجہ نہیں کی) مثلاً صحیح بخاری کی ایک حدیث ہے کہ "سو سال بعد روئے زمین پر کوئی متنفس (زندہ انسان) باقی نہیں رہے گا۔ اسی طرح صحیح بخاری کی ایک اور حدیث ہے کہ: جو شخص صبح سویرے (نہار منہ) سات کھجوریں کھالے اس کو اس دن رات تک نہ کسی بھی قسم کا زہر نقصان پہنچا سکتا ہے نہ جادو۔ (پہلی حدیث کی واقعات تردید کرتے ہیں اور دوسری حدیث کی تجربہ اور مشاہدہ تردید کرتا ہے)

مصنف فجر سلام کے اس بیان کے دو جزو ہیں (۱) اول ان قواعد و ضوابط پر تنقید جو علماء حدیث نے حدیثوں کو پرکھنے کے لئے تجویز کئے ہیں (۲) دوم صحیح بخاری کی دو حدیثوں پر تنقید اُن "جدید قواعد و ضوابط کی" روشنی میں جو مؤلف نے حدیث کو پرکھنے کے لئے تجویز کئے ہیں۔

حدیث کو پرکھنے کے لئے علماء حدیث کے تجویز کردہ قواعد کا جائزہ

کیا علماء حدیث نے متن حدیث کو پرکھنے میں کوتاہی کی ہے؟

کیا حدیث کے جانچنے پرکھنے میں اس سے زیادہ نقد و جرح کی گنجائش تھی جو علماء حدیث نے کی ہے؟

دنیا کا قاعدہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص تمہیں کسی دوسرے شخص کے متعلق خبر دیتا ہے (کہ اس نے یہ کہا ہے یا ایسا کیا ہے) تو سب سے پہلے تمہارا ذہن جس چیز کی طرف جاتا ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ تم خبر دینے والے کی راست گوئی اور سچائی کے متعلق تحقیق کرو (کہ وہ سچا اور قابل اعتماد ہے یا نہیں) اس کی تحقیق تم اس کے حالات زندگی خصوصاً امانت و دیانت اور لوگوں کے ساتھ معاملات وغیرہ کی تحقیق اور چھان بین کے ذریعہ کرتے ہو جب تم اس شخص کی راست گوئی کی تحقیق کر لیتے ہو اور مطمئن ہو جاتے ہو تو اس کے بعد اصل خبر پر غور و فکر کرتے ہو اور اس خبر کو اس صاحب خبر (جس کے متعلق خبر دی ہے) کے دوسرے اقوال و افعال سے، جن کو تم پہلے سے جانتے ہو، ملا کر دیکھتے ہو اگر وہ خبر ان کے مطابق و موافق اور ملتی جلتی ہوتی ہے تو تم کو اس خبر کے سچا ہونے میں اور اس پر اعتماد کرنے میں کوئی شک یا تردد نہیں رہتا اور اگر مطابق و موافق نہیں ہوتی تو تم اس خبر دہندہ کی خبر کو قبول کرنے میں توقف کرتے ہو، اس لئے نہیں کہ تمہیں اس خبر دینے والے کی سچائی اور راست گوئی میں کوئی شک یا تردد ہے کیونکہ تم اس کے سچا اور قابل اعتماد ہونے کا تو اطمینان کر چکے ہو بلکہ یہ توقف تم اس شک و شبہ کی بنا پر کرتے ہو جو تمہیں (اس خبر کے دوسرے اقوال و افعال کے مطابق و موافق نہ ہونے کی وجہ سے) اصل خبر میں پیدا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس شک و شبہ کا منشا خبر دہندہ کے متعلق وہم و نسیان کا گمان ہو (اس لئے کہ اچھے سے اچھے سچے اور راست گو انسان سے بھی بھول چوک ہو سکتی ہے) جیسا کہ یہ بھی اس شک و شبہ کا منشا ہو سکتا ہے کہ اس خبر کے اندر چھپا ہوا کوئی راز ہو جو تم پر منکشف نہ ہو سکا ہو تو ممکن ہے کہ آئندہ چل کر یہ راز تم پر کھل جائے اور جس چیز سے تم ناواقف تھے وہ تمہارے علم میں آ جائے (اور یہ شک و شبہ) اور

تردد جاتا رہے) اس صورت میں اگر تم اس خبر کے بارے میں توقف کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کے جھوٹ ہونے کا حکم لگا دیتے ہو تو یہ تمہاری طرف سے اس خبر دہندہ پر تعدی، زیادتی اور حق تلفی ہوگی اور جس چیز کے تم درپے ہو یعنے تحقیق خبر اس کی بیخکنی کے مرادف ہوگا کیونکہ تم نے (اس جلد بازی سے) خبر دہندہ کو سچا جانتے ہوئے اور اس پر وثوق واعتماد حاصل کرتے ہوئے اس کو جھوٹا قرار دیا (یہ انتہائی ظلم ہے)

بالکل یہی مثال ہے علماءِ حدیث کے اس موقف کی جو اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن احادیث کے بارے میں پیش نظر رکھا اور اختیار کیا جو (راویان حدیث کے ذریعہ) ان کے سامنے آئیں چنانچہ سنت پر ان کی جرح وتنقید کے دو مرحلے ہوتے ہیں (۱) اول سند (راویان حدیث) کی چھان بین (۲) دوم متن کی تحقیق وتنقیح۔

جہاں تک سند کا تعلق ہے ہم ان شرائط کو اس سے پہلے تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں جو اُنھوں نے راوی حدیث کے متعلق لگائی ہیں یعنی راوی کی عدالت (دیانت ومروت) حفظ وضبط اور سند کے ہر راوی کا اپنے مروی عنہ شیخ سے براہِ راست اور بالمشافہ سماع (حدیث کا سننا) جس کا سلسلہ صحابی تک پہونچتا ہو اس کی تحقیق کرنا ہم سمجھتے ہیں کہ خود مؤلف اور ان کے پیش رو (بلکہ پیشوا) مستشرقین بھی ان علماء جرح وتعدیل پر اس سلسلہ میں کوئی الزام عائد نہیں کر سکتے کہ شخصی طور پر راویوں کو پرکھنے اور ان کی حدیثیں قبول کرنے کے بارے میں دقیق اور محتاط شرائط تجویز کرنے میں اُنھوں نے کوتاہی سے کام لیا ہے۔ یہ لوگ تو خود ہمارے ساتھ اس پر متفق ہیں کہ ہمارے علماء رحمہم اللہ اس سلسلہ میں تحقیق وتفحص کی اس انتہا کو پہونچ چکے ہیں جس کے بعد احتیاط کوشی کا کوئی مرتبہ باقی نہیں رہتا اور کسی بھی تنقید کرنے والے محتاط محقق کے لئے اس میں مزید اضافہ کی گنجائش نہیں ہے۔

باقی متن کو پرکھنے کے لئے اُنھوں نے جو قواعد وضوابط تجویز کئے ہیں اگرچہ اس سے پہلے ہم اُن پر بھی روشنی ڈال چکے ہیں تاہم ان میں اہم امور کا ہم اعادہ کرتے ہیں جو یہ ہیں:-

(۱) حدیث کے الفاظ ایسے رکیک اور گرے ہوئے نہ ہوں جن کو کوئی بھی فصیح وبلیغ انسان استعمال نہیں کر سکتا ہو۔

(۲) حدیث عقلی بدیہیات کے اس طرح مخالف نہ ہو کہ اس کی کوئی تاویل نہ ہو سکے۔

(۳) حدیث حکمت و اخلاق کے عام (اور مسلّمہ) اصول و قواعد کے خلاف نہ ہو۔

(۴) حدیث حس اور مشاہدہ کے مخالف نہ ہو۔

(۵) حدیث طب اور حکمت کے اعتبار سے بدیہی امور کے مخالف نہ ہو۔

(۶) حدیث میں کسی ایسی اخلاقی رذیلت کی طرف ترغیب اور دعوت نہ ہو جس سے شریعت اور اس کے مقصد کی نفی لازم آئے۔

(۷) حدیث خدا اور رسول کی صفات سے متعلق اصولی عقائد میں، عقل کے خلاف نہ ہو۔

(۸) حدیث کائنات اور انسان کی ہستی سے متعلق سنت الہیہ کے مخالف نہ ہو۔

(۹) ایسی غیر معقول اور گری ہوئی باتیں اس حدیث میں مذکور نہ ہوں جن سے عقلمند انسان اجتناب اور پرہیز کرتے ہیں۔

(۱۰) حدیث قرآن عظیم محکم سنت، اجماع اور معروف "ضروریات دین" (یعنے دین کے قطعی امور و احکام) کے اس طرح مخالف نہ ہو کہ اس کی کوئی تاویل نہ ہو سکے۔

(۱۱) حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اور عہد سے متعلق جو معروف تاریخی حقائق ہیں ان کے مخالف نہ ہو۔

(۱۲) حدیث ایسے (گمراہ فرقوں کے) راوی جو اپنے عقیدہ اور مذہب کی طرف دعوت دینے کے عادی ہوں ان کے مذہب کے مطابق اور مؤید نہ ہو۔

(۱۳) کسی ایسے واقعہ کی اس حدیث میں اطلاع نہ ہو جو بہت بڑے مجمع کے سامنے پیش آیا ہو لیکن اس کی اطلاع صرف ایک ہی راوی دے رہا ہو۔

(۱۴) وہ حدیث کسی ایسے نفسیاتی محرک اور داعیہ کا نتیجہ نہ ہو جس کی بنا پر راوی اس کی روایت پر مجبور رہا ہو۔

(۱۵) حدیث کسی چھوٹے سے عمل پر بہت بڑے (اور غیر معقول) ثواب کسی معمولی سے گناہ پر بہت زیادہ (اور غیر معقول) عذاب اور شدید وعید پر مشتمل نہ ہو۔

یہ وہ قوی اور مضبوط بنیادی اصول ہیں جن کے ذریعہ حدیثوں کے متن کو پرکھنے اور صحیح و ضعیف حدیثوں میں تمیز کرنے کے اندر علماء حدیث نے عمریں صرف کر دی ہیں اور اس میں کوئی

شبہ نہیں کہ یہ ایسے کھرے اور بے عیب بنیادی اصول ہیں جن کی خوبی، گہرائی اور کافی ووافی ہونے سے کوئی منصف انکار نہیں کر سکتا۔

ہمارے علماء نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حدیث کے اُن تمام علتوں (اور عیوب) سے جن کا اوپر ذکر ہوا پاک وصاف ثابت ہونے کے بعد بھی متن حدیث کو مزید پرکھا ہے اُنھوں نے متن کو اس کے اضطراب[1]، شذوذ اور اس کی مخفی علتوں کے اعتبار سے بھی پرکھا ہے جیسا کہ انہوں نے متن کے قلب (تغیر وتبدل) غلطی اور ادراج (اضافہ) کے پہلو سے جانچ پڑتال کی ہے۔ ان میں سے ہر عیب کی انہوں نے بکثرت مثالیں دی ہیں اور شواہد پیش کئے ہیں جو اس فن کی کتابوں میں بالتفصیل مذکور ہیں۔

اس شدید ترین دقیقہ رسی اور انتہائی اہتمام واعتنا کے باوجود انہوں نے صاف لفظوں میں یہ کہنے سے بھی دریغ نہیں کیا کہ :۔(اس تحقیق وتنقید کے باوجود بھی) ہو سکتا ہے کہ یہ حدیثیں فی الواقع صحیح نہ ہوں اس لئے کہ یہ سب اخبار آحاد ہیں (متواتر نہیں کہ قطعی اور یقینی طور پر ان کو صحیح کہا جا سکے) اگرچہ یہ احتمال انتہائی کمزور اور بعید ہے" اسی طرح وہ یہ کہنے میں بھی دریغ نہیں کرتے کہ: (ان تمام احتیاطوں کے باوجود) عقلاً راوی کو وہم ہو جانے یا بھول جانے کا امکان اب بھی باقی رہتا ہے اگرچہ ہمیں اس کا علم نہیں ہو سکا"

انہی عقلی احتمالات کی بنا پر جمہور محدثین کہتے ہیں کہ: "احادیثِ آحاد" مفید ظن ہیں (یعنے غالب گمان یہ ہے کہ یہ حدیثیں صحیح ہیں یقینی طور پر صحیح نہیں کہا جا سکتا) تاہم ان پر عمل کرنا واجب

---

[1] ان اصطلاحات کی تشریح حسب ذیل ہے۔

اضطراب: ایک حدیث کا متن ایک سند سے کچھ ہو اور دوسری سند سے کچھ اور ہو۔ ایسی حدیث کو مضطرب کہتے ہیں۔ شذوذ: شاذ اس حدیث کو کہتے ہیں جسمیں ثقہ راوی اپنے سے زیادہ ثقہ راویوں کی مخالفت کرے علت: جس حدیث کے متن یا سند میں کوئی ایسی پوشیدہ مانع صحت خرابی ہو جو بظاہر محسوس نہ ہوتی ہو ایسی حدیث کو معلل کہتے ہیں قلب: کوئی راوی ایک حدیث کے پورے متن یا سند کو یا اس کے کسی جزو کو دوسری حدیث کے متن یا سند سے یا اس کے کسی جزو سے بدل دے ایسی حدیث کو مقلوب کہتے ہیں ادراج: کسی حدیث میں کوئی راوی تشریح یا بیانِ مراد کی غرض سے اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر دے جو اصل حدیث میں نہ ہو ایسی حدیث کو مدرج کہتے ہیں۔

ہے (اس لئے کہ وجوب عمل کے لئے گمان غالب کافی ہے)۔

بخدا! یہ اللہ کے دین میں احتیاط کی انتہا ہے اور علمی حقائق کو ثابت کرنے میں یہ احتیاط کوشی کی آخری حد ہے۔

لیکن علماء حدیث کی یہ تمام تر احتیاط کوشی اور راویوں اور حدیثوں کے پرکھنے میں یہ شدت مولف فجر الاسلام کو ایک آنکھ نہیں بھاتی صرف اس لئے کہ ان کے (یہودی اور مسیحی) اساتذہ مستشرقین کو پسند نہیں ہے اس لئے وہ — جیسا کہ اس بحث کے دوران ہم ذکر کر چکے ہیں — ان قاعدوں پر تنقید (بلکہ تنقیص) کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: محدثین کا فرض تھا کہ وہ حدیثوں پر نقد و جرح کرتے اور پرکھتے وقت مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھتے:

(۱) کیا وہ حدیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی گئی ہے اس زمانہ کے حالات کے مطابق ہے جن میں بیان کی گئی ہے۔

(۲) کیا تاریخی واقعات اس کی تائید کرتے ہیں۔

(۳) کیا اس حدیث کا انداز بیان فلسفیانہ تو نہیں ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے (سیدھے سادے) معروف انداز بیان سے مختلف ہوتا ہے۔

(۴) حدیث میں مذکورہ شرطیں اور قیدیں فقہ کی عبارتوں سے ملتی جلتی تو نہیں ہیں۔

مولف نے اپنی دوسری کتاب ضحی الاسلام میں ج ۲ ص ۱۳۰ - ۱۳۱ پر مندرجہ ذیل امور کا اور اضافہ کیا ہے۔

(۵) حدیث واقعہ پر منطبق ہوتی ہے یا نہیں؟

(۶) اس حدیث کو گھڑنے کا کوئی سیاسی محرک تو نہیں ہے؟

(۷) حدیث اس معاشرے کا ساتھ دیتی ہے جس میں وہ بیان کی گئی ہے یا نہیں؟

(۸) راوی حدیث کا کوئی شخصی محرک اور نفسیاتی داعیہ تو ایسا نہ تھا جس نے راوی کو اس حدیث کے وضع کرنے پر آمادہ کیا ہو؟

نقد حدیث کے یہ وہ "نئے ضابطے" ہیں جن کو فجر الاسلام اور ضحی الاسلام کے مولف نے متن کو پرکھنے کے لئے تجویز کیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ ہمارے علماء حدیث کی

رسائی ان ضابطوں تک نہیں ہوسکی اگر ان کی توجہ ان ضابطوں کی طرف ہوجاتی تو بہت سی ان حدیثوں کی قلعی کھل جاتی جن کو انھوں نے صحیح قرار دیا ہے اور بزعم مولف وہ سب گھڑی ہوئی ہیں۔

مولف فجر الاسلام نے ان حدیثوں کی مثال میں صحیح بخاری کی دو حدیثیں پیش کی ہیں اور ضحی الاسلام میں جامع ترمذی کی ایک حدیث پیش کی ہے۔ جو حضرت ابوہریرۃ سے مروی ہے کہ (انھوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا):-

"کھنبی[1] مَن[2] کی ایک قسم ہے اور "عجوہ"[3] کھجوریں جنت کا میوہ ہیں ان میں زہر سے شفا رکھی ہوئی ہے۔

ہمارے مولف کو شکایت ہے کہ:-

محدثین نے اس حدیث کے پرکھتے وقت ابوہریرہ کے اس ہوے کے علی الرغم (برخلاف) کہ: میں نے کماءۃ (کھمبی) کا تجربہ کیا ہے اور امراض چشم کے لئے شفا بخش پایا ہے۔" خود اُس کو نہیں آزمایا حالانکہ حدیث کے پرکھنے کے لئے انھیں خود تجربہ کرنا چاہیئے تھا)

---

(۱) الکماءۃ ایک خود رو لوبی ہے برسات کے موسم میں بڑے درختوں کے نیچے بڑی کثرت سے نکل آتی ہے اس کی شکل بالکل چھتری کی سی ہوتی ہے اسی لئے عوام اس کو "سانپ کی چھتری" یا "سانپ کی ٹوپی" کہتے ہیں۔ پتلی سی شاخ پر "سفید ٹوپی" سی معلوم ہوتی ہے اطبا امراض چشم کے لئے اس کے نچوڑے ہوئے پانی کو مفید لکھتے ہیں۔ (۲) المن میدان تیہ میں سرگرداں اور محصور قوم بنی اسرائیل کو اللہ نے اپنے کرم سے "من وسلوی" عطا فرمایا تھا مَن قدرتی شکر تھی جو صبح سویرے شبنم کے قطروں کی طرح درختوں کی شاخوں اور پتوں پر جمی ہوئی ملتی تھی اور سلوی بٹیر کی قسم کے پرندے تھے جن کا گوشت بیحد ہی زیادہ لذیذ ہوتا تھا اور آتی کثرت سے صبح کے وقت خود بخود آتے تھے جیسے ٹڈی دل چنانچہ لوگ بآسانی ہاتوں سے ہی پکڑ لیتے تھے۔ مَن صنعتی شکر کا قدرتی نعم البدل تھا اور سلوی ہوائی گوشت کا نعم البدل تھا (۳) عجوہ کھجور کی ایک قسم ہے جواب بالکل نایاب ہے۔ ۱۲ مترجم

اگرچہ مولف نے اخیر میں اس کا تو اعتراف کیا ہے کہ: محدثین سے
نقد حدیث کے سلسلہ میں راوی کے شخصی حالات سے متعلق کچھ تنقیدی
امور منقول ہیں مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر نے حضرت ابوہریرۃ کی حدیث
میں لفظ او کلب زرع کے اضافہ پر تنقید کی ہے کہ: "ابوہریرہ کاشتکار
تھے" (اس لئے انھوں نے اپنے کھیتوں میں حفاظت کے لئے کتے پالنے
کا جواز ثابت کرنے کی غرض سے او کلب زرع ـــ یا کھیتی کا کتا ـ
کا لفظ اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے العیاذ باللہ)

آیئے ذرا ہم بھی نقد حدیث کے ان اچھوتے پیمانوں (جدید اصول نقد) کی جانچ پڑتال کریں جن کی بزعم مولف "محدثین کو ہوا بھی نہیں لگی" اور ان مثالوں کا بھی جائزہ لیں جن کو مولف نے ان جدید اصول کے تحت پرکھنے کے سلسلہ میں بطور مثال پیش کیا ہے اور اندازہ لگائیں کہ مولف اس (محدثین پر نکتہ چینی) میں کس حد تک کامیاب ہیں۔

(۱) مولف کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ: محدثین نے ان امور کی تحقیق نہیں کی کہ جو حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ آیا وہ جن حالات میں کہی گئی ہیں ان کے مطابق و موافق ہیں یا نہیں۔

آپ (مولف کے اس دعوے کے متعلق) دیکھ چکے ہیں کہ اُن کا یہ زُعم قطعاً صحیح نہیں ہے (اور بالکل خلاف واقعہ ہے) بلکہ محدثین نے تو اس اصول کو متن حدیث کے پرکھنے کے سب سے اہم اصول میں شمار کیا ہے اور گذشتہ اوراق میں ہم اس کی مثال میں "حمام کی حدیث" پیش کر چکے ہیں، کہ علماء حدیث نے اس حدیث کو صرف اسی بنیاد پر رد کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو کبھی بھی حمام میں تشریف نہیں لے گئے اور حجاز تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں حمام کو جانتا بھی نہ تھا کہ کیا ہوتا ہے (یعنی حجاز میں تو حمام کا نام و نشان بھی نہ تھا پھر آپ کیسے تشریف لے گئے)

(۲) دوسرا نیا اصول مولف نے یہ بتلایا ہے کہ حدیث کو پرکھتے وقت یہ دیکھنا چاہئے کہ تاریخی واقعات اس حدیث کی تائید کرتے ہیں یا تکذیب و تردید کرتے ہیں؟ اس سلسلہ میں بھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ محدثین نے اس (تاریخ کی مخالفت) کو حدیث کے موضوع ہونے کی علامات میں سے شمار

کیا ہے اور اس کی مثال میں انھوں نے "اہل خیبر پر جزیہ لگانے کی حدیث" کو پیش کر کے رد کیا ہے (کہ یہ حدیث موضوع ہے) علماء حدیث نے اس حدیث کو صرف اسی لئے رد کیا ہے کہ تاریخی واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔ اور آپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ محدثین نے راویوں کے اپنے مشائخ (اور اساتذہ) سے ملاقات میں ان کے جھوٹ کا کھوج لگانے کے لئے تاریخ کو کس قدر اہمیت دی ہے (اور کتنے اہتمام سے تاریخ کے ذریعہ ان کا جھوٹ ثابت کیا ہے لہٰذا محدثین پر یہ الزام بھی حقیقت کے خلاف ہے اور سراسر بہتان)

(۳) تیسرا جدید اصول مولف نے یہ بتلایا ہے کہ (محدث کو یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ) حدیث کے الفاظ اور انداز بیان فلسفیانہ قسم کا تو نہیں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معروف و مانوس انداز بیان کے خلاف ہو۔

یہ اصول درحقیقت "رکیک الفاظ" کے تحت داخل ہے اور اس کا ضابطہ محدثین نے یہ تجویز کیا ہے کہ آپ کو اس امر کا یقین ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کا کلام نہیں فرما سکتے۔ اس سلسلہ میں ہم ابن دقیق العید کا یہ قول نقل کر چکے ہیں:۔

> بسا اوقات محدثین ایسے امور کی وجہ سے حدیث کے موضوع ہونے
> کا حکم لگا دیتے ہیں جن کا تعلق حدیث کے متن سے ہوتا ہے جن سے وہ یہ
> پہچان لیتے ہیں کہ کون سے الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہو سکتے ہیں،
> اور کون سے نہیں"

تو جب محدثین نے (حدیث کے الفاظ کے متعلق) یہ ضابطہ مقرر کر لیا تو اس قسم کی فلسفیانہ حدیث کو بآسانی رد کر سکتے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معروف و مانوس الفاظ اور انداز بیان کے خلاف ہو۔

اسی لئے ہم مؤلف کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ کوئی ایک حدیث بھی ایسی بتلائیں جس کو ہمارے محدثین نے صحیح کہا ہو اور وہ اس قسم کی ہو (یعنے اس کے الفاظ اور انداز بیان فلسفیانہ ہو)

(۴) رہا مولف کا یہ نیا ضابطہ کہ حدیث اپنی شرائط اور قیود کے لحاظ سے فقہ کے متن کے مشابہ اور ملتی جلتی نہ ہو، سو اس سلسلہ میں بھی آپ اس سے قبل پڑھ چکے ہیں کہ علماء حدیث نے

(حدیث کی صحت کے لئے) کتنی عجیب شرائط لگائی ہے کہ حدیث کسی متعصب راوی کے (فقہی) مذہب کے موافق اور مؤید نہ ہونی چاہیئے اور صرف اسی اصول کے تحت عقائد سے متعلق بہت سی حدیثوں کو رد کر دیا ہے صرف اس لئے کہ وہ راویوں کے مذہب کی تائید کرتی تھیں اسی طرح محدثین نے صرف اسی اصول کے تحت بہت سی فقہی حدیثوں کو بھی رد کیا ہے مثلاً یہ حدیث:۔

جنبی (ناپاک آدمی) کے لئے تین مرتبہ کلی کرنا اور تین مرتبہ ناک میں پانی دینا فرض ہے"

اسی طرح ذیل کی حدیث:

اگر کپڑے پر درہم کے بقدر خون لگا ہو (اور نماز پڑھ لی ہو) تو کپڑے کو دھویا جائے گا اور نماز لوٹائی جائے گی۔

اس قسم کی بہت سی حدیثیں ہیں جن پر علماء حدیث نے موضوع ہونے کا حکم لگایا ہے۔ مزید تفصیل کے لئے مندرجہ ذیل کتابیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) زیلعی کا نصب الرایہ (۲) ابن الجوزی کی موضوعات (۳) سیوطی کی اللآلی المصنوعہ

(۵) رہا مولف کا یہ جدید اصول کہ حدیث واقعات پر منطبق ہوتی ہے یا نہیں؟ تو ائمہ حدیث نے (اپنے اصول نقد حدیث میں) اس کا بھی ذکر کیا ہے جیسا کہ آپ اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں اور اسی اصول کے تحت انھوں نے بہت سی حدیثوں کو رد کیا ہے مثلاً مندرجہ ذیل احادیث:۔

(۱) سو سال کے بعد ایسا کوئی بچہ پیدا نہ ہوگا جس کو خدا کی حاجت ہو (یعنی خدا کو مانتا ہو)

محدثین نے یہ حدیث صرف اسی لئے رد کی ہے کہ یہ واقعات اور مشاہدات کے خلاف ہے کیونکہ اکثر و بیشتر ائمہ دین خصوصاً مشہور و معروف امام پہلی صدی ہجری کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔

(۲) بینگن ہر بیماری کے لئے شفا ہے۔

(۳) اسی طرح ایک اور حدیث ہے:۔

مسور ضرور کھایا کرنا اس لئے کہ اس میں برکت بھی ہے، دل کو بھی رقیق (نرم) کرتی ہے آنسو بھی کثرت سے لاتی ہے (یعنی رونا خوب آتا ہے)

علماء حدیث نے ان دونوں حدیثوں کو باطل کہا ہے کیونکہ یہ علم طب کے عام اور معروف

قاعدہ کے بھی خلاف ہیں۔

(۶) رہا مولف کا یہ جارید اصول کہ "اس حدیث کے بیان کرنے میں کوئی سیاسی محرک تو کار فرما نہیں ہے" ؟ تو آپ گزشتہ اوراق میں پڑھ ہی چکے ہیں کہ علماء حدیث نے (اسی اصول کے تحت) گمراہ فرقوں اور باطل مسلکوں کے متعصب راویوں اور ہوا پرستوں کی روایتوں کو ترک کر دینے کی تصریح کی ہے اور صرف اسی وجہ سے محدثین نے حضرت علی (اور اہل بیت) کے بارے میں غالی شیعوں کی، حضرت ابوبکر کے بارے میں "فرقہ بکریہ" کے غالی راویوں کی اور حضرت عثمان کے بارے میں فرقہ "عثمانیہ" کے غالی راویوں کی اور بنو اُمیہ کے بارے میں امویوں کے متعصب طرفداروں کی اور بنو عباس کے بارے میں عباسیوں کے متعصب طرفداروں کی روایتیں یکسر رُد کر دی ہیں اور یہ بھی آپ گزشتہ اوراق میں پڑھ چکے ہیں کہ محدثین نے اس حقیقت کو برابر پیش نظر رکھا ہے کہ سیاسی اختلافات وضع حدیث کا سب سے بڑا اور اہم محرک ہوئے ہیں چنانچہ اُنھوں نے سیاسی اختلافات سے متاثر احادیث کو ایک ایک کر کے تلاش کیا ہے اور ان پر انتہائی شدید تنقید کی ہے اور اس چھان بین اور جرح و تنقیح کے بعد اس سلسلہ کی جو حدیثیں انھوں نے قبول کی ہیں وہ ان سے تعداد میں بدرجہا کم ہیں جن کو اُنھوں نے رُد کیا ہے۔

(۷) رہا مولف کا یہ اصول کہ "حدیث اس معاشرہ سے مطابقت بھی رکھتی ہے یا نہیں جس میں وہ کہی گئی ہے"، تو محدثین نے تو اس اصول کو بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور اسی اصول کے تحت متعدد حدیثوں کو رد کیا ہے۔ ان میں سے ایک حدیث یہ ہے:

(۱) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) میری آنکھیں دُکھنے لگیں تو میں نے جبرئیل سے اس کی شکایت کی تو اُنھوں نے کہا: مصحف (قرآن) کی طرف ہمیشہ دیکھا کرو (تو آنکھیں دُکھنے نہیں آئیں گی۔)

محدثین نے کہا ہے کہ: (یہ حدیث موضوع ہے اس لئے کہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مصحف (کتابی شکل میں لکھے ہوئے قرآن) کا وجود ہی نہ تھا کہ آپ اس کی طرف دیکھتے۔

(۸) رہا مولف کا بیان کردہ یہ اصول کہ "راوی حدیث کا کوئی شخصی معاملہ تو نہیں ہے جس نے اسے حدیث گھڑنے پر آمادہ کیا ہو"؟ آپ محدثین کے اصول جرح و تعدیل کے ذیل میں پڑھ چکے ہیں،

محدثین وضع حدیث کے اس داعیہ سے بھی غافل نہیں رہے بلکہ اُنھوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ : بعض اوقات راوی کے شخصی حالات سے بھی پتہ چل جاتا ہے کہ حدیث موضوع ہے" اور اس کی مثال میں اُنھوں نے یہ حدیث پیش کی ہے کہ :-

(۱) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) ہرلیسہ (حلیم) کمر کو مضبوط کرتا ہے۔

یہ حدیث موضوع ہے اس لئے کہ اس کا راوی ہرلیسہ بنایا (اور بیچا) کرتا تھا (حلیم فروش تھا اس نے اپنی دکان چمکانے کے لئے حدیث گھڑلی)

(۲) اسی طرح ایک اور حدیث ہے :-

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) : تمہارے بچوں کے پڑھانے والے (اُستاد) تم میں سب سے بُرے لوگ ہیں۔

(یہ حدیث گھڑی ہوئی ہے اس لئے کہ) اس حدیث کے راوی سعد بن طُریف نے یہ حدیث اس وقت بیان کی ہے جب اس کا بچہ اس کے پاس رُوتا ہوا آیا ہے اور بتلایا ہے کہ اس کے اُستاد نے پیٹا ہے۔

دیکھا آپ نے، متن حدیث کو پرکھنے کے وہ جدید اصول جن کو مولف نے بزعم خود بطور مستزاد بیان کیا ہے (اور جن کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ اگر محدثین ان اصول سے واقف ہوتے اور متن حدیث کے پرکھنے میں ان سے کام لیتے تو بہت سی وہ حدیثیں جن کو اُنھوں نے صحیح قرار دیا ہے ان کی حقیقت کُھل جاتی)۔ علماء حدیث ان اصول سے نہ صرف یہ کہ بے خبر تھے بلکہ محدثین نے تو ان سے بھی زیادہ سخت قواعد تجویز کئے ہیں اور ان کی بنیاد پر بہت سی حدیثوں کو رَد کیا ہے۔ اگر مولف "موضوعات" سے متعلق محدثین کی (کاوشوں اور) کتابوں کے دیکھنے کی زحمت گوارا کرتے، علماء مصطلح حدیث اس سلسلہ میں جو کچھ لکھ گئے ہیں۔ اس کو دیکھتے نیز جرح و تعدیل کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تو یقیناً وہ بھی اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے کہ علماء حدیث خود مولف سے بہت زیادہ اس چیز کے درپے اور حریص ہوئے ہیں جس کا مولف نے ذکر کیا ہے (یعنی موضوع حدیثوں کی چھان بین اور تلاش و جستجو) چنانچہ متن حدیث کے موضوع ہونے کی پہچان کے لئے جو علامتیں بتلائی ہیں ان کی تعداد ــ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں ــ پندرہ سے زیادہ ہے

ہاں یہ ضرور ہے کہ علماء حدیث رحمہم اللہ نے ان "پیمانوں" کو صرف اسی حد تک استعمال کیا ہے جتنا ناگزیر تھا چنانچہ کسی حدیث کو اُنھوں نے صرف اُسی وقت رد کیا ہے جب اس کی تاویل (و تصحیح) بالکل ہی ناممکن ہوگئی ہے یعنے صحت حدیث کی جو شرطیں اُنھوں نے لگائی ہیں ان میں سے کسی شرط کا موجود نہ ہونا قطعی طور پر متحقق ہو گیا ہے اور حدیث کے موضوع ہونے کی علامتوں میں سے کوئی علامت قطعی طور پر پائی گئی ہے اسی لئے اُنھوں نے اپنا پہلا اور اہم ہدف سند کو قرار دیا اور اس نقد سند کے ذریعہ سنت کے ذخیرہ سے ہزاروں بلکہ لاکھوں جھوٹی حدیثیں نکال پھینکیں، اس کے بعد اُنھوں نے متن حدیث کو ان حدود کے اندر رہ کر پرکھا جن کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں لیکن انتہائی محدود دائرہ میں۔ اس لئے کہ یہ حضرات صحیح حدیثوں کی تلاش و جستجو اور تحقیق کے درپے تھے (انکار حدیث کے درپے نہ تھے اسی لئے) ان کا قلم آزاد بیباک اور بے لگام نہ تھا وہ اپنی خواہشات واغراض اور جذبات کے تحت اللہ کے دین میں اٹکل کے تیر نہیں چلاتے تھے اسی لئے وہ ان شرمناک اور فحش غلطیوں کے ارتکاب سے محفوظ رہے جن کا شکار مولف ہوئے جبکہ اُنھوں نے دین میں پختگی، احتیاط اور حدیث کی بہتر توجیہہ کے جذبہ کے بغیر انتہائی بے باکی اور بے پروائی کے ساتھ نقد حدیث میں اِنھی پیمانوں اور اصولوں سے کام لیا جس کے نتیجہ میں مولف نے ایسی صحیح حدیثوں کے اوپر بھی موضوع ہونے کا حکم لگادیا جو زرِ خالص کی مانند کھری اور صحیح ہیں اس کی تفصیل آپ آگے پڑھیں گے۔

علماء حدیث رحمہم اللہ نے نقد حدیث میں جس احتیاط کوشی (اور حسن عقیدت) سے کام لیا اس کا عذر بالکل واضح ہے ان کا مقصد وحید صرف ان حدیثوں کی چھان بین اور تلاش و جستجو تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی جاتی تھیں اور (یہ حقیقت ہے کہ نبی کی ہستی کی سطح عام انسانی ہستیوں سے اتنی بلند ہوتی ہے کہ اس کو عام انسانوں پر قیاس کیا ہی نہیں جاسکتا اس لئے کہ) نبی کے مخصوص حالات (اور ملکوتی احوال ہوتے ہیں جن میں وہ زندگی بسر کرتا ہے۔ یہی مخصوص احوال (اور تشریعی ذمہ داریاں) ہیں جو عام انسانوں کی خبروں اور باتوں کی بہ نسبت نبی کے اقوال و افعال کے جانچنے پرکھنے کے پیمانوں اور ضابطوں کو زیادہ دقیق مشکل اور لائق احتیاط بنادیتے ہیں اس لئے کہ وہ رسول (فرستادہ الٰہی) ہوتا ہے خدا کی وحی (متلو اور غیر متلو)

اس کے پاس آتی رہتی ہے، جامع کلمات (ہمہ گیر اور دُور رس اقوال) اس کو (بطور معجزہ) دیئے جاتے ہیں، قانون شرعی کی تشکیل کا اختیار اس کے سپرد کیا جاتا ہے وہ (انسانی زندگی سے متعلق) غیب کے ان رازوں (سے اوانف اوران) پر حاوی ہوتا ہے جو ایک عام انسان کی دسترس سے قطعاً باہر ہوتے ہیں لہٰذا از روئے عقل اس امر میں کوئی مانع نہیں کہ وہ ایسی باتیں بھی بیان کرے جو اس نبی کے زمانہ کے لوگوں کی عقل و فہم سے ماوراء اور اعلیٰ و ارفع ہوں، تو نبی کا وہ کلام عقل و فلسفہ کے اس اعلیٰ معیار پر بھی ہو سکتا ہے جہاں فلسفہ اور عقلی علوم و فنون اپنے عروج کے انتہائی دور میں پہونچتے ہیں اسی طرح از روئے عقل اس امر کو تسلیم کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں کہ ایک نبی انسانوں کے باہمی معاملات — بیع و شراء، نکاح و طلاق اور فصل خصومات — سے متعلق احکام لوگوں کے سامنے ایسے نپے تلے الفاظ میں بیان کرے جو قانون کے الفاظ اور اصطلاحات کے مشابہ ہوں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

> بائع و مشتری کو (خریدی ہوئی چیز کے لینے نہ لینے کا) اختیار رہتا ہے جب تک کہ وہ ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوں۔

اسی طرح آپ ارشاد فرماتے ہیں:

> ایک عورت کے نکاح میں ہوتے نہ اس عورت (بیوی) کی پھوپی سے نکاح کیا جائے اور نہ اس کی خالہ سے۔

اسی طرح آپ ارشاد فرماتے ہیں:۔

> دودھ پلانے سے بھی (دودھ پلانے والی عورت اور دودھ پینے والے بچے کے درمیان) وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں

یہ (اور اسی قسم کے) احکامات ان قانون سازی کے اختیارات تمیزی کے تحت صادر ہوئے ہیں جو ایک صاحب شریعت نبی ہونے کی حیثیت سے آپ کو دئے گئے ہیں اور اس خصوصی فصاحت و بلاغت کی فضا میں صادر ہوئے ہیں جو بطور معجزہ آپ کو دی گئی ہے

لہٰذا اس قسم کے نپے تلے قانونی اقوال کا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان وحی ترجمان سے

صادر ہونا قطعاً مستبعد نہیں (کہ ان کو محض یہ کہہ کر رد کر دیا جائے کہ یہ تو فقہی متوں اور فقہا کی عبارتوں کے مشابہ ہیں) سوال یہ ہے کہ (شارع اور مقنن ہونے کی حیثیت سے) آخر ان قطعی اور واضح مفہومات کو ادا کرنے کے لئے ان فصیح و بلیغ کلمات کو آپ استعمال نہ کرتے تو کون سے الفاظ استعمال کرتے؟ (سوقیانہ اور عامیانہ؟)

اور جب فقہا اور مقننین اسلام بعد میں آئے تو انھوں نے آپ کے ان جچے تلے اور منضبط الفاظ کو بعینہ اختیار کر لیا اور کتب فقہیہ (اسلامی قانون) کی کتابوں میں درج کر دیا (اس لئے کہ ان سے زیادہ ہمہ گیر اور منضبط الفاظ و تعبیرات کو اختیار کرنا ان کے لئے ممکن نہ تھا) تو کیا اس پر یہ اعتراض کرنا کسی درجہ میں بھی معقول اور صحیح ہو سکتا ہے کہ یہ احادیث تو فقہی متوں (اور فقہاء کی عبارتوں) کے مشابہ ہیں (حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ فقہی متوں اور فقہاء کی تعبیرات احادیث رسول کے مشابہ اور مطابق ہیں اس لئے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے فقہی متوں نہ تھے بلکہ فقہاء کے سامنے احادیث نبویہ موجود تھیں)

یہی جواب ان احادیث کے بارے میں دیا جا سکتا ہے جن میں نباتات اور پھلوں کے متعلق ایسی معجزانہ معلومات بیان کی گئی ہیں جو ماہرین نباتات اور پھلوں کے آزمودہ کار لوگ بیان کیا کرتے ہیں (یہ اعتراضات تو بھلا کیا معقول ہو سکتے ہیں ان کے برعکس) یہ احادیث تو وہ نبوت کا علمی اور فنی معجزہ ہیں جو رہتی دنیا تک ہر زمانہ میں لوگوں کو اس قسم کی معلومات بہم پہنچا کر ان احادیث کے سچا اور صحیح ہونے کا ثبوت مہیا کرتا رہے گا لہٰذا اگر کسی زمانہ میں رسول کی دی ہوئی ان خبروں کا راز لوگوں پر نہیں کھلتا تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ یہ حدیثیں جھوٹی یا گھڑی ہوئی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ علماء حدیث نے متن کے پرکھنے کا دائرہ اتنا ہی تنگ اور محدود رکھا جتنا سند کے پرکھنے کے دائرہ کو وسیع اور ہمہ گیر رکھا ہے کیونکہ جن لوگوں (راویان حدیث) کے حالات سند میں پرکھے جاتے ہیں وہ بہر حال عام انسان ہی ہیں ان کے حالات کی چھان بین میں وہی اصول و قوانین اختیار کئے جانے چاہئیں جو عام لوگوں کے حالات کی چھان بین میں اختیار کئے جاتے ہیں باقی رہا حدیث کا متن تو وہ تو اس مقدس اور معصوم ہستی کے اقوال و افعال ہیں جو اپنے

علوم ومعارف، ملکوتی صفات اور عام بشریت کی سطح سے بڑھ کر فطری صلاحیتوں اور اہلیت کی مالک ہے۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (چونکہ افصح العرب والعجم تھے اس لئے) کبھی[1] آپ اپنے کلام میں "مجاز" کا پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔ جو قرآن عظیم میں بکثرت اختیار کیا گیا ہے۔ تو آپ کے ایسے کلام پر پہلی نظر میں غور کرنے سے یہ وہم ہوتا ہے کہ یہ بات تو صحیح نہیں ہے حالانکہ اس کلام سے وہ حقیقی اور لغوی معنی مراد نہیں ہوتے جو اول وہلہ میں ذہن میں آتے ہیں۔

اور کبھی[2] آپ ان غیبی امور سے متعلق کلام فرماتے اور اُمت کو آگاہ کرتے ہیں جو آئندہ زمانہ میں پیش آنے والے ہوتے ہیں اور حدیثوں کے پرکھنے کے وقت تک ان کے پیش آنے کا زمانہ آیا نہیں ہوتا تو ایسے امور سے متعلق حدیثوں کے انکار کرنے میں جلد بازی سے کام لینا کسی طرح معقول نہیں ہو سکتا۔

اور بعض اوقات آپ ایسے علمی حقائق سے اُمت کو آگاہ کرنے کی غرض سے کلام فرماتے ہیں جن کا انکشاف نہ عہد نبوت میں ہوا ہوتا ہے اور نہ ناقدین حدیث کے زمانہ تک انسانی علم کی رسائی ان حقائق تک ہوتی ہے بلکہ زمانہ مابعد میں ان علمی حقائق کا انکشاف ہوتا ہے اور حدیث کی صحت ثابت ہو جاتی ہے جیسے "کتے کے برتن میں منہ ڈال دینے سے متعلق حدیث" کہ جدید سائنس نے کتے کے لعاب دہن کی مضرت کو اور اس حدیث کی صحت کو ثابت کر دیا ہے دراں حالیکہ اب سے پہلے خود ہمارے علماء حدیث بھی اس حکم کو ان تعبدی امور میں سے سمجھتے رہے ہیں جن کی حقیقت اور حکمت عام انسانی عقل کی رسائی سے ماوراء ہوا کرتی ہے، اس کے باوجود دورِ حاضر کے بعض محققین نے اس حدیث کے متعلق فیصلہ کرنے میں بھی جلد بازی سے کام لیا ہے (اور رد کر دیا ہے حالانکہ جدید سائنس کتے کے جھوٹے کی مضرت کو تسلیم کرتی ہے)

یہی وہ امور ہیں جو نقد متن حدیث میں علماء حدیث کے محتاط طریق کار کو صحیح اور درست ثابت کرتے ہیں جبکہ اُس حدیث میں کوئی معمولی سا شبہ پیدا ہو جائے یا عقل انسانی کو اس کے سمجھنے اور قبول کرنے میں کچھ تردد پیش آ جائے مگر اسی کے ساتھ عقلاً اس کے محال ہونے کا یقین بھی محض اس بے بنیاد شبہ یا تردد کی بنا پر نہیں کرتے اور حدیث کو رد کرنے میں جلد بازی سے کام نہیں لیتے اسس

کے بعد کہ وہ سند کے صحیح ہونے اور راویان حدیث میں سے کسی بھی راوی کے جھوٹا یا ضعیف یا متہم نہ ہونے کا پختہ یقین حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔

رہے (یہودی اور مسیحی) مستشرقین تو وہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات معصوم کے بارے میں اس موقف (یعنی آپ کے فوق العادہ ملکوتی صفات صاحب وحی والہام نبی ہونے) کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے وہ تو (آپ کو بھی ایک عام انسان سمجھتے ہیں اور) آپ کی احادیث — اقوال و افعال — کو بھی جرح و نقد کے اُنھیں اصولوں سے پرکھتے ہیں جن سے عام لوگوں کی خبروں (اقوال و افعال) کو پرکھا جاتا ہے کیونکہ وہ تو رسول کو بھی اسی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس نگاہ سے اس عام آدمی کو دیکھتے ہیں جس کا نہ وحی الٰہی سے کوئی علاقہ ہو نہ ہی خدا نے اس کو غیبی امور سے آگاہ کیا ہو اور عام بنی نوع انسان سے علوم و معارف اور روحانی کمالات و کرامات میں بھی اس کو کوئی خاص امتیاز حاصل نہ ہو۔ چنانچہ جب بھی آپ کی کوئی حدیث ان کے سامنے آتی ہے جس میں کسی ایسے علمی معجزہ کی خبر دی گئی ہوتی ہے جو آپ کے زمانہ میں معروف نہ ہو تو وہ برملا اس حدیث کے بارے میں فیصلہ دیدیتے ہیں کہ یہ حدیث موضوع ہے کیونکہ یہ آپ کے زمانہ میں معروف علوم و فنون کے ساتھ میل نہیں کھاتی اور جب ان کے سامنے کوئی ایسی حدیث بیان کی جاتی ہے جس کی تعبیر میں قانون کا رنگ پایا جاتا ہو تو وہ برملا کہدیتے ہیں کہ یہ حدیث تو موضوع ہے کیونکہ یہ تو فقہ اسلامی کے اس دور کی نمائندگی کرتی ہے جبکہ فقہ اسلامی میں پختگی آچکی تھی (یعنے ائمہ مجتہدین اور فقہاء اسلام نے فقہی احکام کو قانون کی شکل میں مدون کر دیا تھا) اس کے برعکس یہ حدیث اس سادگی سے محروم ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے دور کی نمائندگی کرتی ہے (جبکہ فقہ اسلامی مدون نہیں ہوئی تھی) اور جب کوئی ایسی حدیث ان کے سامنے آتی ہے جس میں (صاحب وحی والہام) رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے آئندہ زمانہ میں واقع ہونے والی کوئی بشارت دی گئی ہوتی ہے یا مستقبل میں مسلمانوں کے درمیان کسی واقعہ کے پیش آنے کی خبر دی گئی ہوتی ہے تو وہ اس کو فوراً یہ کہکر رد کر دیتے ہیں کہ نبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے زمانہ کے حالات آپ کو ایسی بشارت یا خبر دینے کی اجازت نہیں دیتے (لہٰذا یہ حدیث جھوٹی ہے)

غرض ان مستشرقین نے تو ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بالکل اُس

شخص کا موقف اختیار کیا ہے جو آپ کی رسالت کا منکر ہو خدا کی طرف سے جو دین آپ نے پہنچایا ہے اس کی سچائی کو وہ شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہو، آپ کی مقدس ومعصوم روح کے اس اعلیٰ وارفع مقام کے انکار پر اسے اصرار ہو جس کو اس ملاء اعلیٰ سے اتصال حاصل تھا جہاں سے آپ پر انوار وتجلیات، حکم ومصالح اور علوم ومعارف کا فیضان ہوتا تھا (اور آپ غیبی امور یا آئندہ زمانہ میں پیش آنے والے واقعات کی خبریں دیا کرتے تھے)

ان مستشرقین نے اسی پہ اکتفا نہیں کیا کہ خود احادیث رسول کا انکار کریں بلکہ ہمارے علماء حدیث پر بھی انتہائی رکیک حملے کئے (کہ یہ لوگ عقل وخرد سے کورے اور نقد وجرح کے علمی اصول سے محروم تھے) صرف اس لئے کہ انھوں نے رسول اور حدیث رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں وہ موقف اختیار نہیں کیا جو مستشرقین نے اختیار کیا ہے۔

یقیناً ہمارے علماء حدیث مستشرقین کے اس غلط طریق کار (اور معاندانہ انداز تحقیق وتنقید) کو اختیار نہ کرسکتے ہیں معذور تھے (اس لئے کہ وہ سچے اور پکے مسلمان تھے، وحدہٗ لاشریک لہٗ خدا اور اس کے معصوم رسول پر ان کا ایمان تھا) وہ محمد بن عبداللہ پر ایک رسول کریم ہونے کی حیثیت سے ایمان لائے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے پوری نوع انسانی کے لئے اپنا رسول (پیغام رساں) بنا کر بھیجا تھا، ان کو ایک محکم شریعت (اور مکمل دین) عطا فرمایا تھا اور ان کو وہ سعادت (ختم نبوت) عطا فرمائی تھی جو روئے زمین کے تمام انسانوں کے لئے دنیا اور آخرت دونوں کے اعتبار سے عام اور محیط تھی۔

رہے مستشرقین کے یہ مسلمان چیلے (جن کے ذہن وفکر پر یورپ اور امریکہ وغیرہ مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں کا ٹھپہ لگا ہے) جیسے مولف فجر الاسلام تو بڑا ہی دکھ ہوتا ہے یہ کہتے ہوئے کہ انھوں نے بھی یہی مستشرقانہ یعنی کافرانہ روش اور طرز عمل اختیار کیا (ان دشمنان اسلام کی اندھی تقلید میں) وہ اس انداز تحقیق وتنقید کی غلطی کو سمجھنے سے قاصر رہے (یا سستی شہرت حاصل کرنے کی غرض سے جان بوجھ کر انجان بن گئے) چنانچہ یہ مسلمان مستشرقین بھی علماء حدیث کے بارے میں متن حدیث کو پرکھنے میں کوتاہی برتنے کا رونا رونے بیٹھ گئے اور ان دلائل کے علاوہ کوئی اور معقول دلیل بھی نہیں پیش کرسکے جو مستشرقین پیش کرتے ہیں (یعنے مستشرقین کے

چبائے ہوئے تقمے چبا رہے ہیں اور ان کی چھوڑی ہوئی ہڈیاں ہی چچوڑ رہے ہیں)

چنانچہ میں چیلنج کرتا ہوں کہ استاذ احمد امین مرحوم نے اس موضوع — نقدِ متن حدیث — پر جو کچھ لکھا ہے اس میں وہ کوئی ایک بھی ایسی نئی دلیل نہیں پیش کر سکے ہیں جو انھوں نے مستشرقین سے نہ لی ہو۔

علاوہ ازیں مولف فجر الاسلام ہوں یا اس قماش کے کوئی اور محقق یہ جو احادیث کو جانچنے پرکھنے میں عقل کو حکم اور رہنما بنانے کا نعرہ لگاتے ہیں میں نہیں سمجھتا کہ وہ کس عقل کو (اور کونسی عقل کو) حکم بنانا چاہتے ہیں؟ اور وہ کونسی عقل ہے جس کو وہ اس سے زیادہ فیصلہ کا اختیار دینا چاہتے ہیں جتنا ہمارے علماء حدیث نے اپنے دقیق اصول نقد میں عقل کو دیا ہے؟

ہمارے پاس کوئی ایک عقل تو نہیں ہے (جو سب کے پاس یکساں ہو) جس سے ہم چیزوں کو پرکھتے ہوں بلکہ ہماری عقلیں بھی ایک دوسرے سے مختلف اور متفاوت ہیں اور ہمارے عقلی پیمانے (پرکھنے کے اصول) بھی ایک دوسرے سے مختلف اور جدا جدا ہیں اور ہماری سوچنے سمجھنے کی خداداد فطری صلاحتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد ہیں چنانچہ ایک بات کو ایک شخص کی عقل باور نہیں کرتی اور وہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی مگر دوسرے شخص کی عقل اس کو باور بھی کرتی ہے اور سمجھتی بھی ہے جیسا کہ ایک زمانہ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وہ احکام . . . . . جن کی حکمت و مصلحت اور ان کو شرعی قانون بنانے کے راز لوگوں پر مخفی رہتے ہیں لیکن دوسرے زمانہ میں جبکہ علوم وفنون ترقی کر جاتے ہیں اور انسانی زندگی کے راز لوگوں پر کھل جاتے ہیں تو ان احکام کی حکمت و مصلحت لوگوں پر بآسانی منکشف ہو جاتی ہے اور ان کی حکمت معقول اور مراد واضح طور پر سمجھی جانے لگتی ہے۔ غرض جوں جوں علم بڑھتا جاتا ہے اور زندگی کے اسرار کھلتے جاتے ہیں ان شرعی احکام کی حکمتیں اور مصلحتیں اُجاگر ہوتی جاتی ہیں۔

اس لئے انسانی عقل — جس کا نہ کوئی ضابطہ ہے نہ معیار متعین ہے — کے فیصلہ کی رُو سے متن حدیث کو پرکھنے کا دروازہ کھول دینا اور اس سلسلہ میں پرکھنے والے کی عقل کو مطلق العنان اور بے لگام چھوڑ دینا کہ وہ اپنی اغراض وخواہشات کے تحت جتنی چاہے دراز دستی کرے یا ناقد کے ان شکوک وشبہات کی بنا پر — جو عموماً کم علمی، کوتاہ نظری یا حقائق سے

بے خبری پر مبنی ہوتے ہیں احادیث کے رد و قبول کا اختیار عقل کو دینا اور ان جیسے پرکھنے والوں کی عقلوں کے لئے رد و قبول احادیث کے دروازے چوپٹ کھول دینا یقیناً ایسی خود رائی، انار کی اور انتشار کو دعوت دینے کے مرادف ہے جس کی انتہا (اور اس کے خطرناک نتائج) کو سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اور اس روش کے موجود ہوتے سنت صحیحہ کی عظیم عمارت، ٹھوس بنیادوں اور مضبوط ستونوں پر ہرگز قائم نہیں رہ سکتی اس لئے کہ ایک عقلمند ایک حدیث کا انکار کرے گا، دوسرے عقلمند اس حدیث کو صحیح اور درست قرار دیں گے اور تیسرے دانشور اس کو قبول کرنے یا رد کرنے میں توقف کریں گے اور اس افراتفری کی وجہ صرف یہ ہوگی کہ ان مدعیان عقل و خرد کی عقلیں عقلی فیصلے کرتے ہیں، افکار و نظریات میں، تہذیب و معاشرت میں اور غور و فکر کی گہرائیوں میں ایک دوسرے مختلف بلکہ متضاد ہوں گی تو بھلا اس صورت حال کو کیسے برداشت کیا جا سکتا ہے؟

پھر کیا مؤلف فجر الاسلام نے جو اس روش کو اختیار کر کے شرمناک ٹھوکریں کھائی ہیں اور گھناؤنی غلطیاں کی ہیں، کیا وہ مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا سامان عبرت نہیں ہے؟ چنانچہ مؤلف نے ان حقیقتوں کو جھٹلایا ہے جن کو جھٹلانے کی کسی کو مجال نہیں اور ان حدیثوں پر موضوع ہونے کا حکم لگایا ہے جن کی صحت پر بکثرت دلائل و شواہد موجود ہیں۔ لیجئے ذیل میں ان کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے

وہ چند صحیح اور کھری حدیثیں جنکو مؤلف فجر الاسلام نے بطور نمونہ جدید اصول کے تحت جھوٹی اور جعلی قرار دیا ہے

(۱) پہلی حدیث:

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا):

"سو سال کے بعد روئے زمین پر کوئی سانس لینے والی جان باقی نہ رہے گی (یعنی کوئی متنفس باقی نہ رہے گا)

اس حدیث کو امام بخاری و مسلم وغیرہ ائمہ حدیث نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ مؤلف اس حدیث کا مطلب یہ سمجھے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اس حدیث کے ذریعہ سو سال بعد دنیا کی عمر ختم ہونے کی اطلاع دینا ہے اسی بنا پر انھوں نے اس حدیث کو جھوٹا قرار دیا ہے اس

لئے کہ یہ تاریخی واقعات اور بدیہی مشاہدات کے خلاف ہے۔

لیکن یہ حدیث جس کا انھوں نے یہاں ذکر کیا ہے درحقیقت ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے اس پوری حدیث کو امام بخاری نے کتاب الصلوٰۃ میں باب السمر فی الفقہ والخیر بعد العشاء کے زیرعنوان نقل کیا ہے۔ اس پوری حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ :-

> عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں عشاء کی نماز پڑھائی جب آپ نے سلام پھیرا تو آپ کھڑے ہوئے اور (صحابہ کو خطاب کر کے) فرمایا: ذرا بتلاؤ تو اس رات کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ (دستو) "آج" (دیعنے اس وقت) جو لوگ بھی روئے زمین پر موجود (اور زندہ) ہیں، سو سال کے ختم پر ان میں سے کوئی متنفس بھی باقی نہ رہے گا۔" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ بات سُنکر لوگ گھبرا گئے اور سو سال کے متعلق طرح طرح کی باتیں کرنے لگے (کہ سو سال میں دنیا ختم ہو جائے گی) حالانکہ آپ نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ روئے زمین پر جو لوگ "آج" (یعنے اس وقت) موجود ہیں ان میں سے کوئی متنفس باقی نہیں رہے گا۔ اس سے آپ کا مقصد یہ بتلانا تھا کہ اس صدی کے خاتمہ کے ساتھ ہی آپ کے صحابہ بھی دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔

تو اس پوری حدیث کے سامنے آنے کے بعد یہ حدیث بالکل صاف اور واضح ہو جاتی ہے، اور صراحت کے ساتھ اس حدیث سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں — حضرت جابرؓ کی روایت کے مطابق اپنی وفات سے صرف ایک ماہ قبل — اپنے صحابہ کو یہ اطلاع دی ہے کہ آپ کے اس ارشاد فرمانے کے وقت جتنے لوگ روئے زمین پر زندہ موجود ہیں ان کی عمریں سو سال سے زیادہ نہ ہوں گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "آج" کی جو قید لگائی تھی بعض صحابہ نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور وہ اس پیشین گوئی کا مطلب یہ سمجھ بیٹھے کہ ساری دنیا ہی سو سال کے بعد ختم ہو جائے گی تو اس غلط فہمی کو دور کرنے کی غرض سے حضرت ابن عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے الفاظ مبارک میں اس قید (لفظ "آج") پر متنبہ کیا اور اس حدیث کی اصل مراد کو انھیں بتلایا (کہ آپ کی مراد یہ ہے کہ اس صدی کے لوگوں کی عمریں سو سال سے زیادہ نہ ہوں گی)،

عبداللہ بن عمر کی طرح طبرانی کی روایت کے مطابق حضرت علی بن ابی طالب نے بھی اس حدیث کا یہی مطلب بتلایا ہے (اور لوگوں کی غلط فہمی کو دور کیا ہے)

اسی لئے علماء حدیث نے اس پیش گوئی کے تحت کافی چھان بین اور تلاش و جستجو کی ہے کہ آپ کے صحابہ میں سے سب سے آخر میں کس نے (اور کب) وفات پائی ہے چنانچہ علماء حدیث نے ثابت کیا ہے کہ ابو الطفیل عامر بن واثلہ کا انتقال سب سے آخر میں ہوا ہے اور ان کی وفات سنہ ۱۱۰ھ میں ہوئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے مطابق یہ (سنہ ۱۱۰ھ) اس صدی کا آخری سرا تھا (اس لئے کہ آپ نے اپنی وفات سے ایک ماہ پہلے یعنی سنہ ۱۰ھ میں یہ پیش گوئی بیان فرمائی تھی)

اس لئے یہ حدیث تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الہامی معجزات میں سے ایک اہم معجزہ ہے کہ آپ نے آئندہ زمانہ میں پیش آنے والے ایک غیبی امر کی اطلاع دی جو ہو بہو اسی طرح واقع ہوا جیسے آپ نے خبر دی تھی۔

یہ ہے اس صحیح اور کھری حدیث کا وہ صریح اور قطعی مفہوم جس کی تاریخی واقعات نے تائید و تصدیق کر دی۔ آیئے اب ذرا شارحین حدیث کے بیانات بھی سنئے:

(۱) حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری شرح صحیح بخاری میں مذکورہ بالا باب کے تحت لکھتے ہیں:

> بلاشبہ حضرت عبداللہ بن عمر نے اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ آپ کا مقصد اس حدیث سے یہ تھا کہ آپ کے اس ارشاد فرمانے اور خبر دینے کے وقت سے لے کر سو سال تک میں یہ صدی اور اس کے لوگ ختم ہو جائیں گے یعنی اس خبر دینے کے وقت جو لوگ زندہ اور موجود ہیں ان میں سے کوئی بھی شخص سو سال کے بعد موجود نہیں رہے گا۔
>
> تاریخی واقعات اور حقائق سے اس کی تصدیق ہو چکی ہے کہ ایسا

ہی ہوا ہے جیسے آپ نے فرمایا تھا چنانچہ اس وقت جو لوگ دنیا میں زندہ موجود تھے ان میں سب سے آخر میں وفات پانے والے ابو الطفیل عامر ابن واثلہ ہیں اور علماء حدیث کا اس پر اتفاق اور اجماع ہے کہ صحابہ میں سب سے آخر میں ان کی وفات ہوئی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عامر نے ١١٠ھ میں وفات پائی ہے (اور حدیث میں صرف سو سال کا ذکر ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ) آپ کے خبر دینے کے وقت (یعنی ١٠ھ) سے سو سال اسی وقت (یعنی ١١٠ھ) میں پورے ہوتے ہیں،

(لہٰذا حدیث کی خبر بالکل سچی اور ہو بہو واقعات کے مطابق ہے)

(۳) امام مسلم نے صحیح مسلم میں اس حدیث کو متعدد سندوں سے روایت کیا ہے چنانچہ ایک سند سے جس میں راوی حدیث حضرت جابرؓ ہیں اس حدیث کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

ما من نفس منفوسة الیوم تاتی علیہا مائۃ سنۃ وھی حیۃ یو مئذ	آج (یعنے اس وقت) کوئی بھی سانس لینے والی روح (متنفس) ایسی نہیں ہے جس پر سو سال گذر جائیں اور وہ اس وقت زندہ ہو۔

امام نووی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:۔

یہ تمام احادیث (مجموعی طور پر) ایک دوسرے کی خود تفسیر و تشریح کر رہی ہیں (جس کے بعد حدیث کا مطلب اور مراد سمجھنے میں مطلق خفا نہیں رہتا) اور یہ حدیث تو نبوت کی روشن نشانیوں (یعنے الہامی معجزات) میں سے ایک بہت بڑی اور اہم نشانی (اور معجزہ) ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آج کی رات ـــ جس میں آپ نے یہ خبر دی ہے ـــ جو بھی روئے زمین پر زندہ لوگ موجود ہیں وہ سو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہیں گے خواہ اس سے پہلے ان کی عمر کم ہو یا زیادہ (یعنے آج کے بوڑھے، جوان اور بچے سب سو سال میں دنیا سے اٹھ جائیں گے) اس حدیث میں ان لوگوں کے سو سال کے بعد زندہ رہنے کی نفی نہیں ہے

جو اس رات کے بعد پیدا ہوں گے۔

(۳) حافظ کرمانی (اس حدیث کی شرح میں) ابن بطال کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

اس کے سوا نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اس حدیث سے یہ ہے کہ اس مدت (سو سال) میں یہ نسل جو اس وقت موجود ہے ختم ہو جائے گی تو گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث کے ذریعہ اس امت کی عمروں کے کم ہونے کی اطلاع دی ہے اور بتلایا ہے کہ ان کی عمریں پچھلی امتوں کے لوگوں کی عمروں کی طرح دراز نہ ہونگی اسی بنا پر آپ نے انکو نصیحت فرمائی کہ وہ خدا کی عبادت میں زیادہ سے زیادہ جد وجہد اور جانفشانی سے کام لیں (تھوڑے وقت میں بہت سا کام کریں زندگی کا کوئی لمحہ بیفائدہ ضائع نہ کریں) رہی ابو الطفیل عامر بن واثلہ (آخری صحابی) کی وفات تو ابن الصلاح نے اپنے مقدمہ میں تصریح کی ہے کہ: سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی ابو الطفیل عامر بن واثلہ ہیں ان کا انتقال سنہ ھ میں ہوا ہے[1] اسد الغابہ میں بھی ابو الطفیل کا سن وفات سنہ ہجری لکھا ہے ایک قول یہ بھی ہے کہ سنہ ہجری میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ اور یہ وہ آخر شخص (صحابی) ہیں جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کا شرف حاصل کیا ہے۔

(۴) حافظ ابن حجر عسقلانی الاصابہ میں لکھتے ہیں:

باقی رہی (صحت روایت کی) دوسری شرط تو وہ یہ ہے کہ (راوی حدیث اپنے شیخ کا) معاصر اور ہم زمانہ ہو، تو (صحابہ کے بارے میں) اس کا اعتبار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے ایک سو دس سال گذرنے تک کیا جائیگا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخر عمر (سنہ ھ) میں صحابہ کرام کو مخاطب کرکے فرمایا تھا کہ: تمہیں اپنی اس رات کے متعلق کچھ معلوم ہے؟ (سنو)

---

(۱) مقدمہ علوم الحدیث ص ۱۵۰!

آج سے سو سال بعد، تم میں سے جو لوگ اس وقت روئے زمین پر موجود ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی باقی نہ رہے گا"۔ اس حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم نے ابن عمرؓ کے واسطہ سے روایت کیا ہے امام مسلم نے اسی حدیث کو حضرت جابرؓ کے واسطہ سے بھی روایت کیا ہے جابر نے اس میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ :۔" یہ خبر آپ نے اپنی وفات سے صرف ایک ماہ پہلے دی ہے"۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں :۔

اسی نکتہ کی بنا پر جس شخص نے بھی اس مدت کے بعد صحابی ہونے کا دعویٰ کیا ہے ائمہ حدیث نے اس کے دعوے کی تصدیق نہیں کی (اور اس کو صحابی تسلیم نہیں کیا)، چنانچہ بہت سے لوگوں نے اس طرح کے دعوے کئے مگر ائمہ حدیث نے ان کی تکذیب و تردید کی (اور صحابی تسلیم نہیں کیا) رتن ہندی بھی انہی لوگوں میں سے ہے (جس نے صحابی ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور امت نے اس کو صحابی تسلیم نہیں کیا)

نتیجہ بحث

اب آپ دیکھئے اور انصاف کیجئے کہ درحقیقت یہ حدیث تو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے عظیم معجزات میں سے ایک آفتاب نیمروز کی طرح روشن معجزہ ہے اس کے برعکس جدید اصول تنقید کے تحت جن کے مولف فجر الاسلام مدعی ہیں یہ عظیم حدیث ایک جھوٹی حدیث اور افترا محض بن جاتی ہے۔

اس حدیث کے متعلق مولف کا موقف اور اس کی حقیقت

باقی رہا یہ کہ استاذ احمد امین مصری مرحوم نے اس حدیث کے بارے میں یہ موقف کیوں (اور کہاں سے) اختیار کیا اور اس حدیث پر جھوٹ اور جعلی ہونے کا حکم کیسے لگایا؟ تو یہ تو (مسلمان مولفین کے لئے) بڑا ہی عبرت کا مقام ہے (اس کی اصلیت یہ ہے کہ) ابن قتیبہ نے اپنی کتاب تاویل مختلف الحدیث میں (معتزلہ کے مشہور امام) نظام اور اس کی جماعت (فرقہ نظامیہ) کی جانب سے علماء حدیث پر لگائے گئے جو مطاعن (اور عیوب) گنوائے ہیں ان میں سے ایک طعن یہ بھی نقل کیا ہے

کہ یہ حضرات ایسی حدیثیں بھی روایت کرتے ہیں جن کی تاریخی واقعات ومشاہدات تکذیب وتردید کرتے ہیں اور اس کی مثال میں اس حدیث کو پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ابن قتیبہ نے اس پر شدید گرفت کی ہے اور اس اعتراض کے وہی جوابات دیئے ہیں جن کا خلاصہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف فجر الاسلام کو ابن قتیبہ کی گرفت اور جوابدہی مطلق پسند نہیں آئی کیونکہ وہ تو اس پر بجید مصر اور حریص ہیں کہ دنیا کو اپنے جدید طرز تنقید سے روشناس کرائیں اور متن حدیث کے پرکھنے میں ہمارے علماء حدیث کی کوتاہیوں کی فہرست تیار کریں اسلئے کہ وہ تو دراصل دور قدیم کے نظام وغیرہ منکرین حدیث اور دور حاضر کے مستشرقین کی افتراپردازیوں، زبان درازیوں سے بڑی حد تک مطمئن ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اسی وجہ سے نہ ان کو ابن قتیبہ کی جوابدہی پسند آئی اور نہ اس حدیث کی شرح میں شارحین حدیث نے جو کچھ لکھا ہے وہی اچھا لگا بلکہ اُنھوں نے ان تمام حقیقتوں سے بالکل آنکھیں بند کر لیں اور خود صحیح بخاری میں جو حضرت ابن عمر سے اس حدیث کی تفسیر وتشریح مروی ہے اس کو بھی قصداً نظر انداز کر دیا اسی طرح وہ صحیح مسلم میں جو حضرت جابر کی تصریح موجود ہے اس کو بھی خاطر میں نہیں لائے۔ (نہ صرف یہ بلکہ) اُنھوں نے (اعتراض کرنے کی دھن میں) اس حدیث کے صرف اسی حصہ کے نقل کرنے پر اکتفا کیا جو امام بخاری نے کتاب العلم میں ذکر کیا ہے (اور پوری حدیث جو کتاب الصلوٰۃ باب السمر بعد العشاء میں امام بخاری نے ذکر کی ہے اس کو نقل نہیں کیا دکتنی بڑی خیانت اور علمی بددیانتی ہے)

امام بخاری تو (کسی طویل) حدیث کے ٹکڑے کرنے اور ہر حصہ کو موقعہ بموقعہ ذکر کرنے میں معذور ہیں کہ اُنھوں نے (مختلف اور متنوع مسائل واحکام استنباط کرنے کی غرض سے) ایک ہی حدیث کے کئی کئی ٹکڑے کر کے ان کو حسب موقعہ مختلف ابواب میں ذکر کیا ہے (اور ہر حصہ سے علیحدہ علیحدہ احکام ومسائل اخذ کئے ہیں)۔

باقی رہے استاذ احمد امین مرحوم مؤلف فجر الاسلام تو ان کے لئے (پوری حدیث بخاری سے نقل کرنے کے بجائے) صرف اس (مبہم اور مجمل) حصہ کے نقل کرنے پر اکتفا کرنے (اور بخاری کا حوالہ دینے) کا نہ کوئی عذر ہے اور نہ کوئی جواز ہے دراں حالیکہ شارحین بخاری نے واضح طور پر اس بات کو جتلا دیا ہے (کہ یہ ایک طویل حدیث کا حصہ ہے جو فلاں باب میں مذکور ہے) تاکہ ناظرین وقارئین اس

کی مراجعت کر سکیں)

چنانچہ امام بخاری نے کتاب العلم میں جہاں حدیث کے اس (زیر بحث) حصہ کو ذکر کیا ہے حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں :-

> رسول اللہ صلی علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ روئے زمین پر کوئی بھی ذی روح انسان باقی نہ رہے گا" اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس وقت (یعنے آپ کے فرمانے کے وقت) موجود ہیں ان میں سے کوئی موجود نہیں رہے گا" فرماتے ہیں: یہ (اس وقت کی) قید شعیب کی اس روایت میں موجود ہے جو امام زہری کے واسطہ سے مروی ہے اور اس حدیث کے معنیٰ اور مطلب پر بقیہ بحث آئندہ کتاب الصلوٰۃ میں آتی ہے۔

اس کے بعد حافظ ابن حجر نے (بطور تائید) ابن بطال اور نووی کی عبارتیں نقل کی ہیں جن کو اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں۔

اب اگر (مؤلف کی اس ذہنیت اور علمی خیانت پر آپ کو تعجب ہے تو یہ تو کچھ بھی نہیں تعجب تو اس پر) ہے کہ مولف فجر الاسلام نے اپنی کتاب کی اس فصل کے آخر میں اپنی اس (مستشرقانہ) تحقیق کے جو ماخذ بیان کئے ہیں ان میں سب سے پہلے صحیح بخاری اور شرح صحیح بخاری فتح الباری اور قسطلانی، صحیح مسلم اور اس کی شرح نووی کے نام گنائے ہیں۔ حالانکہ ان تمام شارحین حدیث نے اس حدیث کے معنیٰ اور مطلب کے متعلق مفصل اور مدلل بحث کی ہے اور صاف و صریح الفاظ میں بتلایا ہے کہ امام بخاری نے اس حدیث کو دو ٹکڑوں اور حصوں میں تقسیم کر کے دو جگہ ذکر کیا ہے (ایک کتاب العلم میں اور ایک کتاب الصلوٰۃ میں) اور جہاں (کتاب العلم میں) اس حدیث کے مختصر حصہ کا ذکر کیا ہے وہیں پوری حدیث کی طرف اشارہ کر دیا ہے (کہ باب السمر بعد العشاء کے تحت پوری حدیث مذکور ہے)

اب اگر استاذ احمد امین مرحوم کو اس حدیث کی تمام روایات اور شارحین حدیث — جن کا وہ خود حوالہ دیتے ہیں — کی تمام تصریحات کا علم تھا تو پھر انھوں نے (اس علم کے ہوتے) اس حدیث پر جھوٹ اور افتراء ہونے کا حکم کیسے لگایا اور اگر ان کو اس کا پتہ نہیں تھا تو ان کتابوں اور شرحوں کے نام اپنی تحقیق کے ماخذوں کی فہرست میں کیوں شمار کرائے نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے

بے جانے بوجھے اس اہم موضوع پر تحقیق و تنقید کرنے اور قلم اٹھانے کی جرأت کیسے کی؟

دوسری حدیث!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص روزانہ صبح کو عجوہ کھجور کے
سات دانے کھالیا کرے اسے اس پورے دن، رات میں نہ کوئی زہر نقصان
پہونچائیگا اور نہ کوئی جادو۔

اس حدیث کو امام بخاری نے صحیح بخاری میں اور امام مسلم نے صحیح مسلم میں کتاب الطب کے تحت ذکر کیا ہے اور امام احمد نے مسند احمد میں سعد بن وقاص کی روایت سے نقل کیا ہے۔

اس حدیث کی تشریح کے بارے میں علماء امت کے مختلف مسلک ہیں۔

(۱) بعض علماء نے صحیح مسلم کی روایت کو سامنے رکھتے ہوئے اس حدیث (اور اس کی تاثیر) کو مدینہ کی عجوہ کھجوروں کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے اس لئے کہ صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: جو شخص سات کھجوریں اُن کھجوروں میں سے جو مدینہ کے دونوں کناروں (یعنے حدود) کے اندر ہوتی ہیں الی آخرہ۔ اس کی تائید مسلم کی اُس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو حضرت عائشہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: عالیہ (مدینہ کے ایک محلہ کا نام ہے) کی کھجوروں میں شفا رکھی ہوئی ہے"۔

یہ حضرات علماء فرماتے ہیں: خدا کی قدرت سے کچھ بعید نہیں کہ وہ کسی خاص شہر کی سرزمین کو کسی ایسی خاص امتیازی تاثیر کے ساتھ ممتاز فرمادے جو دوسرے شہروں میں نہ پائی جائے جیسا کہ تجربہ شاہد ہے کہ بعض خاص ملکوں کی بعض بیماریوں سے شفا کی تاثیر ایسی چیزوں میں رکھی ہوتی ہے جو وہیں پیدا ہوتی ہیں۔ دوسرے ملکوں کی انہی دوائیوں میں وہ تاثیر نہیں پائی جاتی اس کا سبب یا تو وہاں کی زمین کا اثر ہوتا ہے یا آب وہوا کا۔ لہذا مدینہ کی عجوہ کھجوروں میں وہاں کی زمین اور آب وہوا کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھ کی برکت سے مدینہ کی عجوہ کھجوروں میں یہ مخصوص تاثیر پائی جائے تو کچھ بھی بعید نہیں ہے اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے

دست مبارک سے مدینہ میں عجوہ کھجور کا پودا لگایا تھا۔

(۲) بعض علماء کی رائے ہے کہ یہ (حدیث میں مذکور) تاثیر ہر جگہ کی عجوہ کھجوروں میں پائی جاتی ہے (خواہ وہ کہیں کی ہوں مدینہ کی کچھ خصوصیت نہیں ہے) اس لئے کہ (از روئے طب) زہریلی اشیاء اپنی حد سے بڑھی ہوئی برودت کی وجہ سے مہلک ہوتی ہیں تو جب کوئی پابندی کے ساتھ روزانہ نہار منہ ہمیشہ عجوہ کھجوریں کھائے گا تو اس کے بدن میں حرارت نہایت مستحکم اور قوی ہو جائے گی اور مزید براں اس کی حرارت غریزی (اصلی حرارت) بھی اس کی مدد کرتی رہے گی لہذا اس کی بدنی حرارت زہر کی حد سے بڑھی ہوئی برودت کا مقابلہ بخوبی کر سکے گی اس لئے کہ وہ برودت عارضی اور خارجی ہونے کی وجہ سے اتنی قوی نہ ہو گی جتنی قوی اور پائیدار اس کی بدنی حرارت پہلے سے موجود ہے۔

مصنف کی رائے یہ تو علما کے ہر دو فریق کے مسلک اور دلائل ہیں باقی اکثر و بیشتر علماء نے جس رائے کو پسند کیا ہے وہ یہ تاثیر صرف مدینہ کی عجوہ کھجوروں کے ساتھ مخصوص ہے۔ حافظ ابن قیم زاد المعاد میں لکھتے ہیں:

> کھجور بہت ہی عمدہ غذا ہے صحت کی (خاص طور پر) حفاظت کرتی ہے خصوصاً ان لوگوں کے حق میں جو غذا کے طور پر ان کھجوروں کے کھانے کے عادی ہوں جیسے مدینہ کے باشندے اور اس کے اطراف میں رہنے والے عرب قبائل۔ تمام ٹھنڈے ملکوں کے باشندوں کے اور ان گرم ملکوں کے رہنے والوں کے لئے جن کی حرارت دوسرے درجہ پر ہو کھجور سب سے اچھی اور عمدہ غذا ہے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: اور مدینہ کے مقام عالیہ کی کھجوریں تو مدینہ کی سب سے اچھی اور عمدہ قسم کی کھجور ہوتی ہے کیونکہ یہ کھجور خاص طور پر بدن کے لئے ملین ہوتی ہے مزہ میں نہایت لذیذ ہوتی ہے اور انتہا درجہ شیریں ہوتی ہے۔ کھجور ایک ایسی نباتاتی پیداوار ہے جو غذاؤں میں بھی داخل ہے اور دواؤں میں بھی شامل ہے اور میوہ تو ہے ہی یعنے

غذا بھی ہے دوا بھی ہے اور تفریح طبع کے لئے خوش ذائقہ پھل بھی ہے
خصوصاً تازہ کھجوریں) فرماتے ہیں: کھجور اکثر و بیشتر مزاجوں کے موافق ہوتی
ہے، بدن کی حرارت غریزیہ (اصلی حرارت) کو قوی کرتی ہے اور کھجور
سے وہ ردی فضلات (مادے) پیدا نہیں ہوتے جو دوسری غذاؤں
اور پھلوں سے پیدا ہوتے ہیں بلکہ جو شخص روزانہ کھجوریں کھانے کا عادی ہو
اس کے اخلاط (بلغم صفرا سودا) کو سڑنے اور خراب ہونے سے روکتی ہے
اور یہ حدیث ان حدیثوں میں سے ہے جن کے مخاطب خاص لوگ ہوتے
ہیں جیسے (اس حدیث میں) اہل مدینہ اور ان کے آس پاس رہنے
والے عرب قبائل (اس لئے کہ ان کی مستقل اور دائمی غذا کھجور رہی ہے)
اور اس میں تو کوئی شک وشبہ ہے ہی نہیں کہ خاص خاص مقامات
(اور شہروں) کی ان دواؤں کو تاثیر اور منفعت میں بہت زیادہ دخل
ہوتا ہے جو وہاں پیدا ہوتی ہیں، دوسری جگہ کی انہی دواؤں میں وہ اثر
بالکل نہیں پایا جاتا چنانچہ ایک دوا جو کسی خاص مقام میں پیدا ہوتی ہے وہ
وہاں کے ایک مرض کے لئے مفید ہوتی ہے لیکن یہی دوا جو دوسرے مقامات
میں پیدا ہوتی ہے اس میں وہ اثر نہیں ہوتا اس لئے کہ وہاں کی مٹی یا آب و
ہوا یا دونوں کی تاثیر کا اس میں دخل ہوتا ہے کیونکہ یقینی طور پر زمینوں کے
بھی خواص اور مزاج ہوتے ہیں جن میں اختلاف اور تفاوت انسانوں
کی طبائع اور مزاجوں کے اختلاف کے قریب قریب ہوتا ہے (یعنے جیسے
ایک ملک کے باشندوں کی طبائع اور مزاج دوسرے ملک کے لوگوں
سے مختلف ہوتے ہیں ایسے ہی ان ملکوں کی زمینوں کی طبائع اور مزاج
بھی دوسرے ملک کی زمینوں سے مختلف ہوتے ہیں) چنانچہ بعض ملکوں

میں بہت سی نباتات غذا کے طور پر استعمال ہوتی ہیں لیکن وہی نباتات دوسرے ملکوں میں سم قاتل (اور مہلک زہر) شمار ہوتی ہیں۔"

ایک اور مقام پر ابن قیم لکھتے ہیں:

نہار منہ کھجوریں کھانے سے پیٹ کے کیڑے مرجاتے ہیں اس لئے کہ کھجور میں حرارت کے ساتھ ساتھ تریاقی قوت (زہر اتارنے کی قوت) بھی رکھی ہوئی ہے تو جب روزانہ صبح صبح نہار منہ پابندی کے ساتھ کھجوریں کھائی جاتی ہیں تو کیڑے پیدا کرنے والا مادہ کمزور پڑجاتا ہے اور (جو پیدا ہو چکے ہوتے ہیں) کھجوریں ان کو کمزور اور رفتہ رفتہ ختم کردیتی ہیں (غرض) کھجور پھل بھی ہے، غذا بھی ہے، مشروب بھی ہے اور حلوہ بھی ہے۔

دوسری جگہ حافظ ابن قیم لکھتے ہیں:-

اس خاص خطے (عرب) کے اس خاص اور معین شہر (مدینہ) کی کھجوروں کی اس معین تعداد (سات کھجوروں) کی یہ منفعت اور تاثیر کہ یہ زہر اور جادو کو اثر کرنے سے روکتی ہیں یہ وہ خواص ہیں جن کو اگر بقراط اور جالینوس وغیرہ اطبا بیان کرتے تو دنیا کے سارے طبیب اُن کے اس بیان کو یاد کرتے مانتے یقین کرتے اور اُن پر عمل کرتے حالانکہ یہ بیان کرنے والے اطباء (بقراط وجالینوس) محض اندازوں اور ظن وتخمین کی بنیاد پر کہتے، تو جس ہستی کی زبان سے نکلا ہوا ہر کلام یقینی اور قطعی ہو اور وحی الہٰی اور برہان یقینی پر مبنی ہو اس کو بدرجہ اولیٰ قبول کرلینا چاہیئے اور اعتراض کرنے کی گستاخی نہ کرنی چاہیے (۱)

اس حدیث کے مصداق کے متعلق علماء اُمت نے جو کچھ بیان فرمایا ہے یہ اس کا خلاصہ ہے

(۱) زادالمعاد ج ۳ ص ۵۴

میرا خیال ہے کہ کسی بھی حدیث کی تکذیب کرنے اور اس کو رد کرنے میں جلدی کرنا بہرحال درست نہیں بجز اس صورت کے کہ اس کی سند ضعیف اور کمزور ہو یا عقل اور طب کے اصول قطعی طور پر اس کو جھوٹا اور باطل بتلاتے ہوں۔ اس حدیث کی سند متعدد طرق سے ائمہ حدیث کے نزدیک صحیح ثابت ہو چکی ہے اور ایسے ثقہ اور عدول راویوں نے اس کو روایت کیا ہے جن کو جھٹلانے کی کسی کو مجال نہیں، اس کا متن بھی اجمالی طور پر صحیح اور معقول ہے کیونکہ عجوہ کھجور کے فائدے سب کے نزدیک مسلم ہیں اور اس کے کھانے کی ترغیبیں بھی دی گئی ہیں نہ صرف طب قدیم بلکہ طب جدید کی رو سے بھی یہ ثابت ہے کہ عجوہ کھجور بڑی عمدہ غذا ہے، معدہ کے لئے ملین ہے جسم کو نشاط بخشتی ہے، پیٹ میں جو کیڑے پڑ جاتے ہیں ان کو ہلاک کر ڈالتی ہے۔ اور اس میں تو کچھ شک و شبہ ہے ہی نہیں کہ داخلی (اندرونی) امراض مثلاً آنتوں میں تعفن اور کیڑے پڑ جانا از قسم زہر ہیں اگر یہ حد سے زیادہ بڑھ جائیں اور قوت پکڑ جائیں تو انسانی زندگی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ حدیث اس حیثیت سے کہ اس میں عجوہ کھجور کے پابندی سے کھانے کو زہروں کا علاج بتلایا گیا ہے بالکل صحیح اور معقول ہے ذرہ برابر بھی اس میں خفا نہیں ہے۔

جہاں تک جادو کا تعلق ہے تو جبکہ ہم یہ مانتے ہیں کہ جادو ایک نفسیاتی مرض ہے اور یہ کہ اس کا علاج بھی نفسیاتی ہونا چاہیے اور یہ کہ (مریض کی) نفسیاتی توجہ ہر قسم کے نفسیاتی امراض کے ازالہ میں بہت بڑا دخل ہوتا ہے تو جب ہم نفسیاتی پہلو سے کسی کو یہ بتلائیں کہ عجوہ کھجور بڑی عمدہ غذا ہے بدن کے لئے بیحد مفید ہے، جسمانی بناوٹ (باڈی) کو بیحد قوت بخشتی ہے، پیٹ کے کیڑوں کو مار ڈالتی ہے فضلات (ردی مادوں) کے تعفن کو دور کرتی ہے مزید برآں یہ کھجور بھی، مدینۃ الرسول کی عجوہ کھجور ہے جو رسول کریم صلی اللہ کا شہر ہے اور آپ نے ہی عجوہ کھجور کا پودہ اپنے دست مبارک سے لگایا ہے اور جادو کا یہ علاج بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی بیان فرمایا ہے جن کی شان یہ تھی کہ آپ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں فرماتے تھے۔ (جو فرماتے وہ خدا کی وحی اور الہام ہوتا تھا لہٰذا یہ علاج بھی آپ نے وحی الٰہی کے ذریعہ بیان فرمایا ہے) ان تمام نفسیاتی محرکات کے پیش نظر مجھے

تو اس میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں کہ عجوہ کھجور کا اثر نفسیاتی اعتبار سے اس شخص پر جس پر جادو کیا گیا ہو بہت ہی اچھا ہوگا (اور جادو کا اثر زائل کرنے میں بیحد مفید ہوگا) دراں حالیکہ طب قدیم و جدید میں تخیل کی، وہم کی اور نفسیاتی توجہ کی تاثیر بہت سے امراض میں شفا بخشنے یا بیمار کر دینے کے لحاظ سے ثابت شدہ اور مسلم ہے۔ تو کیا ان تمام حقائق کا تقاضہ یہ نہیں ہے کہ ہم اس حدیث کی تکذیب کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لیں جبکہ اس کی معقول توجیہ ممکن ہے اور جبکہ خود جدید طب بھی اب تک عجوہ کے تمام خواص معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی ہے ایسی صورت میں اس حدیث پر موضوع اور جعلی ہونے کا حکم لگانے میں جلد بازی سے کام لینا کیا علمی غلطی نہیں ہے؟ اور کیا کسی بھی طبیب نے خواہ طب قدیم کے ماہرین ہوں یا طب جدید کے آج تک یہ دعویٰ کیا ہے کہ فن طب اپنے آخری نقطۂ عروج کو پہونچ چکا ہے (اب اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا) یا اس نے جتنی بھی دنیا میں کھانے اور پینے کی چیزیں اور پھل ترکاریاں پائی جاتی ہیں ان سب کے تمام خواص معلوم کرلئے ہیں؟ ایسی صورت میں مجھے یقین ہے کہ آپ میرے ساتھ متفق ہوں گے اور یہ کہنے میں آپکو کوئی تردد نہ ہوگا کہ مؤلف فجر الاسلام کا یہ اقدام کہ یہ حدیث قطعی طور پر جھوٹی ہے حد سے بڑھی ہوئی جسارت اور بیباکی ہے جس کو علمی حلقوں میں کسی حال میں بھی قبول نہیں کیا جاسکتا جبکہ اس کی سند بلا کسی نزاع کے بالکل صحیح اور کھری ہے اور جبکہ اجمالی طور پر اس کا متن بھی صحیح اور معقول ہے اس کے بعد یہ کہنا بھی (حدیث کی صحت کے لئے) قطعاً مضر نہیں کہ طب اب تک عجوہ کھجور کے باقی خواص (جو حدیث میں مذکور ہیں) معلوم نہیں کرسکی ہے۔ یہ بات بالکل یقینی ہے کہ اگر حجاز میں ترقی یافتہ طبی ادارے (اور لیبارٹریز) ہوتے یا عالیہ کی کھجور اہل یورپ کے پاس ہوتی تو جدید طبی تجزیہ اور تحلیل کے ذریعہ اس کے بہت سے نئے نئے خواص دنیا کو معلوم ہوجاتے نیز اگرچہ اب تک عجوہ کھجور کے یہ عجیب وغریب خواص طبی اصول کے مطابق معلوم نہیں ہوسکے ہیں لیکن بہت ممکن ہے کہ انشاء اللہ مستقبل میں دنیا کو یہ خواص معلوم ہوجائیں گے (اور دنیا اس حدیث کی تصدیق کرنے پر مجبور ہوگی)

(۳) تیسری حدیث!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے! کھمبی مَنّ کی قسم ہے اس کا پانی آنکھ کے لئے شفا ہے، عجوہ جنت کا پھل ہے اس میں زہر سے شفا رکھی ہوئی ہے۔

اس حدیث کو امام ترمذی نے جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہ کے واسطہ سے اور امام احمد نے اپنی مسند میں سعید بن یزید کی روایت سے نقل کیا ہے۔ مؤلف فجرالاسلام کا اس حدیث پر اعتراض یہ ہے کہ:

کیا محدثین نے اس حدیث کو پرکھنے کے وقت کھمبی کا تجربہ کیا تھا (کہ وہ آنکھ کی بیماریوں کے لئے مفید ہوتی ہے) اور کیا عجوہ میں تریاق (زہر اتار نے کی خاصیت) رکھی ہوئی ہے؟ ہاں محدثین حضرت ابوہریرہ سے ضرور روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا ہے کہ میں نے تین یا پانچ یا سات کھمبیاں لیں اور ان کو ایک شیشی میں نچوڑا اور اپنی ایک نیم اندھی کنیز کی آنکھوں میں اس کو سرمہ کی طرح لگایا تو وہ اچھی ہوگی" (اور اس کو صاف نظر آنے لگا) لیکن اس حدیث کے صحیح ہونے کا فیصلہ کرنے کے لئے اتنا کافی نہیں ہے کیونکہ یہ تو ایک جزئی تجربہ ہے جو عام طور پر کسی چیز کو دواؤں کی فہرست میں شامل کرنے کے لئے کافی نہیں ہے (ہو سکتا ہے کہ ازالۂ مرض کا کوئی اور مخفی سبب ہوا ہو اور ابوہریرۃ اس کو نہ سمجھ سکے ہوں) اس تجربہ کا طریقہ تو بس یہی ہو سکتا تھا کہ بار بار تجربے کئے جاتے اور اس سے بھی بہتر یہ تھا کہ کسی جراثیم لیبارٹری میں تحلیل کئے جاتے تو آسانی فیصلہ کیا جا سکتا لیکن چونکہ اس زمانہ میں تحلیل تجربہ ممکن نہ تھا اس لئے اس کا بدل یہی ہو سکتا تھا کہ پورے استقصا اور احاطہ کے ساتھ واقعات کی چھان بین کی جاتی اور بار بار تجربے کئے جاتے تو یہ تجربے حدیث کے صحیح یا موضوع ہونے کے فیصلہ کے لئے

معقول طریقہ ہوسکتے تھے (۱)

یہاں دو پہلو سے بحث کرنی ضروری ہے۔

اول: یہ کہ حدیث بالکل صحیح اور کھری ہے اور صحیحین وغیرہ کتب حدیث میں موجود ہے اس کی سند میں کوئی راوی متہم اور مجروح نہیں ہے۔

دوم: یہ کہ حضرت ابوہریرہ نے اس حدیث کے تحت کھمبی کا تجربہ کیا اور اس کو ویسا ہی مفید پایا جیسا آپ نے ارشاد فرمایا ہے۔ ابوہریرۃ کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے کھمبی کے تجربات کئے ہیں اور اس کو ویسا ہی مفید پایا ہے جیسے حدیث میں مذکور ہے۔

چنانچہ یہ امام نووی جو اپنے وقت کے بہت بڑے شیخ اور حدیث کے امام ہیں بیان کرتے ہیں کہ:۔

> ان کے زمانہ میں کوئی عالم نابینا ہوگئے تھے ان کی بینائی بالکل جاتی رہی تھی تو انھوں نے (حدیث نبوی علیہ الصلوۃ والسلام کے مطابق) محض کھمبی کا پانی آنکھ میں لگایا اور ان کو شفا ہوگئی (اور بینائی لوٹ آئی) بعض علماء نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ اگر اثمد (سرمہ) کا بھی کھمبی کے ساتھ اضافہ کردیا جائے تو بہت ہی نافع اور مفید ہوتا ہے۔

مسلمان ماہرین طب نے بھی کھمبی کے متعلق تحقیقات کی ہیں اور حدیث کے صحیح اور درست ہونے کا اعتراف کیا ہے چنانچہ حافظ ابن قیم الھدی النبوی (۲) میں لکھتے ہیں کہ:۔

> زمانہ قدیم میں بھی بہت سے مشاہیر اطبا نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ کھمبی کا پانی آنکھ کو روشنی بخشتا ہے ان مشاہیر اطبا میں مسیحی اور ابن سینا وغیرہ چوٹی کے ماہرین طب کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ یہ اطبا یہ بھی کہتے ہیں کہ کھمبی میں ایک خاص جوہر ہے جو اس کی خفت پر دلالت کرتا ہے اور اس کا سرمہ

---

(۱) فی الاسلام ج ۲ ص ۱۳۱ (۲) الھدی النبوی ج ۳ ص ۱۸۱

لگانا آنکھ کی دھند اور گرم آشوب چشم کے لئے بہت مفید ہے۔ غافقی مفردات میں لکھتے ہیں کہ کھمبی کا پانی آنکھ کی دواؤں میں سب سے زیادہ مفید دوا ہے جبکہ اس کو اثمد کے پانی کے ساتھ ملا لیا جائے اور اس کا سرمہ بنا کر لگایا جائے خاص طور پر پلکوں کو قوی اور مضبوط کرتا ہے اور بینائی کی روح (طاقت) میں تیزی اور قوت کا اضافہ کرتا ہے۔ داؤد نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ کھمبی کا پانی آنکھ کی سفیدی کو دور کرتا ہے۔

آپ دیکھتے ہیں نہ علماء حدیث نے ہی کھمبی کے تجربات میں کوئی کوتاہی کی ہے اور نہ اطباء اسلام نے ہی اس کی طبی تحقیقات میں کوئی دقیقہ اٹھا رکھا ہے اس کے باوجود مؤلف فجر الاسلام مطمئن نہیں ہیں ان کے اطمینان کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ ہر مسلمان جنگل میں جائے اور کافی مقدار میں کھمبیاں لے اور ان کا پانی خود اپنی (اور اپنے آس پاس کے لوگوں کی) آنکھوں میں ٹپکائے اگر وہ سب کے سب نابینا ہو جائیں تو حدیث جھوٹی اور موضوع ہے ورنہ سچی اور صحیح ہے۔

ہم مؤلف سے پوچھتے ہیں کہ حضرت ابوہریرۃ امام نووی اور متقدمین علما و اطبا کھمبی کے تجربات کر چکے ہیں اور اس کو آنکھوں کے لئے بیحد مفید پایا ہے تو کیا (ان سب کے مقابلہ میں) خود مؤلف فجر الاسلام نے کھمبی کے ایسے ہی تجربات کئے ہیں اور اس سے کوئی نقصان پہونچا ہے (جس کی بنا پر انھوں نے حدیث کو جھٹلانے کی جرأت کی ہے) اور کیا انھوں نے کھمبی کی مختلف اور متعدد انواع واقسام میں سے ہر قسم کی ایک ایک کھمبی کو استعمال کیا ہے اور اس کو نقصان دہ پایا ہے؟ اور اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ انھوں نے اس قسم کے ناقابلِ عمل عالمگیر تجربات کر بھی لئے ہیں اور وہ مفید اور نافع ثابت نہیں ہوئی ہے تو کیا ہمیں مؤلف سے یہ دریافت کرنے کا حق نہیں ہے کہ انھوں نے اس کی بھی تحقیق کر لی ہے کہ جن کھمبیوں کا انھوں نے تجربہ کیا ہے کیا وہ بعینہ اسی قسم کی تھیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حجاز کے اندر ہوا کرتی تھیں اور جس کی زیر نظر حدیث میں خاصیت بتلائی ہے اور کیا طب اور اس کی تحقیقات اپنی انتہا کو پہونچ چکی ہیں کہ اگر کوئی حدیث اس کے خلاف ہو تو آپ اس کے

جھوٹ اور موضوع ہونے کا حکم لگا دیں ؟

بہرصورت میری سمجھ سے تو یہ بات بالکل باہر ہے کہ ایک ایسی حدیث میں جس کی سند میں کوئی خفا نہیں شک وشبہ کرنے کی گنجائش کیسے (اور کہاں سے) نکل آئی اس کے متن کو بھی تجربات کے ذریعہ آزمایا جا چکا اور اطبا بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں اور اس کی صحت پر متفق ہیں۔

اگر بالفرض جدید طبی تحقیقات سے کوئی ایسی بات ثابت ہوئی ہوتی جو حدیث کے مفہوم کے خلاف ہوتی تو ایسی صورت میں تو بیشک اُن کے لئے اس حدیث کی صحت کو قبول کرنے میں توقف کرنا، پوچھ گچھ کرنا، شک وشبہ کرنا اور علماء حدیث پر کوتاہی کرنے کا الزام لگانے کی گنجائش ہو سکتی تھی لیکن نہ وہ ایسا کر سکے ہیں اور نہ کر ہی سکتے ہیں۔

(۴) چوتھی حدیث !

حضرت عبداللہ ابن عمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ: جو شخص کتا پالتا ہے علاوہ شکار کی ضرورت کے، یا مویشیوں کی حفاظت کے، اس کے ثواب میں سے روزانہ دو قراط کم ہوتے رہتے ہیں"۔ اس پر حضرت ابن عمر سے کہا گیا کہ ابوہریرۃ اس حدیث میں اوکلب زرع — یا کھیتی کی حفاظت کے لئے کتا — کا اضافہ کیا کرتے ہیں تو حضرت ابن عمر نے فرمایا: ان لابی ھریرۃ زرعا — ابوہریرۃ کے ہاں کھیتی ہوتی ہے۔

ضحی الاسلام کے مصنف اس کے بعد فرماتے ہیں:۔

ابن عمر کا یہ قول حضرت ابن عمر کی (ابوہریرۃ پر) نفسیاتی اسباب کے سلسلہ کی ایک لطیف (اور مہذب) تنقید ہے

مؤلف ضحی الاسلام یہ کہنا چاہتے ہیں کہ:۔

ابن عمر ابوہریرۃ پر اوکلب زرع کے الفاظ حدیث میں زیادہ کرنے کا

الزام لگا رہے ہیں اس لئے کہ ابوہریرۃ صاحب زرع (کاشتکار) تھے تو انھوں نے اپنی کھیتی کی حفاظت کے لئے کتا پالنے کا جواز پیدا کرنے کی غرض سے حدیث میں یہ الفاظ بڑھا دیئے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ کی یہ حدیث جس میں کھیتی کی حفاظت کے لئے کتا پالنے کا استثنا مذکور ہے صحیح بخاری میں کتاب المزارعت کے تحت باب اقتناء الکلب للحرث میں مستقلاً مذکور ہے اور اس میں ابن عمر کے قول اور ان کی حدیث کا مطلق ذکر نہیں ہے اور امام بخاری نے ابوہریرہ کی روایت کی تائید کی غرض سے سفیان بن زہیر کے واسطہ سے بھی اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔ اسی طرح امام ترمذی نے بھی اس حدیث کو کتاب الصید کے ذیل میں ذکر کیا ہے اور (ابوہریرۃ کی تائید کی غرض سے) عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن مغفل وغیرہ کی احادیث کا بھی ذکر کیا ہے۔ امام مسلم نے بھی کتاب المساقات والمزارعت کے تحت اس حدیث کو بیان کیا ہے اور ابن عمر کی حدیث ذکر کرنے کے بعد اور چند روایتیں ذکر کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض راویوں نے خود ابن عمر سے بھی اس اضافہ او کلب زرع کو روایت کیا ہے جو ابوہریرۃ کی روایت سے ثابت ہے اور یہ کہ بعض اور صحابی بھی ابوہریرۃ کے ساتھ حدیث میں اس زیادتی کی روایت میں موافقت کرتے ہیں جو انھوں نے روایت کی ہے اور یہ کہ ابوہریرۃ اس اضافہ والی روایت میں منفرد (اکیلے) نہیں بلکہ بعض ایسے صحابہ نے بھی اس اضافہ کو روایت کیا ہے جنھوں نے براہِ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو سنا ہے۔

شارحین حدیث نے بھی ابوہریرۃ کے اس اضافہ او کلب زرع سے اور ان صحابہ سے جنھوں نے حدیث میں اس اضافے کے روایت کرنے میں ابوہریرہ کی موافقت کی ہے مفصل بحث کی ہے چنانچہ حافظ ابن حجر فتح الباری میں، یہ بیان کرنے کے بعد کہ ابن عمر کا مقصد اس قول سے کہ ان لابی ھریرۃ زرعا ابوہریرۃ کی روایت کی تائید اور اس کے ثبوت کی تحقیق ہے (نہ کہ تنقید و تردید) لکھتے ہیں کہ: اس حدیث میں کھیتی کی حفاظت کے لئے کتا پالنے (کی اجازت) کا ذکر

ابوہریرۃ کے علاوہ سفیان بن زہیر اور عبداللہ بن مغفل نے بھی کیا ہے ان دونوں کی یہ روایتیں صحیح مسلم میں موجود ہیں۔

امام نووی ابن عمرؓ کا یہ قول کہ: ابن عمر کے ہاں کھیتی ہوتی تھی" نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

ابن عمر کے اس قول کا مقصد نہ ابوہریرہ کی روایت کی تضعیف ہے نہ ہی اس کے بارے میں کسی قسم کے شک و شبہ کا اظہار مقصد ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ چونکہ ابوہریرۃ خود کاشتکار تھے اس لئے اس حدیث کو پورا یاد رکھنے میں انھوں نے خاص طور پر اہتمام کیا ہے اور اچھی طرح محفوظ اور یاد رکھا ہے اس لئے کہ عادت عامہ یہ ہے کہ جو شخص کسی چیز میں مبتلا ہوتا ہے (اور وہ اس سے متعلق ہوتی ہے) وہ اس کو اتنی پختگی کے ساتھ یاد رکھتا ہے کہ دوسرا آدمی اس طرح یاد نہیں رکھتا اور اس کے متعلق شرعی احکام کو وہ اتنا جانتا ہے کہ دوسرا آدمی اتنا نہیں جانتا پھر امام مسلم نے (اصل حدیث میں) اس اضافہ کو کہ: کھیتی کی حفاظت کے لئے بھی کتا پالنے کی اجازت ہے" عبداللہ بن المغفل اور سفیان بن زہیر کی روایت سے بھی نقل کیا ہے (جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل حدیث میں ہی یہ استثنا موجود ہے) اسی طرح امام مسلم نے ابن الحکم سے۔ جن کا نام عبدالرحمن بن ابی نعیم البجلی ہے ـــ خود ابن عمر سے حدیث میں اس استثنا کو روایت کیا ہے اب اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ ابن عمر نے جب ابوہریرۃ سے اس استثنا کو سنا ہو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے ثبوت کا ان کو یقین ہو گیا ہو تو اس کے بعد انھوں نے بھی اس حدیث میں اس استثنا کو روایت کرنا شروع کر دیا ہو دوسرا احتمال یہ ہے کہ کسی وقت ابن عمر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے یہ حدیث روایت کرتے وقت یاد ہو اور انھوں نے اس کو روایت
کیا ہو اور کسی وقت یاد نہ رہا ہو تو چھوڑ دیا ہو[1] (اور جب ابوہریرۃ کی
روایت میں اس کا ذکر ان کے سامنے آیا ہو تو یاد آگیا ہو اور ابوہریرۃ
کے اس کو یاد رکھنے کی وجہ یہ بتلائی ہو کہ ابوہریرۃ کاشتکار تھے اس
لئے ان کو یہ استثنا ہی یاد رہا ہے)

حاصل یہ ہے کہ ابوہریرۃ اس استثناء او کلب زرع — کے
اضافہ میں منفرد (اکیلے) نہیں ہیں بلکہ ان کے ساتھ صحابہ کرام کی ایک
جماعت نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس استثنا کو روایت کیا
ہے لیکن اگر بالفرض ابوہریرۃ اس استثناء کے ذکر میں تنہا بھی ہوتے
تب بھی ان کی یہ روایت قابل قبول، پسندیدہ اور لائق احترام ہوتی

یہ ہے اس مسئلہ کی صحیح صورت حال، اس تشریح و تفصیل سے آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ
حضرت ابوعبداللہ بن عمر اپنے اس قول: ابوہریرہ کاشتکار ہیں" سے ابوہریرۃ کی روایت کی
تکذیب نہیں کرتے اور نہ ہی وہ اس اضافہ کا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف (بقول
مؤلف خلاف واقعہ) اس کو منسوب کرنے کا کوئی نفسیاتی، محرک اور شخصی داعیہ بتلانا چاہتے
ہیں (جیسا کہ مؤلف ضحی الاسلام کے استشراقی ذہن نے اختراع بلکہ افترا فرمایا ہے) حضرت
ابن عمر سے ابوہریرۃ کے متعلق اس قسم کے بہتان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ
ابن عمر ہی تو وہ شخص ہیں جو برملا اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ابوہریرہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] تیسرا احتمال یہ بھی ہے کہ کسی وقت کتا پالنے کی ممانعت کی پوری حدیث بیان کی ہو اور اس میں سے کلب صید۔
کلب ماشیہ اور کلب زرع تینوں کے استثنا کا ذکر کیا ہو اور کسی وقت بطور اختصار صرف کلب صید اور کلب ماشیہ
کا ذکر کیا ہو۔ صحابہ سے اس قسم کا اختصار حدیثوں میں بکثرت ثابت ہے ۱۲ مترجم

کی سب سے زیادہ حدیثیں یاد ہیں۔ اس کی مزید تفصیل آگے آئیگی جہاں ہم یہ تبلائیں گے کہ ابن عمر اور دوسرے تمام صحابہ کے دلوں میں ابوہریرہ کا کیا مرتبہ اور مقام تھا اور یہ کہ ائمہ حدیث ابن عمر کے اس قول کو کیوں (اور کس مقصد کے لئے ذکر کرتے ہیں) اور تمام کتب صحاح میں (اس حدیث کے ساتھ ساتھ) اس قول کو کیوں نقل کرتے چلے آتے ہیں جبکہ ابن عمر کا مقصد (بقول مؤلف ضحی الاسلام) ابوہریرہ پر لطیف نفسیاتی تنقید یعنی تکذیب ہو تو پھر فقہاء اُمت ابوہریرۃ کی اس روایت پر کیسے عمل کرتے اور اپنے احکام کی بنیاد اس پر کیسے رکھتے چلے آئے (یعنی کھیتی کی حفاظت کی غرض سے کتا پالنے کی اجازت کیسے دیتے چلے آئے جبکہ ابن عمر کا مقصد اس قول سے ابوہریرہ کی تکذیب اور اس اضافہ کا انکار ہو؟

واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں ہے لیکن مؤلف فجر الاسلام کی علمی "دیانت" نے ان کو اس کے سوا اور کچھ باور نہ کرنے دیا کہ ابن عمر کا یہ قول ابوہریرہ پر ایک لطیف تنقید ہے اور اس نفسیاتی محرک کی نشاندہی ہے جس کی بنا پر ابوہریرۃ نے اس حدیث میں (از خود) یہ اضافہ کر دیا (العیاذ باللہ (تماشا یہ ہے کہ) اسی کے ساتھ ساتھ مؤلف کی "علمی دیانت" ان کو اس پر بھی مجبور کرتی ہے کہ وہ (حدیث ابوہریرۃ پر) اپنی اس تنقید کے موضوع پر ان کتب حدیث کی بھی رہنمائی فرمائیں اور حوالہ دیں جن سے اُنھوں نے اس تنقید کو اخذ کیا ہے چنانچہ وہ اس مقام پر اپنی کتاب کے حاشیہ میں لکھتے ہیں: دیکھئے مسلم پر نووی کی شرح (چہ دلاور است دُزدے کہ بکف چراغ دارد)

حالانکہ آپ ابھی چند سطر پہلے ابن عمر کے اس قول سے متعلق امام نووی کا مفصل بیان پڑھ چکے ہیں، خدارا آپ ہی تبلایئے کیا نووی کے اس بیان میں ذرا سا شائبہ بھی اس کا ہے کہ: ابن عمر ابوہریرۃ کی تکذیب کر رہے ہیں؟ نہ صرف یہ بلکہ آپ دیکھتے ہیں وہ تو ان اوہام وشکوک کی بھی نہایت شدید اور قوی تردید اور بیخکنی کر رہے ہے جو اس قول سے کسی کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

ہاں اب آپ یہ سوال ضرور کر سکتے ہیں کہ آیا مؤلف فجر الاسلام نووی کی اس عبارت

کو سمجھے نہیں ہیں؟ یا وہ سمجھ تو گئے ہیں لیکن اُنھوں نے مشہور مستشرق گولڈتسہیر کی رائے کو ــ جس کا مفصل بیان اسی موضوع پر عنقریب آتا ہے ــ مسلمان علماء حدیث اور ائمہ دین کی رائے پر ترجیح دی ہے (اور حاشیہ میں نووی شرح مسلم کا حوالہ ناواقف مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لئے ایک شاطرانہ چال ہے)

بہرحال یہ وہ احادیث ہیں جن کو مؤلف فجر الاسلام نے اس عمیق و دقیق اور اچھوتے طریق تنقید کی مثالوں کے طور پر پیش کیا ہے جس کو وہ دنیا کے سامنے (اپنے کارنامہ کے طور پر پیش کرنا) چاہتے ہیں۔

اب اس میں تو کوئی شبہ ہے ہی نہیں کہ ہمارے سابقہ تجزیہ اور موازنہ سے آپ پر یہ بات بخوبی واضح اور عیاں ہو چکی کہ مؤلف فجر الاسلام تنقید کے جارحانہ (اور سائنٹیفک) ضابطوں کے ذیل میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نئی نہیں پیش کر سکے جو ہمارے علماء کے پیش نظر نہ ہو اور وہ اس سے باخبر نہ ہوں۔ ہاں اس سلسلہ میں کوئی نئی چیز اگر پیش کی جا سکتی ہے تو وہ صرف وہ (ملحدانہ) جرأت اور بیباکی ہے جو مؤلف موصوف نے ضابطوں اور قاعدوں کے برتنے میں اور بغیر کسی اعتدال و توازن اور بغیر علمی پختگی کے احادیث پر ان کو منطبق کرنے (اور مکری حدیثوں کو رد کرنے) میں اختیار کی ہے چنانچہ اُنھوں نے ان قواعد و ضوابط کو ایسی کھری حدیثوں پر منطبق اور ان کو رد کرنے کے لئے استعمال کیا ہے جن کی صحت و قوت ہی ان کو اس میدان (نقد حدیث) میں شکست دینے کے لئے اور مستشرقین سے جو مسخ شدہ علم اور غلط افکار و نظریات حاصل کئے تھے ان کا بھانڈا پھوڑنے کے لئے بہت کافی و وافی ہے اور یہ کہ الحمدللہ ہمارے علماء رحمہم اللہ کو اغراض و خواہشات نفس ہدایت کے راستہ سے ہٹانے میں قطعاً کامیاب نہیں ہوئیں، اور انکے جذبات و میلانات نے انھیں اس پر مجبور نہیں کیا کہ وہ اُن دشوار اور مشکل مباحث میں دخل اندازی کریں جن سے دامن بچا کر نکلنے کا راستہ ہی نہ ہو اور یہ کہ (نقد حدیث کے) ان قاعدوں اور ضابطوں کے استعمال اور تطبیق میں جو کامیابی ان کو نصیب ہوئی ہے یہی وہ واضح اور دیانتدارانہ طریق کار

ہے جس کو اختیار کرنا ہر ناقد حدیث کا حتمی فریضہ ہے۔ کہ جب ایک حدیث صحیح علمی طریق سے ہم تک پہونچے، جس کو اوّل سے آخر تک ثقہ اور پختہ حافظے والے راوی ثقہ اور پختہ حافظے والے راویوں سے روایت کرتے ہوں اور اسی طرح یہ سلسلۂ روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچ جاتا ہو اور اس متن کو صحیح تسلیم کرنے میں بھی ایسی کوئی عقلی قباحت نہ ہو جس کی بنا پر اس کا رد کرنا حتمی طور پر واجب ہو، تو ایسی حدیث کا انکار اور تکذیب کسی طرح جائز نہیں ہو سکتی اس لئے کہ ایسی صورت میں حدیث کے انکار و تکذیب کے معنی یا تو العیاذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے انکار و تکذیب کے ہیں جس کا کوئی مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتا یا پھر حدیث کے راویوں یعنے صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے ائمہ حدیث کی تکذیب کے مرادف ہے جن کے متعلق تسلیم کیا جا چکا ہے کہ وہ سب کے سب ثقہ اور پختہ حافظوں کے مالک تھے اور یہ کہ جو شخص بھی ان کی سیرت اور اخلاق و کردار کا جائزہ لے گا وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ بنی نوع انسان میں ان سے زیادہ سچا، ان سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا آج تک پیدا نہیں ہوا، علاوہ ازیں ان حضرات نے جو کچھ نقل کیا ہے اس کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تاریخ کے اوراق میں دنیا کی قوموں کے جو حالات محفوظ و مدون ہیں ان کو تو بدرجہ اولیٰ شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جائے (یعنے انکار حدیث کے بعد اقوام عالم کی تاریخ سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا)

اگر پروفیسر احمد امین مصری یہ کہیں کہ ہم ان ثقہ اور عدول راویوں کو جھوٹا تو نہیں کہتے لیکن ان حضرات سے سہو و نسیان یا نادانستہ غلطی یا وہم کے مرتکب ہونے کا امکان ہے (اس لئے ہم ان کی حدیثوں کو قبول نہیں کرتے) اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امکان نہایت کمزور اور بے بنیاد احتمال ہے جس کو قوی ظن غالب پر ترجیح نہیں دی جا سکتی (اور یہ احتمال تو ہر چیز میں موجود رہتا ہے لہٰذا آپ کو تمام علوم و فنون اور افکار و نظریات کو قبول کرنے سے اور ان پر اعتماد کرنے سے انکار کر دینا چاہیے)

اس کے باوجود ہمارے علماء حدیث نے تو اس سلسلہ میں بھی انتہائی احتیاط سے کام لیا ہے

اور چند علماء کے سوا باقی تمام علماء اصول حدیث اس پر متفق ہیں کہ اخبار آحاد ظن غالب کے لئے مفید ہوتی ہیں. کیا اس تصریح کے بعد کوئی کسر باقی رہ جاتی ہے۔

اس بحث کو آخر تک پہونچانے کے بعد اب ہم کتاب فجر الاسلام پر نقد و بحث کا سلسلہ شروع کرتے ہیں

خبر واحد پر عمل

مؤلف فجر الاسلام ص ۲۶۷ پر رقمطراز ہیں:-

علماء نے حدیث کو دو قسموں پر تقسیم کیا ہے (۱) ایک حدیث متواتر، حدیث متواتر علم و یقین کے لئے مفید ہوتی ہے لیکن اس کا وجود نہیں ہے بعض علماء نے صرف ایک متواتر حدیث کا وجود تسلیم کیا ہے اور بعض علماء نے حدیث متواتر کی تعداد سات تک پہونچائی ہے (۲) دوسری قسم حدیث آحاد ہے. خبر واحد صرف ظن (گمان) کے لئے مفید ہوتی ہے (علم و یقین کے لئے مفید نہیں ہوتی اور (یہی ثابت ہونے کی صورت میں) اس پر عمل کرنا جائز ہے (ضروری نہیں)

مؤلف فجر الاسلام کا یہ بیان (بیحد خطرناک اور مستشرقانہ تلبیس کے تحت انتہائی مجمل ہے اس لئے) بحث و تنقیح کا محتاج ہے (واقعہ یہ ہے کہ) جن علما نے متواتر کی تعداد میں اختلاف کیا ہے ان کے نقطہ ہائے نظر مختلف ہیں جیساکہ سیوطی نے اس کی تصریح کی ہے۔ ورنہ تو اس میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ متواتر احادیث بہت ہیں ایک، دو یا پانچ، سات نہیں اتنی ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔

باقی احادیث آحاد کے متعلق جو مؤلف علماء حدیث کی طرف "جواز عمل" کی نسبت کر رہے ہیں (کہ ان پر عمل کرنا جائز ہے واجب نہیں) ہمیں نہیں معلوم کون ہیں وہ علما جنہوں نے یہ کہا ہے؟

(اور کس فرقہ سے انکا تعلق ہے؟) آپ سابقہ فصلوں میں پڑھ چکے ہیں کہ جو لوگ سنت کے حجت (دلیل شرعی) ہونے کے منکر ہیں جیسے غالی رافضی وہ تو سرے سے خبر واحد پر عمل کرنے کو جائز ہی نہیں سمجھتے باقی جو علماء حدیث خبر واحد کو قبول کرتے ہیں ـــ اور وہ جمہور علماء اہل سنت اور عامۃ المسلمین ہیں ـــ وہ تو یک زبان (اور متفقہ طور پر) حدیث واحد پر عمل کرنے کو واجب کہتے ہیں (نہ کہ جائز) جبکہ اس کی سند صحیح ہو (یہ تو ایسا متفقہ مسئلہ ہے کہ اس میں علماء اہل سنت کی دو رائیں کبھی ہوئی ہی نہیں بلکہ بعض علماء تو وجوب اعتقاد کے بھی قائل ہیں (اور صحیح خبر واحد پر عمل کرنا بھی واجب ہے اور اس پر اعتقاد رکھنا بھی ضروری ہے) ایسی صورت میں استاذ احمد امین مرحوم نے جو علماء حدیث کی طرف منسوب کر کے خبر واحد پر عمل کرنے کو جائز کہا ہے اس کی دو کے سوا تیسری وجہ نہیں ہو سکتی (۱) یا تو یہ ان کی ناواقفیت اور لاعلمی پر مبنی ہے تو یہ ان کی ایسی حیرتناک جہالت ہے جو ایک ایسے شخص سے انتہائی بعید اور تعجب خیز ہے جو دعوت اسلام کے ظہور کی اور اس کی تہذیب و ثقافت کی تاریخ لکھنے چلا ہو اور علماء اسلام اور راویان احادیث پر تنقید کرنے کے لئے اس نے قلم اٹھایا ہو اور علماء حدیث کے مختلف طبقات اور مذاہب کے درمیان خود کو ایک ناطرندار فیصلہ کرنیوالے کی حیثیت سے پیش کیا ہو اور اس کی جہالت کا یہ عالم ہو (کہ وہ علوم حدیث کے ایک ابتدائی مسئلہ سے بھی واقف نہ ہو) (۲) یا پھر اس کی وجہ یہ ہو کہ انھوں نے ان تمام حقائق کو جانتے بوجھتے ازراہ تلبیس اجمال سے کام لے کر حقائق کو چھپایا ہو تو اس صورت میں وہ مسخ و تحریف کے مرتکب اور مجرم بنتے ہیں ان دونوں کے علاوہ تیسری کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

اور اس مسخ و تحریف کا مقصد اور نتیجہ بس کے سوا اور کچھ نہیں جیسا کہ اس سے پہلے بھی ہم بتلا چکے ہیں ـــ کہ وہ سنت اور حدیث کے پورے ذخیرہ میں شکوک و شبہات پیدا کر کے اسے ناکارہ بنانا چاہتے ہیں کیونکہ جب حدیث متواتر کا تو وجود ہی نہ ہوا اور اخبار آحاد پر عمل کرنا صرف جائز ہوا (چاہے کوئی اس پر عمل کرے چاہے نہ کرے) تو پھر سنت اور

حدیث کا مقام ہی کیا رہا اور احکام شرعیہ کا ماخذ ہونے کے اعتبار سے اس کی حیثیت ہی کیا رہی اور پھر مسلمانوں کو حدیث وسنت کی ضرورت ہی کیا رہی۔

اس نتیجہ پر آپ ٹھنڈے دل سے غور کریں اور پھر فجر الاسلام کے "ان اما استاد عالم" کے بارے میں فیصلہ کریں (کہ وہ مستشرقین کے ایجنٹ ہیں یا نہیں)

فہرست جلد دوم

"دین اسلام میں سنت و حدیث کا مقام"

کے اہم عنوانات

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ